مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سُورَۃُ المائد

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سُوْرَۃُ المائد

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان۔سورۃ یونس
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوعِ اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوعِ اسلام 25بی2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	نومبر 2009ء
مطبع	....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفیٰؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو

آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

6الصّٰفّٰت ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الصّٰفّٰت

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ الصّٰفّٰت (1 تا 11)

دوسرا باب: سورۃ الصّٰفّٰت (آیات 12 تا 46)

تیسرا باب: سورۃ الصّٰفّٰتِ (آیات 47 تا 74)

چوتھا باب: سورۃ الصّٰفّٰت (آیات 75 تا 99)

چھٹا باب: سورۃ الصّٰفّٰت (آیات 123 تا 157)



فہرست مشمولات سورۃ ص

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ ص ۤ (آیات 1 تا 8)

دوسرا باب: سورۃ ص ۤ (آیات 9 تا 26)

تیسرا باب: سورۃ صٓ (آیات 27 تا 44)

27



فہرست مشمولات سورۂ زمر

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ الزمر (1 تا 7)

27

دوسرا باب: سورۃ الزمر (8 تا 20)

تیسرا باب: سورۃ الزمر (21 تا 40)

چوتھا باب: سورۃ الزمر (41 تا 48)

پانچواں باب: سورۃ الزمر (49 تا 55)

چھٹا باب: **سورۃ الزمر** (53تا66)

ساتواں باب: **سورۃ الزمر** (67 تا اختتام)

184 الصّٰفّٰت۔

پہلا باب: سورۃ الصّٰفّٰت (1 تا 11)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۳﴾ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ؕ﴿۵﴾ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨ الْكَوَاكِبِ ۙ﴿۶﴾ وَحِفْظًا
مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ﴿۷﴾ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۖ﴿۸﴾ دُحُوْرًا
وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ﴿۹﴾ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ
اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾

عزیزانِ من! اب سورۃ الصّٰفّٰت شروع ہوتی ہے [1]۔ قرآن کریم نے وَالصّٰفّٰتِ۔ صَفًّا۔ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا۔ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا۔ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ (37:1-4) کہا ہے۔

اسلامی مملکت کا مقصد، منتہا، غایت کیا ہے؟ یہ سب کچھ کاہے کے لیے ہوتا ہے؟ یہ تمہارے ہاں کی، جنہیں تم عبادت کہتے ہو، جنہیں انتظامات کہتے ہیں، یہ کس غرض، کس غایت کے لیے ہیں؟ کہا ہے کہ صاحب! یہ ایک ہی مقصد کے لیے ہیں۔

قرآن حکیم کے موجودہ تراجم کی نوعیت اور آیات کا صحیح مفہوم

عزیزانِ من! بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ ان میں ربط نہیں ہے۔ اب ہمارے ہاں کے ترجمے اور تفسیریں آتی ہیں۔ ان کے متعلق تو یہ ہے کہ اگر آپ نے قرآن کریم کی تعلیمات سے دور جانا ہو تو انہیں زیادہ سے زیادہ پڑھتے چلے جایئے۔ آپ انہیں جتنا زیادہ پڑھتے چلے جائیں گے، غلط پٹڑی پہ پڑی ہوئی گاڑی کی طرح، آپ اتنا ہی زیادہ منزل سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔

---

[1] یہ درس اگست 1980 کی 15 تاریخ والے درس کا ہی تسلسل ہے۔ سورۃ یٰسین کے ختم ہونے کے فوراً بعد (اسی دن) اسے شروع کر دیا گیا تھا۔

یہاں کہا ہے کہ وَالصّٰفّٰتِ ۔ صَفًّا ۔(37:1)صفیں باندھ کرنماز پڑھنے والے‘ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا (37:2) پھر دوسروں کوڈانٹنے الصّٰفّٰت 184
والے کہ ’’تیری نماز نہیں ہوئی ہیگی ۔ فیر پڑھ ۔ کی ہو یا سی‘‘؟ ❶ کہنے لگے کہ وہ جو تمہاری پتلون تھی‘ اس سے تمہارے ٹخنے ڈھکے ہوئے تھے‘ اس لیے نماز نہیں ہوئی ’’گویا اِناں نے ٹکٹاں کٹوا لیاں ہویاں سن پہنچیاں نہیں ❷‘‘ یہاں مسجد سے نکل جاؤ۔ کہتا ہے کہ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا (37:2) ڈانٹنے والے فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا (37:3) قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے۔ یہ ان آیات کا ترجمہ ہو گیا۔ آگے کہا کہ اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ (37:4) تمہارا الہ الواحد ہے۔ ’’گل کی بنی؟ کہ جی گل کی بنی‘ خدا دا کلام ہیگا‘ اے ایہد یاں باریکیاں اچ تہاڈا چھوٹا جیا ناریل جیا دماغ کیوں سمجھ سکدا ❸‘‘ یعنی خدا کے کام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی ربط نہ ہو جو انسانوں کے کلام میں ہونا چاہیے۔

اوتھے کیہہ پرواہ اے راقب‘ اوتھے بے پرواہیاں
پھڑ لئے عملاں والیاں نوں‘ چھڈ دیئے اوگن ہارنوں ❹

جب وہاں یہ چیز ہے تو اس میں یہی چیز ہونی چاہیے۔ یہ پابندی کہ اس میں ربط ہو‘ معنی ہوں‘ مقصد ہو‘ غایت ہو‘ یہ تو وہ ہے جو ان پابندیوں کے اوپر قائم رہیں ’’جیہڑا اے بے پرواہیگا‘ اوہنوں ایہدی کی لوڑ ہیگی اے۔ سردار جی دیاں گلاں اچ نہیں ہونداہیگا ربط‘ اوہناں دے ذہن اچ وہ نیں ہونداہیگا‘‘ ❺ (معاذ اللہ معاذ اللہ) کیا کہا جا رہا ہے کہ خدا کے کلام میں ربط نہیں ہوتا۔

یہاں کہا کہ ان سب کی غایت وغرض کیا ہے؟ پوچھا کہ بتاؤ کہ میدان جنگ میں‘ مومنین کے صف کشیدہ لشکر کا ہے کے لیے ہوتے ہیں؟ یہ انسانیت کو قتل کرنے کے لیے نہیں ہیں‘ یہ تو فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا (37:2) غلط کاروں کو غلط کاری سے روکنے کے لیے‘ میدان جنگ تک میں آ جانے والے ہیں۔ پوری امت یہی ہے۔ یہ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا (37:3) یہ پورے خدا کی کتاب کی پیروی کرنے والے ہیں۔ تلاوت کے معنی ’’پیروی کرنا‘‘ ہے۔ یہ تمام باقی امت جن کو عوام کہیے جو باقی رہ گئے‘ وہ سارے کے سارے قرآن کریم کا اتباع کرنے والے ہیں۔ ان میں سے انتظامیہ ہے جسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں۔ یہ نہی عن المنکر غلط کاروں کو غلط کاری سے

---

❶ تیری نماز نہیں ہوئی‘ اسے پھر پڑھو۔ (جناب!) کیا ہوا تھا کہ میری نماز نہیں ہوئی؟
❷ انہوں نے اس کی ٹکٹیں تو کٹوائی تھیں لیکن وہ تا حال پہنچی نہیں ہیں۔
❸ کیا بات ہوئی؟ کہ جناب! بات کیا بنی‘ یہ تو خدا کا کلام ہے۔ اس کی باریکیاں تمہارا ناریل سا دماغ نہیں سمجھ سکتا۔
❹ اے راقب! خدا بڑا بے پرواہ ہے۔ اس کی بے پرائیوں کا عالم یہ ہے کہ وہاں نیکوکار پکڑے جاتے ہیں اور گنہگار چھوٹ جاتے ہیں۔
❺ جو بے پرواہ ہے‘ اسے اس کی چنداں ضرورت نہیں‘ سردار جی کی باتوں میں ربط نہیں ہوتا‘ ان کے تو ذہن میں ہی نہیں ہوتا۔

روکنے والے ہیں۔ یہ آپ کی اسلامی مملکت کی انتظامیہ ہوتی ہے اور ان میں سے جب ضرورت پڑے گی، وہ دشمن نہیں رکیں گے وہ حملہ آور ہونگے' وہ یورشیں کریں گے' وہ اس دیئے کو بجھانے کے لیے آگے بڑھیں گے تو پھر یہ صف بستہ میدان جنگ میں بھی جا پہنچیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کرنے والے خواہ وہ میدان جنگ کے اندر ہوں' خواہ وہ انتظامیہ کی رو سے Executive والے ہوں' خواہ یہ باقی قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے والے ہوں' یہ سارا کچھ کس مقصد کے لیے ہوگا؟ کہا کہ اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ (37:4) یہ سب کچھ ایک خدا کی محکومیت قائم کرنے کے لیے ہوگا۔ آپ ربط دیکھتے ہیں کہ وجد آ جاتا ہے۔ غائت بتائی' منتہا بتایا' مقصد بتایا کہ یہ سارا کچھ کاہے کے لیے ہوگا۔ کہا کہ یہ قرآن کریم کی اطاعت کے لیے ہے۔ یہ انتظامیہ میدان جنگ تک میں جانے والے لشکر ہیں' جن کا مدعا ''مال غنیمت نہ کشور کشائی'' کچھ نہیں' صرف اس کے لیے ہے کہ اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ(37:4) ایک خدا کی محکومیت قائم ہو جائے۔

حقائق کو پیش کرتے وقت کائنات کو بطور دلیل وثبوت بیان کیا جاتا ہے

عزیزانِ من! اسلامی مملکت کی غایت احکام خداوندی کے سوا کسی اور کی اطاعت نہیں ہے۔ کہا ہے کہ یہاں ہم تمہیں یہ کہہ رہے ہیں کہ تم خارجی کائنات میں دیکھتے نہیں ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ خدا جہاں بھی انسانوں سے کہتا ہے کہ صرف ایک خدا کے قانون کی اطاعت کرو تو فوراً خارجی کائنات کو دلیل اور ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ کہا ہے کہ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (37:5) مالک ہی نہیں، وہ ربوبیت تھی' وہ خارجی کائنات کی ہر شے کو نشوونما دینے والا ہے۔ اب یہاں بھی اسلامی مملکت کی غایت آ گئی کہ ایک خدا کی مملکت کاہے کے لیے ہوتی ہے؟ تا کہ ہر ایک انسان کی' ہر ایک فرد کی' اسی طرح کامل نشوونما ہوتی چلی جائے جس طرح خارجی کائنات میں وہ از خود کر رہا ہے۔

مشرق ومغرب کی بجائے مشارق اور مغارب کے الفاظ کا استعمال

یہاں کہا ہے کہ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا(37:5) اس سے پہلے کبھی ذہن میں نہیں آتا تھا کہ مختلف کرّوں کے درمیان کیا چیزیں ہیں اور وہاں کیا ہے۔ قرآن کریم نے یہ چیزیں کہی ہیں۔ کہا ہے کہ وَرَبُّ الْمَشَارِقِ(37:5)۔ یہاں قرآن کریم مشرق کی جمع لاتا ہے۔ وہ مغارب بھی کہتا ہے' وہ مشارق بھی کہتا ہے۔ اس زمانے کے انسان کے ذہن میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا۔ وہ دیکھتا تو یہ تھا کہ ''جی ذرا سردیاں اچ سورج ایدروں نکلتا ہے' تے گرمیاں اچ ایدروں نکلتا ہے''[1] وہ زیادہ سے زیادہ مشرقین تک پہنچتا تھا یعنی

---

[1] جی جناب! سردیوں میں سورج ذرا ادھر سے نکلتا ہے اور گرمیوں میں ذرا ادھر سے۔

جو Extreme کنارے ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ گرمیوں میں سورج یہاں سے نکلتا ہے پھر سردیوں میں یہاں سے نکلتا ہے'اس کے نزدیک 184 وہ الصّٰفّٰت۔ مشرقین ہیں لیکن وہ تو ہر آن بلکہ ہر روز ایک نئی مشرق ہوتی ہے۔ یہ اتنا بڑا فرق ہے۔اب یہ علم الافلاک والے بتاتے ہیں کہ سورج کے طلوع ہونے کی جو جگہ ہے'اس میں روز فرق پڑتا ہے۔قرآن کریم یہاں جمع کا صیغہ لاکر مشارق کہہ رہا ہے' اسی طرح غروب ہونے والا جو مقام ہے اس میں بھی ہر روز فرق پڑتا ہے۔ وہاں بھی وہ ان چیزوں کے اندر مغارب کہتا ہے۔ ذرا آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھو اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآئَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ نِ الْکَوَاکِبِ (37:6) یہ جو سماء الدنیا کہنا ہے' چودہ سو سال پہلے اس کو کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔دنیا کے معنی ہوتا ہے ''قریب تر'' اور عام فہم الفاظ میں وہ اسے تمہاری دنیا کا آسمان کہیں گے۔ علم الافلاک کی رو سے کہیں گے کہ یہ ہے جو تم سے قریب تر بلندی تمہیں نظر آتی ہے۔

آسمانوں کے متعلق ہمارے ہاں کے تفسیری بیانات اور حقیقتِ حال

ہمارے ہاں تو ترجموں اور تفاسیر میں بھی یہ ہے کہ یہ آسمان ایک شیشے کا ڈل ہے' بیچ میں گزرنے کا پانچ سو سال کا راستہ ہے اور یہ جو ستارے ہیں' یہ اس کے اندر ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ اس طرح نظر آتے ہیں اور پھر وہ اس طرح سے اتنے آسمان طے کرنے کے بعد اوپر آپ کو پتہ ہے کہ پھر وہ عرش آتا ہے۔اس عرش کے اوپر خدا بیٹھتا ہے۔قرآن مجید کہتا ہے کہ السَّمَآئَ الدُّنْیَا (37:6) یہ جو تمہیں قریب تریں صرف بلندی نظر آتی ہے' سماصرف بلندی کو کہتے ہیں' اس کے اندر یہ کرّے ہیں۔کہا ہے کہ تم نے کبھی ہماری ربوبیت پر غور کیا ہے کہ ان کے اندر یہ کرّے ہیں۔ یہ تمہاری پہلی ہی بلندی ہے' اس کی بیک گراؤنڈ نیلگوں (Blue Browny) قسم کی ہے' اس کی داد آرٹسٹ دے گا۔اس بیک گراؤنڈ میں اس کا جو رنگ ہے' کہا ہے کہ اگر تمہیں یہ بے نقاب' اپنی اصلی شکل کے اندر' نظر آجائے تو ڈر کے مارے تمہیں نیند نہیں آئے۔ باہر وہ سویا ہوا ہو اور وہاں وہ بھیانک' جیسا انہوں نے فوٹو کے اندر دکھایا ہے کہ باہر یہ سارے کے سارے چاند اس قسم کے ہیں' وہ دھڑام سے تمہارے اوپر آگریں اور تمہارا منہ کھلے کا کھلا رہ جائے۔

دیکھنے میں یہ آسماں ہیں لیکن حقیقت میں یہ کرّے ہیں

یہ سامنے جو سخت قسم کے نیوی بلیو پس منظر کے اندر نظر آرہے ہیں' یہ اس قسم کے ڈراؤنے ہیں کہ اگر اصل رنگ میں نظر آجائیں تو کوئی سو ہی نہ سکے اور بچہ تو چیخ مار اٹھے۔کہا ہے کہ ہماری ربوبیت دیکھتے ہو! یہ کرّے ہیں' یہ سما ہے' یہ صرف بلندی ہے' کوئی شے نہیں ہے' نہایت Artistic رنگ کے اندر ہم نے ان کرّوں کو ایسا کیا کہ وہ تمہارے سامنے نہایت حسین' چمکتے ہوئے موتی نظر آئیں۔ شعروں کے اندر تو شعرا انہیں انجم کہتے ہیں' یہ اس قدر چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اتنے بھلے خوبصورت نظر آتے ہیں۔قرآن حکیم کہتا ہے کہ یہ کچھ ربوبیت کے لیے ہے' یہ ڈراؤنے نہیں بنائے۔

184الصّٰفّٰتِ۔

عظیم الجثہ ٹوٹنے والے کواکب کے لیے یہ محفوظ چھت ہے

کہا ہے کہ وَ حِفۡظًا مِّنۡ کُلِّ شَیۡطٰنٍ مَّارِدٍ (37:7) یہ چیز ہے کہ یہ ''انجم'' ہماری اس زمین کے کرّے ہیں۔ یہ اوپر جا کر جو درمیان کا ہمارا Atmosphere ہے' جسے ہم فضا کہتے ہیں' یہ غالباً چودہ میل موٹی ہے' یہ اس میں آ گرتے ہیں۔ اب ان کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ چھت ہے۔ قرآن حمید نے اسے سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا (21:32) کہا تھا کہ تمہارے اوپر یہ وہ چھت ہے جو تمہاری حفاظت کرتی ہے۔ اب معلوم ہو رہا ہے کہ اس سے اوپر کے جس قدر بھی وہ گردش میں آنے والے کواکب یا کرے ہیں' ان میں سے جو ذرے ٹوٹتے ہیں' آپ کے ہاں وہ جو میٹیارز (Meteors) آتے ہیں' یہ جو اوپر سے ٹوٹتے ہیں' اتنے اتنے زیادہ وزنی ہوتے ہیں' ان میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح پستے نہیں ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی اسی حالت میں نیچے آ جائے تو کچھ مہیب سا گڑھا کر دے' وہ اتنے اتنے عظیم الجثہ ہوتے ہیں' اتنے اتنے بھاری ہوتے ہیں۔ اگر وہ اسی شکل کے اندر کہیں نیچے آ جائیں' تو یہ زمین آباد ہی نہ ہو سکے۔

فضا کے اندر یہ پستی ہوئی غبار اور اس کے ذریعے روشنی کا انتظام

قرآن مجید نے اسے سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا (21:32) کہا ہے کہ درمیان میں ہم نے یہ ایک اس قسم کا Buffer Zone (ضرب خور حلقہ) بنایا ہوا ہے' اوپر سے یہ جتنی چیزیں آتی ہیں وہ اس گردش کے اندر آ کر پس جاتی ہیں' سرمہ ہو جاتی ہیں۔ یہ جو کبھی کبھی تمہیں دم دار تارہ نظر آتا ہے' یہ وہی ہوتی ہے۔ یہ جو اس کی دم ہوتی ہے' یہ روشنی کے اندر چمکتی ہے اور پس جاتی ہے۔ یہ فضا اپنے اندر اس کو Preserve (محفوظ) کرتی ہے' پھر غبار کی طرح سے اسے نیچے لاتی ہے اور وہ جو غبار ہے' وہ اتنا مفید ہے جتنی یہ روشنی جو آپ تک پہنچتی ہے۔ روشنی چاند کی ہو یا سورج کی' وہ غبار (Dust) کے ذرے ہیں' وہ روشنی سے چمکتے ہیں تو اس واسطے (Medium) سے روشنی یہاں تک پہنچتی ہے۔

زندہ انسانوں کو پتھروں کا محتاج بتانے والے یہ ستارہ شناس

وہ کہتا ہے کہ تم ہماری ربوبیت کو تو دیکھو ''اوتہاڈے لئی کی کی پاپڑ ویلے'' [1] پھر یہ ہم سے جھگڑتا ہے۔ کہا ہے کہ وَ حِفۡظًا مِّنۡ کُلِّ شَیۡطٰنٍ مَّارِدٍ لَا یَسَّمَّعُوۡنَ اِلَی الۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰی وَ یُقۡذَفُوۡنَ مِنۡ کُلِّ جَانِبٍ [2] (37:7-8) ہم نے ان کُلِّ شَیۡطٰنٍ مَّارِدٍ (37:7)

---

[1] وہ تمہارے لیے کیا کچھ کرتی ہے۔

[2] اور ہم نے انہیں ہر قسم کے تخریبی عناصر سے محفوظ رکھا ہے (یہ ہے ان ستاروں کی حقیقت جن کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ انسانی تقدیر ان کے مطابق بنتی اور بگڑتی ہے اور ان کے ذریعے کاہن اور نجومی انسانی تصورات کے متعلق پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے علم اور رسول کی وحی کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ یہ غلط ہے)۔ ان کے کاہن اور نجومی محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں' وہ عالم امر' جہاں اشیائے کائنات کی تقدیرات (پیمانے' قوانین) بنتی ہیں' وہاں تک ان کی قطعاً رسائی نہیں ہو سکتی۔ انسانی قیاس آرائیوں کو وہاں ہر طرف سے دھکے پڑتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص1034)۔

سے محفوظ رکھا ہے۔ کہا ہے کہ یہ ہوئی تمہارے ہاں کی جہالت کہ یہ کرے ہیں' آسمان ہے اور تم کہتے ہو کہ یہ شیشے کا ڈل ہے اور اس میں یہ 184الصّٰفّٰت ۔ موتی جڑے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے کہ تمہارے ہاں وہ دانشور ستارہ شناس چلے آتے ہیں' وہ قسمتیں بتانے والے تمہارے ہاں چلے آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک سائنس بنا رکھی ہے۔ وہ ستاروں سے' تمہاری تقدیریں بتاتے ہیں۔ یہ ذرا ملاحظہ فرماؤ۔ انہوں نے اپنی بڑی دنیا بنا رکھی ہے۔ آج تو کچھ غنیمت ہے کہ یہ کم ہو گئے ہیں' یہ کہیں کہیں نظر آتے ہیں جو بڑی سڑک کے کنارے پر کہیں کہیں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اِدھر وہ ہاتھ دیکھنے والے ہیں' اُدھر یہ ستاروں سے قسمتیں بتانے والے ہیں۔ اب تو قدرے کم ہو گئے ہیں۔ یہ ہندوؤں کے اثر سے ہیں۔ جب ہم وہاں ہندوستان میں بستے تھے تو مسلمانوں میں یہ کچھ بہت ہوتا تھا۔ اب بھی منجم ہیں' پیش گوئیاں کرنے والے ہیں۔ ان کا بڑا کاروبار ہے لیکن اب قرآن کریم کی رو سے انسانوں پہ علم کے درواز کھلے ہیں۔

دوسروں کے حالات لوحِ محفوظ سے پڑھنے والوں کے اوپر آتشیں کوڑوں کی بارش

یہ کہتے ہیں کہ وہاں تک ہماری رسائی ہے' اوپر جو کچھ ہوتا ہے ہم وہاں سے سن کر چلے آتے ہیں' اور پیر صاحب تو یہ کہتے ہیں کہ ہم لوحِ محفوظ کو بھی پڑھ کر آتے ہیں۔ ''پتہ نہیں کیہڑی زبان اچ لکھی ہوئی ہوندی ہیگی اے۔ یعنی ایتھے دے جاہل ہوندے نیں' خط دوسرے کولوں پڑھواندے نیں' لوح محفوظ پڑھ کے اوندے نیں۔''❶ یہ دعاوی کرتے ہیں کہ ہم تو وہاں سے سن کر آتے ہیں۔ کہا ہے کہ اب یہ جو ہم نے علم کی روشنی کا ایک قرآن مجید تمہیں دیا ہے' یہ اتنا آتشیں کوڑا ہے کہ ان سے کہیے کہ ذرا وہاں کے حالات معلوم کرنے کے لیے دعویٰ کریں' پھر دیکھیں کہ علم کا یہ کوڑا کس طرح ان کو وہاں سے بھگا دیتا ہے۔ نزول قرآن کریم کے بعد یہ چیزیں خود بخود آہستہ آہستہ کم ہونی شروع ہوئیں۔ قرآن کریم نے کہا یہ تھا کہ یہ ساری کائنات سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (45:13) ہے۔ انسان کا مقام اتنا بڑا ہے کہ یہ ساری کائنات' یہ ارض' یہ سما اور تمام کا تمام جو کچھ اس میں ہے' یہ تو اس کے تابع تسخیر ہے' یہ اس کے مقدر کے اوپر کس طرح سے حاوی ہو سکتا ہے' آدم تو مسجود ملائکہ ہے' ملائکہ تو اسے سجدہ کرتے ہیں۔ ان ستاروں کی حیثیت ہی کچھ نہیں ہے کہ وہ ان کی قسمت کے اوپر حاوی ہوں۔ وہ تو زیر تسخیر ہیں۔

''یہ قرآن والے'' آج بھی ان ستارہ شناسوں کے چنگل میں گرفتار ہیں

جوں جوں کائنات کا یہ علم بڑھتا گیا حقیقت سامنے آتی چلی گئی۔ یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کے نام سے یہ کچھ ہوا ہے' یہ جو

---

❶ معلوم نہیں یہ لوحِ محفوظ کس زبان میں تحریر شدہ ہے۔ یہاں تو جاہل ان پڑھ ہوتے ہیں۔ خط دوسروں سے پڑھواتے ہیں مگر لوح محفوظ خود پڑھ کر آتے ہیں۔

''قرآن والے'' ہیں وہ تو اب تک بھی اسی طرح سے ستارہ شناسوں کے پاس جاتے ہیں۔ جو کائناتی علم والے ہیں' وہ اٹھ کر ال184الصّٰفّٰت ۔ چاند کو مسخر کر لیتے ہیں' مریخ کی طرف چلے جا رہے ہیں' راستے کے چھوٹے چھوٹے کواکب تو کچھ شے ہی نہیں ہیں۔ انہوں نے ان کو بے نقاب کر کے دکھا دیا ہے۔ ان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ جو ہمارے مقدرات کے طے کرنے والے بتائے جاتے تھے' ہم ان کے اوپر جا کر چلتے پھرتے ہیں۔ کیا بات ہے قرآن کریم کی! کہتا ہے کہ اب علم اتنا سخت شعلہ ہے کہ جب بھی کوئی اس قسم کا دعوی کرے گا' تو علم کائنات' جو علم الافلاک ہے وہ ایک شعلہ بن کر ان کے پیچھے لپکے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (37:9)[1]) یہ وہاں سے دھتکارے جائیں گے' پھٹکارے جائیں گے' ان کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ کہنے والے نے کہا ہے کہ

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تُوْ' تابعِ ستارہ نہیں

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

اب ان کے ہاں خاک زندہ' اُس کے تابع ہے جس میں زندگی نہیں۔ کہا ہے کہ کیا کبھی یہ ہو سکتا ہے؟

قرآن حکیم کی تعلیم تو زندوں کے لیے ہے

عزیزانِ من! خاک تو دونوں ہی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تو خاکِ زندہ ہے۔ سوچنے کی بات پر پھر وہیں آ گئے جو قرآن کریم نے کہا تھا کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) قرآن کریم اس کے لیے ہے جو زندہ ہے۔ یہ مردوں کے لیے نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم خاکِ زندہ کی کیٹگری (شق) میں آتے ہیں؟ قرآن کریم نے دُحُوْرًا (37:9) کہا تھا کہ وہ پھٹکارے ہوئے' دھتکارے ہوئے ہیں۔ کہتا ہے کہ

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خار و زُبوں

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

یہ شعر قرآن حکیم کی آیت کا ترجمہ ہے کہ جو خدا کے قانون کی زنجیروں میں ایسا جکڑے ہوئے ہے کہ اس کو ذرا سی بھی آزادی حاصل نہیں ہے' وہ میری تقدیر کی کیا خبر دے گا؟ جس کا تعارف خدا نے یہ کہہ کر کرایا کہ ہم نے آدم سے کہا کہ یہ کچھ نہیں کرنا' اس نے

---

[1] اس کے لیے مزید آیات دیکھیے: (15:18;26;212;67:5;72;8-9) وہ مقام' سرحدِ عقل انسانی سے ماوراء ہے۔ جو لوگ اس قسم کی توہم پرستیوں میں مبتلا رہتے ہیں' وہ زندگی کے میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ان کے لیے ذلت و پستی کا مستقل عذاب ہوتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1034)

کہا کہ میں کروں گا اور کر کے دکھا بھی دیا' کہنے لگا کہ صاحب اختیار تو ایسا ہے' کسی ستارے سے کہو' خواہ وہ سورج جتنا یا اس سے کہیں 484الصّٰفّٰت بڑا کیوں نہ ہو' یہ کہہ کر کبھی دکھائے۔اس کی تو کیفیت یہ ہے کہ جکڑے ہوئے چلا جا رہا ہے:

گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو

گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بائست!

(اقبالؒ: زبورِ عجم)

خدا نے کہا کہ آدم! دیکھو' ہم نے اس کو ایسا بنایا ہے کہ بس یہ ایسا ہی رہے گا۔آدم کہنے لگے کہ معاف فرمائیے گا' ایسا آپ نے بنایا ہے' یہ ایسا نہیں رہے گا' جیسا ہم چاہیں گے ویسا ہوگا۔

قیاسات کے بل بوتے پر دوسروں کو ورغلانے والے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں

عزیزانِ من! کہا ہے کہ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41:40) ٹھیک ہے بھئی! ہماری مشیت وہاں چلتی ہے' تمہاری مشیت یہاں چلے گی۔کہتا ہے کہ اس کے باوجود یہ شکر گزار نہیں ہوتا۔ اِلَّا مَنۡ خَطِفَ الۡخَطۡفَةَ فَاَتۡبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (37:10) قیاسات میں کبھی کبھی ان کی کوئی بات ٹھیک نکل آتی ہے۔کہنے لگے کہ یہ ہے وہ چیز جس سے یہ دوسروں کو ورغلا دیتے ہیں اور اپنا الو سیدھا کر لیتے ہیں لیکن اگر کسی کے پاس علم ہو تو پھر ان کی یہ کیفیت ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ ستاروں سے خبر لینے والوں کا محض اس قسم کا ایک اتفاقی امر اور قیافہ ہوتا ہے۔یہ باتیں اس زمانے میں تو ان کی ''روحانی قوت'' کی دلیل بن سکتی تھیں جب ہنوز دنیا علم کی روشنی سے محروم تھی لیکن نزول قرآن حمید کے بعد' اس کی گنجائش نہیں۔اب ان کے ہر ظن و تخمین کے پیچھے علم کا ایک چمکتا ہوا شعلہ پڑتا ہے۔یہاں تمثیل بھی وہ دی ہے کہ وہ شعلہ صفت ہوتا ہے' ان کو بھگا دیتا ہے' یہ وہاں رہ نہیں سکتے۔جہاں علم موجود ہو' قیاسات کام نہیں دے سکتے۔قرآن الحق ہے' اس کے سوا جو کچھ بھی ہے' وہ کہتا ہے کہ ظن ہے جو انسانوں کا ہوتا ہے۔یہ ظن یقین کا درجہ اسی وقت حاصل کرے گا جب یہ قرآن حکیم سے ہم آہنگ ہو جائے گا۔کہا ہے کہ یہ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (37:10) ہے۔

خالق کائنات کی قدرتوں کی وسعت یہ ہے کہ یہ طین لازب سے زندگی کی نمود کرنے والی ہستی ہے

یہ جو انہوں نے کہا تھا کہ یہ زندہ کیسے کرے گا؟ کہا ہے کہ فَاسۡتَفۡتِهِمۡ اَهُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمۡ مَّنۡ خَلَقۡنَا ؕ اِنَّا خَلَقۡنٰهُمۡ مِّنۡ طِيۡنٍ لَّازِبٍ (37:11)۔یہ تو ان کو پھر وہی تعجب ہو رہا ہے' یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہوگا۔یا اسے ناممکن سمجھ رہے ہیں۔کہا ہے کہ ان سے پھر پوچھو کہ یہ اتنی بڑی کائنات ہے جو تم دیکھ رہے ہو' بتاؤ' یہ کس طرح سے عدم سے وجود میں آ گئی؟ ذرا سوچو تو سہی کہ اتنی بڑی عظیم کائنات کو اس

طرح عدم سے وجود میں لانے والے' اس طرح سے اس کی پرورش کرنے والے' نشوونما دینے والے' قانون کی زنجیروں میں جکڑنے الصّٰفّٰت184
والے' کے لیے کیا یہ زیادہ مشکل ہے کہ تمہیں زندہ کر دیا جائے۔ اب پھر وہی بات آ گئی کہ اِنَّا خَلَقۡنٰهُمۡ مِّنۡ طِيۡنٍ لَّازِبٍ(37:11) سوچو تو سہی کہ ان کی پیدائش کیسے ہوئی؟ کہ یہ جو چپ چپی مٹی جو ہڑوں کے کنارے' تالابوں کے کنارے ہوتی ہے' وہ یہ ہے کہ پانی اور مٹی کا ملاپ ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ ابتدا میں وہ جو جرثومہ اول یعنی نفس واحدہ ہے جسے انہوں نے بابا آدم بنا دیا' وہ ہے جامد مادہ جس سے اس کی تخلیق ہوئی۔ کیا بات ہے! چودہ سو سال پیشتر قرآن حکیم یہ بتا رہا ہے کہ وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ (21:30) زندگی پانی سے ہوتی ہے لیکن کہا ہے کہ زندگی صرف خالص پانی سے نہیں ہوتی' ہوتی تو اس کے اندر ہے مگر وہ پانی ذرا مٹی سے ملتا ہے تو وہاں سے وہ جو طین لازب ہے' اس سے پہلا جرثومہ پیدا ہوتا ہے۔ پانی کے اندر اس قسم کی ملاوٹ ہو تو پھر اس میں جرثومہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے طِيۡنٍ لَّازِبٍ (37:11) کہا ہے۔ وہ چپ چپی مٹی جو پانی کے ساتھ ملتی ہے' وہاں سے جو پہلا لائف سیل ہے' وہ وجود میں آتا ہے۔ کہا ہے کہ اس کے بعد ہماری ربوبیت ہے کہ وہ اس پیکر انسانی میں آ جاتا ہے۔ کہا کہ کیا یہ تمہارے تصور میں بھی آ سکتا تھا' اگر یہ چیز تمہارے سامنے نہ ہوتی یا ہم نہ بتاتے کہ یہ کیسے آتا ہے؟ ایسی چیز جو تمہارے نزدیک یکسر ناممکن تھی' وہ ممکن ہو کر سامنے آ گئی' تو یہ زندگی کا آگے بڑھنا کون سی ایسی بات ہے جو نہیں ہوگا۔ اب تو انسانی زندگی' مادی تخلیق کے اس زور سے سینکڑوں منازل آگے بڑھ چکی ہے(32:7-8)۔

سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت 11 تک' عزیزانِ من! ہم آ گئے' آیت 12 سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔



❀...❀...❀

دوسرا باب: سورة الصّٰفّٰت (آیات 12 تا 46)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ﴿١٢﴾ وَإِذَا ذُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ ﴿١٣﴾ وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ ﴿١٤﴾ وَقَالُوا إِنْ
هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ﴿١٥﴾ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿١٦﴾ أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ﴿١٧﴾ قُلْ
نَعَمْ وَأَنْتُمْ دَاخِرُونَ ﴿١٨﴾ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ فَإِذَا هُمْ يَنْظُرُونَ ﴿١٩﴾ وَقَالُوا يَا وَيْلَنَا هَٰذَا يَوْمُ
الدِّينِ ﴿٢٠﴾ هَٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿٢١﴾ احْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ
وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿٢٢﴾ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ﴿٢٣﴾ وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ
مَسْئُولُونَ ﴿٢٤﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُونَ ﴿٢٥﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ ﴿٢٦﴾ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ
بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٧﴾ قَالُوا إِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَأْتُونَنَا عَنِ الْيَمِينِ ﴿٢٨﴾ قَالُوا بَلْ لَمْ تَكُونُوا
مُؤْمِنِينَ ﴿٢٩﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ ۖ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طَاغِينَ ﴿٣٠﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ
رَبِّنَا ۖ إِنَّا لَذَائِقُونَ ﴿٣١﴾ فَأَغْوَيْنَاكُمْ إِنَّا كُنَّا غَاوِينَ ﴿٣٢﴾ فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿٣٣﴾ إِنَّا
كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ﴿٣٤﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٣٥﴾
وَيَقُولُونَ أَإِنَّا لَتَارِكُو آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَجْنُونٍ ﴿٣٦﴾ بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٧﴾ إِنَّكُمْ
لَذَائِقُو الْعَذَابِ الْأَلِيمِ ﴿٣٨﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾
أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَعْلُومٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ ۖ وَهُمْ مُكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ
مُتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِنْ مَعِينٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ ﴿٤٦﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1980ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ۔الصّٰفّٰتِ کی آیت 12 سے 184 ہورہا ہے:(37:12)۔

انسانی زندگی میں ایمان کی اہمیت اوراس پر اٹھنے والا اعتراض

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات سے بات آخرت کی زندگی سے متعلق چلی آ رہی تھی اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ دین کا نقطۂ ماسکہ' اس کی اصل بنیاد' حیاتِ آخرت ہے۔اس پر ایمان ہے۔خدا پر ایمان کا بھی عملی نتیجہ اسی صورت میں برآمد ہوسکتا ہے کہ اس بات پر ایمان ہو۔ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس بات کا یقین ہو کہ انسان کا کوئی عمل' یعنی میرا کوئی عمل' حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال اور ارادہ بھی بغیر نتیجہ مرتب کیے نہیں رہے گا۔اچھا ہے تو اس اچھائی کا میرے لیے نتیجہ ہوگا' برا ہے تو اس برائی کا میرے لیے نتیجہ ہوگا۔اب اس کے متعلق جو اعتراض پڑتا تھا کہ ہم تو یہی دیکھتے ہیں کہ اس زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔یہ ہمارے مشاہدے کی بات ہے کہ غلط کار' غلط کوش' غلط بین' کو دنیا میں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچتا۔وہ نہایت خوشحالی کی' نہایت خوشگواریوں کی' زندگی بسر کرتے چلے جاتے ہیں۔یہ جو چیز ہے' یہ اس پہلے بنیادی اصول کے خلاف چلی گئی کہ ہر عمل کا' ہر کام کا' نتیجہ سامنے آتا ہے۔حقیقت میں اس کے ساتھ اگلا ٹکڑا یہ ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے' زندگی مسلسل آگے بھی چلتی ہے' اس لیے جن کاموں کے نتائج یہاں ہمارے سامنے نہیں آتے' کوئی بات نہیں! وہ زندگی تو یہیں ختم نہیں ہوجاتی' آگے چلتی ہے' تو وہاں چل کر یہ سامنے آئیں گے' یہ سامنے آ کر رہیں گے۔یہ ہے اصل و بنیاد۔اگر یہ یقین نہ رہے تو پھر اس کے بعد جس کی لاٹھی اس کی بھینس' جو بھی قوت جمع کرلے' طاقت اکٹھی کرلے' وہ جو جی میں آئے کرتا پھرے' کوئی اس کو پوچھنے والا نہیں ہے' جو زیادہ فریب کار ہو وہ دوسروں کو دھوکا دے سکے' وہ جو جی میں آئے کرتا چلا جائے۔یہ جو اس قسم کی تدبیریں کرلے کہ کسی کی گرفت میں نہ آئے اور اگر گرفت میں آ جائے تو آگے جس کو ہم دنیا کی عدالت کہتے ہیں' اس میں سے چھوٹ جانے کی ہزار تدبیریں ہوتی ہیں' ویسا کچھ کرلے پھر کوئی چیز ہے ہی نہیں جو اس کو روک سکے۔

آخرت پر ایمان کے بغیر نوعِ انسانی کی ہر کوشش بے نتیجہ ہوگی

یہ تو افراد کی بات ہے۔اقوام کی بھی یہی کیفیت ہے' جو قوم بھی جسے آج کل کی اصطلاح میں سپر پاور کہتے ہیں' اس قسم کی حیثیت اختیار کرلے یعنی جو قوم بھی دوسری قوم کے مقابلے میں زیادہ قوت حاصل کرلے' وہ جو جی میں آئے کرتی پھرے' کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے۔یہ سب چیزیں غلط ہیں' دکھانے کے تماشے ہیں' ڈھونگ ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ Leage of Nations بن گئی تھی [1]

---

[1] یہ تنظیم عالمی امن قائم رکھنے کے لیے 1920 میں بنی اور 1946 میں ختم ہوگئی۔

اور پھر اقوام متحدہ کی UNO بنی اور وہ سلامتی کونسل ہے اور اب Resolution (قرار دادیں) پاس ہو رہے ہیں' کانفرنسیں ہو رہی ہیں کہ اس کا کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ یہاں تو صورت ہی یہ ہے کہ ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات''۔ یہاں تو یہ صورت ہے کہ نہ افراد کو کوئی گرفت کرنے والا ہے' نہ اقوام کو کوئی پوچھنے والا ہے' طاقت قوت فریب یہی چیزیں ہیں جو اس زندگی میں قول فیصل بنتی ہیں۔ اگر یہ یقین نہ رہے اور اس وقت جو ساری دنیا جہنم میں گرفتا ہے' وہ اسی لیے ہے کہ یہ یقین باقی نہیں رہا ہے: ''نہ دیر میں' نہ حرم میں' خودی کی بیداری'' تو اس میں مسلم اور غیر مسلم اقوام کا بھی کوئی فرق نہیں رہتا' افراد کا بھی کوئی فرق نہیں رہتا۔ ہمارے یہاں تو ہم سارے مسلمان ہی بستے ہیں بجز چند اقلیتوں کے' یہ کس کا ایمان ہے' کون ہے جو غلط کام سے محض اس لیے رک جائے کہ ہیں! مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا؟ اصلاحات کے لیے یہ اتنی کوششیں' پروگرام' ترکیبیں اور کانفرنسیں ہو رہی ہیں مگر کچھ نتیجہ برآمد نہیں کرتیں۔ یہ جو بنیادی چیز ہے یہ نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کو آپ دیکھیے گا کہ وہ قریب ہر صفحہ پہ یہ بات بالواسطہ یا بلا واسطہ کہتا چلا جا رہا ہے کہ اصلی چیز یہ ہے' اگر اس پہ تمہارا ایمان اور یقین ہے تو تم دیکھو گے کہ تمہاری حالت بھی سنورے گی' اس دنیا کی حالت بھی سنورے گی اور اس کے بعد تو پھر تمہاری زندگی نے ارتقائی منازل طے کرنا ہیں۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے ایمان کی نوعیت' مسلمانوں کا عقیدہ اور بقائے روح کا نیا تصور

میں نے پچھلی دفعہ بھی یہ عرض کیا تھا کہ اس سے پیشتر ہم لوگ تو محض عقیدتاً بھی اس کو نہیں مانتے تھے' محض زبان سے کہتے چلے آ رہے تھے' ہم میں مانتا تو کوئی بھی نہیں تھا لیکن جب ہم اس کو عقل و دانش کی سطح پر لے آتے ہیں تو وہاں ہمارے پاس ایسا نظر آتا ہے کہ کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ اور چونکہ یورپ کی قومیں دانش و بینش میں بہت آگے نظر آتی ہیں اور وہ قریباً ساری کی ساری اس یقین اور ایمان سے منکر ہیں۔ ان کے ہاں جو مذہب پرست قومیں ہیں' میں ان کی بات نہیں کرتا۔ ان میں یہودی اور عیسائی تو آخرت کی زندگی کا عقیدہ رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے لیے یہ عقیدہ بھی مقرر کر لیا ہے کہ وہاں ہماری شفاعت ہو جانی ہے۔ یہودیوں نے تو کہہ دیا کہ چند دن کے لیے یونہی دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔ جب ہمارے وہ بڑے بڑے اسلاف اور لیڈر انبیاء آئیں گے' وہ ہمیں نکال لیں گے۔ یہ بس دو تین دن کی بات ہو گی۔ عیسائیوں نے تو ایمان کفارۂ حضرت مسیحؑ بنا ہی لیا کہ انہوں نے صلیب پر اپنی جان دی اور ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ وہ ان کے لیے کافی ہے۔ مسلمانوں کے ہاں بھی شفاعت کا یہی عقیدہ پیدا ہو گیا۔ اگر کہیں کسی وقت کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا بھی ہے کہ نہیں' زندگی آخرت کی بھی ہے' تو اس میں اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے اس قسم کے قاعدے وضع کر لیے جاتے ہیں۔ بات وہی ہو جاتی ہے' نہ ماننے والا بھی اور ماننے والا بھی ایک ہی سطح پہ آ جاتے ہیں

بلکہ یہ اپنے آپ کو زیادہ فریب دیتا ہے۔ساری دنیا کی یہی کیفیت ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ (30:41) قرآن کریم نے 184الصّٰفّٰت
کہا تھا۔وہ تو نزولِ قرآن کریم کے زمانے کی بات تھی' آج اس سے بھی زیادہ بر اور بحر کے اندر فساد ہے۔ اس وقت دنیا کا کوئی خطہ ہے ہی نہیں جہاں یہ ایمان عملاً پایا جاتا ہو۔یہ چیز مغرب کے سیکولرازم کا حصہ ہے۔اس میں ہم دیکھتے تھے کہ من حیث القوم یعنی وہاں پوری کی پوری جماعتیں اور اقوام اس کا انکار کرتی تھیں۔یہ وہی ہے جسے Materialistic View of Life کہتے ہیں یعنی مادی نظریہ زندگی کہ زندگی اسی کا نام ہے:

زندگی کیا ہے؟ ''عناصر میں ظہور ترتیب''
موت کیا ہے؟ ''انہی اجزاء کا پریشاں ہونا'' ❶

اس کے بعد معاملہ ختم لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ اب خود مغرب کے فلاسفر یعنی وہاں کا مذہب پرست طبقہ (Priesthood) نہیں بلکہ وہاں کے فلاسفر جو کسی مذہب پہ بھی یوں کہیے کہ بظاہر ایمان نہیں رکھتے' وہ محض فلسفے کی بنا پہ اس چیز پہ آ رہے ہیں کہ زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی' آگے چلتی ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اس سے پیشتر وہ چارلس رابرٹ ڈارون (82-1809ء) وغیرہ کا زمانہ ابھی دس بیس سال ادھر کی بات ہے' وہ تو صرف یہی Survival (بقا) کے اوپر آئے تھے کہ موت کے بعد زندگی تو ہے' وہ بس یہاں تک آئے تھے۔اب جو وہاں کے فلاسفر ہیں' وہ اس طبعی موت کے بعد یہ کہہ رہے ہیں کہ زندگی آگے چلے گی۔وہ اب Immortality of Soul (بقائے روح) کے متعلق آ گئے ہیں The Immortality of the Soul کتاب کا نام ❷ ہے۔وہ Immotality (بقا) کے اوپر آئے ہیں کہ مرنے کے بعد زندگی ہے' یہ حیات جاوید ہے۔اب وہ اس کو فلسفیانہ سطح کے اوپر سمجھاتے ہیں اور اسے مان رہے ہیں لیکن بہرحال اب بھی وہاں کی آبادی کی جتنی اکثریت ہے اس کی وہی کیفیت ہے جو ظہور اسلام کے وقت عرب کی تھی جو سامنے تھے۔

---

❶ چکبست کا یہ شعر مادی نظریہ زندگی کا ترجمان ہے۔

❷ اس کے مصنف کا نام Sir Oliver Lodge ہے یعنی Lodge, Sir Oliver: The Immortality of the Soul اور ہیکل کی کتاب The Riddle of the Universe کے ایک باب کا عنوان بھی The Immortality of the Soul ہے۔

قرآنِ حکیم زندگی کی حقیقتوں کو کسی اندھے عقیدے کی بنا پر تسلیم نہیں کرواتا مگر یہ تمسخراڑاتے ہیں 184الصّٰفّٰت۔

قرآن حکیم کہتا ہے کہ اے رسول! تُو انہیں یہ بات سمجھاتا ہے کہ اصل ایمان یہ ہے بَلۡ عَجِبۡتَ وَیَسۡخَرُوۡنَ (37:12)۔ یہاں دو الفاظ آئے ہیں۔ تُو انہیں جو کچھ کہتا ہے، یہ اس کا تمسخر اڑاتے ہیں اور تجھے اس پر حیرت ہوتی ہے۔ تو کیا انہیں انسان سمجھا جائے؟ سنیے! قرآن حکیم اندھے عقیدے کے طور پر اسے نہیں منواتا۔ وہ کسی بات کو بھی اندھے عقیدے کی بنا پہ نہیں منواتا۔ وہ مذہب ہے ہی نہیں۔ وہ دلائل و براہین کی رو سے منواتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ آج اس صدی میں مغرب کے فلاسفرز جو دلائل پیش کررہے ہیں، وہ دلائل قرآنِ کریم کے اندر چودہ سو سال پہلے سے موجود ہیں۔ آج دلائل وہ دیئے جا رہے ہیں جو قرآن کریم میں موجود ہیں لیکن تمسخر والی وہ بات آج بھی یورپ کے اندر موجود ہے۔ مذہب پرست طبقہ تمسخر کرنے میں ذرا جھجکتا ہے، مانتا تو یہ بھی نہیں ہے، محض معاشرے کے ڈر کی وجہ سے، نہ تو یہ اسے کھلے بندوں زبان پہ لاتا ہے اور نہ ہی تمسخر اڑاتا ہے۔ اگرچہ ہم نے نئی نسل پیدا کی ہے، ہم نے انہیں مذہب سے جو متنفر کیا ہے تو ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ بعض اوقات تمسخر بھی ہوتا ہے لیکن اس زمانے میں تو قرآن کریم یہ کہہ رہا ہے کہ تُو انہیں یہ بات کہتا ہے! اب بجائے اس کے کہ یہ اسے کسی عقل و فکر کی، دلیل و برہان کی، رو سے سمجھنے کی کوشش کریں اور اگر ان میں ہمت ہے تو تردید کرنے کی کوشش کریں مگر یہاں صرف اتنی سی بات ہے کہ یہ تمسخر اڑاتے ہیں اور بَلۡ عَجِبۡتَ (37:12) تجھے اس پر حیرت ہوتی ہے۔

یہ عجیب چیز ہے کہ جو شخص کسی بات کو عقل و فکر کی رو سے صحیح مانتا ہو، دلائل و براہین کی رو سے ثابت کرتا ہو، دوسرا اس بات سے انکار ہی نہیں بلکہ اور مذاق اڑا دے تو اس کو اس پہ تعجب آتا ہے کہ یہ کس قسم کے انسان ہیں کہ نہ عقل و فکر کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، نہ دلائل و براہین سے اس کی تردید کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بس محض تمسخر اڑا دیا۔ یہ ہے ان کا انداز۔ کہا ہے کہ وَاِذَا ذُکِّرُوۡا لَا یَذۡکُرُوۡنَ (37:13) قرآن کریم تو پیش کرتا ہے، وہ اسے سننے تک کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے وَاِذَا رَاَوۡا اٰیَۃً یَّسۡتَسۡخِرُوۡنَ (37:14)۔ پہلے تو یَسۡخَرُوۡنَ (37:12) کہا تھا اور اب یَّسۡتَسۡخِرُوۡنَ (37:14) کہا ہے۔ قرآن کریم میں اس قسم کی آیات جب سامنے لائی جاتی ہیں، میں نے یہ عرض کیا ہے کہ جب ایک ہی مادے سے عربی زبان کا باب بدلتا ہے تو اس میں معنی بدلتے جاتے ہیں۔ اب یہ باب بدل گیا کہ ''وہ اکیلا ہی نہیں ہے، وہ ہنس کر دوسروں کو بلاتا ہے، کہتا ہے کہ ذرا ادھر آنا، سننا! دیکھو! یہ کیا کہتا ہے اور پھر یہ مل کر مذاق کرتے ہیں''۔ اور تجھے اس پہ تعجب ہوتا ہے۔

مرنے کے بعد کی زندگی پر تمسخر کرنے والوں کو قرآنِ حکیم کا جواب

کہا کہ وَقَالُوۡۤا اِنۡ ھٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ۔ ءَاِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ۔ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ (37:15-17) وہ

آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آؤ' ذرا سنو' یہ کیا کہہ رہا ہے اور مذاق کرتے ہیں کہ کہہ یہ رہا ہے کہ مرنے کے بعد تم 184 الصّٰفّٰت۔ اٹھائے جاؤ گے' اس کے بعد زندگی ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ گل سڑ کر ہماری ہڈیاں تک بھی خاک میں مل جائیں گی اور یہ کہہ رہا ہے کہ پھر زندہ کیے جاؤ گے' ہم بھی زندہ کیے جائیں گے۔ چلیے! ہم تو آج مرے نہیں' وہ جو دس ہزار سال' لاکھ سال پہلے' ہمارے آباؤ اجداد مر گئے ہیں' وہ کہتا ہے کہ وہ زندہ کیے جائیں گے' ذرا اس کی بات سننا! کہا کہ اس سے پوچھو کہ کیا ایسا ہوگا؟ قرآن حکیم نے ایک ہی لفظ کہا ہے کہ قُلْ نَعَمْ (37:18) ہاں ایسا ہو کر رہے گا' یہ ایک یقینی حقیقت ہے جسے میں بیان کر رہا ہوں۔ یہ قیاسی بات نہیں ہے۔ کہا ہے ''نعم '' ہاں ہو کر رہے گا اس لیے کہ سمجھانے کی خاطر اس کے دلائل تو اس نے بکثرت دیئے ہیں لیکن جب یہ آ کر پوچھیں کہ کیا ایسا ہوگا تو جواب ہے کہ ہاں ہوگا۔

اہلِ قریش کو صدرِ اول کے مسلمانوں کے ہاں نظام کے قیام کی شکل میں عملی ثبوت

وہ تو اس دور کا مسلمان تھا یا صدر اول میں اسلام میں وہ اس قابل بھی تھے کہ وہ بتا دیں کہ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ غلط کاموں کے غلط' تباہ کن انجام یا نتائج سامنے آتے ہیں' آج ہم کیسے بتائیں!! اگر قرآن مجید کا نظام قائم ہو جائے تو آخرت تک ہی معاملہ اٹھا رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی' وہ نتائج اسی دنیا میں بھی سامنے آجاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تسلسلِ حیات تو قائم رہتا ہے' آگے بھی چلنے والی بات ہے لیکن تم جو اس وقت ان باتوں پہ تمسخر کر رہے ہو' تو یہ اس قوت کی بنا پر ہے جو تمہارے پاس ہے۔ تمسخر انسان ہمیشہ اپنی جھوٹی قوت یا عزت کے بل بوتے پہ کرتا ہے' طاقتور کا کوئی مذاق نہیں اڑاتا' اسے پتہ ہے کہ سامنے سے ایسا طمانچہ پڑے گا کہ یہ دانت نکال دے گا۔ وہ کرتا یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو بہت بڑا طاقتور سمجھتا ہے' وہ کہتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ تم جو اس طرح مذاق اڑاتے ہو' یہ اس طاقت کی وجہ سے ہے۔

یہ جماعت پہلے بہت کمزور سی' مختصر سی' چند غریب نفوس کی جماعت تھی' اور غریب الدیار تھی' یہ اپنے وطن سے بھی نکالے ہوئے تھے۔ ان کی یہ کیفیت تھی اور وہاں اگر مکے میں تھے تو قریش کی یہ کیفیت تھی کہ صاحب! پوچھو نہیں کہ قریش کی قوت اور اقتدار کے معاملے کے اندر کیفیت کیا تھی! کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم تو یہ کہتے ہو لیکن اس نظام کو قائم ہو جانے دو جسے میں لے کر آیا ہوں' تم دیکھو گے کہ وہ اتنی لمبی تاریخ بھی نہیں ڈالنی پڑے گی کہ وہاں جا کر مرنے کے بعد قیامت میں جا کر یہ نتائج سامنے آئیں۔ کہا ہے کہ نَعَمْ (37:18)۔ یہ واقعہ ہے جو ہم کہہ رہے ہیں' یہ ہو کر رہے گا۔ اور دوسری بات میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے ہاں کے جو غلط کام ہیں' غلط نظام ہے' غلط پروگرام ہے' اسکے نتائج یہاں بھی آئیں گے۔ اب تم قوت کے نشے میں بدمست ہو اور تمسخر اڑاتے ہو۔ تم دیکھ لو گے کہ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ (37:18) کس طرح سے اسی دنیا میں تم ذلیل و خوار ہوتے ہو۔ یہ قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ غلط کام تباہی اور

بردباری کے نتائج سامنے لاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ اچھے کام خوشگواریاں اور کامرانیاں پیدا کرتے ہیں 184الصّٰفّٰت ۔ یہ اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں بشرطیکہ وہ نظام قائم کر دیا جائے جو قرآن کریم نے دیا ہے۔ وہ نظام یہ کر کے رہتا ہے۔ چنانچہ دونوں ہی باتیں کہہ دیں کہ میں جو کچھ تمہیں کہتا ہوں' اس کی صداقت کا ثبوت تو یہیں مل جائے گا' بس تھوڑا سا انتظار کرو اور پھر تم دیکھو کہ تم جو اپنی قوت کے نشے میں بدمست ہو وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ (37:18) اسی دنیا کے اندر تم کس طرح ذلیل وخوار ہوتے ہو۔ کہا ہے کہ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ (37:19) ایک یورش ہوگی' ایک جھٹکا آئے گا' تم دیکھتے کے دیکھتے رہ جاؤ گے۔

قرآن کریم حقائق کی روشنی میں اور تاریخی پس منظر میں سمجھنا چاہیے

عزیزانِ من! یہ قرآن کریم کی باتیں ہیں۔ آج ہم اول تو یہ معنی ہی نہیں سمجھتے' پڑھتے ہی نہیں ہیں' پڑھتے ہیں تو اسے ناظرہ پڑھتے ہیں' اگر کوئی سمجھتا بھی ہے تو وہ وہی پرانے طریقے پہ ہے۔ قرآنِ کریم سے اگر تاریخ کو مرتب کیا جائے' اس کے پس منظر اور تناظر میں ان چیزوں کو پڑھا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کتنی بڑی حقیقتیں تھیں جو قرآن مجید بیان کر رہا تھا۔ ان لوگوں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اس قریش جیسی قوم پر اس دور میں کم از کم اس علاقے کے اندر' اس ملک کے اندر' کوئی دوسری قوم' ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس قوم کو وہیں کے رہنے والے [1] نے کہا تھا کہ تمہارے ہاں جو نہایت غریب ہیں ان پہ روز ظلم و ستم ہو رہا ہے' اسے ختم کرو۔ اس کہنے والے کی تعداد جماعت اتنی کم ہے' یہ بے سروسامان ہے۔ وہ یہ بات کہہ رہے ہیں کہ تم مکافاتِ عمل کے قانون کو نہیں مانتے کہ غلط کوشیاں تباہیاں لاتی ہیں۔ تم اسے نہیں مانتے' تم قیامت کی بات بھی چھوڑ و' تم یہ دیکھو کہ اسی دنیا میں تمہارا غلط نظام کس قسم کی تباہیاں تمہارے سامنے لاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ایک مختصر سی' کمزوروں کی' مفلسوں کی' غریبوں کی' جماعت کس حتم ویقین سے یہ بات کہہ رہی ہے۔

الدین کے دور میں انسانوں کے ہر عمل کا نتیجہ سامنے آجائے گا

کہا ہے کہ وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ۔ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ (37:18-19) ایک جھٹکا آئے گا' تم دیکھتے کے دیکھتے رہ جاؤ گے وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ (37:20) اور اس وقت تم کہو گے کہ اف! ہماری تباہی! یہ ہے الدین کا وہ دور جس کے متعلق ہم سے کہا جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ جسے الدین کا دور کہا ہے' جس کا ترجمہ آج ہم اسلامی نظام کر رہے ہیں' وہ الدین کا دور یا اسلامی نظام جب متمکن ہو' جس جگہ جس دور میں متمکن ہو' وہاں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ يَنْظُرُوْنَ (37:18) وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ

---

[1] یہ اشارہ نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جنہوں نے وہاں کے شہنشاہوں کو اس قسم کے خطوط لکھے تھے۔

لیں گے اور کہیں گے کہ اف! ہماری تباہی! یہ ہے وہ یوم الدین' یہ ہے وہ اسلامی نظام' یہ ہے وہ قرآن حمید کا دور۔ یہ یوں قائم ہوتا ہے 184الصّٰفّٰت۔ ہم نے تو آج ان اصطلاحات کو ہی بے معنی بنا دیا ہے۔

مالکِ یوم الدین کا دور اور ہوگا جس میں کوئی شخص نہ کسی کا محکوم ہوگا' نہ محتاج

عزیزانِ من! کہا ہے کہ هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ (37:20)۔ وہ جو قرآن کریم کی آیت دوسرے مقام کے اوپر ہے' اس میں کہا ہے کہ يَوْمُ الدِّيْنِ کیا ہے' تمہیں خدا کے سوا کون بتائے گا کہ وہ دور جو الدین کا دور ہے' اس نظام کا دور ہے' وہ کیا دور ہے! کہا ہے کہ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَّ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (82:19) جس دن کسی انسان کا' کسی دوسرے انسان پہ کوئی دباؤ نہیں رہے گا اور ہر معاملہ کا خدا کے قانون کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ یہ ہے يَوْمُ الدِّيْنِ۔ نماز پڑھنے والے تو کم از کم دن میں چالیس مرتبہ یہ ''مٰلِکِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' (1:3) ''مٰلِکِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ وہ یہ کہتا ہے کہ هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ (37:20)۔ اور یوم الدین کے متعلق میں نے عرض کیا ہے' قرآن حکیم نے دوسرے مقام پہ خود کہا ہے کہ يَوْمُ الدِّيْنِ کی ایک خصوصیت تمہیں بتائیں کہ کیا ہوگی؟ وہ یہ ہوگی کہ کسی انسان کا' کسی دوسرے انسان پہ کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔ وہ جو انہوں نے کہا ہے کہ وہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے اور اس وقت کہو گے کہ وہ يَوْمُ الدِّيْنِ ہماری تباہی ہے: هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِیْ کُنْتُمْ بِهٖ تُکَذِّبُوْنَ (37:21) یہ یوم فصل ہے' فیصلہ کن ہے' یہ الگ الگ ہو جانے والا ہے جس کے متعلق ہم تمہیں کہتے ہیں اور تم اس کا مذاق اڑاتے تھے اور جھٹلاتے تھے' اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ غلط کام' غلط نظام' غلط پروگرام' کیا نتائج پیدا کرتا ہے۔ جب چار دن میں تم نے یہاں دیکھ لیا تو میں جو کہتا ہوں کہ اگر یہاں کسی کے ہاں نہیں ہوا تو وہ آگے چل کر ہوگا۔ زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ اس میں جھوٹ کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ اور یہ ہے عزیزانِ من! دین کی صداقت اور یہ ہے اسلام کی حقیقت کو قائل کرانے کا طریقہ۔ یہ Pragmatic Test (استنتاجی ٹسٹ) ہے کہ اس کے جو نتائج ہیں وہ دنیا کے سامنے آ جائیں۔ سیدھی سی بات ہے ڈاکٹر کا کتنا ہی بڑا دعویٰ کیوں نہ ہو کہ میری یہ دوا یہ کرے گی اور وہ کرے گی تو کوئی اتنا قائل نہیں ہوتا۔ وہ مریض آ جائے اور وہ اسے اس مریض کے اوپر آزمانا شروع کر دے' جب اس کو شفا ہو جائے گی تو سارے قائل ہو جائیں گے۔

قرآن حکیم کی صداقت کو مختلف نظاموں کے نتائج واضح کر دیتے ہیں

قرآن حکیم تو اپنے دعاوی کی صداقت کا ثبوت ہی پیش کرتا ہے اور نتائج اسی دنیا کے اندر برآمد کراتا ہے۔ وہ نظام قائم ہو جائے تو وَ امْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (36:59) مجرم معاشرے میں چھٹ کر الگ ہو جائیں گے تاکہ ان کے پہچاننے میں کسی کو دقت نہ

رہے کہ یہ کس کردار کا انسان ہے۔ آج تو روز ہم ایک دوسرے سے دھوکا کھاتے ہیں۔ وہ یوم الدین یوم الفصل ہے' چھٹ جانے کا دن الصّٰفّٰت 184
ہے' الگ ہو جانے کا دن ہے' فیصلہ ہو جانے کا دن ہے۔ یہاں وہ نظام قائم ہو اور اس طرح سے یہاں نتائج برآمد ہوں تو اس سے پھر ایمان اور بھی محکم و مستحکم ہو جاتا ہے۔ دلائل نظری کے علاوہ یہ جو عملی نتائج ہیں' یہ بتاتے ہیں کہ وہاں بتایا جائے گا کہ شریف انسانوں کی کتنی بڑی عزت ہوتی ہے اور جو مجرم ہے وہ معاشرے کے اندر کتنا ذلیل ہوتا ہے۔ اس دور میں یہ ہوگا' یہ یوم الفصل ہوگا۔

قرآن حکیم کے غلط تراجم کی پیدا کردہ الجھنیں

کہا ہے کہ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (37:22-23) سب کو ایک جگہ اکٹھا کرو' لوگوں کو لاؤ' کون ہیں یہ لوگ' جنہوں نے دوسروں پہ ظلم کیا' زیادتی کی اور اس کے وَاَزْوَاجَهُمْ (37:22) بھی۔ یہ ازواج کا لفظ آیا ہے ہمارے ہاں جیسا میں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ زوج کا لفظ ہی استعمال نہیں ہوتا' زوجہ کا ہوتا ہے اور بیوی کے معنوں میں آتا ہے' وہی زوجہ ہی ہوتی ہے' یہ خاوند اس کا زوج ہوتا ہی نہیں ہے اسی لیے جب انہوں نے یہ معنی یہاں پہنائے تو پھر وہ ازواج جہاں کہیں بھی آیا' اس کا ترجمہ بیویاں ہو گیا: یہاں بھی' اگلی دنیا میں بھی اور جنت کے اندر بھی۔ پہلے یہ کیا کہ جنت کے اندر یہ ان کی ازواج ہونگی یعنی ان کی بیویاں بھی ساتھ ہونگی۔ جب اس کا یہ ترجمہ کیا تو پھر آگے خود ہی ایک الجھن پیدا کی' اس کے اندر ہاتھ پھنسا لیا اور اس کے بعد رونا شروع کر دیا۔ گرہیں کھولنی شروع کیں کہ پھر کیا کیا جائے۔ پھر مسائل آ گئے کہ جی! اگر ایک بیوی نیک ہوئی' جنت میں گئی اور اس کا میاں گنہگار ہوا تو جہنم میں گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ پھر کیا ہوگا۔ اب یہ حل کرنے کے لیے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں' ان کا مسئلہ یہاں حل ہو رہا ہے کہ کیا کیا جائے۔ اب سوائے اس کے کہ اس جہنم والے کو پیرول پہ کچھ دنوں کے لیے چھوڑ دیا جائے اور اس کے لیے کیا ہو سکتا ہے لیکن یہ نہیں کریں گے' یہ اس بیچاری کو یہاں شاید جہنم میں لائیں گے۔ وہ بیچاری یہاں بھی جہنم میں ہے اور وہاں بھی جہنم میں۔ بہرحال میں نے تو یہ کہا ہے کہ ایک لفظ کے غلط ترجمے سے کتنی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہے۔

عربی زبان کے اندر زوج یا ازواج رفیقوں (Companions) کو کہتے ہیں۔ اب اس کا یہ ترجمہ ان کے ساتھی ہو تو بات ختم ہو گئی۔ ایک تو وہ ہیں جو خود ظلم کرتے ہیں وَاَزْوَاجَهُمْ (37:22) اور وہ جو ان کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ساتھیوں کی مدد کے بغیر تو کوئی ظالم ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک ظالم فرد کسی دوسرے پر کیا ظلم کرے گا' وہ اگر اس سے بھی زیادہ ہاتھ مروڑنے والا ہو تو وہیں کلائی مروڑ دے گا۔ اگر ایک نہ ہو' دو تین اکٹھے ہو کر آ جائیں تو وہ تو اس کا قیمہ کر کے رکھ دیں گے۔ وہ جتھہ ہوتا ہے۔ یہ ہیں ساتھی یعنی وَاَزْوَاجَهُمْ (37:22) ظلم کرنے والے اور ان کے ساتھی۔ قرآن حکیم نے کیا بات کہی ہے! آگے کہا ہے کہ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ (37:22) اور وہ حکمران طبقہ جو اوپر بیٹھا ہوا ہے' یہ ان تمام چیزوں کی اجازت دے رہا ہوتا ہے' شہ دے رہا ہوتا ہے' جرأتیں بڑھا رہا ہوتا ہے' خدا کو

چھوڑ کر اپنی حکمرانیاں قائم کر رہا ہوتا ہے۔ 184الصّٰفّٰتِ۔

یوم الدین جو اس دنیا میں قائم ہوگا' اس کی نشانیاں

قرآن کریم کے نزدیک یہ نظام ہی ظلم کا ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ ان سب کو اکٹھا کرلو' ایک ہی جگہ ان کا فیصلہ کرلو۔ اکٹھا کرو اور پھر کہا ہے کہ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ (37:23) ان کو اس راستے پر ڈال دو جو ان کو سیدھا جہنم میں پہنچا دے۔ یہ ہے اسی دنیا کے اندر قائم ہونے والا یوم الدین۔ آج بڑے لمبے لمبے مضامین شائع ہو رہے ہیں کہ وہ اسلامی نظام کیا ہوگا اور اس اسلامی نظام کی تفاصیل یہ ہو رہی ہیں کہ آیا وہ پارلیمنٹری سسٹم ہوگا یا Presidential System (صدارتی نظام) ہوگا یعنی اگر یہ طے کرلیا جائے کہ اسمبلی ہال میں یہ کس قسم کا نظم ونسق ہوگا تو اسلامی نظام قائم ہو گیا' آپ کے پاس یوم الدین آ گیا۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارے ہاں امام دین نام رکھا جاتا ہے' کسی دن یوم الدین بھی نام رکھ لو۔ یہاں یوم الدین کو یوم الفصل کہا ہے جہاں یہ کیفیت ہے کہ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ (37:23)۔

میں نے کہا ہے کہ قرآن کریم کا انداز بڑا محاکاتی ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے ڈرامائی کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا نقشہ محسوس طور پر سامنے لاتا ہے جس سے بات بڑی واضح ہو جاتی ہے۔ کہا ہے کہ ان کو ذرا اس راستے پر چلاؤ جو ان کو سیدھا جہنم کی طرف لے جائے۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ وَقِفُوْهُمْ (37:24) ذرا ان کو روکنا' ذرا روکنا ان کو! اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ (37:24) ان سے ہم نے کچھ پوچھنا بھی ہے۔ ذرا ان کو روک لو۔ میں نے کہا ہے کہ قرآنِ کریم نے اخروی زندگی کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ تو سمجھانے کے لیے تمثیلی انداز میں ہے لیکن یہ اس دنیا کی زندگی کے متعلق باتیں ہیں۔ کہا ہے کہ ان سے ذرا پوچھا جائے گا۔ کیا پوچھا جائے گا؟ قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پہ یہ بات آئی ہے کہ وہاں ان سے کیا پوچھا جائے گا۔ میں صرف ایک مقام اس وقت پیش کرتا ہوں' وقتاً فوقتاً درس میں یہ چیزیں آتی رہتی ہیں لیکن جسے بڑا زیادہ Comprehensive (جامع طور پہ) کہتے ہیں یہ سورۃ انبیاء 21ویں سورۃ میں ہے کہ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (21:11) ہم نے اس سے پیشتر کتنی بستیاں تباہ کردیں۔ بستیوں کے تباہ کرنے کے معنی ان قوموں کو تباہ کرنا ہے' ورنہ وہ جو مکاں ڈھا دینے ہیں' اس سے تو بات نہیں بنتی۔ مطلب تو ان قوموں کو تباہ کرنا ہوگا۔ وہ قومیں کیوں تباہ کردیں؟ وہ اقوام کیوں تباہ ہوگئیں؟ کہا ہے کہ كَانَتْ ظَالِمَةً (21:11) وہ ظلم کرتی تھیں۔ اور تباہی کے بعد کیا صورت ہے؟ کہا ہے کہ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (21:11) ان کی جگہ ایک دوسری قوم نے آ کر لے لی جو ان جیسی نہیں تھی۔

قوموں کی زندگی میں پیدا ہونے والے واقعات ہنگامی طور پر واقع نہیں ہوتے

قرآن کریم نے قوموں کے استخلاف اور استبدال کے جو قوانین (Laws of Succession and Substitution)

بنائے ہیں کہ ایک قوم کس طرح سے متمکن رہتی ہے' کون سے اس کے جرائم ہوتے ہیں' نقائص ہوتے ہیں جس کی وجہ سے پھر اس میں 184 الصّٰفّٰت۔ کمزوری آتی ہے۔ پھر اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے جو ان جیسی نہیں ہوتی' ان سے بہتر ہوتی ہے۔ یہ یونہی ہنگامی طور پہ واقعہ نہیں ہو جاتا کہ وہ سلطنت تھی وہ مٹ گئی' اس کی جگہ پھر فلاں سلطنت آ گئی' فلاں کی حکومت آ گئی' یہ تو خدا کے قانون ہیں جن کے مطابق یہ ساری تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اگر قوم ظلم پر اتر آتی ہے' ظالم ان کے ساتھی ہو جاتے ہیں' ان کا یہ حکمران طبقہ اور یہ سارے کے سارے مل کر ظلم پہ اتر آتے ہیں تو پھر وہ قوم باقی نہیں رہ سکتی' اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ ایک جگہ یہ ہے کہ پھر وہ اس کی مثل نہیں ہوتی' ان جیسی نہیں ہوتی' دوسری جگہ ہے کہ ان سے بہتر ہوتی ہے۔ بہتر ہو گی تو یہ Substitution (استبدال) اچھا ہو گا ورنہ ان جیسی قوم ہی اگر آ جائے تو ظالم کی جگہ ظالم کا آنا تو کوئی معنی نہیں رکھتا۔

قوموں کے اعمال کا گراف بتدریج اوپر اٹھتا رہتا ہے

کہا ہے کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَرْكُضُوْنَ (21:12)۔ ان کے ساتھ یہ ہوا۔ عجیب الفاظ ہیں! قرآن مجید کہتا یہ ہے کہ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ (21:12) جو قوم بھی کوئی کام کرتی ہے' جس قسم کا نظام قائم کرتی ہے' اس کے نتائج تو ساتھ کے ساتھ مرتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں لیکن وہ غیر محسوس طریقے پر چل رہے ہوتے ہیں' محسوس نہیں ہوتا کہ ان کی جو تباہیاں ہیں' ان کے سامان جمع ہو رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ ہوتا جاتا ہے' وہ نتائج جمع ہوتے رہتے ہیں پھر اس کے بعد جسے قرآن کریم نے پلڑا جھکنا کہا ہے' وہ وقت آ جاتا ہے جب ان کا جو Accumulative Effect (اجتماعی اثر) ہے' جو نتیجہ ہے' وہ اتنا زیادہ محکم بھاری ہو جاتا ہے کہ وہ سامنے نظر آ جاتا ہے۔ کہا ہے کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ (21:12) وہ مدت سے یہ کر رہے تھے اور اندر اندر ان کے یہ اعمال' ان کا یہ پروگرام' نتائج مرتب کر رہا تھا لیکن یہ اس کا خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کو وارننگ دی جاتی تھی' تنذیر دی جاتی تھی' یہ اس طرف کان نہیں دھرتے تھے لیکن جب اس کے نتائج محسوس طور پر سامنے آ گئے تو اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَرْكُضُوْنَ (21:12) یہ وہاں سے بھاگنے لگے۔ ان سے اتنے عرصے تک کہتے رہے' انہوں نے توجہ ہی نہیں دی' جب محسوس طور پر وہ تباہی سامنے آئی تو یہ اس سے بھاگنے لگے۔

ظہورِ نتائج کے وقت قانونِ مکافات پیچھے سے آوازیں دیتا ہے: مت بھاگو

سنیے! قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ بھاگنے لگے اور پیچھے سے ہمارے قانونِ مکافات نے آواز دی کہ لَا تَرْكُضُوْا (21:13) بھاگو نہیں' رک جاؤ' ٹھہر جاؤ۔ یہ اٹھ کر بھاگنے لگے' ہم نے یا ہمارے قانونِ مکافات نے پیچھے سے آواز دی کہ لَا تَرْكُضُوْا (21:13) مت بھاگو' تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ آواز دے کر روک دیا' اس کے بعد کہا کہ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِیْهِ (21:13) چلو لوٹ کر اسی جگہ' جہاں تم دوسروں کی کمائی کے اوپر عیش کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ وہاں واپس چلو۔ قرآنِ کریم نے مترفین کے طبقے کا بار

بار ذکر کیا ہے۔ یہ دوسروں کی کمائی پہ سہل انگاری کی، عیش کوشی کی، زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ظلم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، ظلم میں یہی چیز لیا جاتا ہے:Exploitation(سلب ونہب) کی جاتی ہے، دوسروں کی کمائی کا استحصال کیا جاتا ہے۔یہی توظلم ہوتا ہے۔کہا کہ چلو، وہاں واپس چلو: وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ (21:13)۔یہ جو میں نے کہا تھا کہ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ(37:24) ان کو روکو، ان سے سوال کیا جائے۔ یہ ہے وہ معاملہ جو آیت آئی ہے۔ان سے کہو کہ رکو، ٹھہرو، تم بھاگ کر نہیں جاسکتے، واپس لوٹو، وہاں چلو، وہاں تم دوسروں کی کمائیوں پر من مانی زندگیاں بسر کیا کرتے تھے، چلو وہاں اور ان محلات میں چلو کہ جن کی تزئین کا سامان غریبوں، مفلسوں اور محتاجوں کے خون کی رنگینی کیا کرتی تھی۔لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ (21:13) تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کس کی کمائیوں کا نتیجہ تھا جو تم اس طرح سے استحصال کیا کرتے تھے۔ تم سے یہ پوچھا جائے، واپس چلو اور پھر وہاں جا کر یہ اعتراف ہوگا کہ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (21:14) ہاں! یہ صحیح بات ہے کہ ہم ظلم کیا کرتے تھے، ہم Exploit(استحصال) کیا کرتے تھے، ہم دوسروں کی محنت کا غصب کیا کرتے تھے، سلب ونہب کیا کرتے تھے۔وہاں یہ اعتراف ہوگا اور کہا ہے کہ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ(21:15) وہ یہ اعتراف کرتے چلے جائیں گے۔

غیر قرآنی معاشرے میں خوشحالیوں، سرسبزیوں اور خوشگواریوں کا انجام؛ بجھا ہوا شعلہ، کٹی ہوئی کھیتی

عزیزانِ من! یہ کب تک اعتراف کریں گے؟ اس وقت تک جب حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (21:15)۔اس آیت میں عربی زبان میں دو الفاظ آئے ہیں۔جب کسی چیز کو نہایت اختصار سے Concentrated Form ارتکاز کی صورت میں بیان کرنا ہوتا ہے، یہ عربی زبان کا بھی اعجاز ہے اور قرآن کریم نے جو الفاظ کا انتخاب کیا ہے، وہ ہے یہ چیز جو کہا ہے۔کہا ہے کہ وہ یہ چیز کہے جائیں گے تا آنکہ وہ ایسے ہو جائیں جیسا بجھا ہوا شعلہ یا کٹی ہوئی کھیتی۔قوم کی تباہی ان کی سرکشیاں ہیں۔آپ اندازہ لگائیے کہ جن کے شعلے آسمان پہ جاتے تھے، ان کی تباہی کے بعد وہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے۔یہ ہے خٰمِدِيْنَ (21:15) وہ شعلے جو بجھ کر راکھ بن جائیں۔اور پھر ان کی خوشحالیاں، سرسبزیاں اور خوشگواریاں تھیں وہ خٰمِدِيْنَ (21:15) کٹی ہوئی کھیتی کی طرح ہوگئیں۔وہ بار آور نہیں ہوسکتی تھیں، ان میں کوئی پھل نہیں لگ سکتا تھا۔وہ کہتے رہے لیکن اب تو وقت گزر چکا تھا۔وہ تو اگر اس آخری تباہی سے پہلے اس چیز کا اعتراف کر کے اپنی روش میں تبدیلی پیدا کرلیں، جسے توبہ کہا جاتا ہے تو پھر تو ان کی بازآفرینی کا امکان ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ زندگی حاصل کرلیں لیکن جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو پھر اس اعتراف سے کچھ نہیں ہوسکتا۔

وقت گزر جانے پر فرعون کا اعتراف بھی قابلِ قبول نہ ہوا

یہ وہ اعتراف ہے جو قرآن کریم نے اس وقت کہا ہے کہ جب فرعون نے ڈوبتے وقت اعتراف کیا تھا کہ میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کے

خدا پر ایمان لاتا ہوں تو ادھر سے جواب آیا تھا کہ اب ایمان لاتے ہو جب موت سامنے آئی ہے ’’در کفر ہم پختہ وز نارر ار سوا کفر‘‘ 184 الصّٰفّٰت۔

❶ کم بخت! ایمان میں پختگی نصیب نہیں ہوئی تھی تو کفر میں تو تجھے پختگی نصیب ہوتی، موت کے ڈر سے ایمان لاتے ہو، لعنت ہے تجھ پہ! عجیب چیزیں قرآن مجید بیان کرجاتا ہے۔ کہا ہے کہ اس چیز کا وقت نہیں رہتا، پہلے وقت ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہاں آیا ہے کہ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ(37:24) ان کو روکو تا کہ ان سے کچھ پوچھا جائے۔ دوسرے مقام پہ یہ ہے کہ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ (21:13) ایک ہی چیز کہی کہ ہماری طرف سے بلا مزد و معاوضہ تمہارے ہاں جتنی چیزیں حاصل ہوئی تھیں تم نے ان کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے کر اپنے لیے دبا کر رکھ لیا تھا، خلقِ خدا کو ان سے محروم کردیا تھا، ہم ان سب کے متعلق تم سے پوچھیں گے کہ تمہارا اس پہ کیا حق تھا۔ ہم نے تو تمام مخلوق کی ربوبیت اور رزاقیت کے لیے یہ کچھ دیا تھا، تم خدا بن کر بیٹھ گئے، ظلم کی بنا پر تم نے سمیٹ لیا۔ اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔

حضرت عمرؓ کے الفاظ میں خلافت اور ملوکیت میں فرق کی نوعیت

عزیزانِ من! یہی چیز یوم الدین ہے یا جسے اسلامی نظام کہتے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جس میں یہ چیز اپنی پختگی میں عروج پر پہنچتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور (45/44-634ء) کے اقوال میں آپ دیکھیں گے کہ کتنا ارتکاز ہے۔ انہیں زبان عربی پہ بھی عبور تھا اور پھر قرآن مجید کے اوپر بھی عبور تھا، ان کے الفاظ بھی ایسے ہیں۔ انؓ سے پوچھا گیا کہ خلافت کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ پوچھا جائے گا کہ کہاں سے لیا تھا اور کہاں خرچ کیا تھا۔ اس کو پھیلاتے جائیے۔ عزیزانِ من! پورا نظام آپ کے سامنے آجائے گا۔ بات ہی اتنی ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ اس دن ’’نعیم‘‘ کے بارے میں پوچھا جائے گا یعنی ان چیزوں کے متعلق جو ہم نے بلا مزد و معاوضہ یعنی مفت دی تھیں اور وہ جو يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ(2:165) کہا تھا کہ جو انہیں ملکیت بنا کر بیٹھتے ہیں، وہ خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں، ان سے یہ پوچھا جائے گا۔ اب وہ ساتھی بھی ہیں۔

ظہورِ نتائج کے وقت کوئی کسی کا مددگار نہیں ہوگا

کہا جائے گا کہ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ(37:25) کیوں بھئی! اب ان کی کچھ مدد نہیں کرتے ہو، تمہارے ہی بل بوتے پر تو یہ سارا کچھ ظلم کرتے تھے ورنہ ان کی اپنی قوت کیا تھی۔ جب تمہاری ہی حمایت پر، تمہاری قوت پر، بھروسے پر یہ کرتے تھے تو آج پھر تم ان کی مدد کیوں نہیں کرتے۔ اس وقت تو کوئی بھی ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتا۔ کہا ہے کہ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ(37:26) کیا مدد

---

❶ اُس ایمان سے تو وہ کفر ہزار درجہ بہتر ہے جس پر انسان مصائب و خطرات کے باوجود قائم رہے۔

کریں گے' ان کے ظلم کرنے والے جتنے ساتھی تھے' حکمران طبقہ تھا' وہ تمام کے تمام سارے کے سارے اس وقت سرِتسلیم خم کیے 184 الصّٰفّٰتِ ۔ ہوئے ہونگے' تمام کی کیفیت یہ ہوگی کہ جھکے ہوئے ہونگے۔اس زمانے میں ساری قوتیں ختم ہوچکی ہونگی۔ یہ ہے یَوْمِ الدِّیْن۔ کہا ہے کہ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (37:27) مدد تو نہیں کرسکیں گے' ہماری بات کا جواب بھی نہیں دے سکیں گے' آپس میں جھگڑنے لگیں گے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم یہ سمجھانے کے لیے ایک محاکاتی انداز اختیار کرتا ہے' ڈرامائی انداز اختیار کرتا ہے جس میں یہ چیزیں یوں ہوتی ہیں ورنہ مکافاتِ عمل کے متعلق تو اس نے کہا یہ ہے کہ یہ تمہارا اپنا اعمال نامہ ہے' ہر شخص کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہوتا ہے' فرق یہ ہے کہ آج وہ لپٹا ہوا ہوتا ہے' اس وقت اسے کھول دیا جاتا ہے اور کھولنے کے بعد اس سے کہا جاتا ہے کہ اسے خود پڑھ (17:12-14)۔

انسانوں کا اعمال نامہ خود ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوگا اور انہیں خود ہی اس کا حساب کرنا ہوگا

پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ نہیں ہے' جو (مرزا اسداللہ خاں) غالب (1797-1869ء) کہتا ہے :

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یہ اعمال نامہ فرشتے نہیں لکھتے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا اعمال نامہ تو خود تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اس وقت لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ کیا انداز ہے قرآن حکیم کا بات سمجھانے کا! ہوتا تمہاری گردن میں ہی لٹکا ہوا ہے' اس وقت کھول کر سامنے لایا جائے گا۔ پھر یہ بھی نہیں کہا جائے گا کہ کسی کو بلائے یا کہا جائے صاحب! کہ ذرا دو اس کا فردِ جرم' پڑھ جو اس کے خلاف لکھی ہوئی ہے' اس کو خود کہا جائے گا کہ اقراء کتبک (17:14) ذرا اپنا اعمال نامہ پڑھو' خود ہی پڑھو۔ اور اس کے بعد ہے کہ پھر اپنا حساب بھی آپ ہی کرو اور ہمیں بتاؤ کہ یہ جو تمہارے پاس Credit Debit-(خرچ کردہ اور جمع کردہ رقوم) ہیں' یہ کس نتیجے پر پہنچے ہوئے ہیں تم خود بتاؤ۔ بتاؤ پھر کہ تمہارا انجام کیا ہو' تمہارے ساتھ کیا کیا جائے یا جو کچھ تمہارا اعمال نامہ کہتا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

بات کو سمجھانے کے لیے قرآنِ حکیم کا اپنے ہاں ایک محاکاتی انداز ہے' مثلاً لیڈران اور متبعین کے مکالمے

بات تو وہ یہ ہے لیکن سمجھانے کے لیے وہ انداز ایسا اختیار کرتا ہے جیسا ایک عدالت ہوتی ہے' وہاں وہ ایک جج ہوتا ہے' گواہ لائے جاتے ہیں' اس کے ساتھ کھڑے ہونے والے ہوتے ہیں' فردِ جرم قائم کی جاتی ہے۔ قرآن حکیم اس قسم کا انداز اختیار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہماری بات کا تو کوئی جواب نہیں دے سکیں گے' لاجواب ہو جائیں گے' آپس میں جھگڑنے لگ جائیں گے۔ قرآنِ کریم میں

بہت سے مقامات آئے ہیں' عزیزانِ من! جہاں یہی کہا گیا ہے کہ جہنم میں لیڈروں کی اوران کے Followers (متبعین) کی آپس میں 184 الصّٰفّٰت۔ بات چیت ہوئی' بڑے ہی سبق آموز وہ بیانات ہیں' یہ مقامات ہیں۔ان کی تفصیلات ضرور دیکھیے۔ یہ کئی دفعہ سامنے آچکی ہیں۔ میں اس وقت صرف ان چندایک آیات کے حوالے دیتاہوں' جواحباب اس میں دلچسپی رکھتے ہیں' تحقیق کیا کرتے ہیں' وہ حوالے نقل کرلیں۔ بہر حال میرا کہنے کا مقصد یہی ہےاور میں باربارکہا کرتا ہوں کہ ایک توقرآن کریم کے نسخے سامنے رکھا کریں اور دوسراان حوالوں کونقل کرتے چلے جایا کریں۔یوں بیٹھ کراس طرح سے سنتے رہنےاورسن کر چلے جانے کا آپ لوگوں کوزیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔قرآن کریم اس طرح سے سننے کی بات نہیں ہے۔یہ ان کے آپس میں مکالمات ہیں۔وہ ایک دوسرے کو جسے کہتے ہیں' دوش دیتے ہیں' الزام لگاتے ہیں کہ تم نے ہمیں تباہ کیا۔ پھر وہ آگے سے جواب دیتے ہیں۔ان سے بالکل چھٹ کربات سامنے آجاتی ہے' عزیزانِ من! یہ کچھ ہوتا ہے۔

یہاں توقرآن حکیم نے ایک لفظ کہا ہے جس میں ساری بات آ گئی ہے۔حوالے لکھ لیجیے' یہ ہیں:(14:21, 33:64, 34:32, 40:47) اور یہ مقام جو ہمارے سامنے ہے یہ 37ویں سورۃ ہے اوراس میں یہ آیات 29-27 میں سمجھ لیجیے۔کہا ہے کہ وہ آپس میں جھگڑنے لگ جاتے ہیں کہ قَالُوْۤا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ(37:28) تم ہمارے دائیں بائیں سے یورشیں کرکے' حملے کرکے' جتھے بنابنا کر"جنوں کیندے ساڈے تو نبےتوڑ رکھےسن تسی"[1] تمہاری یہ کیفیت تھی۔ وہ عوام لیڈروں سے یہ کہہ رہے ہونگے۔یہ جوان کے ساتھی تھے' حکمرانوں سے کہہ رہے ہونگے کہ تم تو اس طرح سے جتھے بنا کر یورش کرکے سیلاب بلا کی طرح ہمیں آکرگھیر لیتے تھے کہ ہماراساتھ دو' یہ کرو' ہماری اسکیم کو کامیابی بناؤ۔ یہ کچھ تم کیا کرتے تھے' ہمارا بس کیا تھا۔

قرآن حکیم کے نزدیک کوئی مومن دوسروں کے جال میں نہیں پھنس سکتا

عزیزانِ من! ایک لفظ ہے غور کریں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ جھوم جائیں گے اور ساری بات سمجھ میں آجائے گی۔یہ جو ہم کہتے ہیں کہ صاحب! یہ چندلوگ ظالم ہوتے ہیں جو اوپر برسرِ کار ہوتے ہیں' وہ اتنا کچھ ظلم کرتے ہیں' باقی بیچارے تو عوام ہوتے ہیں' یہ تو کچھ نہیں کرسکتے۔قرآن حکیم نے ایک لفظ میں ان کی طرف سے بات کہہ دی کہ یہ ہوتا کیسے ہے۔کہا کہ تم ہمیں دوش دیتے ہو' الزام دیتے ہو بات یہ ہے کہ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (37:29) تم خود ہی مومن نہیں تھے۔عزیزانِ من! کہیے! اس سے زیادہ اور جامع طور پہ کچھ کہا جاسکتا ہے۔کیا بات کہہ گیا ہے قرآن حمید! ارے! مومن ہو اور کوئی اس کے اوپر زیادتی کرسکے' مومن ہو اور وہ مظلوم ہو' مومن ہو اور وہ کمزور ہو' مومن ہو اور دوسرا اس کو اپنے فریب میں لے آئے' یہ تو متضاد باتیں ہیں۔ہمیں الزام دیتے ہو۔عزیزانِ من! اس کو بار بار سوچیے' ایک لفظ میں قرآن کریم وہ سب کچھ کہہ گیا ہے۔انہوں نے کہا کہ بات یہ تھی کہ ہم جو کچھ کرتے تھے' اسکو چھوڑ دو' تم جو کہہ رہے ہو

---

[1] جسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ جان پہ بنا رکھی تھی۔

کہا کہ کیا کہہ رہے ہو الصّٰفّٰتِ 184 ۔ یہ سب کچھ تم کراتے تھے۔ ہمارا جرم نہیں ہے' ہمارا قصور نہیں ہے' ہمارا کوئی دوش نہیں ہے' کہ ہم بری الذمہ ہیں'
بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (37:29) تم خود مؤمن نہیں تھے۔ بات ختم ہوگئی۔

عزیزانِ من! کسی انکوائری کمیشن کے بٹھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ تحقیق کرتا پھرے کہ معاشرے میں یہ ظلم' تعدی' زبردستی' Exploitation (استحصال) کیوں ہوتا ہے۔ بات ہی یہاں سے چلے گی کہ یہ جو کرنے والے ہیں' ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ اگر بڑی ہی Impartial Inquiry (بے لاگ تفتیش) ہوگی تو یہی ہوگی کہ یہ اوپر والے یہ کچھ کرتے ہیں۔ بات قرآن مجید یہاں لاکر کہتا ہے کہ اس کا سوال ہی نہیں ہے بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (37:29) تم ہی مومن نہیں تھے تو ہم کیوں نہ فائدہ اٹھاتے۔ ایک ہی لفظ میں وہ بات کہہ گیا ہے۔ پھر اس ظلم و استبداد سے بچنے کا علاج کیا ہے؟ یہ کہ تم خود مومن ہو جاؤ' انہیں کچھ نہ کہو' وہ تو تکلے کی طرح سیدھے ہو جائیں گے۔

کوئی غیر مسلم' مسلمان پر غالب آ ہی نہیں سکتا: تم ہی سب پر غالب رہو گے

ساری بات آ گئی' عزیزانِ من! اس کے بعد اس موضوع پہ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا تھا اور ہماری جرأتیں بیباک ہو رہی تھیں کہ تم مومن نہیں تھے۔ قرآن کریم نے تو مومنین کے متعلق جہاں منفی طریقے پہ جو کہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ غیر مومن' غیر مسلم' کسی مومن کے اوپر غالب آئے' یہ ہو ہی نہیں سکتا اور Positively (مثبت طور پہ) یہ کہا کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:139) تم تو سب پہ غالب آنے والی قوم ہو۔ اس کے بعد ان لوگوں کا ان اپنے ہی بڑے بڑے لوگوں سے یہ کہنا کہ وہ حاکم ہوں' لیڈر رہوں' کچھ بھی ہوں کہ صاحب! تم ہمیں آ کر ورغلایا کرتے تھے' تم ہمیں غلط راستے پہ لایا کرتے تھے' تم ہم سے یہ کچھ کرایا کرتے تھے' یہ سارا کچھ غلط ہے۔ ایک لفظ میں بات آ گئی کہ ہم کیا کرایا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ تم مومن نہیں تھے۔ مومن تو ظالم سے ظلم کرانا تو ایک طرف رہا' وہ تو اس کو ظلم کرنے ہی نہیں دیتا' یہ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110) بھی تو مومن کا فریضہ ہے۔ یہ غلط کوش اور غلط کار کو وہیں روک لیتا ہے۔ مومن تو وہ ہوتا ہے اس لیے انہوں نے جو کہا ہے' صحیح کہا ہے۔

دوسروں کو گمراہ کرنے والے ہوں یا ان کی قوت کا باعث بننے والے ہوں' یہ دونوں برابر کے مجرم ہیں

ان مقامات میں ایک آیت میں کہا گیا ہے کہ یہ خدا سے کہیں گے کہ یہ جو بڑے بڑے ظالم ہیں' یا اللہ! ان کو دوہرا عذاب دے' ایک تو ان کے اپنے مظالم اور جرائم کا اور دوسرا انہوں نے ہمیں جو گمراہ کیا تھا اس کی وجہ سے۔ جواب دیا جائے گا کہ ٹھیک ہے ان کو تو دہرا دیں گے' تمہیں بھی دوہرا عذاب ملے گا' ایک تو اس لیے کہ تمہارا جو فریضہ تھا کہ ان کو روکو' وہ کچھ تم نے نہیں کیا اور دوسرے اس لیے کہ

تمہارے ہی بل بوتے کے اوپر تو انہوں نے یہ ظلم کیا تھا۔ یہ جو ذریعہ' یہ جو سبب' یہ جو ان کے ظلم کی وجہ تھی' وہ تو تم تھے۔ اگر تم ان الصّٰفّٰت 184 کی قوت نہ بنتے' دست و بازو نہ بنتے' ان کے سہارے نہ بنتے' تو ان میں اپنی قوت کیا تھی کہ یہ دنیا پر ظلم کرتے۔ اس لیے تمہیں بھی دہرا عذاب ہے۔

عزیزانِ من! جسے ہم مظلوم کہتے ہیں' مظلوم بن کر ساری قوم روتی چلی جا رہی ہے کہ ہم پہ ظلم ہو رہا ہے' بیٹھے ہوئے رو رہے' گویا ان کا کوئی جرم نہیں' کوئی قصور نہیں' یہ بری الذمہ ہیں۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ تمہیں بھی دہرا عذاب ملے گا اور بات وہی ہے کہ بَلۡ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ (37:29) تم مومن نہیں تھے۔ جو مومن نہ رہے تو پھر دنیا میں جو ظلم کرنے والا ظلم کرے' مجرم جو جرائم کرے' اس کا ایک سبب یہ بھی ہو جاتے ہیں' جو مومن نہیں رہے' اس لیے ان کو بھی قرآن حمید کہتا ہے کہ انہیں دہرا عذاب دیا جائے۔ عجب چیزیں قرآن حمید کہتا ہے۔

لیڈران قوم کے بالمقابل عام پبلک کی طرف سے قانون شکنی کی کیفیت

عزیزانِ من! قرآن کریم کہتا ہے کہ پھر ان کا دوسرا جواب ہے۔ اس پر کہا ہے کہ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ‌ۚ بَلۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا طٰغِيۡنَ (37:30) ذرا بتاؤ تو سہی کہ ہمارے پاس وہ کون سا ایٹم بم رکھا تھا جو ہم تمہارے اوپر مسلط کر رہے تھے' ہماری کیا قوت تھی جو تم پہ ہم مسلط کر رہے تھے۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو فرعون نما کوئی دس بیس ہونگے' تم ہزاروں لاکھوں کروڑوں کی تعداد کے اندر تھے' تو ہم میں کون سی قوت تھی جو ہم تم پہ مسلط ہو رہے تھے۔ اصل یہ چیز ہے کہ بَلۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا طٰغِيۡنَ(37:30) تم خود ہی یہ جو قوانین خداوندی تھے' ان کی خلاف ورزی میں اپنے مفاد تم دیکھتے تھے' تم خود اس طرف چلے جا رہے تھے' ہم نے تو صرف آواز دی کہ تم آ گئے۔ بات تو یہ ہے کہ فَحَقَّ عَلَيۡنَا قَوۡلُ رَبِّنَآ‌ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوۡنَ (37:31) تم ہو یا ہم ہوں جو کچھ خدا نے کہا تھا' خدا کے رسول کہتے تھے' اس کی کتاب کہتی تھی' وہ حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ گیا۔ تم بھی اپنے کیے کا مزہ چکھو' ہم بھی چکھ رہے ہیں۔ اب تو اس سے نکلنے کی نہ کوئی راہ ہے' نہ کوئی ہماری یا تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ فَاَغۡوَيۡنٰكُمۡ اِنَّا كُنَّا غٰوِيۡنَ(37:32) ہم نے تمہیں گمراہ کیا' ہم خود گمراہ تھے تمہارا کام تھا کہ ہمیں بتاتے کہ یہ راستہ گمراہی کا ہے' ہمیں اس راستے سے روکتے۔ ہم اگر گمراہ تھے تو تم کون سے صحیح راستے پہ چل پڑے تھے' تم بھی تو اسی راستے کے اوپر ہمارے پیچھے چلتے گئے' تو کیا تم گمراہ نہ ہوئے؟

سیلاب کی زد سے نہ مسجد محفوظ رہتی ہے' نہ مندر

عزیزانِ من! خدا کا قانونِ مکافات اس قسم کے Justificatory Reason (وجہٗ جواز) کے فریب میں کسی کو نہیں آنے

دیتا۔ کہا ہے کہ اپنے آپ کو کیوں فریب میں رکھتے ہو کہ ہم بری الذمہ ہیں' ہم مظلوم ہیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ (37:33) یہ اوپر والے اور یہ جوان کے ساتھی تھے' یہ سارے کے سارے' پھر اس عذاب میں مشترک ہوتے ہیں۔ جب کسی قوم پہ تباہی آتی ہے' عزیزانِ من! تو پھر ''سیلاب نہ پرسد کہ درمیخانہ کجاست'' سیلاب آتا ہے تو پھر وہ مندر اور مسجد میں بھی تمیز نہیں کیا کرتا' وہ شریف اور مجرم کے گھر کو بھی نہیں دیکھا کرتا' سب اس کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی اپنی بستی کو بچانے کا انتظام نہیں کیا ہوتا' ان سب کے گھر اس سیلاب میں بہہ جاتے ہیں۔

قوموں کے لیے عذاب سے بچنے کا طریق اس کی بروقت روک تھام ہوتا ہے

قوموں کا جو مجموعی انجام ہوتا ہے' عزیزانِ من! اس سے افراد کی جسے آپ اپنی ذاتی (Personal) نیکیاں کہتے ہیں' وہ بھی ان کو نہیں بچا سکتیں۔ جو غلط اجتماعی نظام ہے' وہ سب کو لے ڈوبتا ہے۔ اس سے بچنے کا وقت وہ ہوتا ہے جب ابھی نظام بن رہا ہوتا ہے کہ جو بچنا چاہتے ہیں اس وقت اس کو روکیں۔ اگر وہ نہیں روکتے' چشم پوشی کرتے ہیں' سیلاب کو روکنے کا بند بنایا جارہا ہے' ٹھیک ہے اگر وہاں کا انجینئر Overseer یا SDO ٹھیکیدار کے ساتھ مل کر سیمنٹ کی جگہ ریت بھر رہے ہیں تو اگر یہ جو گاؤں والا ہے' اسے دیکھ رہا ہے اور دیکھ کر چشم پوشی کر کے' آگے چلا جاتا ہے تو کل جب یہ بند ٹوٹے گا تو یہ کتنا ہی متقی پرہیزگار کیوں نہ ہو' اس کا مکان بھی بہے گا۔ اس سے بچنے کا وہ وقت تھا کہ وہ وہاں یہ کر رہے تھے تو وہ ان کے خلاف کھڑا ہو جاتا۔

بنی اسرائیل قوم کی تباہی کی بنیادی وجہ

بنی اسرائیل کی قوم جب ڈوبی ہے' تباہ ہوئی ہے تو قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو شخص آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں' وہ ان کو روکتے نہیں تھے۔ اس طرح سے یہ جتنے بھی اجتماعی جرائم ہوتے ہیں' اس میں سب شریک ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے پھر جو تباہیوں کا سیلاب آتا ہے وہ سب اس میں شریک ہوتے ہیں: مُشْتَرِكُوْنَ (37:33) پہلے ایسا نظر آتا تھا کہ یہ کوئی قصۂ ماضی ہے' پرانے زمانے کی کوئی قوم ہے' قرآن حکیم اس کی باتیں سنا رہا ہے' یا یہ کہہ رہا ہے کہ وہاں قیامت میں یہ کچھ ہوگا' کسی اور کی بات ہو رہی ہے' ہماری بات نہیں ہو رہی۔ کہا ہے کہ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ (37:34) یہ نہ سمجھو' کسی اور کی بات ہو رہی' مجرمین' ظالم جہاں بھی ہونگے' جب بھی ہونگے' جس زمانے میں ہونگے' جس قوم میں ہونگے' ہم یہی کچھ اس کے ساتھ کریں گے۔ یہ ہم چودہ سو سال پہلے کی بات نہیں کر رہے' یہ تاریخ کے واقعات نہیں' جسے ہم دہرا رہے ہیں' ہم تو یہ ابدی حقائق' قرآن کریم کے قانونِ مکافاتِ عمل کو بیان کر رہے ہیں: جہاں بھی یہ ہوگا یہی کچھ اس کا نتیجہ ہوگا۔ اب بتایا کہ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ (37:35) مجرم

کون تھے؟ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ اقتدار، اختیار اور حقِ حکومت صرف خدا کے قوانین کو تھا، کسی اور کے قانون کو نہیں تھا، تو یہ اس سے استکبار کرتے تھے کہ ہوں! ہماری حکومت نہیں ہے، یہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب! خدا کی حکومت ہے۔ سرکشی برتتے تھے۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ خدا کو اس سے (معاذ اللہ) کوئی غصہ آتا ہے کہ ہماری حکومت میں یہ کیوں آ گئے۔

قرآنِ حکیم کے قوموں کی موت وحیات کے ابدی اصولوں میں اور اسلاف سے جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے اس میں ٹکراؤ

سوال صرف یہ ہے کہ وہ جو فطرت کے، قدرت کے اٹل قوانین ہیں، خدا کے بنائے ہوئے ہیں، ان کے مطابق افراد اور اقوام کے اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں، یہ ان سے سرکشی برتتے تھے اس لیے اس کا یہ نتیجہ ہوا۔ اور اس کے لیے وہ دلیل کیا دیتے تھے؟ دلیل یہی تھی کہ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓ اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (37:36)۔ یہ کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آیا ہے۔ ایک ہی دلیل ہوتی ہے کہ یہ سلف صالحین کا راستہ ہے۔ بھئی! دیکھو، قرآن حکیم کیا کہتا ہے کہ اس کے احکام کیا ہیں، کہ جی! ان کے سامنے قرآن حکیم نہیں تھا۔ بھئی! آج ہمارے لیے قرآن حکیم کو کیوں محفوظ رکھا ہے۔ اگر یہ اسی دور تک تھا تو وہاں قصہ ختم کر دیتا، یہ ہمیں بار بار کیوں حکم دیا جا رہا ہے کہ تدبر کرو، تفکر کرو، غور کرو، فکر کرو۔ اگر یہی چیز ہے کہ جو سمجھا جانا تھا، سمجھا جا چکا اور جو انہوں نے سمجھ لیا وہ ہمارے لیے دلیل بن گیا تو پھر اس کو ٹھپ کر رکھ دو۔ یہ ایک ایک رات میں تین تین دفعہ دہراتے کیوں ہو، صرف دہراتے ہی ہیں تو ٹھیک ہے جی دہراتے ہی رہو۔ ''کہا یہ ہے کہ کیا اس کے لیے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟'' یہ دلیل اور برہان دے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شاعر کی خاطر، ایک پاگل کی خاطر، جواب مل رہا ہے۔ ٹھیک ہے مفاد پرست گروہ انہیں واقعی پاگل کہتا ہے۔ آج بھی یہ آپ کو معلوم ہے، پاگل کسے کہتے ہیں ''آہا! تُو بالکل پاگل ہو گیا ہے، تجھے اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں ہے''۔ اپنے نفع نقصان کا خیال ہو تو یہ دانشمند ہے، انسانیت کے نفع نقصان کا خیال ہو تو پاگل ہے، مجنون ہے، شاعری کرتا ہے تو کیا پھر اس کی خاطر ہم اپنے الٰہوں کو چھوڑ دیں! کوئی دلیل نہیں دی بس اتنا کہہ دیا کہ ''پاگل ہے، شاعری کر رہا ہے''۔ کہا ہے کہ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ (37:37) یہ جسے تم شاعر اور مجنون کہہ رہے ہو، وہ ایک حقیقت ثابتہ لے کر آیا ہے، الحق لے کر آیا ہے، تم اس کے متعلق جو جی میں آئے کہو، اس الحق کو تو دیکھو کہ وہ کیا ہے؟ کیا وہ شاعری ہے؟ کیا وہ کسی پاگل کی باتیں ہیں؟ یعنی خود اس کو دیکھو جس کو یہ شاعر اور پاگل کہتے تھے۔

مُردہ قوموں کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی قرآنِ حکیم کا ایک فارمولا: ''سوچا کرو''

آپ کو معلوم ہے کہ قرآن حکیم میں ایک لفظ آیا ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا۔ آپؐ اتنا عرصہ ان لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہے، اس کے بعد یہ کہا کہ ذرا رک جاؤ، میں آج تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں، لمبی چوڑی کوئی وعظ نہیں، کوئی نصیحت نہیں، کوئی لیکچر نہیں، لمبا چوڑا کچھ نہیں، صرف ایک بات ہے۔ انہوں نے کہا کہ بھئی! سن لو، ایک بات تو یہ ہے جو یہ کہہ رہا ہے، سن لو۔ کہا کہ ایسے نہیں، وہ بات ایسی نہیں ہے کہ تم چلتے چلتے سنو، رک کر کھڑے ہو جاؤ، سب نہیں کھڑے ہونا چاہتے تو ایک ایک دو دو کر کے صحیح طور پر

کھڑے ہو جاؤ' رک کر میری بات سنو جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ بات بڑی اہم ہے' جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ آپ نے دیکھا 184الصّٰفّٰت۔ Psychologically (نفسیاتی طور پر) ان کو کتنا آمادہ کیا ہے کہ واقعی بڑی اہم بات ہوگی' ایک بات چھوٹی سی کھڑے ہو کر سن لو' کھڑے ہو گئے' کہا کہ فرمایئے وہ ایک بات جو کہنا چاہتے ہو۔ کہا کہ تَتَفَكَّرُوا (34:46) سوچا کرو بس! بس یہ کہا اور اس کے بعد یہ کہا کہ اگر تم نے یہ سوچنا شروع کر دیا تو پھر تم خود اس نتیجے پہ پہنچو گے کہ جس نے وہ کہا تھا وہ پاگل نہیں تھا۔ اللہ توفیق دے' عزیزانِ من! تھوڑی سی عربی سیکھ لیا کرو' تھوڑی سی عربی سے قرآن حکیم آ جاتا ہے' پھر خود اس کو اس طرح سمجھا کرو' دیکھو کس طرح وجد آ جاتا ہے۔ ایک بات ہے تَتَفَكَّرُوا اوہ فکر' جو قوموں کے لیے بڑی انقلاب آفریں چیز تھی' وہ کہی۔

جس نے دین کی خاطر عقل کا دیا گل کر دیا' وہ حیوانی سطح پہ آ گیا

عزیزانِ من! قومیں زندہ رہتی ہیں جب تک وہ فکر اور غور کرتی ہیں۔ قوموں کو تباہ کرانے کی سب سے بڑی سازش یہ ہے کہ ان کے غور و فکر کی جو صلاحیتیں ہیں' ان کو مفلوج کر کے رکھ دیا جائے' اس قوم کے عقل و دانش کے دیئے گل کر دیں۔ بس اس کے بعد اس سطح کے اوپر جب انسان آتے ہیں تو **مالکوں** (37:71) جیسے لوگ حیوانوں کے مالک ہو جاتے ہیں' دوسرے لوگ اس قوم کے مالک ہو جاتے ہیں۔ اب آج بھی یہی سازش ہے۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ کب سے ہے؟ صدیوں سے ہمارے خلاف یہ سازش چلی آ رہی ہے کہ مذہب کے معاملے کے اندر عقل کو دخل ہی نہیں ہے۔ قرآن حمید نے کہا ہے کہ حیوان اور انسان میں مابہ الامتیاز شے ہی عقل و دانش ہے' اس نے کہا ہے کہ عقل و دانش سے کام نہ لینے والے جہنم میں جانے والے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ جہنم کا داروغہ جہنم میں آنے والوں کو پوچھے گا کہ تم نے کیا کوئی اتنا برا جرم کیا تھا جو تم جہنم میں آ گئے۔ وہ وہاں اپنے جرائم کی فہرست نہیں پیش کریں گے' کہیں گے کہ ہم نے عقل و فکر سے کام نہیں لیا تھا۔ جس قوم کو مذہباً یہ سکھایا جاتا ہو کہ مذہب کے معاملے میں' شریعت کے معاملے میں' عقل کو دخل نہیں ہے' تو پھر اس کا یہ حشر کیوں نہ ہوگا! میں پھر کہوں گا کہ کونسی انکوائری کمیٹیاں بٹھانے کی ضرورت ہے' بات صاف ہے۔

قرآن حکیم کے متعلق مولانا رومؒ کا فتویٰ

اب صدیوں سے یہ کچھ آپ کے ساتھ ہو رہا ہے اور یہ بڑی گہری سازش ہے جس نے پہلے آپ کے ہاں تصوف کی خانقاہ قائم کی' اس نے سب سے پہلی بنیادی اینٹ اس کے ساتھ رکھی۔ تصوف کے معنی یہ ہیں کہ عقل و فکر اور علم کے پیچھے لٹھ لے کر پھرتے رہو۔ اس نے تباہ کر کے رکھ دیا۔ پھر اس کو مغزِ دین قرار دے دیا "تت کڈیا ہو یا دین دا ساڈے کول ہے [1]"۔ جیسا مولانا رومؒ (638-560ھ مطابق 1165-1240ء) کہہ رہا ہے:

---

[1] دین کا ملخص ہمارے پاس ہے۔

ماز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پیشِ سگاں انداختم

(معاذ اللہ) دین کا مغز تو ہم نے لے لیا' یہ تم اپنے پاس قرآن لیے پھرتے ہو' یہ تو وہ ہڈیاں ہیں جن کے اندر مغز بھی نہیں ہے' ہڈیاں ہیں جو ہم نے کتوں کے سامنے پھینک دی ہیں۔ یہ شعر ہے یہ امام ہیں جن کو آپ صوفیائے کرام کہہ رہے ہیں کہ قرآن کا مغز ہم نے لے لیا ہے' یہ ہڈیاں ہیں جو ہم نے کتوں کے آگے پھینک دی ہیں۔

دنیائے تصوف کا نچوڑ عقل وفکر سے لاتعلقی میں ہے

اور تصوف میں مشترک ایک ہی چیز ہے کہ عقل اور علم اور فکر سے کوئی کام نہ لو ''اکوالف تینوں درکار'' ڈھولک کی تھاپ ہے اور یہ ایک ہی مصرع ہے۔ یہ تو طریقت تھی۔ شریعت کی طرف آئے تو اسلاف کا راستہ یہ بتایا کہ بات وہی ہے جو سلف صالحین فرما گئے' بس بات ختم ہوگئی۔ جو کچھ وہ فرما گئے ہیں اس کے اوپر تم غور وفکر ہی نہیں کر سکتے۔ یہ دونوں (طریقت اور شریعت) ایک ہی مقام پہ ہیں۔ یہ ہے وہ جو قرآن کریم ان کا قول نقل کر رہا ہے کہ اَئِنَّا لَتَارِکُوْ آالِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ(37:36) یہ جو قرآن کریم کی طرف دعوت دینے والے ہیں' یہ شاعر ہیں' پاگل ہیں' دیوانے ہیں۔ کیا ان کی خاطر ہم اپنے اسلاف کے راستے چھوڑ دیں! اور پھر کہا ہے کہ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ (37:37)۔ الحق قرآن کہتا ہے۔

حق کے قرآنی مفہوم کے لیے ایک عملی ثبوت

حق' عزیزانِ من! کوئی نظری چیز نہیں' یہ Abstract (بسیط' غیر محسوس) بات نہیں' یہ Theoretical (نظری سی) چیز نہیں' عربی زبان کے اعتبار سے کسی چیز کو حق اس وقت کہتے ہیں جب وہ محسوس شکل (Concrete Form) میں سامنے آ جائے۔ جب آپ کہتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے تو اس میں یہ نہیں ہوتا کہ نظری طور پہ میں بحث کرنے کے بعد تمہیں کہتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے' اس کے معنی ہوتے ہیں کہ یہ جو میں نے دعویٰ کیا ہے' اس کا محسوس نتیجہ تمہیں بتا رہا ہے کہ یہ حقیقت ہے۔ یہ چیز تو اس دور کے سپاہی مومن مجاہد جانتے تھے۔ یہی غالباً بیت المقدس کی جنگ تھی جس نے ایک مجاہد سپاہی سے پوچھا تھا کہ ہر دین کی' ہر مذہب کی' ایک حقیقت ہوتی ہے تو وہ تو عرب تھے وہ تو جانتے تھے کہ حقیقت کے معنی کیا ہیں' اس نے کہا تھا کہ بتاؤ تمہارے دین کی حقیقت کیا ہے؟ کہنے لگے کہ یہ جو چالیس ہزار شہر اور قلعے ہم نے فتح کیے ہیں' اگر یہ حقیقت نہیں ہے تو اور حقیقت کیا ہوتی ہے۔ کوئی فلسفیانہ دلائل نہیں دیئے کہ آؤ ہم بتائیں Truth (حقیقت وصداقت) کیا ہوتا ہے' انہوں نے کہا کہ یہ حقیقت نہیں تو اور کیا ہے۔ الحق کہتے ہی اس کو ہیں۔ کہا ہے کہ جَآءَ بِالْحَقِّ(37:37)۔ اگلے

دوالفاظ نے یہ معنی خود متعین کر دیئے۔قرآن کریم اپنے معنی آپ متعین کرتا ہے۔کہا ہے کہ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ(37:37) یہ اس 184الصّٰفّٰت۔ حق ہے کہ جو کچھ پہلے انبیائے کرامؑ نے دعوے کیے تھے، تم بھی ان کو دہراتے ہو کہ خدا کی بادشاہت اس زمین پہ قائم ہوگی، جوانہوں نے دعوے کیے تھے، یہ ان دعاوی کو سچ کر دکھائے گا۔صدق کے معنی یہ ہوتے ہیں۔

لفظ صدق کا قرآنی مفہوم: سچ کر دکھانا

ہمارے ہاں اس کے لیے ایک لفظ ''تصدیق کرتا ہے'' لے لیا، اس کا یہ ترجمہ کر دیا، تصدیق کرنے کے معنی ہیں کہ انہوں نے کہہ دیا کہ ہاں جی، وہ سچ کہا کرتے تھے، چل بھئی! ہمیں اس چیز کا کیا فائدہ ہوا کہ وہ سچ کہا کرتے تھے، کیا کارنامہ سرانجام دیا انہوں نے؟ کہ وہ سچ کہا کرتے تھے۔صدق کے معنی ہیں ''کسی چیز کو سچ کر کے دکھا دینا''۔وہ دعاوی جو انہوں نے کیے تھے اور ان کو تم بھی دہراتے رہتے ہو لیکن تمہارے ہاں تو وہ سچ ہو کر سامنے نہیں آ رہے۔تم جو کہتے ہو کہ خدا کی بادشاہت زمین کے اوپر قائم ہوگی، یہ تو حقیقت بن کر سامنے نہیں آ رہی۔کہا ہے کہ یہ الحق ہے، یہ حقیقت بن کر سامنے آئے گی اور جو انبیاء نے دعوے کیے تھے یہ ان کو سچ کر دکھائے گا۔یہ ہے عزیزانِ من! دین، اسکو سچ کر دکھانا۔کہا ہے کہ اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ(37:38)۔تم ان کے مقابل میں کہتے ہو کہ یہ ان کے لیے ہے جنہوں نے تکذیب کی تھی، جسے ہم الم انگیز دردانگیز عذاب کہتے ہیں، نہیں! کہا یہ ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ذرا اس کا مزہ چکھو کہ کیا الم انگیز عذاب ہے!

اللہ تعالیٰ کی ذات کسی کو باہر سے سزا نہیں دیتی

آپ کو یاد ہوگا میں نے پہلے بھی کئی دفعہ کہا تھا، اب پھر میں عرض کر دوں۔کہا ہے کہ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (37:39)۔کیا بات ہے اس عربی زبان کی! ایک تو وہ سزا ہے جو کوئی باہر سے کسی کو دے اور ایک سزا یہ ہے کہ جو کچھ تم خود کرو، اس کا خود نتیجہ جو مرتب ہو، وہ ملے مثلاً اگر کوئی آ کر چھرا مار کر آپ کو ہلاک کرے، تو مارنے والے کو یہ سزا باہر سے ملی اور اگر آپ خودکشی کے لیے خود ہی سنکھیا کھائیں تو یہ آپ کی موت آپ کے اپنے عمل کا نتیجہ ہے جو عمل کے اندر تھا، یہ کسی نے باہر سے سزا نہیں دی۔قرآن حکیم کا عجیب انداز ہے! جہاں وہ سوسائٹی کی طرف سے مجرموں کو سزائیں وغیرہ ملنے کا ذکر کرتا ہے تو کہتا ہے کہ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (36:54) یہ اس کی سزا ہے جو تم نے کیا۔اور جب یہ اس قسم کا مثلاً خود ہی سنکھیا کھانے کا نتیجہ ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (45:28) جو تم نے کیا تھا وہی تمہارے اندر نتیجہ بن گیا ہے، سنکھیا کھایا تھا سنکھیا ہلاکت بن گیا ہے، ہم نے تمہیں باہر سے طمانچہ بھی نہیں مارا۔یہ وہ ہے جو تم کرتے تھے۔کیا بات ہے! یہ تو ان کی بات ہوگئی ہے۔

جیسے ڈالڈا اب گھی بن چکا ہے اسی طرح اب مذہب کی جگہ یہ دین ہو گیا ہے

کہا ہے کہ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ(37:40)۔اس آیت میں مخلصین آیا ہے۔اسی سے مخلص، خلوص اور اخلاص کے الفاظ آتے

ہیں۔ وہ مخلص یا خلوص یا اخلاص اسی طرح کہتے ہیں جیسے خالص چیز کہتے ہیں' اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''آلائش سے الگ ہوجانا'' الصّٰفّٰتِ 184 یعنی اس میں آلائش' آمیزش وغیرہ کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ اب تو ہمارے ہاں جو غلط چیز ہوتی ہے' وہ خالص ہوجاتی ہے۔ مثلاً یہ ڈالڈا گھی ہے۔ پہلے اس ڈالڈا گھی کی بجائے بناوٹی گھی تھا' اس کا پہلا نام ڈالڈا ہی تھا' یہ بناسپتی تھا اور گھی اس سے الگ ہوتا تھا' پھر اس ڈالڈا کو کہنے لگے کہ بناوٹی ہوتا ہے' آہستہ آہستہ اس کی روش ایسے عام ہوگئی کہ اس کا نام ہی گھی ہوگیا' اب گھی کہتے ہی اس کو ہیں۔

میں نے کہا تھا کہ دین مذہب میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ گھی کا نام پہلے تو ڈالڈا رکھا جاتا ہے' کچھ وقت تک تو وہ رہتا ہے' پھر آہستہ آہستہ اس کو گھی کہنا شروع کر دیتے ہیں' پھر وہ گھی ہوتا ہے۔ اب گھی کے جو خصائص' اس کی جو خوبیاں' اس کی جو چیزیں' کتابوں میں' حکمت میں' درج ہیں وہ تو گھی کے نام سے درج ہیں۔ اب آگے کتابیں وہ پڑھائی جاتی ہیں' جن میں گھی کی ساری خصوصیات ہوتی ہیں اور وہ گھی یہ ہوتا ہے۔ اب اس کا نتیجہ وہ نکلتا نہیں۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ یہ گھی نہیں' ڈالڈا ہے' وہ تو مدت ہوئی کہ ڈالڈا' گھی بن چکا تھا' اب آگے بات سمجھ میں نہیں آتی کہ گھی تو طاقت دیتا تھا ''اے تے سنگ پھڑ لیند اہیگا''[1] یہ کیا ہوا؟ کہ جی! تم صحیح طریقے سے کھاتے نہیں ہو' یعنی اس میں نقص نہیں ہوگیا۔ تمہارے کھانے کے انداز میں نقص ہوا ہے۔ مذہب' عزیزانِ من! دین کا ڈالڈا ہوتا ہے لیکن جب یہ ڈالڈا ہمارے جیسی قوم میں آجاتا ہے' تو آپ نے اب یہ چیز سنی ہوگی کہ ڈالڈا برانڈ ہے وہ چیز سب سے پہلے نکلی تھی' پھر تو بیسیوں برانڈیں تھیں' جیسے مذہب کے اندر فرقے بن گئے' اب ہر فرقے کا اپنا ڈالڈا ہے۔ اس کے بعد یہاں یہ شکایت پیدا ہوگئی کہ ''ہن تے ڈالڈا ای خالص نئیں ملدا''[2] کیا بات ہے اس قوم کی کہ اب تو بناوٹی بھی خالص نہیں ملتا!

ہمارے اس دور میں حضرت علامہ اقبالؒ (1877-1938ء) جب زندہ تھے تو ایک گروہ تھا جو قوم کے خلاف ہمیشہ منافقت برتتا تھا۔ ایک دن یونہی دوستی کی محفل میں' ان کی عجیب شگفتہ محفل ہوتی تھی' ان کا ذکر آیا کہ صاحب! وہ منافق ہیں۔ کہنے لگے کہ یہ اتنی سی بات ایسے نہ کہو۔ کہو کہ وہ مخلص منافق ہیں۔ تو عربی زبان میں مخلص یا اخلاص یا خلوص کے معنی ہوتا ہے ''وہ جس میں غلط چیز کی آلائش تک نہ ہو' وہ ان آلائش کی چیزوں سے الگ ہوگیا ہو''۔ کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ لَھُمۡ رِزۡقٌ مَّعۡلُوۡمٌ (37:41) یہ ہیں جن کو سامانِ زیست ملے گا۔ اور ایسا نہیں ہے کہ ذہنی طور پر ہی ہو' وہ ہے مَّعۡلُوۡمٌ (37:41) ان کو علم ہوگا کہ کہاں سے ملے گا' کیسا ملے گا' کیوں نہیں مل رہا' ملے گا۔

عزیزانِ من! روٹی تو گداگر کو بھی ملتی ہے' محنت کرنے والے کو بھی ملتی ہے' یہ رزق جو ملا ہے یہ تو ملا ہے' کیسا ملے گا؟ اس کے لیے کہا ہے کہ

آن خدا نانے دہد جانے دہد

---

[1] یہ تو گلا پکڑ لیتا ہے۔

[2] اب تو ڈالڈا ہی خالص نہیں ملتا۔

ایک روٹی وہ خدا دیتا ہے' روٹی دیتا ہے اور جان بھی دیتا ہے۔ 184الصّٰفّٰت۔

این خدا جانے برد نانے دہد

اور ایک یہ خدا ہے جو روٹی دیتا ہے مگر جان نکال لیتا ہے۔ یہ بھی روٹی ملتی ہے' گداگر کو بھی روٹی ملتی ہے' محتاج کو بھی ملتی ہے' انفرادی طور پہ ہو یا قومی سطح کے اوپر ہو' یہ ملتی ہے۔ دیکھیے! قرآن کریم کیا کرتا ہے؟ اس نے کہا ہے کہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ(17:70) ہر انسان' انسان ہونے کی جہت سے' واجب التکریم ہے۔ اس کی تکریم میں' اس کے احترام میں' اگر کسی نہج سے فرق آتا ہے تو وہ دین نہیں ہے' وہ اسلام نہیں ہے۔ کہا ہے کہ ہم نے یہاں یہ کہا تھا کہ اس کو رزق دیا جائے گا' روٹی دی جائے گی۔ فوراً ذہن میں آیا کہ یہ نہ ہو جائے کہ صاحب! اس قسم کی روٹی دی جائے گی کہ جس میں گداگر کی طرح روٹی تو ملتی تھی' عزت و تکریم سب ختم ہو جاتی تھی۔ کہا ہے کہ فَوَاكِهُ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ (37:42) ان کی تکریم' احترام اور تعظیم سب برقرار رہے گا۔ یوں روٹی ملے گی۔ اسے قرآن کریم نے رزقِ حلال کہا ہے' جس میں انسانیت کا شرف اور تکریم باقی رہے۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام میں رزقِ حلال کی تعریف

عزیزانِ من! جس رزق میں بھی تکریمِ انسانیت باقی نہیں رہتی' قرآن حکیم کی رو سے وہ رزق حرام ہے' رزقِ حلال نہیں ہے وَهُمْ مُكْرَمُوْنَ (37:42)۔ اس کے بعد کہا ہے کہ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۔ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ(37:43-44)۔ اب یہاں قرآن حکیم کی وہی اصطلاحات آ گئیں کہ وہاں گھنیرے باغ ہیں' اس کے اندر ہر قسم کی آسائشیں ہیں اور وہ ان کے ساتھ تکریم باقی رہتی ہے' اس شرط کو یاد رکھیے گا احترام میں فرق نہیں آتا عزت میں فرق نہیں آتا۔ دوسری جگہ تو قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ تو خدا کے مہمان ہونگے۔ کیا بات ہے ان کی' جن کی یہ کیفیت ہو کہ خدا میزبان ہو! مہمان کی کوئی بے عزتی نہیں کرتا۔

قرآنِ مجید کے نظامِ زندگی میں مساوات کی کیفیت

کہا ہے کہ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ(37:44)۔ مساوات ملاحظہ فرماؤ۔ نشستوں کا بتایا کہ ایسی نشستیں بھی نہیں ہونگی کہ کچھ آگے' کچھ پیچھے' کچھ اس طرح سے اور ایسی بھی نہیں ہونگی کہ کچھ اونچے' کچھ نیچے ایسے بیٹھے ہوئے ہیں' بالکل نہیں۔ کہا ہے کہ تختوں پہ بیٹھے ہوئے ہونگے' مساوات کی یہ کیفیت ہے کہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونگے۔ قرآن مجید نے ایک لفظ میں بات کہہ دی کہ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ (37:45)۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ زندگی پانی کے اوپر ہے۔ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (21:30) رزق میں بنیادی چیز بتائی ہے جس کے اوپر زندگی کا معیار ہے۔ کہا ہے کہ وہ زندگی کا مشروب' آبِ حیات يُطَافُ عَلَيْهِمْ (37:45) ہے یعنی

وہ زندگی کے مشروب کا پیالہ یوں پھیر کر دیا جائے گا جیسے پیالہ یوں ایک دوسرے کو دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کو بڑھ کر پھر لینا پڑے الصّٰفّٰت 184 ۔
گا یا آج کل کے نل کی طرح وہ بالٹیاں لے کھڑا ہونا پڑے گا پھر ایک دوسرے کا سر پھٹول ہوگا' وہاں تو خود وہ پیالہ ادھر سے آئے گا۔

قرآنی نظام کے اس جہانِ نو کے اندر' رزق کے چشموں پر کوئی بند نہیں لگا سکے گا

قرآن کریم نے آبِ حیات کے اس طرح ملنے کے لیے مِّنۡ مَّعِیۡنٍ (37:45) کہا ہے۔ قرآن کریم کا ایک لفظ جو بار بار آتا ہے' کہا ہے کہ یہ وہ آبِ حیات ہے جو بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہے' اس کے آگے بند نہ لگے ہوئے ہوں' اس کو کسی نے روکا ہوا نہ ہو' کوئی اس کو اپنی طرف کھینچ کر نہ لے جائے۔ مَّعِیۡنٍ کہتے ہی اس چشمے کو ہیں' جو رواں رہے' جاری رہے' جہاں اس کے اوپر بند لگا تو قرآن کریم نے کہا کہ اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ (107:1) تم نے اس کو بھی دیکھا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ کون جھٹلاتا ہے؟ وہ جو وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ (107:3) ان لوگوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتے جن لوگوں کا کاروبار رک جاتا ہے' وہ کسی طرح کام کے قابل نہیں رہتے ہیں۔ کہا ہے کہ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ (107:4) نمازیں پڑھتے ہیں' تکذیب کرتے ہیں' نمازیں پڑھتے ہیں' اس کے باوجود تکذیب کرتے ہیں الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ (107:6) ان کا نماز سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ حرکات و سکنات ایسی ہیں کہ انہیں کوئی دوسرا دیکھ سکتا ہے اور بس' نماز کے مقصد سے غافل ہوتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ کہ جی! نمازیں پڑھتے ہیں' تباہیاں مول لیتے ہیں۔ کیوں ایسا ہوتا ہے؟ اس لیے کہ وَ یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) رزق جس کو بہتے پانی کی طرح ہر ایک کے سامنے سے گزرنا چاہیے' وہ اس پہ بند لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہاں مَاعُوۡنَ آیا ہے اور (37:45) میں معین آیا ہے' یہ بھی وہی لفظ ہے۔ ایک مقام پہ کہا ہے کہ یہ چیزیں ہم نے نوعِ انسانی کی ربوبیت عالمینی کے لیے دی ہیں تا کہ ہر ایک ان سے اپنی پرورش اور نشوونما کا سامان حاصل کرے۔ وَ مَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحۡظُوۡرًا (17:20) یاد رکھیے! یہ چیزیں خدا کی عطا کردہ ہیں' کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ ان کے اوپر بند لگا کر بیٹھ جائے' ان کے اوپر رکاوٹیں کھڑی کر دے۔ یہ عطائے رب ہیں۔

قرآنی نظام میں رزق کے حصول کے لیے کسی کو مشقت نہیں کرنا پڑے گی

قرآن کریم نے تو جنت کے چشمے یا وہاں کے پانی کو وَّ مَآءٍ مَّسۡکُوۡبٍ (56:31) کہا ہے۔ ایک تو پانی وہ ہے جو کنواں کھود کر مشقت کے بعد نیچے سے نکلتا ہے' ایک پانی وہ ہے جو خدا کا چشمہ ہے' وہ بہتا ہوا تمہارے سامنے سے گزرتا ہے۔ کہا ہے کہ اس نظام کے اندر یہ جو زندگی کا سب پانی ہے' اس کے لیے جگر پاش مشقتیں کر کے' کنوئیں کھود کھود کر' نکالنا نہیں پڑے گا' وہ بہتے ہوئے چشمے کی طرح تمہارے گھروں کے سامنے سے رواں دواں جائے گا۔ یہ وَّ مَآءٍ مَّسۡکُوۡبٍ (56:31) ہوگا' وہ جس کے لیے کنواں کھودنا بھی نہ پڑے اور یوں چلتا ہوا آگے سے جائے۔ یہ ہیں وہ جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ ان کے لیے رِزۡقٌ مَّعۡلُوۡمٌ (37:41) ہے اور اس کے لیے

مُکْرَمُوْنَ (37:42) ہے۔ یہ ہے وہ رزق جو بہتے پانی کی طرح ہے‘ بہتے پانی میں سے جو کوئی کچھ پانی پی لیتا ہے تو اس پہ کسی کا احسان نہیں ہوتا‘‘ ’’اے ٹھیک ہے جامے والا کھوہ جیہڑا ہیگا وے اوہدے تے تے جامے دی ملکیت ہوندی ہے نا اوہدا جی کرے تہانوں پانی پین دے اوہدا جی کرے نہ پین دے‘‘[1] اور ٹھنڈے اور جاری چشموں کا نہایت خوشگوار پانی جس کے آگے روک نہیں اور ایسا مشروب ہے جو بَیْضَآئَ لَذَّۃٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ (37:46) ہے یعنی دیکھنے میں برف کا سفید اور پینے میں بے حد لذیذ۔

184 الصّٰفّٰتِ۔

انسانوں کے خود ساختہ نظام میں انسان کی انسانوں کے ہاتھوں کیفیت

عزیزانِ من! آج بھی ’’جامے والے کنوئیں‘‘ موجود ہیں۔ ہندوستان میں آج بھی آپ سن رہے ہیں کہ برہمنوں کی بستی میں اگر کوئی ہریجن پانی کا ایک ڈول نکال لیتا ہے‘ تو اس کی ساری بستی کو جلا دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی تو پوچھو نہیں کہ گاؤں میں کیا ہوتا ہے ’’چوہدریاں دا کھوہ تے نمبرداراں دا کھوہ‘‘[2] لیکن جو مآء معین ہے وہ کسی کا کنواں نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! چلتے چلتے آپ کو ایک بات بتا دوں۔ یہ جو آپ کے ہاں روز شریعت کا لفظ بولا جاتا ہے کبھی آپ نے ان سے پوچھا بھی ہے کہ صاحب! اس کے معنی کیا ہیں؟ کہنے لگے: معنی کیا ہیں!! شریعت ہیں!!! عزیزانِ من! عربی زبان کا ایک ایک لفظ سارا مقصود و ماحصل بیان کر دیتا ہے۔ شرعاً اس راستے کو کہتے ہیں جو ’’اس پانی کی طرف لے جائے‘ جو ندی کی طرح بہتا ہوا ہو‘‘۔ اگر وہ پانی کھڑا ہے تو عرب اس کے لیے شریعت کہتے ہی نہیں ہیں۔ یہاں ہزار برس پہلے کے جو ایک جوہڑ یا تالاب بنے تھے‘ آج تک ان کو رکھا ہوا ہے‘ سڑانڈھ پیدا ہوئی ہے‘ اس کا نام شریعت رکھا ہے۔ یہ تو زبان کے اعتبار سے ہی غلط ہے۔ عربوں کے ہاں بولو گے‘ وہ بھی اب مذہب کے اندر گرفتار ہیں‘ انہوں نے ان کے معنی Technically (تکنیکی طور پر) سمجھ لیے ہیں‘ اصطلاحی سمجھ بیٹھے ہیں۔ شریعت تو وہ کہتے ہی اس راستے کو تھے‘ جو اس پانی کی طرف لے جائے جو بہتا ہو‘ جو نہ بہتا ہو اس کے لیے یہ لفظ نہیں بولتے تھے۔ یہاں ماء معین ہے۔ وہ رزق ہے جس میں تکریم انسانیت باقی رہتی ہے‘ قائم رہتی ہے۔

سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت 46 تک آ گئے‘ 47ویں سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ



---

[1] یہ درست ہے کہ وہ جو جامے والا کنواں ہوتا ہے‘ اس پر تو جامے کی ملکیت کا پٹہ ہوتا ہے‘ اس کا دل چاہے تو آپ کو اس کا پانی پی لینے دے اور اگر جی نہ چاہے تو نہ پینے دے۔

[1] یہ چودھریوں کا کنواں ہے اور وہ نمبردار کا کنواں ہے۔

تیسرا باب: سورة الصّٰفّٰت (آیات 47 تا 74)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

لَا فِيۡهَا غَوۡلٌ وَّلَا هُمۡ عَنۡهَا يُنۡزَفُوۡنَ ﴿۴۷﴾ وَعِنۡدَهُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ عِيۡنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيۡضٌ
مَّكۡنُوۡنٌ ﴿۴۹﴾ فَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۵۰﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ اِنِّىۡ كَانَ لِىۡ
قَرِيۡنٌ ﴿۵۱﴾ يَّقُوۡلُ اَءِنَّكَ لَمِنَ الۡمُصَدِّقِيۡنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيۡنُوۡنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ
هَلۡ اَنۡتُمۡ مُّطَّلِعُوۡنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِىۡ سَوَآءِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنۡ كِدۡتَّ لَـتُرۡدِيۡنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوۡلَا
نِعۡمَةُ رَبِّىۡ لَكُنۡتُ مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ ﴿۵۷﴾ اَفَمَا نَحۡنُ بِمَيِّتِيۡنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوۡتَتَنَا الۡاُوۡلٰى وَمَا نَحۡنُ
بِمُعَذَّبِيۡنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۶۰﴾ لِمِثۡلِ هٰذَا فَلۡيَعۡمَلِ الۡعٰمِلُوۡنَ ﴿۶۱﴾ اَذٰلِكَ خَيۡرٌ نُّزُلًا اَمۡ
شَجَرَةُ الزَّقُّوۡمِ ﴿۶۲﴾ اِنَّا جَعَلۡنٰهَا فِتۡنَةً لِّلظّٰلِمِيۡنَ ﴿۶۳﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخۡرُجُ فِىۡۤ اَصۡلِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۶۴﴾ طَلۡعُهَا
كَاَنَّهٗ رُءُوۡسُ الشَّيٰطِيۡنِ ﴿۶۵﴾ فَاِنَّهُمۡ لَاٰكِلُوۡنَ مِنۡهَا فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمۡ عَلَيۡهَا
لَشَوۡبًا مِّنۡ حَمِيۡمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرۡجِعَهُمۡ لَاِلَى الۡجَحِيۡمِ ﴿۶۸﴾ اِنَّهُمۡ اَلۡفَوۡا اٰبَآءَهُمۡ ضَآلِّيۡنَ ﴿۶۹﴾ فَهُمۡ عَلٰٓى
اٰثٰرِهِمۡ يُهۡرَعُوۡنَ ﴿۷۰﴾ وَلَقَدۡ ضَلَّ قَبۡلَهُمۡ اَكۡثَرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۷۱﴾ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا فِيۡهِمۡ مُّنۡذِرِيۡنَ ﴿۷۲﴾ فَانۡظُرۡ
كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۷۴﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1980ء کی 29 تاریخ ہوگئی اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت 47 سے ہو رہا ہے: (37:47)۔

قرآنِ حکیم کا ایک وجد آفریں مقام اور ہمارے ہاں کی تفاسیر اور تراجم عہدِ ملوکیت کی غماز

سابقہ آیات میں جنت کی آسائشوں کا، نعماء کا، نعمتوں کا، ذکر چلا آرہا تھا۔ اور اس کے بعد آج آیت وہ سامنے آرہی ہے جس کے

متعلق شاید اقبالؒ (1938-1877ء) نے کہا تھا کہ 184الصّٰفّٰت۔

تھم اے راہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا ❶

یہ مشکل مقام آ گیا تھا۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ۔ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ۔ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ (37:47-49)۔ کیا عرض کیا جائے کہ قرآنِ کریم کے یہی مقامات ہیں جن سے انسان وجد میں آ جاتا ہے! ہمارے ہاں کی تفسیروں اور ترجموں نے انہیں کیا سے کیا بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ مقام وہ ہے جس میں آپ کہتے ہیں کہ جنت میں حوریں ہونگی۔ حوروں کا یہ ذکر یہاں ان کے ترجمے کی رو سے آ رہا ہے۔ میرے لیے مشکل یہ ہے کہ مجمع مخلوط ہوتا ہے' میری بیٹیاں اور بہنیں ہوتی ہیں' ہزار احتیاط کے باوجود بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جنہیں میں کسی طرح سے بھی پیش کرنے کی جرأت کر نہیں سکتا' فضا اس کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ میں اس سے زیادہ اپنی قومی بدبختی کے متعلق اور کیا کہوں کہ ہمارے ہاں کی یہ تفسیریں اور یہ روایات اس زمانے میں وضع اور مدون ہوئیں' جب ملوکیت اپنے شباب پر تھی۔

دورِ ملوکیت میں مذہبی پیشوائیت کا کردار اور جنسیات کا پہلو

ملوکیت دراصل انسانوں کا انسانوں پہ خدا بن جانا اور ان پہ حکومت کرنا ہے۔ دنیا بھر کے جتنے بھی عیوب ہیں' وہ اس کی رو میں بہتے ہوئے چلے آتے ہیں' یہ ایک سیلاب ہوتا ہے جس میں ہر قسم کا خس و خاشاک' غلاظتیں' کثافتیں' گندگیاں اس کے ساتھ چلی آتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ چیز جو ان کے اعصاب پہ سوار ہوتی ہے وہ سیکس (Sex) یعنی جنسی رفاقت ہوتی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ملوکیت میں ویسے ہی دولت کی افراط ہوتی ہے پھر ملوکیت اسے بھی ضروری سمجھتی تھی کہ مذہبی پیشوائیت اس کے ساتھ رہے کیونکہ انہی کی طرف سے ڈر ہوتا ہے کہ اگر یہ کہہ دیں کہ یہ چیز خلافِ اسلام ہے تو عوام اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ عوام کے دل میں اسلام کے ساتھ اتنی محبت ہوتی ہے کہ پھر وہ اس آواز کے اوپر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اسی لیے ملوکیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ مذہبی پیشوائیت کو اپنے ساتھ رکھے۔ اور اُدھر فرعون' فرعون ہو نہیں سکتا تاوقتیکہ اسے ہامان اور اس کے لشکروں کی تائید حاصل نہ ہو۔ قرآن کریم نے ہامان کے جنود کہا ہے۔ حکومت یعنی بادشاہت کے تو جنود لشکر ہوتے ہیں' اس نے' یہ جو ہیڈ پریسٹ (Head Priest)' جو پیشوائیت کا سرغنہ تھا' اس کے بھی لشکر گنائے ہیں۔ اور یہ (لشکر) تو وہ ہوتے ہیں جن میں ''بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی''۔ ان کے ہاں تو وہ سپاہ ہوتی ہیں۔ ملوکیت کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ انہیں راضی رکھے' خوش رکھے۔ چنانچہ ہمارے ہاں تاریخ میں ہے کہ یہ جو لوگ تھے ان کے وظیفے لگے ہوئے تھے' ان کے لیے

---

❶ مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا تھم اے راہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا (اقبالؒ: بالِ جبریل)

اوقاف تھے' انہیں کمانے کی کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ جب اس قسم کا دور ہو جس میں یہ ساری برائیاں معاشرے کے اندر اچھائیاں بن گئی ہوں 184 الصّٰفّٰت
معاشرے میں جب برائی عام ہو جاتی ہے تو پھر وہ نگاہوں کے اندر کھٹکتی ہی نہیں۔ کوئی ٹوکنے روکنے والا نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم نے یہودیوں کی تباہی کے متعلق کہا ہے کہ وہ جو کچھ کرتے تھے' وہ تو کرتے تھے لیکن انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں تھا اس لیے تباہی آئی۔ ان میں روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں جنسیات ان کے اعصاب پہ اتنی چھائی ہوئی ہوتی ہیں کہ وہ کوئی بھی گوشہ لیں' اس میں کسی نہ کسی طرح سے یہ پہلو ضرور نکل آتا ہے بلکہ وہ اس کے لیے نکال لیتے ہیں۔

ہماری موجودہ تفاسیر متقدمین کی تفسیروں کی طرحی غزلیں ہیں

یاد رہے کہ ہمارے متقدمین کی تفاسیر کے بعد جنہوں نے یہ تفسیریں لکھیں وہ ساری متقدین کی تفاسیر کی طرحی غزلیں ہیں یعنی طرح مصرع وہیں سے لیا جاتا ہے اور اس کے اوپر اسی کا فیۂ ردیف اور انہی مضامین کے اعتبار سے غزل مرتب کر دی جاتی ہے۔ وہی ہوتا ہے' کوئی وہاں سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ انہیں اس قدر مستند سمجھا جاتا ہے۔ اور وہ اس طرح سے مستند بنا دی گئیں کہ جو کچھ کہا گیا اس کی تائید میں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر ایک روایت لکھ دی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا تھا۔ اس کے بعد کس کی جرأت ہے کہ یہ کہے کہ میں اس کے خلاف کچھ کہنا چاہتا ہوں یا یہ کہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ آپ کے ہاں یہ ہے کہ اگرچہ وہ کہیں گے کہ ہزار بارہ سو سال سے آپ کے ہاں اتنا کام ہوا ہے اور کام کی صورت یہ ہے کہ جو قرآن حکیم کی واقعی تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ سو سو جلدوں میں ایک تفسیر ہے اور یہ مسلسل لکھی چلی جاتی ہیں' کمرے کیا کئی کئی ہال بھر گئے ہیں۔ اس کے اوپر اتنی کتابیں ہیں لیکن یہ سب طرحی غزلیں ہیں۔ پہلی تفسیر میں جو طبری [1] لکھ گیا ہے' آخری تفسیر میں' آج بھی جو لکھی جا رہی ہے' وہی کچھ ہے' بس انداز بیاں ذرا مختلف ہو جاتا ہے۔ یہ سارے میان ہیں جو مختلف ہیں' شمشیر وہی ہے۔ اور جنسیات کی وہ چیز سب میں موجود ہے۔

پہلی تفسیروں کے اندر جنت کی حوروں کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے' جو نقشہ کھینچا گیا ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ مجھ میں تو یہ جرأت نہیں ہے کہ مخلوط مجمع کے اندر اسے بیان کر سکوں۔ یہ وہ ہے جسے Sex Perversion (جنسی بدنہادی) کہتے ہیں۔ یہ Perversion ایک Technical Term (تکنیکی اصلاح) ہے۔ اس کے لیے میں نے بدنہادی ترجمہ کیا تھا لیکن بدنہادی بھی حقیقت میں اس کا صحیح

---

[1] علامہ ابوجعفر محمد بن جریر الطبری (310-224ھ مطابق 923-838ء) تفسیر و تاریخ کے مدوّن اوّل سمجھے جاتے ہیں۔ ابن جریر طبری سے بعض متقدم مفسرین کا ذکر ضرور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض نے اسی (80) جلدوں میں اپنی تفسیر مکمل کی تھی مگر وہ تفسیر جب دنیا کی نظروں کے سامنے صدیوں سے نہیں ہیں تو ان کا ذکر ہی فضول ہے کہ وہ تفسیریں صحیح ہوں۔ اسی لیے ملاحدۂ عجم ہی نے ان کو ضائع کر دیا۔ سب سے قدیم تفسیر ابن جریر ہی کی دنیا کے سامنے ہے۔

184 الصّٰفّٰت ترجمہ نہیں ہے۔ Perversion کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے آپ یوں سمجھیے کہ ایک تو دریا کا' نہر کا' رخ ہوتا ہے اور وہ دریا یا نہر اپنے ساحلوں کے اندر بہتی ہوئی چلی جاتی ہے' ایک یہ ہے کہ سیلاب کی بنا پر اس کے ساحل ٹوٹ جاتے ہیں تو ساحل کے ٹوٹ جانے سے پھر جو پانی کا رخ ہوتا ہے' اس میں ہوتا یہ ہے کہ اس کا جی چاہے ادھر بہہ نکلتا ہے اور وہی پانی جسے سامانِ زندگی مہیا کرنا تھا' تباہیوں کا موجب ہو جاتا ہے۔ سائیکولوجی (نفسیات) کی اصطلاح میں کچھ یوں سمجھیے کہ یہ Perversion (کجروی' بدنہادی) ہے جو وہ دریاؤں کا پانی ساحل کو توڑ کر جدھر جی چاہے بہہ نکلے۔ ہمارے ہاں اس دور میں یہ Sex Perversion (جنسی بدنہادی) نظر آتی ہے۔ ٹھیک ہے' اپنے طور پہ وہ متقدمین تاریخ میں یہ کچھ لکھتے' تو کوئی بات نہیں تھی۔ اب یہ سارا کچھ آپ کے ہاں قرآن مجید کی تفسیروں کے اندر آیا ہوا ہے۔

قرآن حکیم میں جنت اور جہنم کا تذکرہ تو ایک تمثیلی انداز ہے

قرآنِ کریم میں ایک تو یہ چیز سمجھ لیجیے کہ اس نے جنت اور جہنم کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ صرف تمثیلی بیان ہیں' یہ مثال کے طور پر سمجھانے کے لیے ہم نے کہا ہے' یہ سچ مچ اسی طرح سے نہیں ہے جیسا اس دنیا کے اندر تم سمجھتے ہو' مثالیں ہی صرف دی ہوئی ہیں۔ ایک یہ چیز ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جسے آپ سیکس یا جنسیات میں میاں بیوی کے تعلقات کہتے ہیں' وہ کوئی ایسی معیوب شے نہیں ہے کہ مذہب کی دنیا میں کہا جائے کہ وہاں تو اس کو بار ہی نہیں پانا چاہیے۔ ہمارے ہاں ایک طرف تو یہ ہے کہ وہ اعصاب پہ پوری طرح سوار ہے اور دوسری طرف ہمارے ہاں وہ تصوف والے آتے ہیں' ان کے ہاں سیکس (جنسیات) کا نام لینا ہی جرم ہے' یہ ساری چیز جو ہمارے ہاں موجود ہے' یہ ساری عیسائیت کی طرف سے آئی ہے۔

سیکس (جنسیات) کے سلسلہ میں عیسائیت کا کارنامہ

عیسائیت اپنا بڑا کارنامہ یہ بتاتی ہے کہ بقول ان کے حضرتِ مسیحؑ نے شادی نہیں کی تھی حتیٰ کہ وہ جو خدا کے بیٹے تھے' وہ بھی خدا کی بیوی کے بغیر ہی بیٹے ہو گئے تھے' انہوںؑ نے خود شادی نہیں کی تھی۔ آگے ان کے ہاں پھر تصوف چلا' ان کے ہاں Saints چلے تو شادی کرنا تو ایک طرف رہا' پوچھو ہی نہیں کہ ان کی کیا زندگی تھی' وہ کس قسم کے تارک الدنیا تھے۔ ان کے ہاں بڑے بڑے سینٹ' کا معرکہ آراء کارنامہ کیا ہے؟ کہ جی! انہوں نے ساری عمر کیچڑ میں بسر کی تھی' فلاں سینٹ ہیں جناب! انہوں نے ساری عمر غسل نہیں کیا تھا' یہ سینٹ ہیں کہ انہوں نے ساری عمر ناخن نہیں ترشوائے۔ یعنی اولیاء ہونے کے لیے ملاحظہ فرمایئے کہ کیا صفات تھیں۔ اس قسم کی تو انہوں نے یہ دنیا ترک کی۔ جب یہاں تک کیفیت ہو تو پھر یہ بیوی بچوں کا تو معاملہ ہی کوئی نہیں ہوتا۔ نیز ان کے ہاں وہ عورتیں ہوتی ہیں جو ساری عمر راہبہ ہوتی ہیں' شادی ہی نہیں کرتیں۔ انہوں نے سیکس (جنسیات) کو بڑا گھناؤنا کر کے بتایا' اس کا اثر دوسری طرف یہ پڑا کہ وہ سیکس (جنسیات) پوری طرح ان کے اعصاب پہ سوار ہو گئی۔

184 الصّٰفّٰت۔

جنسیات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے پیش کردہ حقائق اور آج قوم مسلم کی حالت

قرآنِ کریم ہمیشہ حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ اس نے یہ کہا کہ سیکس (جنسیات) ایسی گھناؤنی چیز نہیں ہے مگر اس کے حدود متعین ہیں جن میں اس نے اسے حلال اختلاط کہا ہے اور کہا ہے کہ یہ تو نسل انسانی کے آگے بڑھنے کا ذریعہ ہے اور نہایت ضروری چیز ہے تو یہ ایسی گھناؤنی چیز کیوں ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے لیے جب یہ جذبہ ساحل ناآشنا ہو جائے تو پھر واقعی یہ چیز حرام ہو جاتی ہے لیکن خود یہ جذبہ ایسا نہیں ہے جس کے نام سے ہی انسان کو گھن آنی شروع ہو جائے۔

عزیزانِ من! عیسائیت نے جنسیات کو بڑھا گھناؤنا کر کے بتایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو یہ کیفیت ہوگئی اور دوسری طرف ہمارے ہاں جو اس دور میں تفسیریں لکھی گئیں ان میں اربابِ شریعت اور فقہ کے مسائل آئے۔ اگر آپ دیکھیں تو حیران ہو جائیں کہ ان کتابوں میں کم از کم 75 فیصد جو مسائل ہیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی سلسلے کے ہوتے ہیں۔ عجیب قسم کے Extreme Ends (افراط و تفریط) کے اندر ہماری قوم چلی آ رہی ہے، تصوف میں جاتی ہے تو ترکِ دنیا اور ترکِ لذات ہے، شریعت کی طرف آتی ہے تو اس میں پوچھیے ہی نہیں کہ کیا کچھ تحریر ہے۔ اب یہ تفسیریں ہیں جو یہ کچھ انسان کو بتاتی ہے۔

اُخروی زندگی کے لوازمات کی نوعیت، اس زندگی جیسی نہیں ہوگی

جنت کے متعلق یہ کچھ سمجھنے یا طے کرنے کا سوال ہی نہیں کہ وہاں جنسیات کا بھی یہی سلسلہ ہوگا۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ وہاں اس سلسلے والی بات ہی نہیں ہے۔ وہ دنیا اس کے کوائف، اس دنیا کے تضمنات کو آج تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے، وہ دنیا کچھ اور ہوگی، وہ زندگی کچھ اور ہوگی، زندگی کے لوزمات کچھ اور ہونگے۔ اب اسے سمجھانے کے لیے قرآنِ کریم نے وہ چیزیں بیان کی ہیں جو انسانوں کو اور خاص طور پر اس مخاطب قوم کو بہت زیادہ پرآسائش اور مرغوب نظر آتی تھیں، قرآنِ کریم نے مثالوں کے ذریعے سے ان چیزوں کو سمجھایا ہے۔ یہ ہے سارا قصہ۔ لیکن یہاں یہ ہے کہ جہاں بھی جنت کے متعلق کوئی چیز آئی، انہوں نے اپنی تفسیروں میں اس کے متعلق وہ کچھ لکھا، آپ سے میں عرض کر رہا ہوں کہ میں انہیں بیان بھی نہیں کر سکتا۔

حور اور حورعین کے مفہوم کے برعکس صدیوں سے ہماری کوتاہ نظری کا نتیجہ

حور اور حورعین دو دو لفظ قرآن مجید میں آتے ہی۔ یہ جو الفاظ ہیں ان کے لیے پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان کا قرآنی مفہوم سمجھ لیجیے، ممکن ہے کہ پھر ان چیزوں کا موقعہ نہ آئے۔ ہمارے ہاں حوروں کے متعلق یہ چیزیں مسلمات کے طور پر چلی آتی ہیں کہ جنت کے اندر مومنوں کو جو بیویاں ملیں گی، وہ حوریں ہونگی۔ یہ جو عربی زبان کے اندر حور کا لفظ ہے، پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کے معنی ''نہایت پاکیزہ شفاف سیرت، جس میں کوئی دھبہ نہ ہو، بالکل شفاف اور صاف پاکیزہ'' کے ہوتے ہیں اور یہ لفظ مؤنث اور مذکر دونوں کے لیے آتا ہے۔ پاکیزہ سیرت،

شفاف سیرت وکردار کے مرداورعورت دونوں کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ یہ لفظ حور جمع کا صیغہ ہے مرداورعورت جو پاک شفاف سیرت کے ہونگے تو انہیں حور کہا جائے گا۔ یہ ہمارے ہاں کے جومستند لغت ہیں ان کے اندر بھی یہ چیزیں موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ لین (Lane) نے جو یہ انگریزی میں اس کا ترجمہ لکھا ہے وہ زیادہ بہتر سمجھ میں بات آنے والی ہوگی۔ وہ کہتا ہے کہ عربوں کے ہاں یہ لفظ Pure & Clean Intellect (صاف اور شفاف عقل) کے لیے بولا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عرب عقلِ فریب کار کے مقابلے میں اس چیز کو لاتے ہیں۔ ایک تو عقل فریب کار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے۔ یہ عقل عیار نہیں ہے۔ یہ تو نہایت پاکیزہ Pure & Clean عقل ہے اس لیے میں نے انگریزی کے لفظ استعمال کیے ہیں کہ اس کا جو لفظی ترجمہ ہے یا جن معنی میں عرب استعمال کرتے تھے وہ Pure & Clean Intellect یعنی نہایت پاکیزہ صاف شفاف عقل ہے۔ یہ ہیں عزیزانِ من! اس لفظ کے معنی۔ اور یہ مؤنث مذکر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے مردوں کے لیے بھی یہی لفظ حور آتا ہے یعنی حور عربوں کے ہاں کہیں گے تو حوریں عورتیں جنہیں کہتے ہیں وہ صرف وہی مراد نہیں ہوں گی پاکیزہ شفاف سیرت وکردار کے صاف عقل کے مالک جو مرد ہیں ان کے لیے بھی عربوں کے ہاں یہ لفظ حور استعمال ہوتا ہے اور اسی طرح کی پاکیزہ شفاف سیرت وکردار کی صاف عقل کی مالکہ عورتوں کے لیے بھی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس سے پہلے آپ نے یہ کبھی بھی نہ سنا ہو کہ مرد بھی حور ہوتے ہیں۔

حور اور حورعین کا لفظ مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے

حور کے ساتھ دوسرا لفظ عین آتا ہے۔ ہمارے ہاں ترجموں اور تفاسیر میں اسے بھی مؤنث ہی کہا جاتا ہے۔ ان کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بڑی بڑی سفید آنکھوں والیاں ہیں یہ جو "والیاں" ہیں بس اس پہ زور دیا جاتا ہے۔ لفظ حور کی طرح یہ لفظ بھی جمع کا صیغہ ہے اور مرد اور عورت دونوں کے لیے آتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں یہ چیز آئے گی خواہ وہ حور یا عین ہو اس میں پاکیزہ سیرت Pure & Clean Intellect صاف اور شفاف عقل کے اوصاف سے متصف افراد مرد وزن دونوں آئیں گے۔ اسے پھر ذہن نشین کیجیے کہ اس کے لیے مرد ہوں یا عورتیں عربی زبان کی رو سے دونوں کے لیے حور اور عین کا لفظ آئے گا۔ اب آپ اندازہ لگا لیجیے کہ قرآن حمید نے بات کیا کی ہے۔ وہ ایک معاشرے کا ذکر کرتا ہے جسے آپ جنتی معاشرہ کہتے ہیں۔ اس معاشرے کے اندر مرد بھی ہوتے ہیں عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ اس کا اندازہ یہ ہے کہ جہاں تو کوئی چیز ایسی ہے جو خالص قوت کی ہے مبارزت کی ہے کچھ جنگ کی ہے قتال کی ہے وہاں وہ مردوں کے صیغے لاتا ہے کہ وہ اس باب میں آگے آگے ہوتے ہیں۔ اگرچہ قاعدے کی رو سے اس کے اندر عورتیں بھی شامل ہیں۔ یہ قانون کا ایک بنیادی اصول ہے کہ انگریزی زبان میں جو Verbs (افعال) ہیں وہ تو مؤنث مذکر دونوں کے لیے ایک ہی آتے ہیں لیکن اس میں Pronouns (ضمائر) مختلف ہوتے ہیں۔ قانون کی بنیادی شرط یہ ہے۔

آپ کو ہر قانون کی کتاب میں لکھا ملے گا کہ اس کے اندر ضمیریں تو مذکر کی استعمال ہونگی لیکن وہ Law (قانون) عورت اور مرد

دونوں کو محیط ہوگا۔یعنی اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ یہ جو دوسرا شخص ہوتا ہے' اس کے لیے زبان کے اعتبار سے الگ الگ نہیں کہنا پڑتا۔عربی زبان میں تو جو Verbs (افعال) ہیں' ان میں بھی مذکر اور مؤنث کا فرق ہوتا ہے لیکن اصول اور قانون وہی ہے۔ آپ سارے قرآن حکیم میں دیکھیے بجز چند مقامات کے' جہاں بالتخصیص اسے مومنات کہنا پڑا ہے۔قرآن حکیم میں یَاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا آیا ہے۔ یہ مذکر کا صیغہ ہے۔سارے قرآن حکیم میں یَاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہے تو پھر کیا اگر اسے مردوں کے صیغے کے اعتبار سے کہا جائے تو پھر قرآن حکیم کے سارے احکام مردوں ہی کے لیے ہیں بجز ان دو چار آیتوں کے جہاں ساتھ مومنات آتا ہے؟ تو اسے یاد رکھیے یہ اصولی چیز تھی کہ قانون (Law) میں ضمیریں تو مذکر کی استعمال ہونگی لیکن وہ قانون مرد اور عورت دونوں کو محیط ہوگا۔

قرآن کریم عفت وعصمت کا تقاضا مرد اور عورت دونوں سے کرتا ہے

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جہاں ان دونوں مرد یا عورت میں سے کسی کی کوئی نمایاں خصوصیت بیان کرنا ہوتی ہے تو وہ اس قسم کے افعال یا ضمیریں لاتا ہے مثلاً یہ چیز کہ حیا' عفت ضروری ہے یہ ٹھیک ہے کہ مردوں کے لیے بھی وہ تقاضا کرتا ہے بلکہ وہ تقاضا تو پہلے مردوں کے متعلق کرتا ہے۔سورۃ النور میں جہاں پردے کے احکام آئے ہیں کہ باہر نکلیں تو ہمارے یہاں تو یہی ہے کہ عورتیں باہر نکلیں تو انہیں چاہیے کہ اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں اور نگاہیں نیچی رکھیں۔ وہ عورتوں کے متعلق ہیں۔قرآنِ کریم نے مومن مردوں کے متعلق پہلے کہا ہے کہ قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَیَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ(24:30) مردوں سے کہو کہ اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں۔اس کے معنی یہ نہیں ہوتا کہ چلیں تو ہم نگاہیں نیچی رکھ کر چلیں' وہ تو اسی وقت کوئی نہ کوئی Accident (حادثہ) ہو جائے۔اسکے معنی ہوتا ہے کہ باہر جائیں تو نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں۔ ویسے بھی ہر زبان میں محاورہ ہوتا ہے کہ ندامت سے نگاہیں جھک گئیں۔ وہ ضروری نہیں ہوتا کہ یونہی کیا ہو' 'کیندے نیں کہ بٹ بٹ تکدے اودیدیاں نال❶ ''یعنی یہ زبانوں کے محاورے ہوتے ہیں۔

حیا انسانیت کے جسم وجاں کا ایک لازوال زیور ہے

قرآن کریم نے کہا ہے کہ یَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ (24:30) یہ ٹھیک ہے کہ اس کے معنی نگاہیں نیچی رکھنا ہے۔جھکی ہوئی نگاہوں کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اپنے چہرے کی سچ مچ جو Physical Eyes (جسمانی آنکھیں) ہیں' چلو تو ان کو نیچے رکھو'اس کے معنی یہ ہیں کہ نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دو'ان میں حیا ہونی چاہیے۔ بات سے بات نکلتی ہے۔عربوں کے ہاں کیا پوچھتے ہو' جسے آپ حیات یعنی زندگی کہتے ہیں'اسی سے تو حیا ہے' چنانچہ اگر حیا نہیں ہے تو پھر زندگی انسان کی نہیں ہے۔آنکھوں کو نیچی رکھو' بیباک نہ ہونے دو' تو مومنین سے

---

❶ کہتے ہیں کہ ٹکٹکی باندھ کر دیدار بازی کرتے ہو۔

پہلے کہا ہے۔آ گے ہے کہ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (24:30)۔عورتوں کو بعد میں کہا ہے لیکن یہاں الگ الگ اس لیے کہا ہے کہ اگر ایک صیغہ استعمال میں لایا جاتا تو ہوسکتا تھا کہ یہی کہا جاتا کہ صاحب! یہ عورتوں سے ہی کہا گیا ہے مردوں سے نہیں کہا گیا قرآن کریم نے ایسے مقامات کے اوپر تخصیص کر دی۔حیا اس کے نزدیک انسان کی عصمت اور عفت کا وہ جذبہ ہے جس کا اظہار نگاہوں سے ہوتا ہے۔

آنکھیں انسان کی اندرونی کیفیت کی عکاس ہوتی ہیں

عزیزانِ من! بڑی چیزیں آتی ہیں۔بات اور طرف چلی جائے گی ورنہ میں یہ بتاؤں کہ یہ کرامات اور یہ جتنی چیزیں ہوتی ہیں جن کو آپ مسمریزم کہتے ہیں، بہت کچھ جو اس سائیکولوجی میں کیا جاتا ہے، وہ آنکھوں کے ذریعے ہوتا ہے، آنکھوں میں عجیب چیز خدا نے پیدا کی ہوئی ہے۔یہ جو چیز آنکھوں کی حیا ہے، آنکھیں دیکھنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس میں حیا ہے یا بیبا کی ہے۔قرآن حکیم نے اسی لیے حیا اور عفت کے لیے آنکھ کی تشبیہہ دی ہے۔پہلے تو میں یہ عرض کروں کہ میں نے بار بار تشبیہ کہا ہے۔یہ میں نے اپنی طرف سے نہیں کہا۔یہ لفظ ہی وہاں ہے کہ كَاَنَّهُنَّ (37:49) تشبیہ یہ ہے، مثال یوں دی جاسکتی ہے گویا یہ ساری چیزیں تشبیہاً ہیں، اس جنتی معاشرے کے اندر مثال کے طور پر بیان کیا ہے۔اب دیکھیے کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔کہا ہے کہ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ (37:48)۔عزیزانِ من! قرآن کریم نے اتنے بلیغ الفاظ ہیں کہ میں تو کہا کرتا ہوں کہ شعر کا ترجمہ نہیں ہوتا، وہ تو میں یہ کہوں گا کہ قرآن کریم کے الفاظ کا ترجمہ نہیں ہوسکتا، اور ہو ہی نہیں سکتا، مغرب کے عربی زبان کے جو بڑے بڑے فاضل انگریز ہیں، انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ قرآنِ کریم کا دنیا کی کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہوسکتا❶۔

قرآن حکیم کی تعلیم تو اس چیز کی متقاضی ہے کہ انسانی آنکھ کا گوشہ بھی بیباک نہ ہونے پائے

اب یہ دیکھیے، کہا ہے کہ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ (37:48)۔نگاہوں کا جھکانا ہی کچھ کم بات نہیں تھی، پوری آنکھ کے متعلق نہیں کہا، ''طرف'' کے معنی ہوتے ہیں ''گوشۂ چشم''۔آنکھ کا ہی جھکانا نہیں کہا یعنی اس کی شدت کی کیفیت کی انتہا بیان کی کہ آنکھ تو ایک طرف رہی، ان کا جو گوشۂ چشم بھی ہے، وہ بھی بیباک یا وا نہیں ہوتا، وہ دزدیدہ نگاہی سے بھی کام نہیں لیتے۔دیکھا پھر ہمارے ہاں یہ ''دزدیدہ نگاہ، نگاہِ نیم باز'' کی اصطلاحات کیسے آئی ہیں! یہ جو قرآنِ کریم کے الفاظ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ (37:48) میں آتے ہیں ان پہ غور کیجیے۔آنکھ نہیں کہا، آنکھ کا جو گوشہ ہے اس کا کہا ہے۔اس معاشرے کے اندر جو مرد اور عورتیں رہنے والے ہونگے ان کے حیا اور عفت وعصمت کے احساس کی کیفیت یہ ہوگی کہ آنکھ تو ایک طرف، ان کا گوشۂ چشم بھی بیباک نہیں ہوگا۔یہاں صرف ''عِيْنٌ'' (37:48) آیا ہے، دوسرے مقام

---

❶ مثلاً مشہور مستشرق ایچ۔اے۔آر۔گب (H.A.R. Gibb) اپنی کتاب Modern Trends in Islam کے 1945ء کے ایڈیشن میں لکھتا ہے کہ ''حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں ہوسکتا (ص 4)''۔

پہ آیا ہے کہ وَحُوْرٌ عِیْنٌ۔ کَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَکْنُوْنِ(56:22-23)۔حور اور عین دونوں ہی الفاظ آئے ہیں اور ''کَاَمْثَالِ''184 ئے جو الصّٰفّٰتِ۔ بات میں نے ابھی کہی تھی کہ یہاں کَاَنَّهُنَّ (37:49) آیا ہے۔''ک'' عربی زبان میں مثال کے لیے آتا ہے: گویا یوں سمجھو کہ ۔۔۔۔۔۔اور یہاں واضح کردیا کہ کَاَمْثَالِ(56:23)یعنی ہم اس چیز کی مثال دیتے ہیں' وہ سچ مچ کی چیز نہ سمجھ لیجیے کہ یہ عورتیں یا اس قسم کے مرد جو تمہارے ہاں کے ہیں' وہ دُرِّمکنون (محفوظ موتی) ہیں۔وہاں تو اس قسم کا تصور مثال سے سمجھایا جاسکتا ہے۔

مروّجہ ترجموں کے تحت عورت مرد کو اپنا زوج (ساتھی) سمجھتی ہی نہیں

اب یہ اور آگے بڑھے۔جب یہ جو حوریں تھیں' وہ عورتیں ہی گنائی گئیں تو پھر انہیں مردوں کی زوجہ بھی بنانا ضروری تھا۔میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ عربی زبان کے اندر ''زوج'' کا یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آتا۔ہمارے ہاں تو وہ بیوی زوجہ ہی ہوتی ہے' مرد کو تو زوج کہا ہی نہیں جاتا۔یعنی وہ عورت اس کو اپنا ساتھی سمجھتی ہی نہیں ہے' اسے زوج ہی نہیں کہتی' وہ تو میاں ہوتا ہے' اوپر اللہ میاں ہوتا ہے اور پھر نیچے ''کاکے دا ابا میاں ہوندا ہیگا'' [1] اللہ بھی میاں' یہ بھی میاں ہے۔مجازی خدا تو کہا جاتا ہے' مجازی بھی یونہی تکلف ہی ہے۔حقیقت میں اس خدا کے متعلق تو پتہ ہی نہیں ہوتا' خدا تو ہوتا ہی انسان ہے۔

یہ زوج کا لفظ عربی زبان میں آتا ہی ''رفیق'' کے لیے ہے' ساتھی کے لیے ہے' Companion (رفیق) کے لیے ہے' ازواج کہتے ہی Companions (رفقاء) کو ہیں۔قرآن حمید میں بیشتر مقامات میں یہ چیز آئی ہے یعنی مومن اور ان کے ساتھی۔اب یہاں وہ جو لفظ آیا ہے کہ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ(44:54)۔چلیے صاحب! لفظ زوجنا آگیا' اللہ ان کو دے' یہاں سے یہ زوجہ بن گئی اور یہ ساری عورتیں حور عین بن گئیں۔یہ جو عورتیں ہیں' ان سے انہوں نے زوج بننے کے لیے نکاح کرادیا تو صاحب! یہ ان کے نکاح میں عورتیں آگئیں۔

زوج کے قرآنی مفہوم کے تحت' معاشرتی طور پر' سیرت اور پاکیزگی کے مجسمے مرد اور عورت دونوں ہیں

قرآن کریم نے کہا ہی یہ ہے کہ یہ خود بھی اس قسم کے پاکیزہ سیرت' شفاف خصلت ہیں اور سیرت اور پاکیزگی کے مجسمے ان کے ساتھی بھی ہیں۔یعنی معاشرہ وہی ہے' جو یہ مخلوط معاشرہ ہے۔اس میں کیا ہی مخلوط ہے! کیا اب ہم اسے ہمارے جیسا معاشرہ کہیں گے؟ اس ہمارے معاشرے کے اندر تو اگرچہ ایک شخص بھی سیرت کی پاکیزگی کا حامل ہوتا ہے تو باقی سارا ماحول وہاں بدکردار ہوتا ہے۔قرآن کریم نے جنت کے متعلق یہ بتایا ہے کہ وہاں ان لوگوں کے ساتھی بھی انہی جیسے پاکیزہ سیرت کے لوگ ہونگے' پورے کا پورا معاشرہ ایسا ہوگا۔اس لیے وہ ازواج کا لفظ Companion (رفیق) کے معنی میں لایا ہے۔وہ اور ان کے ساتھی' جو سارا معاشرہ ہے' اس قسم کا پاکیزہ سیرت کا ہوگا۔میں نے عرض کیا ہے کہ ٹھیک ہے جنت میں جانے کے لیے عورتیں وہاں سے محروم نہیں کی گئیں۔یہ تو ان کے اس زمانے کی بنائی ہوئی' وضع

---

[1] منے کا باپ میاں ہوتا ہے۔

کردہ روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ معراج کی رات جب میں نے جہنم میں جھانک کر دیکھا تو وہاں عورتوں کی کثرت نظر آئی۔ الصّٰفّٰت 184

قرآنِ کریم نے تو دونوں کو دوش بدوش چلایا ہوا ہے' سارے قرآن کریم میں آپ دیکھ جایئے' عزیزانِ من! دونوں کے لیے وہ جنت اور مغفرت اور آسائشیں اور نعماء برابر ہیں۔ زندگی میں کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں عورت کو ایک قدم بھی پیچھے رکھا گیا ہو۔ یہ فرق تو ہمارے ہاں ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا' آج تو خیر اب ماڈرن ہو گئے ہیں' وہ بیوی ذرا آگے چلتی ہے' ورنہ ہمارے ہاں اس سے پہلے آپ نے دیکھا ہوگا میاں ہمیشہ آگے چل رہا ہوتا تھا اور بیوی پیچھے پیچھے ہوتی تھی اور وہ باتیں کرتے جا رہے تھے' اس کو جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنے خاوند کے ہمدوش چل سکے۔

قرآنی معاشرے میں پاکیزہ سیرت جوڑوں کی ایک قرآنی مثال

قرآن حکیم نے مرد اور عورت دونوں کو ہمدوش چلایا ہے۔ یہ Companions (رفقاء) ہیں اس معاشرے کے اندر' جنت کے اندر جسے آج ہم مرد اور عورت کہتے ہیں' بہر حال جسے قرآن حکیم مومن اور مومنات کہتا ہے ان دونوں کا ذکر ہے اور دونوں ہی کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ پاکیزہ سیرت ہونگے' Pure & Clear Intellect ہوں گے۔ لین نے اس کا بڑا خوبصورت ترجمہ کیا ہے' یہ عقلِ فریب کار نہیں ہے۔ کہا ہے کہ وہ Pure & Clear Intellect [1] کے حامل ہونگے۔ اور جو مثال دی ہے' وہ بڑی ہی برگزیدہ ہے۔ یوں سمجھیے کہ پاکیزگی سیرت کی جو مثال قرآن حکیم نے دی ہے' کہا ہے کہ یوں سمجھو کہ كَاَنَّهُنَّ بَيۡضٌ مَّكۡنُوۡنٌ (37:49) جیسے صدف کے اندر سیپی کے اندر' پاکیزہ شفاف موتی ہو۔ سیپ اس سمندر کے اندر ہوتی ہے جہاں موجوں کے تھپیڑے ایک سیکنڈ کے لیے چین نہیں لینے دیتے' نہایت کڑوا تلخ کھاری پانی' خس و خاشاک' کثافتیں غلاظتیں' یہ سب کچھ وہاں ہوتا ہے میں نے جیسے کہا ہے کہ موجوں کے ہنگامے بھی ہوتے ہیں' تلاطم خیزیاں بھی اس کے اندر ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے اندر جو سیپ ہوتی ہے' اس پر وہ سب چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں' اس کے اندر جو موتی ہوتا ہے اس پہ خارج کی کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی۔ بات ہوئی پاکیزگی سیرت کی کہ اس قسم کے ماحول میں بھی رہتے ہوئے جو سمندر جیسا تلاطم خیز بھی کیوں نہ ہو' نجاستیں اور غلاظتیں بھی اس کے اندر بھری ہوئی کیوں نہ ہوں' اس پر ان چیزوں کا' فضا کا اور اس قسم کی ہوا کا اثر بھی نہ ہو۔

عزیزانِ من! اب تو ہوا بھی صاف نہیں ملتی۔ اس میں یہ کہا ہے کہ ان چیزوں کا اثر انسان کے جسم کے اوپر تو ہوگا' اس کا یہ جسم سیپ کی مانند ہے' اس کے اندر جوہرِ خودی ہے' جسے انسانیت کہتے ہیں' وہ اس سے بالکل اسی طرح سے محفوظ ہوتا ہے جیسے سیپ کے اندر موتی ہوتا ہے۔

نفسِ انسانی کی اہمیت کے متعلق علامہ اقبالؒ کا تصورِ خودی

یہ جو سیپ کی تشبیہ ہے' بڑی غور طلب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلِ انسان تو وہ' انسانی خودی (Self, Personality)' نفس ہے۔

---

[1] Lane, Edward William (1986)- Arabic- English Lexicon (in Eight parts). Lebanon: Beirat, librairie du liban, p.666.

یہ باقی تو سب کچھ ''میرا'' ہوتا ہے: میرا جسم، میری آنکھ، میرے ہاتھ، حتی کہ میری جان۔ یہ ''میری ہے''۔ یہ کس کی ہوئی جس کو آپ 184الصّٰفّٰت ''میری ہے'' کہتے ہیں؟ وہ ''میں'' ہوتا ہے، یہ ''میں'' ہے جو اصل ہے، جسے قرآن کریم نے نفس انسانی کہا ہے، جسے آج سائیکولوجی میں Personality یا Self کہا جاتا ہے جسے اقبالؒ (1877-1938ء) خودی سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہ بڑی اہم چیز ہے کہ جس طرح سے موتی کی پرورش، اور اس کی پاکیزگی کے لیے صدف کا نہایت مستحکم، محکم، مضبوط ہونا ضروری ہے، ایسا مستحکم کہ وہ باہر کے اثرات کو اندر آنے ہی نہ دے۔ یہ مثال بڑی برجستہ ہے، یہ انسان کے طبعی (Physical) جسم، پیکر اور اس کے اندر جو سیلف (شخصیت) کا موتی ہے، اس کی تشبیہ ہے۔ اور اقبالؒ (1877-1938ء) کے کلام میں تو پوچھیے ہی نہیں کہ کتنا کچھ ہے۔ ان کے فارسی اشعار کے دو مصرعے [1] یوں ہیں:

یا رب درونِ سینہ دل باخبر بدہ

اور

با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ
(زبورِ عجم: دعا)

اے پروردگار! اس قسم کا قلبِ سلیم دے کہ جس طرح سے سیپ کے اندر موتی ہو کہ وہ باہر موجوں کے تھپیڑے کھاتی رہے اور اندر وہ موتی پرسکون ہو، اس کے اوپر اضطراب کا شائبہ تک نہ ہو۔ سیپ کے متعلق یہ مشہور ہے خواہ یہ چیز افسانہ ہی کیوں نہ ہو لیکن تشبیہاً بڑی عمدہ چیز ہے کہ موتی کس طرح سے بنتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ابرِ نیسانِ بہار، یہ بہار کے موسم میں ایک بادل آتا ہے، اس میں سے ایک بوند ٹپکتی ہے، سیپ اپنا منہ کھول دیتی ہے، وہ بونداس کے اندر ٹپکتی ہے تو وہ اپنے آپ کو بند کر لیتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد اس سیپ کے اندر وہ جو پانی کا ایک قطرہ ہوتا ہے، وہ آہستہ آہستہ Develop ہو کر، نشوونما پا کر، پختگی حاصل کر کے، موتی بن جاتا ہے۔ یہ عام چیز ہے۔ یہ جو تشبیہ ہے، یہ بڑی عمدہ تشبیہ ہے، یہ کہنے کے لیے کہ انسانی جسم کی بڑی ضرورت ہے کہ یہ تندرست ہو، توانا ہو، صاف ستھرا ہو، پاکیزہ ہو، یہ مقصود بالذات نہیں ہے، سیپ کا ایسا ہونا بھی مقصود بالذات نہیں، اس موتی کی پرورش کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان کی جو طبعی زندگی ہے وہ ایسی ہونی چاہیے تاکہ اس کے اندر جو انسانی خودی یا ذات یا سیلف کا موتی ہے، وہ نشوونما پا کر اسی طرح سے پاکیزہ و مستحکم ہو۔ یہ جو تشبیہ ہے، یہ اقبالؒ (1877-1938ء) کے ہاں شروع سے آخر تک ملتی ہے، سمجھایا ہی اسی طرح سے جا سکتا ہے:

---

[1] زبورِ عجم میں ''دعا'' کے عنوان سے علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے پہلے شعر کے پہلے مصرع اور چوتھے شعر کے دوسرے مصرع کو اس طرح دیا ہے۔ اس کا پہلا شعر یوں ہے:

یا رب درون سینہ دلِ باخبر بدہ   در بادہ نشہ را نگرم، آں نظر بدہ

(یا رب! میرے سینے میں باخبر دل عطا کر۔ مجھے وہ نظر دے، جس سے کہ میں شراب کے اندر نشہ کو دیکھ سکوں)۔

اس کا چوتھا شعر یوں ہے: سازی اگر حریف یم بیکراں مرا   با اضطرابِ موج، سکونِ گہر بدہ

(اگر تو مجھے بے کنار سمندر کا مدمقابل بنائے تو جس طرح موج کی بے قراری میں موتی کا سکوں پوشیدہ ہوتا ہے، مجھے بھی اضطراب کے ساتھ سکون عطا فرما)۔

الصّٰفّٰت184

زندگانی ہے صدف' قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خودنگر و خود گرو خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تُو موت سے بھی مر نہ سکے
(اقبالؒ:ضربِ کلیم)

قرآنِ حکیم کی تعلیم کے ماحصل کی ایک لازوال مثال

موتی جب اس کے اندر پختہ ہوجاتا ہے تو وہ اتناHardہوتا ہے' اتنا سخت ہوتا ہے' کہ توڑنے سے ٹوٹتا نہیں ہے۔ یہ پانی کا قطرہ بن کر اتنا سخت ہوجاتا ہے۔ دین یہ ہے' عزیزانِ من! کہ وہ جو فطرت کی طرف سے Undeveloped Form (غیر نشوونما حالت) کے اندر' پانی کے قطرے کی شکل میں انسان کو وہ Self یا خودی ملی ہے' وہ اس طبعی زندگی کے صدف کے اندر' آہستہ آہستہ نشوونما پاتی ہوئی موتی بن جائے۔ موتی بن جائے گا تو صدف خود ٹوٹ جائے گی اور یہ جو موتی ہے یہ اس کے بعد اس بازارِ مصر میں چلا جائے گا جہاں یوسفؑ کی طرح اس کے بڑے بڑے خریدار آئیں گے۔ جسے ہم اُخروی زندگی کہتے ہیں: یہ ہے وہ

زندگانی ہے صدف' قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

قران کریم نے کہا ہے کہ کَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ(37:49) کہا ہے کہ مثال کے طور پر یوں سمجھیے جیسے صدف کے اندر پاکیزہ موتی ہوتا ہے۔ پاکیزہ سیرت انسانوں کی مثال دی جارہی ہے' مرد عورت دنوں اس میں شامل ہیں۔قرآن حکیم میں حور اور عین کے الفاظ دنوں کے لیے آئے ہیں۔اس سے زیادہ' عزیزانِ من! خوبصورت بلیغ شاعری نہیں ہوسکتی اور پوچھو شعر کی داد دینے والوں سے بھی کہ اس سے بہتر شاعری کوئی ہوسکتی ہے۔ یہ میں حسنِ اسلوب کی بنا پہ کہتا ہوں ورنہ قرآن حمید تو شاعری نہیں ہے۔قرآنِ مجید کیا مثالیں دیتا چلا جاتا ہے' کیا چیز اس نے کہی تھی! اور اس کے بعد آپ تفسیریں دیکھیے۔ ان کے اندر ان حوروں کی جو تفصیلات دی گئی ہیں' وہ اس قسم کی مخلوط مجلس میں ناقابلِ بیان ہیں۔ آپ قرآن مجید تک رہیے کہ وہ کیا کہتا ہے' ان تفسیروں کو جانے دیجیے۔ اس لیے کہ آج یہ باتیں بھی' بہر حال قرآن مجید کی آیتیں سامنے آتی ہیں' مجھے سمجھانا ہوتا ہے' اس کے الفاظ میں سمجھاتا ہوں' ورنہ بات آج ہماری سمجھ میں مشکل سے آتی ہے' اس لیے کہ وہ رونے والا[1] یہ تو رو گیا ہے کہ

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877ء) کی طرف ہے۔

184الصّٰفّٰت۔

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج، دیکھ چکا صدف صدف

''تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں ہے'' تو جب ہمارے اس محیط میں گوہر زندگی کہیں نہیں تو ان مثالوں سے بھی ہم کیا بات سمجھیں گے۔

اہلِ جنت کے درمیان نشستوں کی ترتیب اور باہمی باتیں

عزیزانِ من! بات ہورہی تھی جس میں جنت کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ باہمی مساوات کا نقشہ کھینچا تھا۔ مساوات کا نقشہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو نشستیں رکھی ہیں، وہ یہ ہیں کہ ''سرر''❶ کے اندر، تختوں کے اوپر، بیٹھے ہوئے ہیں، بیٹھنے کی ایسی خوبصورت چیز ہے جس میں انسان کو سرور آجائے۔ اس میں قرآن کریم نے نشستیں آگے پیچھے نہیں رکھی ہیں، نشستیں ایسی بتائی ہیں کہ ایک دوسرے کا منہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو۔ اس معاشرے میں مساوات کی یہ انتہا ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ ہر ایک کے حصے میں وہی تخت آئے گا بلکہ نشستوں کی ترتیب اس قسم کی ہوگی کہ یہ نہیں ہوگا کہ ایک آگے ہو اور دوسرا اس کے پیچھے بیٹھا ہوا ہو، ایک دوسرے کے بالمقابل ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہونگے۔ کہا ہے کہ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ(37:50)۔ آپ نے جہنم کے اندر، اہل دوزخ کے لیڈروں کے اور عوام کے، مذہبی پیشواؤں کے اور ان کے متبعین کے، اہل طریقت کے اور ان کے مریدوں کے مکالمے تو سن لیے تھے، متعدد بار وہ آیات ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ اب ذرا جنت میں یہ بات سنیے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر باہمی باتیں کریں گے۔ ایک دوسرے سے پوچھے گا کہ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ(37:51) ایک کہے گا کہ یار! میرا وہاں ایک دوست ہوتا تھا، ایک ساتھی ہوتا تھا، وہ میرے بڑا ہی قریبی بنتا تھا، وہ جنت میں کہیں نظر نہیں آیا۔ یہ ''قرین'' کی بات ہے۔ عزیزانِ من! ساتھی بناتے وقت سوچ لیجیے۔

قرآن حکیم کے اندر بیان میں ''تشبیہ'' کے بعد ''گریز'' کا پہلو

کہا ہے کہ يَقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ(37:52) وہ ہمیشہ مجھ سے بات کیا کرتا تھا کہ کیا تو بھی ان لوگوں کی باتوں کو سچا مانتا

---

❶ یہ(15:47) کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں ''سرورٌ'' کا لفظ تختوں کے لیے آیا ہے جن پر بیٹھتے ہیں۔ اس کا واحد ''سریرٌ'' ہوتا ہے۔ اِسرارٌ راز کی باتیں کرنا، دوسروں سے چھپا کر خفیہ بات کرنا(47:26) میں آیا ہے۔ السر جو بات دل میں چھپائی جائے۔ السرورٌ اس خوشی کو کہتے ہیں جو دل ہی دل میں پوشیدہ رہے اور الحبو راس خوشی کے لیے آتا ہے جس کے اثرات چہرے پر نمایاں ہوجائیں۔ (دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن (جلد دوم)، ادارۂ طلوع اسلام، لاہور، 1960ء ص ص 868 تا869۔

ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اَئِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيۡنُوۡنَ (37:53)۔انسان کے ہرعمل کا نتیجہ سامنے آ کر رہے گا' یہاں نہیں تو الصّٰفّٰتِ 184
اگلی زندگی میں آئے گا' اور وہ ''ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ یہ تم کیا کہتے رہتے ہو کہ ہم مرجائیں گے' مٹ جائیں گے' ہڈیوں کا ڈھانچا رہ جائیں گے۔ پھر دوبارہ زندہ ہونگے' پھر مکافاتِ عمل ہوگا' پھر ان کا نتیجہ سامنے آئے گا''۔ کہا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ میرے ساتھ جھگڑا کرتا تھا' آج وہ نظر نہیں آتا۔ کہا ہے کہ قَالَ هَلۡ اَنۡتُمۡ مُّطَّلِعُوۡنَ (37:54) دوسرا اس سے کہے گا کہ اس کو دیکھنا چاہتے ہو کہ وہ بھی آ گیا ہے یا نہیں آیا تو ذرا ادھر جہنم کی طرف جھانک کر تو دیکھو۔

عزیزانِ من! شاعری میں' قصیدے میں' دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تشبیہ ہوتی ہے اور دوسرا گریز ہوتا ہے۔ پہلے اشعار اس میں ہوتے ہیں' وہ عام مناظر کے ہوتے ہیں' پتہ نہیں چلتا کہ آگے چل کر کیا ہوگا اور اسی میں نکلتے ہوئے گریز ہوتا ہے' آگے چل کر پھر وہ ایک شعر آتا ہے جس میں قصیدے کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ یہ قرآن حکیم کا جو انداز تھا کہ جنت کی باتیں ہو رہی ہیں' اب اس میں Abruptly (یک لخت) اگر جہنم کی بات آ جائے تو وہ جو اسلوب بیان کی بلاغت ہے وہ اس میں نہیں رہتی۔ اب یہاں کس انداز سے قرآن حکیم جہنم لا رہا ہے' یہ دیکھیے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ میرا ایک دوست تھا' وہ کہا کرتا تھا کہ یہ قیامت و یامت کچھ نہیں ہے' ہم نہیں اٹھیں گے' آج وہ نظر نہیں آتا' کیا وہ بات سچ مچ ہی تو نہیں ہوگئی؟ دوسرا کہتا ہے کہ ٹھیک ہے' تمہیں نظر نہیں آتا' آ ؤ! ذرا جھانک کر دیکھو۔ یعنی اب جھانک کر دیکھو۔ قرآن حکیم جہنم کی بات کر رہا ہے' گریز ملاحظہ فرمائیے کہ کیسی خوبصورت بات ہے کہ ذرا جھانک کر دیکھو۔

مکافاتِ عمل ہر فرد کا ٹھکانا متعین کر دے گا

کہا ہے کہ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیۡ سَوَآءِ الۡجَحِيۡمِ (37:55)۔ اس نے اس طرف جھانکا دیکھا کہ وہ بالکل عین وسط میں جہنم کے لٹکا ہوا ہے: ''ہت تیرے کی''۔ جھانک کر دیکھا ہے اور دکھا بھی دیا ہے کہ وہ وہاں ہے۔ تو یہ جو لوگ' عزیزانِ من! ایسی بحثیں کرنے والے ہوں کہ صاحب! کہاں کا اٹھنا' کہاں کی جنت' کہاں کا جہنم' کہاں کا مکافاتِ عمل' کہاں کی آخرت کی زندگی' ان سے بچ کر رہا کرو۔ اس لیے کہ قَالَ تَاللّٰهِ اِنۡ كِدۡتَّ لَتُرۡدِيۡنِ (37:56) کہا ہے کہ یہ خدا کا گواہ ہے' یہ اپنے اس دوست سے کہہ رہے ہیں۔ اس نے یہ کہا ہوگا کہ سلام علیکم' یار کہاں ہو تم' ہمیں بھی اپنے ڈبے میں جگہ دو' ہم تو یہاں مر گئے حبس کے مارے' اس نے کہا ہے کہ ستیا ناس تیرا' تُو نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تُو مجھے بھی (اپنے ساتھ) لے ڈوبا تھا۔ وَلَوۡلَا نِعۡمَةُ رَبِّیۡ لَكُنۡتُ مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ (37:57) اگر میرے حال پہ خدا کی نوازش نہ ہوتی اور میں سیدھی راہ اختیار نہ کر لیتا تو میں بھی تیرے ساتھ وہیں ہوتا' تُو تو آپ ڈوبا تھا' تُو ہم کو بھی لے کر ڈوبنے والا تھا' مجھ پہ خدا کی نعمت ہوئی کہ بچ گیا۔ کہا ہے کہ اَفَمَا نَحۡنُ بِمَيِّتِيۡنَ ۔ اِلَّا مَوۡتَتَنَا الۡاُوۡلٰى وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ

جوموت آنی تھی وہ آچکی ہمیں مرنا نہیں ہوگا' اللہ کا شکر ہے کہ اب ہمیں مرنا نہیں ہوگا' جوموت آنی تھی وہ آچکی (37:58-59)۔اب آپ یہ واقعہ نہیں دیکھ رہے ہو کہ ہم کہاں ہیں' اللہ کا شکر ہے کہ اب ہمیں مرنا نہیں ہوگا' جوموت آنی تھی وہ آچکی اور نہ ہی اب عذاب دیا جائے گا۔اس سے اندازہ لگاؤ جو ہم کہہ رہے تھے کہ اس کے بعد ایک جنت کی زندگی ہے اور جنت کی زندگی کے متعلق یہاں دو باتیں کہیں۔

عزیزانِ من! انگریزی میں وہ جو دو الفاظ ہیں' میں نے پچھلے درس میں غالباً بتایا تھا۔ایک تو Survival (بقا) تھا۔ یورپ کے مادہ پرست فلاسفرز اور سائیکولوجسٹ آہستہ آہستہ ریسرچ کرتے کرتے پہلے تو اس پہ پہنچے کہ Survival یعنی مرنے کے بعد زندگی تو ہے' اب ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کیسی ہے' کتنی ہے۔ اب ان کے ہاں جو Latest (جدید ترین) کتابیں آ رہی ہیں ان میں Immortality (حیاتِ ابدی) ہے کہ وہ زندگی ہے' وہ حیاتِ ابدی ہے' وہ اس پہ پہنچ رہے ہیں۔ یہ چیز ہے جو قرآن مجید نے کہی تھی کہ وہ موت جو وہاں آئی تھی' اس کے بعد جو ہم آئے ہیں اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰی (37:59) وہی پہلی موت تو موت ہے' اس کے بعد اب موت نہیں ہے۔ وہ بچپن میں مائیں کانوں میں جو بول ڈالا کرتی تھیں اور کیا ہی وہ چھوٹے چھوٹے بول ہوتے تھے: ''اللہ میاں مارے گا' مار کے جگائے گا' وت فیر نا مارے گا'' وہ قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے تھے۔ پھر اس کے بعد موت نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد موت کیا ہے! بہر حال یہ تو بات وہاں جا کر دیکھیں گے۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں نجات کی بجائے فوز کا تصور دیا ہے

قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ پھر یہ سوچ رکھو کہ اب اس کے بعد موت نہیں ہے اور یہ بھی نہیں ہے کہ اس کے بعد ہمیں کوئی عذاب دیا جائے گا۔قرآنِ کریم میں لفظ فوز (Accomplishment) آیا ہے۔کہا ہے کہ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (37:60)۔میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم میں نجات (Salvation) کا تصور نہیں ہے' فوز کا ہے۔نجات (Salvation) کے معنی ہیں کہ کسی عذاب میں انسان مبتلا ہو اور اس سے چھٹکارا ہو جائے۔ یہ تو کوئی Gain (فائدہ) نہیں ہے' یہ تو کمائی کمانا نہیں ہے' کچھ حاصل کرنا نہیں ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ صبح بخار ہوا' اس کے بعد دوائی دی' شام کو بخار اتر گیا۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جیسے آپ صبح' بخار سے پہلے' تھے ویسے ہی ہو گئے ہیں' اس میں حاصل کچھ نہیں ہوا۔ساری دنیا کے مذاہب کے اندر نجات (Salvation) کا تصور ہی یہ ہے کہ انسان اچھا بھلا تھا' بغیر گناہ کے تھا' یہاں آیا' اس کے ساتھ گناہ کی آلودگیاں ہوئیں' اسکے بعد خدا نے اس کو بھٹی پہ چڑھایا' وہاں دھوبی اور جہنم میں بھیجا' صاف ستھرا کر کے پھر باہر نکال دیا۔ یہ ہوا کیا؟ یعنی یہ اتنا لمبا چوڑا چکر' اتنا بکھیڑا' یہ سب کچھ کہ اسکو پیدا کرنا' دنیا میں سے اس کو گزارنا' پھر زندہ کرنا'

بھٹی پہ چڑھانا، جہنم میں بھیجنا، پھر کیا ہوا؟ کہ جی! جیسا یہ پہلے تھا، ویسا ہو گیا (As you were[1]) ہو گیا ''وڈا کم کیتا''[2]! قرآن حکیم نے، عزیزانِ من! اسے فوز کہا ہے، یہ Achievement (کامیابی اور کامرانی) ہے، یہ Accomplishment (کامرانی) ہے، یہ کچھ حاصل ہونا ہے، یہ پہلے جیسا رہنا نہیں ہے۔ یہ فوز بھی فوز العظیم ہے۔ اور کہا ہے کہ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ (37:61) یہ وہ Achievement (کامیابی اور کامرانی) ہے، جس کے لیے کام کرنے والوں کو کام کرنا چاہیے۔ اب آپ نے دیکھا کہ جنت کن کے لیے ہے۔ کام کرنے والوں کو اس کے لیے کام کرنا چاہیے، اس سے کچھ حاصل ہوتا ہے، اس میں As you were (جیسے پہلے تھے) نہیں ہوتا۔

مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں جہنم کی روداد

اگلی آیت ہے کہ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ (37:62)۔ اب جہنم آ گیا۔ کپکپا دینے والی بات آ گئی، عزیزانِ من! یہاں بیٹھے ہوئے بھی غور کیجیے تو واقعی کپکپی آ جاتی ہے اور پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو رزق کریم کہا ہے، وہ رزق جس میں تمہاری تکریم، عزت، عظمت برقرار رہے گی: روٹی بھی ملے اور عزتِ نفس بھی ہو۔ اس کے لیے میں نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ کہا ہے کہ تم تو ہمارے مہان ہو گے - مہمان کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ نُزُلًا (37:62) کہا ہے کہ یہ جو خدا کی مہمانی ہے یہ بہتر ہے یا شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ (37:62) بہتر ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ متعدد مقامات پہ آیا ہے۔ یہ سب چیزیں تشبیہاً ہیں۔ جو زقوم ہے اس کے لیے دیکھیے کہ ویسے تو وہاں صحرا کے اندر یہ جسے ہم تھوہر کہتے ہیں، اس تھوہر میں بھی ایک ناگ پھنی ہوتا ہے۔ یہ وہ ہے جس کے پتے ایسے ہوتے ہیں جیسے سانپ کے پھن ہوتے ہیں۔ یہ اس قسم کی جو تھوہر ہوتی ہے، وہ عرب اس کو زقوم کہتے تھے یعنی بدترین زہر آلود قسم کا ایک پودا جس کی شکل ہی سانپ جیسی ہو، اسے کوئی بھی نہیں کھاتا تھا، کہیں کوئی چکھ بھی لے تو وہ اتنا کڑوا ہوتا تھا۔ اس سے عربوں نے اس لفظ زَقُّوم سے وہ معنی لیے کہ ہر وہ شے جو وبالِ جان بن جائے۔ اب اس کے معنی یوں ہو گئے۔ اب دیکھیے گا کہ وہاں جو کچھ ملے گا اسے مثالوں کے ذریعے کیا سمجھایا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ وبالِ جان بن جائے گا۔ بات بتا دی کہ یہ کن کے لیے ہے۔ کہا ہے یہ کہ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ (37:63)۔ یاد رکھو! ظلم و ستم سے حاصل کردہ رزق انسان کے لیے عذاب بن جایا کرتا ہے، ظلم ہی جرم عظیم ہے۔

قرآن کریم کے نزدیک سب سے بڑا جرم سلب ونہب اور استحصال ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم کی بارگاہ کے اندر، دوسرے کا سلب ونہب اور استحصال، غصب، زیادتی، استبداد، یہ ہے ظلم جس کے لیے یہ

---

❶ یہ انگریزی کا بڑا ہی مشہور جملہ ہے کہ موت کیا ہے؟ کہا کہ جی! Death is only to be what you were before your birth.

❷ کیا خاک بڑا کام کیا!

سب کچھ ہے۔ کہتا ہے کہ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ (37:64) یہ نہ سمجھو کہ ہم یہاں کے کسی درخت کی بات کر رہے ہیں یہ درخت، وہ شجر ہے جس کی جڑیں جہنم کی بنیادوں میں سے اُبھر کر اوپر آئیں گی یہ ان میں سے اگتا ہے۔ اسے جہنم کی آگ سمجھ لیجیے۔ اس آگ کے اندر یہ اس قسم کا شجر ہے، آپ سوچ لیجیے کہ یہ کیا ہے اور پھر یہاں جحیم ہی کہا ہے۔

جحیم کا قرآنی مفہوم

وہ جحیم تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ ہر وہ مقام ہے جہاں کسی کی نشوونما رک جائے، جہاں پانی کی روانی بند ہو جائے۔ زندگی حرکت اور حرارت کا نام ہے، آگے بڑھنے کا نام ہے، چلتے چلے جانے کا نام ہے، ارتقا کا نام ہے، یہ Evolution (ارتقا) کی Stages (منازل) طے کرنے کا نام ہے، بڑھتے چلے جانے کا نام ہے۔ جہاں کہیں کوئی رک گیا، وہی جحیم ہے، وہی جہنم ہے۔ اس دنیا کے اندر، جہاں جن قوموں کی زندگیاں، کسی مقام پہ آ کر ٹھہر جائیں، رک جائیں، آگے نہ بڑھیں، وہ ان کے لیے جہنم ہے، جحیم ہے۔ اسی طرح سے آگے جانے کے بعد، جنت تو آگے چلنے کا مقام ہے، جہاں رک جانے والی بات ہے، وہ جحیم ہے۔ کہا ہے کہ یہ درخت یا فصلیں یا اجناس یا پھل تو نشوونما دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ جو درخت جحیم سے اُگے، اس نے نشوونما کیا دینی ہے، وہ تو وبالِ جان بن گیا۔ یہاں وہ ہے۔ کہا ہے کہ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ (37:65) یہ جو اس کے پتے ہیں، یہ اس قسم کے ہونگے۔ ہمارے ہاں رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ کے ترجمے کیے جاتے ہیں ''شیطان کے سروں جیسے'' اور پھر ہمارے ہاں کے محقق وہ ہیں جو تحقیق کرتے ہیں کہ شیطان کا سر کیا ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ شیطانوں کے سروں جیسے اس کے خوشے ہونگے۔ عربی زبان میں شیطان پھنیر سانپ (Cobra) کو کہتے ہیں۔ وہ جو میں نے کہا ہے کہ یہ ناگ پھنی ہے، اس کو ناگ پھنی تھوہر کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر بتایا ہے کہ جہنم کے بیچ میں سے اس قسم کا شجر اگے گا، وہ وبالِ جان ہوگا۔ اب یہ اس قسم کی چیز ہے کہ وہ درخت تو نظر آئے گا لیکن وہ وبالِ جان ہو، اس کی مثال سوچیے۔

ہمیں جہنم کی بیان کردہ ان مثالوں کو پہنچاننا اور اس زندگی پر منطبق کر کے دیکھنا ہے کہ ہم کہاں ہیں

عزیزانِ من! اب وہاں کی زندگی چھوڑ کر یہاں آ جائیے اور جس رزق سے موت اچھی ہوتی ہے، اس کا تذکرہ سن لیجیے۔ کہا ہے کہ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ (37:66) یہ ٹھیک ہے، اس سے پیٹ تو بھرتا جائے گا، مگر اس سے نشوونما نہیں ہو سکے گی۔ دولت کے تو انبار ہو نگے، تجوریاں بھری ہوئی ہونگی، بڑے بڑے Bank Balance ہو نگے، بڑا افراوانی سے ملا ہوا ہوتا ہے مگر وہ ہوگا کس قسم کا؟ اس کے لیے میں نے عرض کیا ہے کہ اب آپ اپنی دنیا کی طرف آ جائیے، قیامتِ موجود تو ہے۔ آپ کو یاد ہے میں نے بتایا تھا کہ قرآن حکیم اسی دنیا سے جنت اور جہنم کو شروع کر دیتا ہے، عزیزانِ من! انتظار نہیں دینا چاہتا۔ وہی درخت ہے جس کے متعلق کہا تھا

کہ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ(17:60)۔اس شجر کو ملعون کہا ہے۔لعنت کے معنی ہوتا ہے'' ہر قسم کی نعمت' آسائش' آسودگی ونشوونما کے سامان سے محروم ہوجانا''۔شجر کہہ کر قرآن حکیم رزق کی طرف تو آتا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں تو ہوں گی' اب اس کے متعلق پہلے تو یہ کہا تھا کہ پیٹ ہی بھرے گا' اب اسکو ملعون کہا ہے' یعنی ہر قسم کی نشوونما سے محرومی ہوگی۔کہا ہے کہ اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ۔ طَعَامُ الْاَثِيْمِ (44:43-44)۔الْاَثِيْم کے معنی آپ کو پتہ ہے:'' تھک جانا' وامانده ہوجانا' کمزور ہوجانا' جس کے اندر چلنے کی سکت نہ رہے'' یہ وہی جحیم کی صورت ہے۔یہ کہا ہے کہ یہ رزق طَعَامُ الْاَثِيْمِ(44:44) ہے۔رزق سے تو انسان میں توانائی آتی ہے' وہ چلنے کے قابل ہوتا ہے مگر یہ وہ رزق ہے جس میں جو توانائی انسانیت کی ہوتی ہے' وہ بھی تھکے ہوئے وامانده انسان کی ہوجاتی ہے' اس کے ساتھ چلنے کی ہمت ہی نہیں رہتی۔یہ کس کے لیے ہے؟ دو تین آیات بیچ میں ہیں۔کہا ہے کہ یہ سامنے لایا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا' غور سے سنیے' عزیزانِ من! کن کا ذکر ہورہا ہے۔یہ جو شجرۃ الزقوم ہے' یہ شجر ملعون ہے۔کہا ہے کہ اس سے کہا جائے کہ ذُقْ(44:49) کھا اسے۔

قرآنی اقدار کو اپنانے سے حاصل ہونے والی عزت اور فرعونیت کے بل بوتے پر حاصل کردہ عزت میں بنیادی فرق

کہا ہے کہ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (44:49) تُو دنیا کے اندر بڑا قوت والا' بڑا عزت والا بنا پھرتا تھا' اب اس شجرۃ الزقوم کو کھا۔یہ عزیز کریم کو دیا جارہا ہے۔ایک عزت اور کرامت تو قرآنِ کریم کی اقدار سے حاصل ہوتی ہے' ایک فرعونیت سے حاصل ہوتی ہے۔قرآن کریم اس کا کیا نقشہ کھینچتا ہے! درمیان کی آیتوں میں یہ چیز ہے کہ کھولتا ہوا پانی ساتھ دیا جائے گا۔میں ابھی اس کی طرف بھی آتا ہوں۔

شجر الزقوم کے پھل کے ساتھ کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا

یہ ہوگا شجرۃ الزقوم یعنی ملعون اور اثیم قسم کی یہ چیز پیٹ بھرنے کے لیے ہوگی۔پانی کے لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ پانی میں زندگی ہے لیکن وہ تو ٹھنڈے پانی میں زندگی ہوتی ہے' یہ کھولتا ہوا پانی کسی پودے کے اوپر ڈال دیجیے' وہ اسی وقت مرجھا جاتا ہے' انسان کو تباہ کردیتا ہے' ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔کہا ہے کہ یہ ساتھ ہوگا اور قرآن کریم کا یہ انداز دیکھیے کہ ذُقْ کہا جائے گا۔کھا اب اسے کیونکہ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (44:49) تو بہت بڑا بنا پھرتا تھا۔یہ کیوں کیا؟ یہ اس دنیا کی بات ہے یا نہیں؟ ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے۔ہزار حیف! نہ بنی قیامت موجود۔عزیز' صاحبِ اقتدار کو کہتے ہیں۔کریم وہ جو بڑا عزت والا بنا پھرتا ہو' مکرم بنا پھرتا ہو' اقتدار اور قوت کا مالک ہو۔اور پھر جب اقتدار اور قوت اور دولت حاصل ہوگئی تو کریم تو وہ خود ہی معاشر کے اندر بن ہی گیا۔یہ وہی ہے جسے ہم The Most Respectable Personality (عزت مآب) کہتے ہیں مگر قرآنِ مجید کہتا ہے کہ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (44:49)۔اس سے کہا جائے گا کہ تُو اپنے آپ کو بڑا واجب التکریم اور صاحبِ غلبہ واقتدار سمجھا کرتا تھا'

184 الصّٰفّٰت۔

اب اپنے اعمال کا مزہ چکھ۔قرآن حمید تو اسے واضح کر دیتا ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کے بل بوتے پر مترفین کی حالت

کہا ہے کہ یہ کون لوگ تھے جنہیں اقتدار بھی حاصل ہوا، عزت بھی حاصل ہوئی، یہ سب کچھ ہوا۔کہا ہے کہ **اِنَّھُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُتْرَفِیْنَ** (56:45) یہ اس دنیا کے اندر دوسروں کی کمائی پر عیش کرنے والے سرمایہ داروں کا طبقہ تھا۔اسی لفظ مترفین کا یہ ترجمہ ہوتا ہے، یعنی دوسروں کی کمائی پر عیش کرنے والے، محنت وہ کریں، ماحصل یہ لے جائیں۔اور پھر وہ اتنا جمع ہوجائے کہ پیٹ تو بھر جائے لیکن اس رزق سے، جو اس طرح سے حاصل کیا جائے، اس میں ایک تو حجیم ہے، نشوونما تو وہیں رک گئی، جو پانی جیسی چیز زندگی بخشنے والے عناصر تھے جس کے لیے قرآن مجید نے کہا ہے کہ **وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ** (21:30) ہر شے کی جو زندگی ہے وہ پانی سے ہوتی ہے، اب اس پانی کی وہ حالت ہے جس میں انسان کی زندگی تلف ہوجائے، اب یہ کھولتا ہوا پانی ہے۔یہ اس قسم کا شجرۃ الزقوم ملعون اثیم ہے۔

ایسا کھانا نہ کھایا جائے اور نہ اگلا جائے

ایک بات اور ہے، کیا کیا بیان کروں، عزیزانِ من! کہا ہے کہ **طَعَامًا ذَا غُصَّۃٍ** (73:13) وہ کھانا جو کھائے تو حلق میں پھنس جائے، نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے۔اس کھانے سے اللہ محفوظ رکھے کہ کھانا پڑے مگر ذَا غُصَّۃٍ حلق میں اٹک جائے۔آپ سوچ رہے ہیں عزیزانِ من! کہ یہ کیا کھانے ہیں، یہ کس جہنم کا ذکر ہو رہا ہے، کس قسم کے یہ کھانے ہیں جو کھانے پڑ رہے ہیں! اور پھر آخری چیز عرض کر کے، میرا خیال ہے، اس موضوع کو پھر ختم کر کے، مجھے آگے بڑھنا چاہیے۔میں اپنے اندر ہمت نہیں پا رہا، یہ اپنی واردات ہے۔

یہ تو ساری اپنی داستان بیان ہو رہی ہے

عزیزانِ من! یہ داستان جو بیان ہو رہی ہے یہ تو اپنی ہی ہے۔میں تو اپنے آپ کو ہمیشہ جہنم میں محسوس کرتا ہوں۔اجتماعی زندگی میں دیکھیے، عزیزانِ من! سنیے! کیا رزق بتایا جا رہا ہے؟ کہا ہے کہ **لَیْسَ لَھُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ۔ لَّا یُسْمِنُ وَ لَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ** (88:6-7) یہ کھانا ضَرِیْعٍ کی، قسم کا ہے، آپ نے سمندر کے کنارے دیکھا ہوگا کہ کہیں سے گھاس پھوس، کثافتیں، اس قسم کی چیزیں جو اس میں ڈالی جاتی ہیں، جہاں کہیں ساحل یا کنارہ آجاتا ہے "اوہدیاں چھلاں جینوں کیندے نیں"[1] جو موجیں اس کی ہیں، وہ زور سے آتی ہیں اور یہ اس قسم کی جو ردی چیزیں اس کے اندر ہوتی ہیں، اس کے کسی کام کی نہیں ہوتیں، وہ اس کو اس موج کے ساتھ اچھال کر ساحل کے ساتھ پھینک دیتا ہے اور آپ پیچھے چلا جاتا ہے اور یہ ردی کثافت والی دوسروں کی پھینکی ہوئی چیزیں، دوسری قوموں کی چھچھوڑی ہوئی

---

[1] اس کی طوفانِ بلاخیز موجوں کو کہتے ہیں۔

ہڈیاں ان کے ہاں کی پھینکی ہوئی ردی چیزیں ہیں' انہیں قرآن حمید نے ضَرِیۡعٍ کہا ہے۔ ان قوموں کو جو رزق ملے گا اس طرح کا ملے گا کہ دوسری قومیں جو اپنے ہاں کی چھچھوڑی ہوئی ہڈیاں پھینک جائیں گی' یہ ان کو وہاں جا کر اٹھاتے پھریں گے۔ اف میرے اللہ!

انسانوں کے خودساختہ آئین کے تحت متشکل ہونے والے نظام زندگی کا نتیجہ

یہ خدائے خبیر و علیم کا کلام ہے' عزیزانِ من! یہ نقشہ کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ مل تو جائے گا' یہ اٹھائیں گے' اس سے لے لیں گے لیکن لَّا يُسۡمِنُ وَ لَا يُغۡنِىۡ مِنۡ جُوۡعٍ (88:7) اس میں توانائی نہیں آئے گی' جسم فربہ نہیں ہوگا' بھوک مٹے گی نہیں' طلب اور زیادہ بڑھتی چلی جائے گی۔ پیٹ بھر جائے گا لیکن لَّا يُسۡمِنُ (88:7) وہ جو انسان کے اوپر تندرستی کی نشوونما آتی ہے اس میں وہ نہیں آئے گی' اور صورت یہ ہوگی کہ کھائینگے' اس کے بعد بھوک اور بڑھ جائے گی۔ پھر وہی پھینکی ہوئی جو کثافتیں اور جھاڑ پھونس ہے' ان کو اٹھانے کے لیے پھر وہاں چلے جائیں گے۔ وہاں جہنم کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ باہر پھینکا ہوا لاغر اور کمزور کر دینے والا رزق ہے۔ یہ کونسا ہے؟ کہا ہے کہ ثُمَّ اِنَّ لَهُمۡ عَلَيۡهَا لَشَوۡبًا مِّنۡ حَمِيۡمٍ (37:67)۔ سنیے! عزیزانِ من! کہا ہے کہ وہاں جو کچھ ملے گا اس میں کوئی چیز خالص نہیں ہوگی' ہر شے میں ملاوٹ ہوگی۔ او میرے خدا! تُو واقعی علیم اور خبیر ہے۔ اس طرح سے دوسروں کی پھینکی ہوئی کھانے کی چیزیں ملیں گی' جن سے بھوک نہ مٹے' وہ توانائی نہ دے۔ اور ان کے آنے کے بعد پھر کیفیت یہ ہو کہ کوئی چیز خالص نہیں ملے گی' اس میں ملاوٹیں ہونگی۔ ملاوٹ اور اس کے ساتھ وہ جو کہا ہے کہ اگر پانی ہے تو وہ کھولتا ہوا ہے جس سے پیاس بجھنے کے بجائے اور بھڑک اُٹھے اور وہ بھی مصفا نہیں بلکہ کثافتوں سے بھرا ہوا' اس میں پُرفریب زندگی کی کثافتیں ہیں۔ عزیزانِ من! وہ ذَا غُصَّةٍ (73:13) ہی نے میری حالت غیر کر دی تھی کہ حلق میں اٹکا ہوا ہے' آمیزش شدہ' کڑوا کسیلا ہے' تلخ' زہر آلود ہے' حلق میں پھنسا ہوا ہے' نہ نگلا جائے اور نہ اگلا جائے' پھر وہی کھانا پڑے اور اتنا بھی نہ ہو کہ اس کو نگلنے کا کچھ تھوڑا سا سامان مل جائے۔

دلی میں 1857ء کے واقعہ کے دوران مسلمان کی حالت زار اور غالب کا کلام

وہ پھر یاد آ جاتا ہے' 1857ء کا دَور۔ میں سمجھتا ہوں کہ (مرزا اسداللہ خان) غالب (1869-1797ء) جس دور میں گزر رہا ہے وہ بڑا ہی سختی کا دور تھا۔ وہ 1857ء کا واقعہ ہوا تھا' وہ دلی میں ہی تھا' پتہ نہیں کس کس قسم کی قیامت سے گزر رہا ہوگا' کس قسم کا وہ روٹی اور کھانا تھا' وہ حلق میں پھنس جانے والا تھا۔ عجیب انداز میں وہ بات کر گیا ہے۔ وہ شخص بہت اونچا تھا اور پھر صاف بات کہہ نہیں سکتا تھا' پابندیاں اتنی تھیں۔ شعر کی زبان اس کے پاس تھی اور اس میں بھی وہ اتنی اونچی اور مشکل زبان استعمال کرتا تھا' میں سمجھتا ہوں کہ جان کر کرتا تھا کہ کسی عام کے سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کہہ گیا ہے۔ اسی لیے تو اس نے کہا تھا کہ ''گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل۔''[1] اب وہاں تک ہم تو آئے ہیں

---

[1] کہوں تو مشکل' نہ کہوں تو مشکل۔

کہ حلق میں پھنسے والا' زہر آلود' کڑوا کسیلا' آگے بھی نہ جائے' پھنسا بھی ہوا ہو' وہی پھر دوبارہ بھی سامنے آئے۔ وہی کھانا پڑے۔عزیزانِ 184 الصّٰفّٰتِ۔
من! اس کا ایک شعر ہمیشہ میرے سامنے رہتا ہے' شعریت میں بھی بڑی بلندی ہے اور بات کتنی اونچی کہہ گیا ہے:

یک گریہ پس از ضبط دوصد گریہ رضا دے

ضبط کی تو نے اتنی تلقین کی ہوئی ہے کہ آنسو آتے ہیں اور تمہارا حکم یہ ہے کہ آنسو آنکھوں سے ٹپکنے نہ پائیں' ضبط کر کے رکھو' روکے رکھوں' کہا ہے کہ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ آنسوؤں کا جو روکنا ہے' وہ حلق میں کتنی تلخی اور کڑواہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ دوسو آنسو روکنے کا تم نے حکم دیا ہے' روکتا رہا میں' انتہا ہوگئی ہے:

یک گریہ پس از ضبط دوصد گریہ رضا دے

اوخدا کے لیے دوسو آنسو میں نے ضبط کیے ہیں' اور ایک آنسو بہانے کی تو مجھے اجازت دے۔

تا تلخی آن زہر توانم ز گلو برد

تا کہ اس گھونٹ سے' اس آنسو سے' یہ جو گلے میں زہر پھنس گیا ہے اس کو تو میں نیچے اتار سکوں' اتنی سی تو اجازت دے دے۔ عزیزانِ من! زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ دیکھا! یہ بیچارے کس حالت میں کیا کہتے تھے! دوآنسوؤں کے ضبط کے لیے تم نے حکم دے رکھا ہے او! اتنا سا تو کر کہ یہ جو زہر جمع ہو گیا ہے' باہر تو نہیں نکال سکتا کہ اس سے تیرا جو استبداد ہے' اس کی شہادت مل جائے گی' میں اندر ہی اس کو کسی طرح سے نگل لوں' اوہ! ایک تو آنسو بہانے کی اجازت دے۔ یہ دور تھا' یہ جہنم تھا جس میں سے گزر رہے تھے۔

یک گریہ پس از ضبط دوصد گریہ رضا دے
تا تلخی آن زہر توانم ز گلو برد

زندگی کے اندر کہیں سرانڈ پیدا ہو جائے تو پھر وہ زندگی زندگی نہیں رہتی

قرآن مجید نے بتایا ہے کہ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاۡاِلَى الْجَحِيْمِ (37:68) رک جانے والی جگہ یا مقام وہ ہے جہاں ندی بھی جو تالاب یا جوہڑ بنتی ہے تو اس کے بعد اس میں سڑاند پیدا ہو جاتی ہے' زندگی نہیں رہتی' خود اس ندی کے پانی کے اندر زہر مل جاتا ہے' وہ کڑوا ہو جاتا ہے۔ یہ جحیم ہے۔ کہا ہے کہ ان لوگوں کو یہ کیا ہوا تھا' ان کی عقل وفکر موجود تھی' آنکھیں موجود تھی' دیکھتے تھے' سنتے تھے' پھر کیا ہوا تھا کہ اس جہنم کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کہنے لگا اس لیے کہ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ۔ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ (37:69-70) ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ کہتے تھے کہ جس راستے پہ ہمارے اسلاف چلتے آئے ہیں' ہم اسی کے اوپر چلتے جائیں گے' عقل وفکر سے کام نہیں

لیں گے۔ سن لیجیے جرم! یہ وہی ہے جسے آپ کے ہاں تقلید کہتے ہیں۔ اتنی Description (تفصیل) جو آپ نے، عزیزانِ من! 84الصّٰفّٰت۔ کی، اس کے کھانے کی، اس عذاب الیم کی سنی ہے، جسے قرآن مجید کہتا ہے اس کے بعد کہا گیا ہے کہ کیا ہوا تھا اس قوم کو کہ اتنا بھی نہیں کرتے تھے کہ کسی مقام پر رک کر دیکھ لیں کہ ہم کدھر رہے ہیں۔

آخر مسلم معاشرے کی یہ حالت کیونکر ہوئی؟

قرآن کریم میں ہے کہ سَالَهُمْ خَزَنَتُهَا اَلَمْ يَاتِكُمْ نَذِيْرٌ ۔(67:8) جہنم کا داروغہ ان سے پوچھے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ایسا شخص نہیں آیا تھا جو تمہیں تمہاری غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا؟ تم نے وہاں کیا کیا تھا جو تم آج جہنم میں آ رہے ہو، کیا بات ہو گئی تھی؟ کہا ہے کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (67:10) اگر ہم عقل وفکر سے کام لیتے تو آج اس جہنم میں کیوں آتے۔ عزیزانِ من! یہ جواب ہے۔ عقل وفکر سے کام لینے والے تو جہنم میں نہیں رہتے۔

تقلید پرستی انسانی عقل کو مفلوج کر دیتی ہے

قرآن حمید بتا رہا ہے کہ اس کی وہ وجہ یہ تھی کہ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآئَهُمْ ضَآلِّيْنَ۔ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ (37:69-70) یہ اپنے آباؤ اجداد کے نقشِ قدم پر دوڑتے چلے جا رہے ہیں، جتنا کوئی زیادہ اسلاف کا پابند ہوتا ہے، اسے اتنا ہی زیادہ متقی اور پرہیزگار بتایا جاتا ہے۔ یہاں يُهْرَعُوْنَ (37:70) کا لفظ ہے کہ اٰثٰرِهِمْ (37:70) ان کے نقش قدم کے اوپر چلتے نہیں ہیں، دوڑتے چلے جا رہے ہیں، کھڑے ہو کر سوچتے ہی نہیں ہیں کہ یہ راستہ ہمیں جہنم کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ جرم بتایا گیا ہے۔ کہا ہے کہ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ (37:71) یہ انہی کی بات نہیں ہے، اے رسول! یہ جو تمہارے مخاطب ہیں، یہ تجھ سے بھی شاید یہی کہہ رہے ہیں کہ یہ تمہاری ہی بات ہے۔ اس سے پہلے بھی جس قوم نے یہ روش اختیار کی کہ عقل وفکر سے کام نہیں لیا اور یہ کہہ کر کہ جو کچھ پہلے کرتے چلے آ رہے ہیں، یہ بھی اسی راستے پر چلتے چلے گئے، کہا ہے کہ ان قوموں کی بھی یہی حالت ہو گئی کہ وہ بھی اسی طرح غلط راستہ اختیار کیے چلی گئیں حالانکہ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (37:72) ہم نے ان کے اندر ان لوگوں کو بھیجا تھا جو بتاتے تھے کہ او بابا! یہ راستہ غلط ہے، قرآن حمید کی طرف آؤ، خدا کی طرف آؤ، عقل وفکر سے کام لو۔ ہم نے ان کی طرف متنبہ کرنے والوں کو بھیجا تھا لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ سنی، ایک نہ مانی۔ کہا ہے کہ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ (37:73) پھر دیکھو کہ جنہیں آکر خطرات سے آگاہ کیا گیا تھا، وہ کس قسم کے جہنم میں پڑے ہوئے ہیں، انہوں نے ایک نہ مانی تو ان کے ساتھ یہ کچھ ہوا۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ تھے جن کے متعلق کہا ہے کہ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ (37:74) وہ خدا کے مخلص بندے تھے۔ وہاں کہا تھا کہ اس کے اندر آمیزشیں ہونگی، ملاوٹیں

ہونگی، مخلص وہ ہوتا ہے جس میں کوئی کسی قسم کی ملاوٹ اور آمیزش نہ ہو' خالص صاف شفاف موتی جس سے قرآن کریم نے تشبیہ دی تھی (الصّٰفّٰتِ 184) وہ اس قسم کا ہو:

گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں ❶

جو ایسے ہوں' ان کو مخلص کہا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ جو خدا کے مخلص بندے ہیں ان کی کیفیت یہ نہیں ہوگی' ان کے سامنے خدا کا کلام آئے گا' عقل وفکر ہوگی، علم وبصیرت ہوگی اور اس کے بعد وہ صحیح راستہ اختیار کریں گے اور یہ خدا کے مخلص بندے ہیں۔

عزیزانِ من! اس کے بعد اگلی آیات میں قرآنِ کریم نے ان مخلص بندوں کی داستانیں شروع کی ہیں اور ان میں سب سے پہلے جو خدا کا پہلا نبی تھا' وہ حضرتِ نوح ؑ تھے' جہاں سے سلسلۂ رشد وہدایت شروع ہوتا ہے' وہاں سے بات شروع کی ہے اور مختلف انبیائے کرام ؑ کی بات آتی ہے' چونکہ موضوع نیا آجائے گا اس لیے ہم اسے آئندہ درس پر اٹھا رکھتے ہیں۔

سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت 74 تک ہم آ گئے ہیں' عزیزانِ من! 75 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ



---

❶ گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں (اقبالؒ: بالِ جبریل)

چوتھا باب: سورۃ الصّٰفّٰت (آیات 75 تا 99)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿75﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ
الْعَظِيْمِ ﴿76﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿77﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿78﴾ سَلٰمٌ عَلٰى
نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿79﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿80﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿81﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿82﴾ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿83﴾ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ
بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿84﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿85﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ
تُرِيْدُوْنَ ﴿86﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿87﴾ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿88﴾ فَقَالَ اِنِّيْ
سَقِيْمٌ ﴿89﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿90﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿91﴾ مَا لَكُمْ
لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿92﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ﴿93﴾ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿94﴾ قَالَ
اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿95﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿96﴾ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا
فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿97﴾ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿98﴾ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ
اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿99﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1980ء کی 5 تاریخ ہے اور درس قرآن کا آغاز سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت 75 سے ہو رہا ہے: (37:75)۔ سابقہ آیات میں پہلے ان قوموں کا ذکر تھا جو غلط راستے اختیار کر کے جہنم کی تباہیوں تک پہنچی ہوئی تھیں حالانکہ انہیں اس سے پہلے ان خطرات سے Warn (آگاہ) کیا گیا تھا' لیکن اس پر بھی انہوں نے اپنی روش میں تبدیلی نہ کی۔ یہ ایک گروہ تھا جس کا ذکر کیا۔ اور اس کے بعد کہا تھا کہ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ (37:74) دوسری طرف ہمارے وہ بندے تھے جو نہایت خلوص کے ساتھ قوانین

خداوندی کا اتباع کرتے تھے۔ اور اب اس آیت سے جو ہمارے پیشِ نظر ہے' آگے چند آیات تک ان عباد کا' ان بندوں کا' ذکر ہے 184الصّٰفّٰت۔ جو اس گروہ میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ خدا کے مخلص بندے ہیں۔ اور یہ جماعت تو مومنین کی ہوتی ہے لیکن اس کے سرفہرست ان کا نبی ہوتا ہے۔ نبی بھی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو کہتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْن (6:163) میں سب سے پہلے اس پر ایمان بھی لاتا ہوں اور اس کے سامنے جھکتا بھی ہوں۔ اپنی وحی کی صداقت پر نبی خود بھی ایمان لاتا ہے اور پھر اس پر عمل پیرا بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اس اعتبار سے نبی جماعت مومنین میں ہی شامل ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت کا تذکرہ

قرآن کریم نے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ابتدا حضرت نوحؑ سے کی ہوئی ہے۔ وہ جو عام طور پر عرف عامہ میں مشہور ہے کہ سب سے پہلے نبی حضرت آدمؑ تھے' اب آپ کو تو پتہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حضرت آدمؑ تو کوئی شخص تھے ہی نہیں' وہ تو آدم کا قصہ بیان ہوا ہے' وہ تو تمثیلی قصہ خود آدمی کی داستان ہے' قرآن کریم میں آدم نامی کسی شخص کے نبی ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ نبوت کے سلسلہ کا آغاز سارے قرآن کریم میں جہاں بھی آیا ہے' حضرت نوحؑ سے آیا ہے۔ یہاں بھی جب اس نے وہ جو عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ (37:75) تھے ان کا ذکر شروع کیا ہے تو حضرت نوحؑ سے ذکر شروع کیا ہے۔ کہا ہے کہ وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ (37:75)۔

قرآن حکیم کے بیان کردہ تمام واقعات میں راہنمائی کا عنصر ضرور موجود ہوتا ہے

عام طور پہ یہ ذہن میں ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے یہ انبیائے سابقہؑ یا اقوام گزشتہ کے جو قصے' ان کی داستانیں' ان کے تذکار جلیلہ' بیان کیے ہیں' تو یہ اس لیے نہیں کہ یہ کوئی تاریخ کی کتاب ہے اور ان قوموں کی یہ تاریخیں لکھتا ہے۔ جو بھی قصہ' واقعہ یا داستان بیان ہوئی ہے' اس میں ہمارے لیے ایک خاص سبق ہے' ایک خاص اصول ہے' ایک خاص قانون ہے اور وہ اس قانون یا اصول کی عملی شہادت ہوتی ہے جو ان قصوں میں' ان داستانوں میں' بیان کی جاتی ہے۔ قصۂ حضرت نوحؑ جو شروع ہوا تو اس داستان کا آغاز اس آیت سے ہوا۔ اس میں دیکھیے کہ ہمارے لیے کون سی ہدایت یا رہنمائی پوشیدہ ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ آیت اس زمانے میں ہمارے زیر درس آ رہی ہے جب ہمارا پورا ملک بالعموم اور لاہور خاص طور پر' سیلاب کی زد میں ہے۔

حضرت نوحؑ کے دور میں سیلاب کا قصہ اپنے اور ہمارے لیے ایک سبق رکھتا ہے

حضرت نوحؑ کا قصہ تو سیلاب کا قصہ ہے' پانی کے طوفان کا قصہ ہے گویا اس وقت تو یہ ہماری اپنی داستان ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس قصے میں ہمارے لیے کیا ہدایت ہے' ہمارے لیے کیا رہنمائی ہے۔ کہا ہے کہ وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ

184الصّٰفّٰت۔ الْمُجِیْبُوْنَ (37:75) نوحؑ نے ہمیں آواز دی' ہمیں پکارا۔ایک بہت بڑا خطرہ آ رہا تھا' اس خطرے سے بچنے کے لیے نوحؑ نے ہمیں پکارا' ہمیں آواز دی اور ہم سب سے بہتر پکار کا جواب دینے والے' پکار کو سننے والے ہیں۔تو بڑی اہم بات ہے' سیلاب کا ایک خطرہ آ رہا تھا' حضرت نوحؑ نے خدا کو پکارا' خدا نے اس پکار کو جواب دیا اور کہا کہ نِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ(37:75) ہم بہترین جواب دینے والے ہیں۔خدا نے یہ کیا جواب دیا تھا؟

خدا کو پکارنے کے معنی اس کے قانون کو پکارنے کے ہیں' مساجد میں اذانیں دینا نہیں ہیں

ہمارے ہاں یہ پچھلے دنوں جو طوفان آیا ہے' پہلے تو ہمارے ہاں یہ قحط باراں تھا' خشک سالی تھی' بارش نہیں ہو رہی تھی' تو کہا گیا کہ خدا کو پکارنا چاہیے چنانچہ مسجدوں کے میناروں سے تو ایک طرف' مکانوں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر بھی اذانیں دینی شروع کر دیں۔ ہم نے خدا کو پکارنا شروع کر دیا۔خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بارشیں شروع ہوئیں۔اب جو شروع ہوئی ہیں تو بند نہیں ہو رہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ پھر کہا گیا کہ پھر خدا کو آواز دو' کہ جی پہلے آواز دی تو اس نے بارشیں برسوانی شروع کیں اور اس کے بعد پھر کوٹھے پہ کھڑے ہو کر اذانیں دینی شروع کر دیں کہ یا اللہ! ہم نے تو یہ بارانِ رحمت مانگا تھا' یہ تو ہمارے اوپر عذاب آ گیا ہے۔گویا ہم نے جو خدا کو پکارنا تھا' اس کے متعلق ہمیں بتایا یہ گیا کہ پکارنا یہ ہے کہ ذرا بلند ہو کر' اونچے ہو کر' یعنی اس سے ذرا قریب ہو کر' اوپر ہے وہ عرش پہ' ذرا اونچی آواز سے پکارو اور پھر اب تو لاؤڈ اسپیکر بھی لگے ہوئے ہیں تو وہ اذانیں دیجیے۔یہ خدا کو پکارنا ہو گیا۔ٹھیک ہے جی! خدا کو پکارنا ہے کہ جی یہ کیسا پکارنا ہے؟

حضرت نوحؑ کے سلسلے میں کہا ہے کہ انہوں نے بھی خدا کو پکارا تھا۔ٹھیک ہے جی! پکارا تھا اور اس نے جواب بھی دیا تھا۔ ہمارے ہاں جو یہ پکارنا ہے یہاں تک تو بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے پکارا اور خدا نے اس پکار کا جواب بھی دیا۔جواب کے معنی ہوئے خدا نے انہیں اس سیلاب میں' اس طوفان میں' اس طغیانِ آب میں' غرق ہونے سے بچا لیا' یہ بات ذہنوں کے اندر ہوئی۔اگر ہم یہ دیکھ لیتے ہیں کہ اس نے جواب کیا دیا تھا تو بات ہماری بھی بن جاتی' ہم بھی بچ جاتے۔ہم تو نہیں بچے' روز تباہی آ رہی ہے۔پکارنے کا تو ہمارے ہاں یہ کہا گیا کہ چھتوں پہ کھڑے ہر کر اذانیں دو۔ارے جہاں ''نادنا''(37:75) ہے' اس سے اگلی آیت میں دیکھ لیتے کہ اس نے جو کہا ہے کہ ہم بہترین جواب دینے والے ہیں' ہم نے جواب دیا اور یہ ہمارا جواب تھا جس کی بنا پر حضرت نوحؑ بچا۔

خدا نے وہ کیا جواب دیا تھا؟ جواب دیا تھا کہ نوحؑ! تم کہہ رہے ہو کہ ایک بہت بڑا طوفان آنے والا ہے' اس سے ہمیں بچایئے۔ جواب سنیے! کہا ہے کہ وَ اصْنَعِ الْفُلْکَ بِاَعْیُنِنَا(11:37) ہماری نگرانی میں کشتی بناؤ۔سیلاب سے بچ جاؤ گے۔جواب یہ دیا تھا جی۔

آپ نے غور فرمایا۔ کہا تھا کہ ہم بہترین جواب دینے والے ہیں۔ اس سے بہتر جواب اور کیا ہو سکتا تھا کہ اگر سیلاب سے بچنا ہے تو کشتی بناؤ۔ وَ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ (11:37) اور نوحؑ نے کشتی بنائی' وہ اور اس کے ساتھی بچ گئے۔ خدا کی طرف سے تو یہ جواب ملا تھا۔ جواب ہمارے پاس موجود ہے لیکن ہمیں تو اتنا بتایا گیا تھا کہ بس چھت پر کھڑے ہو کر اذانیں دے دیجیے اور اس کے بعد یہ خدا کی ذمہ داری ہے' وہ تمہیں بچا لے گا۔ اس نے تو نہیں بچایا۔ اس نے نوحؑ کو یہ کہہ کر کہ تمہاری آواز ہم نے سن لی' دعا ہم نے سن لی' پکار ہم نے سن لی' جاؤ گھر میں بیٹھو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نہیں' بلکہ پکار کا یہ جواب دیا ہے کہ وَ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ (11:37) کشتی بناؤ۔ اس نے کشتی بنائی۔

آپ سوچیے کہ اس داستان میں بھی ہمارے لیے کیا ہدایت ہے؟ یہ کہ سیلاب آنے سے پیشتر کشتی بناؤ' بچنا چاہتے ہو تو اس سیلاب سے بچنے کی جو مادی تدابیر ہیں' وہ اختیار کرو۔ یہ ہے خدا کا جواب۔ وہ قانون ہدایت دیتا ہے کہ طوفان سے بچنے کے لیے یہ تدبیر ہے۔ طوفان بلا جو یہ سیلاب ہیں' جس جس انداز سے تباہیاں مچاتے ہیں' سیلاب آنے سے پہلے ان کا سد باب کرو۔ سد باب میں وہی جو مادی اسباب آتے ہیں ان کی رو سے یہ کیا جائے گا۔ حضرت نوحؑ اپنی دعا اور خدا کے جواب کے زور پہ تو نہیں بچے تھے' وہ تو کشتی کے ذریعے بچے تھے۔ ہمیں صرف یہی کہا کہ کوٹھے پر کھڑے ہو کر آوازیں دیں۔ ٹھیک ہے چلیے پکار ہوئی۔ وہ اگلی بات جو کرنے کی تھی وہ یہ ہے۔ کئی سال ہو گئے یہ اسی طرح سے ہوتا ہے' کبھی دریاؤں میں طوفان آتا ہے' کبھی بارشوں کی وجہ سے سیلاب ہوتے ہیں۔ ہمیں یہی بتایا گیا ہے کہ جب یہ خطرہ انتہا تک پہنچ جائے تو تم کوٹھے پر کھڑے ہو کر اذانیں دیا کرو' خدا کو پکارا کرو' یہ جواب جو اس کا ملا ہے یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اس پکار کا جواب یہ ہے۔ حضرت نوحؑ کو بھی اس نے جواب دیا تھا' تمہیں بھی وہ یہی جواب دیتا ہے کہ وَ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ (11:37) سیلاب سے بچنا ہے تو کشتیاں بناؤ' بند بناؤ' پل بناؤ' یہ سارے اسباب پیدا کرو جن سے اس آنے والے طوفان کا سد باب ہو' یہ ہمارا جواب ہے۔

حضرت نوحؑ نے تو یہ جواب سن کر وَ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ (11:37) کشتی بنا لی۔ ہماری توجہ نہ تو کوئی اس جواب کی طرف مبذول کراتا ہے' تباہ ہوئے چلے جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہے قرآن کریم کے سمجھنے کا طریق اور یہ ہے قرآن حمید کی رو سے باتوں کا جواب جو ملتا ہے۔ وہ تو اس نے وہیں جواب دیا ہوا ہوتا ہے۔ ہر خطرے کے متعلق اس کا یہ جواب ہے۔ اور پھر اگلی چیز یہ ہے کہ حضرت نوحؑ نے کشتی بنائی' اس کشتی میں بیٹھ کر وہ اور ان کے جو ساتھی تھے' غرق ہونے سے بچ گئے۔ وہ تو یہ ہوا تھا۔

اس دنیا میں خدا کے وعدے انسان کے ہاتھوں پورے ہوتے ہیں

عزیزانِ من! اب اگلے الفاظ یہ ہیں کہ وَ نَجَّیۡنٰہُ وَ اَہۡلَہٗ مِنَ الۡکَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ (37:76) ہم نے نوحؑ کو اور ان کے ساتھیوں کو بہت بڑی تباہی سے بچا لیا۔ کہا ہے کہ نَجَّیۡنٰہُ (37:76) ہم نے بچا لیا۔ وہ اگر کشتی نہ بناتے تو پھر کیسے بچ سکتے تھے۔ ''یہ ہم نے بچا

الصّٰفّٰت 184 انسانوں کی دنیا میں لیا'' بات ہوگئی۔ یہ پھر اس کے اندر بڑی اہم بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذمہ داریاں' اپنے وعدے' اپنے اعلانات' انسانوں کے ہاتھوں سے پورا کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہاں ایک جماعت موجود ہو جو اس کی ہدایت کے' اس کے قانون کے' مطابق وہ کچھ کرے جیسا وہ کہتا ہے کہ کرو۔ اور جب وہ اس کے ہاتھوں سے ہوتا ہے تو پھر اسے اپنی طرف منسوب کرتا ہے کہ ہم نے پھر یہ کر دیا ہے۔ نَجَّیۡنٰہُ (37:76) ہم نے ان کو نجات دی۔ یہ ہم نے نجات دی۔ کیوں؟ اس لیے کہ انہوں نے خدا کی رہنمائی کے مطابق' اس کے قانون کے مطابق' یہ کیا تو اس طرح سے اس نے یہ کہا کہ ہم نے ان سے کہا کہ اس کے بچاؤ کے لیے سامان تیار کرو' کشتی تیار کرو' انہوں نے کشتی تیار کر لی' وہ بچ گئے۔ دیکھا! اس طرح ہم بچاتے ہیں۔ براہ راست تو وہ نہیں بچاتا' انسانوں کی دنیا کے اندر وہ براہِ راست اپنی ذمہ داری اور وعدے کو پورا ہی نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کی دنیا میں انسانوں کے ہاتھوں یہ کچھ کراتا ہے۔

آپ کو یاد ہے کہ سورۃ النساء کے اندر یہ ہے کہ مکے سے ہجرت کر کے یہ پوری جماعت تو مدینے میں آ گئی' یہاں آ کر انہوں نے مملکت بھی قائم کی' قوت بھی حاصل کر لی۔ مکے میں جو مسلمان رہ گئے تھے وہ بیچارے بڑے کمزور تھے اور وہاں یہ جو دشمن قریش تھے' یہ بڑے ہی سخت قسم کے لوگ تھے۔ انہوں نے ان پہ بڑے مظالم شروع کیے۔ وہ ان کو وہاں سے نکلنے نہیں دیتے تھے۔ ان کو پتہ تھا کہ پہلے لوگ نکل گئے ہیں' وہ ہماری دسترس سے باہر ہو گئے ہیں۔ ان کے اوپر بڑے مظالم ہوتے تھے۔ اب دیکھیے قرآن حمید اسے کس انداز سے بیان کرتا ہے۔ انہوں نے خدا کو پکارنا شروع کیا کہ یا اللہ! ہمیں کسی طرح سے ان ظالموں کی بستی سے نکال یا کوئی ایسا دوست ہمدرد بھیج' جو ان کے مظالم کا سدباب کر کے ہماری حفاظت کرے۔ قرآن حمید میں ہے کہ خدا نے کیا کیا؟ کیا وہاں اپنے ہاں سے فرشتے بھیجے اور کہا کہ یہ ورد پڑھا کرو' یہ وظیفہ کیا کرو؟ نہیں' قطعاً نہیں بلکہ ایک دوسرا راستہ اختیار کیا۔ وہ کیا راستہ تھا؟

کسی کی دعائیں یا مسائل حل کرنے کا طریق کار: اس جماعت مومنین کی موجودگی ہے جو خدا کے نام پر مملکت قائم کرتی ہے

عزیزانِ من! یہ بڑی گہری چیز ہے۔ خدا نے مدینے کی اسلامی مملکت سے کہا کہ تم سنتے نہیں ہو کہ وہ ہمیں مدد کے لیے پکار رہے ہیں' تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جا کر ان کی مدد نہیں کرتے۔ ہم کہتے ہیں کہ پکار تو وہ آپ کو پکار رہے ہیں' اتنا ہی دل میں درد اٹھا ہے تو ان کی مدد کیجیے' آپ ہمارے اوپر ٹال رہے ہیں کہ جاؤ اٹھو۔ کیا عجیب انداز ہے! کہا ہے کہ تم سنتے نہیں ہو کہ وہ ہمیں مدد کے لیے پکار رہے ہیں' اٹھ کر ان کی مدد کیوں نہیں کرتے۔ یہ جو' عزیزانِ من! خدا کے وعدے ہیں' وہ آج ہم سے پورے نہیں ہو رہے' وہ اس لیے نہیں ہو رہے کہ وہ جماعت' وہ افراد' جو اس کے وعدوں کو پورا کیا کرتے ہیں' وہ موجود نہیں ہیں' ان کی موجودگی ضروری ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَاِیَّاهُمۡ (6:151) ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں' تمہاری اولاد کو بھی رزق دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر آدھی دنیا

بھوکی کیوں سوتی ہے۔ ایک طرف اس نے کہا ہے کہ ہم رزق دیتے ہیں۔ اور سارے قرآن حکیم میں آپ دیکھیے' قدم قدم پہ جماعت الصّٰفّٰت 184 مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم ان کے رزق کا انتظام کیوں نہیں کرتے' اٹھو اور ان کے رزق کا انتظام کرو' ہم نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے' ذمہ داری لے رکھی ہے' تم نے اس ذمہ داری کو پورا کرنا ہے۔ اور اگر یہ جماعت مومنین موجود نہ ہو' خدا تو براہِ راست کبھی یہ ذمہ داریاں پوری نہیں کرے گا۔ یعنی ایک ہی آیت کے اندر کتنی عظیم چیزیں واضح ہو رہی ہیں۔ کہا ہے کہ نوحؑ نے ہم کو پکارا' ہم نے جواب دیا کہ ہم تمہیں بچائیں گے' جواب دینے کے بعد نوحؑ سے کہا کہ کشتی بناؤ' نوحؑ نے کشتی بنائی' اس سے وہ اور اس کے رفقاء بچ گئے: **نَجَّیْنٰهُ** (37:76) اور اس طرح ہم نے اس کو ان خطرات سے محفوظ رکھا ہے۔ یہ ہے ساری بات۔ اور اصل یہ ہے کہ وہ جو حضرت نوحؑ کے دوسرے مخالفین تھے' نظر آتا ہے کہ یہ بہت قدیم زمانے کی بات ہے کہ اس سے پیشتر ابھی لوگوں کے ذہن میں بھی یہ نہیں تھا یا ابھی انسان نے کشتی بنانا یا اس طرح سے بچنا سیکھا نہیں تھا۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے جو حضرت نوحؑ کے متعلق کہا ہے کہ **وَ اصْنَعِ الْفُلْکَ** (11:37) تو کہا ہے کہ **بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا** (11:37)' ہماری وحی کے مطابق اس طرح سے کشتی بناؤ' وحی کے ذریعے کشتی بنانا سکھایا۔

اس کائنات کے اندر طبعی قوانین مومن اور کافر میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے

وہاں یہ تھا کہ بیٹھے ہوئے حضرت نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے تھے اور وہ لوگ پاس سے گزرتے تھے۔ یہ دیکھتے تھے کہ یہ کیا بیکار کام کر رہا ہے' وہ اس کا تمسخر اڑاتے تھے۔ اگر وہ تمسخر نہ اڑاتے' اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت یا حضرت نوحؑ کے اس عمل کو Seriously (سنجیدگی سے) لیتے کہ یہ شخص کیا کر رہا ہے تو وہ بھی کشتی بنا لیتے اور وہ بھی بچ جاتے۔ کیا اللہ میاں ان کی کشتی کو ڈبو دیتا اور ان کی کشتی کو پار لگا دیتا؟ نہیں' وہ ایسا تو کبھی نہیں کرتا۔ وہ تو کہتا ہے کہ **کُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ** (17:20) ہمارے طبعی قوانین کے مطابق مومن ہوں یا کافر ہوں' جو بھی اس کے مطابق عمل کرتا ہے' ہم اس کی بھی مدد کرتے ہیں' ہم اُس کی بھی مدد کرتے ہیں۔ کہا تھا کہ ہمیں خطرات سے بچایئے اور خدا کی طرف سے جواب یہ ملا تھا کہ اگر خطرے سے بچنا ہے تو کشتی بناؤ۔ آج یہی ہمارے لیے سبق ہے۔ عزیزانِ من! خالی کوٹھے پہ کھڑے ہو کر اذان دینے سے خدا نہیں بچا لیتا۔ اس نے اپنے پیغمبر حضرت نوحؑ سے کہا کہ تم کشتی بناؤ۔ کیا ہم سے کہے گا کہ اذانیں دے کر نیچے اتر جاؤ تو ہم بچا لیں گے؟ وہ نیچے اترتے ہیں "کوٹھا ای گر جاندا اے ❶"۔ نہیں' ایسا نہیں ہے' بچنے کے لیے تدابیر یں کرنا ہیں۔ وہ تو کہتا ہے کہ **وَ جَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ** (37:77) وہ بھی بچ گئے اور اس کے بعد آگے ان کی نسل بھی چلی۔

---

❶ مکان ہی گر جاتا ہے۔

184الصّٰفّٰتِ۔

نقصان کا ازالہ بھی اس کے قانون کو اپنانے پر ہی منحصر ہے

آ گے کہا ہے کہ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ (37:78) اوران کی اس داستان کو ہم نے آنے والوں کے لیے محفوظ رکھ لیا۔ یہ کیا داستان تھی جو محفوظ رکھ لی؟ یہی بات اس کے اندر محفوظ رکھ لی کہ سیلاب سے بچنے کے لیے قبل از وقت کشتی بناؤ۔ بس یہ ہے ساری بات۔ اب اس اصول کو ہر خطرے سے بچنے کے لیے Apply (استعمال) کرتے جایئے۔ اس نے اس کے لیے قوانین دے دیئے ہیں۔ اس کی رحمت یہ ہے اصل چیز۔ اگر غلطی سے تم سنکھیا بھی کھا لیتے ہو تو اس نے پہلے سے ایسی چیزیں بنا رکھی ہیں، اگر اس قانون کے مطابق بروقت اس کی طرف رجوع کرو تو اس نقصان کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ ہم بچا لیتے ہیں۔ وہ براہِ راست نہیں کسی کو بچاتا، براہِ راست وہ کسی کو چھپڑ پھاڑ کر رزق نہیں دیتا۔

خدا کی طرف سے مقرر کردہ قوانین کے سلسلہ میں ملاّ کی کم مائیگی اور عبد کا ایمان

یہ چیز یاد رکھیے ورنہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ خدا کے یہ وعدے کہاں گئے جو وہ کہتا ہے کہ ہم رزق دیتے ہیں، تمہیں بھی اور تمہاری اولاد کو بھی۔ رات کو آدھی دنیا بھوکی سوتی ہے، بھوکی مر رہی ہے، کہاں ہے اس کا وعدہ؟ چلیے! آپ کہیے کہ کفار سے نہیں ہے، مومنوں سے ہے۔ کفار کی تو شاید آدھی آبادی سوتی ہوگی، ہماری تو 75% بھوکی سوتی ہے۔ یہ اعتراض ہوتا ہے تو ہمارے ہاں کے مُلاّ سے کچھ جواب نہیں بن پڑتا، اس کی نگاہ ادھر جاتی ہی نہیں ہے کہ حضرت نوحؑ نے پکارا، خدا نے کہا کہ ہم نے پکار سن لی، اگلی بات پہ اس کی نگاہ ہی نہیں جاتی۔ یہ اس لیے کہ اگر یہ چیز ہو کہ یہ کرو گے تو بچو گے تو اس کو پھر اپنی روٹی کمانے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ یہ ہے اصل چیز۔ وہ وہیں تک آپ کو کہے گا کہ ایسے وقت میں خدا کو پکارنے کے لیے، اذان دے دیا کرو۔ عزیزانِ من! اس کے مطابق آپ کو کشتی بنانی پڑے گی، پیغمبر کو بنانی پڑے گی، ہم آپ کہاں کی مولی ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ نَجَّيْنٰهُ (37:76) اس کو اس جانکاہ حادثہ سے محفوظ رکھا اور اس طرح سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ (37:79) نوحؑ کو اقوام عالم میں امن و سلامتی کا پیامبر ہونے کا مقام حاصل ہوا۔ دیکھا کیسے سلامتی ملی نوحؑ کو! اور یہ بات صرف نوحؑ سے ہی مخصوص نہیں اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (37:80) جو بھی حسن کارانہ انداز سے ہمارے قانون پہ عمل کرتا ہے، اس کا یہ بدلہ ہوتا ہے، وہ بھی بچ گیا، اس کی آنے والی جو نسل تھی وہ بھی بچ گئی۔ پھر سن لو کہ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ (37:81) اس کو اس چیز پر ایمان بھی تھا، وہ عبد تھا یعنی وہ اس کا محکوم بھی تھا، اس نے اس پر عمل کیا تھا۔ عبد تو کسی کا اسی وقت بنتا ہے جب اس کے کہنے پر عمل بھی کرے۔ آپ ملازم کو ملازمت سے نکال دیتے ہیں اگر وہ آپ کی بات کو سنتا رہے اور بیٹھا رہے۔ آپ اسے کہیے کہ جایئے، اندر سے پانی لایئے اور وہ بیٹھا ہوا ہے کہ جی! سن لیا ہے، سمجھ لیا ہے، ٹھیک ہے، آپ کو پیاس لگی

ہے مگروہ بیٹھا ہوا ہے' وہ تو آپ کا ملازم نہیں کہلا سکتا چہ جائیکہ وہ عبد کا لفظ اس کے لیے استعمال ہو۔ 184الصّٰفّٰت۔

قرآن حکیم نے انبیائے کرام کے لیے عبد کا لفظ استعمال کیا ہے اور مومن کے لیے بھی یہ عبد ہونا شرط ہے

انبیائے کرام ؑ کے لیے عبد کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو مومنین کے ساتھ عبد کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ وہ اس بات کی سچائی پر یقین رکھنے والا ہو اور پھر اس کے مطابق عمل کرنے والا ہو تو پھر انسان عبد بنتا ہے۔ اور سب سے بڑے عبد تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے' انہیں تو قرآن کریم نے **عبد اور رسول** کہا ہے تو سب سے بڑا مقام عبودیت ہے۔ پہلی چیز ہے اس کی صداقت پر یقین رکھنا کہ یہ واقعی ٹھیک ہے کہ اس نے جو کشتی کہا ہے تو یہ بچالے گی اور اگلی بات یہ ہے کہ پھر اسکا عبد بن جائے کہ اس نے جو کہا ہے مجھے وہ کرنا ہے اور پھر وہ کرے۔ تو اس کو وہ کہتا ہے کہ **عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ** (37:81) وہ ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتا تھا اور **ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ** (37:82) باقی جو رہ گئے جنھوں نے کشتی نہیں بنائی تھی' وہ غرق ہو گئے۔ ان کو بھی اَغْرَقْنَا ہی کہا ہے یعنی ہم نے غرق کیا ہے۔ براہِ راست نہیں اس نے بچایا تھا' نہ براہ راست انہیں اس نے غرق کیا تھا۔ انہوں نے ہماری رہنمائی کے مطابق بچنے کا وہ سامان تیار کر لیا تو بچ گئے' ہم نے انہیں بچایا۔ انہوں نے تیار نہ کیا' اس کے لیے سرکشی برتی تو ہم نے ان کو غرق کر دیا۔ یہ ہے داستانِ حضرت نوح ؑ میں پہلی چیز۔ عزیزانِ من! یہ ہمارے لیے قانون ہدایت راہنمائی یا اصول ہے۔ آگے کہا ہے کہ **وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ** (37:83) اسی گروہ میں ابراہیم ؑ بھی ہیں۔

حضرت نوح ؑ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ جلیلہ کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی کا ذکر

قرآن حمید نے بتایا کہ سلسلۂ وحی یا رشد و ہدایت' شروع سے آخر تک' مسلسل وہی چلا آ رہا تھا' وہ ایک ہی دین تھا' جو چلا آ رہا ہے تو ان حضرات انبیائے کرام ؑ کو کہا کہ تمہاری یہ امت' ایک امت واحدہ ہے' تم ایک ہی امت کے افراد ہو۔ انبیائے کرامؑ ایک ہی سلسلۂ رشد و ہدایت کی مختلف کڑیاں تھیں' یہ الگ الگ نہیں تھے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ **لا نفرق** (2:136) ہم ان میں اسی لیے تفریق نہیں کرتے۔ اسی گروہ میں سے ابراہیم ؑ تھے۔ ابراہیمؑ کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی ہے کہ **اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ** (37:84)۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ دوسرے مقام پہ تو اہل جنت کے متعلق بھی ہے کہ وہی جو قلبِ سلیم لے کر آئے گا' وہ ہے جنت میں جانے والا۔ حضرت ابراہیم ؑ کے متعلق **بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ** (37:84) کہا ہے۔ پہلی چیز ہے "کسی چیز کی صداقت پر ایمان لانا" اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' اگلی بات ہے "اس کے عبد بننے کے لیے اس کے سامنے جھک جانا"۔ یہ مقام کس طرح حاصل ہوتا ہے' اس میں ہمارے لیے ایک بہت بڑا نکتہ اور بہت بڑا قانون پوشیدہ ہے: قلب کو پورا اطمینان ہو جانا۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی اور یہ نکتہ ذرا مشکل بھی ہو جائے گا۔

سنیے عزیزانِ من! Mind (دماغ) اور Thought (فکر) دو الگ چیزیں ہیں۔ کسی بات کا سمجھ لینا' یہ ایک چیز ہے۔ سمجھنے کے بعد اس 184 الصّٰفّٰت چیز کے اوپر عمل کرنے کے لیے تیار ہو جانا' یہ دوسری چیز ہے۔ یہ دماغی بات نہیں ہے۔ ہزاروں چیزیں ایسی ہیں جو ہم نے سمجھی ہوئی ہیں' کہ وہ ہمیں نقصان دیتی ہیں۔ سمجھنے کے باوجود جانتے ہیں کہ وہ خطرے والی چیز ہے' مگر پھر بھی کرتے ہیں۔ یہ ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ نقصان دہ چیز ہے' وہ جو بڑے ہی آسان الفاظ میں مرزا اسداللہ خاں غالب (1869-1797ء) نے کہا تھا کہ

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کسی چیز کا ذہنی طور پر تسلیم کرنا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اصل چیز تو اس پر عمل کرنا ہے

یہ Mind (دماغ) اور Thought (فکر) دو چیزیں ہیں۔ صرف جاننا کافی نہیں ہے' قرآن حکیم کا سمجھ لینا کافی نہیں ہے' اس کا مفکر ہونا کافی نہیں ہے گو یہ ضروری ہے' یہ پہلی کڑی ہے لیکن یہی کافی نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بات اور طرف نکل جائے گی' ورنہ اب تو یورپ میں Mind (دماغ) اور Thought (فکر) کے متعلق اور Brain (حافظہ) کے متعلق اتنی بڑی ریسرچ ہو رہی ہے۔ یہ جو کسی چیز کا سمجھ لینا ضروری تو ہے لیکن نتائج صرف سمجھ لینے سے پیدا نہیں ہوتے۔ ہم نے کتنے فارمولے سمجھے ہوئے ہیں' کتنی بیماریوں کے علاج ہیں جو ہم نے سمجھے ہوئے ہیں لیکن وہ تو آگے پھر عمل کرنے کی بات ہے۔ تو یہ جو پہلی چیز ہے یہ ایمان ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو سمجھ لینا ہے' یہ بہت ضروری ہے یعنی سمجھے بغیر جو آپ مانتے ہیں' اس کو تو قرآن حکیم ایمان کہتا ہی نہیں ہے۔ اس کے لیے پہلی کڑی تو سمجھنا ہے' سمجھنے کے بعد' ایک چیز کو آپ سمجھتے ہیں کہ ہاں ٹھیک ہے' یہ حقیقت ہے' یہ جو دوائی ہے اس میں یہ اثر ہے کہ یہ اس مرض کو دور کر دے گی۔ یہ آپ کا ایمان ہے۔ یہ آپ کا یقین ہے کہ یہ کر دے گی۔ لیکن کرے گی تو تب جب آپ اس کو استعمال کریں گے۔ یہ اگلی کڑی آ گئی۔ اور اگر یہ ہو کہ طبیعت ادھر نہیں آتی تو یہ بڑی عجیب چیز ہے جو غالب (1869-1797ء) کہہ گیا ہے۔

میں پھر عرض کروں گا فکر کی دنیا کے اندر' سقراط (C.469-399B.C) کا بہت بڑا مسلمہ تھا جو اس نے آ کر توڑ دیا۔ سقراط نے کہا تھا کہ Knowledge is worship کسی چیز کا جو علم ہونا ہے' جو جاننا ہے یہی نیکی ہے۔ جاننا نیکی نہیں ہے' نیکی کے لیے جاننا ضروری ہے لیکن صرف جاننا نیکی نہیں ہے' اس جاننے کے اوپر جو عمل کرنا ہے' یہ ہے اصل نیکی۔ آپ اپنی اپنی زندگی کے اوپر غور کیجیے کتنی چیزیں نقصان رساں ہیں جو آپ جانتے ہیں لیکن ان کو چھوڑنے کے لیے ''طبیعت ادھر نہیں آتی''۔ یہ طبیعت کا جو ادھر آنا ہے یہ ایک اگلا تقاضا ہے۔ اور یہ ہے قلب سلیم۔ یہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب جاننے کے بعد انسان کی طبیعت بھی ادھر آ جائے۔ اسے کہیں گے قلبِ

سلیم۔کہا کہ ابراہیمؑ قلب سلیم لے کر ہماری طرف آیا۔ 184الصّٰفّٰتِ۔

یہ قلبِ سلیم پیدا کیسے ہوتا ہے؟ بڑے اہم مقامات ہیں، عزیزانِ من! مشہور سورۃ البقرۃ کی آیت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے کہا کہ مجھے بتا کہ تُو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ میں آگے بتاؤں گا کہ ہمیں پھر کیا داستان سنائی جاتی ہے کہ کیسے مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ کہا تھا کہ وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (2:260)۔ عام طور پہ یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے کہا کہ مجھے بتا، تُو کس طرح سے مُردوں کو زندہ کرتا ہے قَالَ اَوَ لَمۡ تُؤۡمِنۡ (2:260) کہا کہ تجھے اس چیز کے اوپر یقین نہیں ہے کہ ہم مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں؟ تمہارا اس پہ ایمان ہے یا نہیں کہ کر سکتے ہیں؟ قَالَ بَلٰی (2:260) کہا کہ ایمان تو ہے، پھر پوچھا کہ کیوں یہ پوچھ رہے ہو؟ کہا کہ وَ لٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ (2:260) اطمینان قلب چاہتا ہوں۔ قلب کا اطمینان چاہتا ہوں۔ وہ جو پہلی چیز تھی، وہ Intellect کی، Mind کی تھی، وہ سمجھنے کی بات تھی۔ سمجھا ہوا تو میں ہوں اس بات کو کہ تُو کر سکتا ہے۔ یہ دیکھیے کہ وہ اطمینان قلب کا چاہتا ہے، دماغ کا اطمینان نہیں چاہتا۔

حضرت ابراہیمؑ کے اطمینانِ قلب کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے بیان کردہ افسانے

اب میں سوچ رہا ہوں کہ پہلے وہ بتاؤں جو ہمیں افسانے سنائے جاتے ہیں۔ وہی پہلے بتاؤں تو پھر میں عرض کروں گا کہ قرآن حمید کیا کہہ گیا ہے۔ پہلے ان کی بات سن لیجیے، سمجھ لیجیے کہ مسجد میں وعظ کی مجلس میں بیٹھے ہیں، بات بیان ہو رہی ہے، حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہا کہ یا اللہ! مجھے بتا کہ تُو کیسے مُردوں کو زندہ کرتا ہے؟ اس نے کہا کہ کیا تمہیں ایمان نہیں ہے؟ کہا! جی مجھے ایمان تو ہے لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اچھا بتاتے ہیں تمہیں۔ کہا کہ چار پرندے لے لو، انہوں نے تو یہ مُردے پوچھا تھا، یہ جو انسان مر جاتا ہے کہ پھر تُو قیامت کو کیسے زندہ کرے گا۔ کہا کہ قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَۃً مِّنَ الطَّیۡرِ فَصُرۡھُنَّ اِلَیۡکَ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنۡھُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُھُنَّ یَاۡتِیۡنَکَ سَعۡیًا (2:260)۔ یہ جو کہانی بیان کی جاتی ہے کہ چار پرندے لو اور پھر یہ داستان گو ان پرندوں کا نام بھی لیتے ہیں: وہ کبوتر ہے اور وہ ایک مور ہے اور ایک مرغ ہے اور تیتر ہے۔ پھر ان میں اختلاف ہو جاتا ہے، میں ان سے پوچھتا ہوں کہ آپ کا یہ Source of Information (ذریعہ معلومات) کیا ہے یعنی کہاں سے آپ کو معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ مرغ اور تیتر اور کبوتر لیے تھے۔

ابن خلدون جیسے مؤرخ کی مذہبی طور پر روایتی سوچ کی کیفیت

آپ اپنے ہاں کی جو تاریخ بھی اٹھائیں، یہ جو ہمارے ہاں کے بڑے بڑے قابل اعتماد مورخ گزرے ہیں حتیٰ کہ ابن خلدون [1]

---

[1] ان کا نام عبدالرحمن بن محمد (1406-1332ء) ہے، لیکن ابن خلدون کے نام سے مشہور ہیں۔

جیسا بھی کہ جس کا مقدمہ تاریخ یورپ میں Philosophy of History (فلسفۂ تاریخ) آج بھی سند مانا جاتا ہے' اتنے بڑے دماغ کا آدمی ہے' وہاں سے جب پھر مذہب کی دنیا میں تاریخ لکھنی شروع کرتا ہے' یورپ کی ہر زبان میں اس کے ترجمے موجود ہیں' نصاب کے طور پر پڑھایا جاتا ہے لیکن جب تاریخ لکھنے پہ آتا ہے تو پھر وہ حضرت آدمؑ کی تاریخ لکھنا شروع کر دیتا ہے حالانکہ تاریخ یا مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے Information (معلومات) کا Source (ذریعۂ سرچشمہ) بتائے' اس کے بغیر تاریخ قابل اعتماد نہیں ہوسکتی۔ لیکن وہ تاریخ لکھی ہوئی ہے اور شروع اس میں حضرت آدمؑ' جنت کا قصہ' جنت سے باہر نکلنے کا قصہ' ان کا روتے پھرتے کا قصہ' کتنے ہزار سال روتے رہے' پھر ملنے کا قصہ' یہ سارا قصہ لکھا ہوا ہے۔ یہ اتنے بڑے مورخ لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ جب ابتدا یہاں سے ہوتی ہے جب تاریخ آگے چلتی ہے تو اسی لیے وہ تاریخ قابل سند ہی نہیں قرار پاتی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں چار پرندوں کا ذکر اور ان کی اصل نوعیت

بہرحال چار پرندے اور چار پرندوں کے نام تک دیئے ہوئے ہیں۔ پھر چار پرندوں کو کیا کیا جائے؟ کہا ہے کہ انہیں ذبح کرو۔ ذبح بھی کر دیا۔ کہا ہے کہ ان کا قیمہ کرو۔ جی! پھر؟ کہا ہے کہ یہ جتنے قیمے ہیں ان کو ملاؤ یعنی یہ نہ ہو جائے کہ بٹیر کا قیمہ الگ ہو' مرغ کا الگ قیمہ ہو' یہ ملا دو۔ ملا دیا جی۔ کہا ہے کہ ان کو چار جگہ مختلف پہاڑیوں کے کونے پر رکھ آؤ۔ رکھ دیا جی! کہا ہے کہ پھر انہیں بلاؤ۔ آواز دی' ایک سیکنڈ کے اندر وہ مرغ کا قیمہ' مرغ بن گیا اور سب اسی طرح وہ پھڑ پھڑاتے ہوئے آ گئے۔ کہا ہے کہ کیوں مُردوں کو ہم زندہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کہنے لگے کہ ہاں سرکار! کر سکتے ہیں۔ یہ ہوا جی۔ اگر آپ ''طلوع اسلام'' پڑھتے ہیں تو پچھلے اگست (1980ء) کے ''طلوع اسلام'' کے جو لمعات تھے' ان میں یہ لکھا گیا تھا کہ قرآن کریم مُردہ قوموں کو زندہ کرنے کی بات کیا کرتا ہے۔

نبوت کی زندگی بھر کی تگ و تاز کا مقصد مُردہ قوم کو زندگی کے حقائق سے آگاہ کرنا ہوتا ہے

مُردہ اقوام کے لیے یہی الفاظ قرآن مجید نے استعمال کیے ہیں۔ اور پھر ان کو زندگی دینے کے لیے' مُردوں کو زندگی دینے کے لیے بھی یہی الفاظ ہیں۔ اس آیت میں ایک لفظ ہے۔ وہ ہے سارا جسے وہ کلیدی (Key) لفظ کہتے ہیں' وہ ساری بات سمجھنے کی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے اور ہر نبی جس قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے' قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ قوم موت کی حالت میں ہوتی ہے' اس مردہ قوم کو زندہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ خدا کا پیغمبر' یہ مشفق معالج' ان کو زندہ کرنے کے لیے دن رات تڑپتا رہتا ہے۔ جان کھپاتا رہتا ہے' وہ اس کی اشد مخالفت کرتے ہیں' سنتے نہیں ہیں' چھوڑ جاتے ہیں' بھاگ جاتے ہیں۔ خدا کی طرف سے پیغمبر سے کہا جاتا ہے کہ اس مُردہ قوم کو زندہ کرنا ہے۔ اب حضرت ابراہیمؑ نے بھی اس مُردہ قوم کو زندہ کرنا تھا۔ سارا قرآن مجید بھرا پڑا ہے کہ انہوں نے کیا کیا

کوششیں کیں اور کس طرح ان کے خلاف ان کا ردعمل کیا ہوا' یہ کس طرح انؑ کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے' دوڑ جاتے تھے' سیٹیاں مارتے تھے۔ یہ کچھ کرنے کے بعد یہاں وہ بات آتی ہے اور یہی ہے وہ اصل چیز۔ 84الصّٰفّٰت۔

حضرت ابراہیمؑ کو وحی کی روشنی میں مُردہ قوم کی رہنمائی کرنا مقصود تھی

کہا ہے کہ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (2:260) کہا کہ تجھے اس پہ ایمان ہے یا نہیں کہ قومیں زندہ ہو سکتی ہیں؟ کہا کہ جب تُو کہتا ہے کہ قوم زندہ ہوتی ہے تو ایمان تو تجھ پہ میرا ہے' میں پوچھتا یہ ہوں کہ کس طرح سے یہ زندہ ہو گی' میں وہ طریقہ سمجھنا چاہتا ہوں۔ ایمان تو میرا یہ ہے کہ یہ زندہ ہونی ہے لیکن اگر میں نے غلط طریقہ اختیار کیا' میری ساری محنت رائیگاں چلی جانی تھی۔ یہ بڑی چیز ہے جو قرآن حکیم نے ہمیں یہاں بتائی ہے کہ اس یقین کے بعد یہ جو دوائی ہے' یہ اثر کرے گی' اس کا طریق استعمال معلوم کرو' اسکا پرہیز معلوم کرو' یہ نہایت ضروری ہے۔ کہا ہے کہ کَیْفَ(2:260)۔ یہ نہیں کہا کہ مجھے یہ یقین اطمینان یا ایمان نہیں ہے کہ تُو کر سکتا ہے یا یہ ہو سکے گا جو تم کہہ رہے ہو' جب تُو نے کہہ دیا کہ قومیں زندہ ہو جاتی ہیں تو میرا اس پہ ایمان ہے' تُو نے کہا ہے کہ یہ ہو جائے گی لیکن میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ میں کیا طریقہ اختیار کروں جو ان کو میں زندہ کروں۔ میں نے اپنی طرف سے جو طریق اختیار کیا ہے' اس میں تو میں تھک گیا ہوں۔ یہ طریق بھی معلوم ہونا بڑا ضروری ہے۔

قرآن کریم نے یہ اصول وقوانین ہی نہیں دیئے' اس کے لیے طریق کار بھی اس نے بتایا ہے۔ اسی لیے اس نے راستہ کہا ہے' صراط مستقیم کہا ہے' منزل ہی صرف نہیں بتائی کہ وہ ہے تمہاری منزل' اس منزل تک پہنچنے کے راستے بھی بتائے ہیں' ایک ہی صراط مستقیم نہیں' سبل بھی بتائے ہیں' پگڈنڈیاں بھی بتائی ہیں جو صراط مستقیم میں جا کر مل جائیں گی' وہ اس نے بتائی ہیں ورنہ صرف یہ جو بات ہے کہ تم نے ریلوے اسٹیشن پہ پہنچنا ہے۔ ایک دیہاتی یہاں آ کر پوچھتا ہے تو آپ یہ کہہ دیتے ہیں کہ تم نے اگر پاکپتن جانا ہے تو ریلوے اسٹیشن پہ پہنچو تو وہ بات ٹھیک تم نے کہی لیکن میں کس راستے سے پہنچوں' کونسا طریقہ اختیار کروں۔ جب تک یہ نہ بتاؤ گے' وہ نہیں پہنچ سکے گا۔ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (2:260) مجھے وہ طریق معلوم کرنا ہے کہ کیسے میں اس قوم کو زندہ کروں۔ ان کی تو صورت یہ ہے کہ میں کھڑا ہو کر آواز دیتا ہوں' یہ بھاگ جاتے ہیں۔

اصل بات وحشی پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کرنے کی تھی

کہا ہے کہ ابراہیمؑ یہ جو پرندوں کو سدھانے والے ہیں' کیا ان کو کبھی تم نے دیکھا ہے؟ ہمارے ہاں تو اب وہ نہیں آتے اور جو لوگ یہاں لاہور میں رہنے والے ہیں' انہوں نے تو انہیں کبھی دیکھا ہی نہیں' ممکن ہے شہر میں شاید اب بھی وہ پرانے طریقے کے کچھ

لوگ ہوں ورنہ ہمارے چھوٹے چھوٹے شہروں کے اندر ''اوہنا نو پکھی واس کیندے ہوندے سن ❶ ''اور ہندی میں انہیں چڑی مار کہتے تھے۔ یہ پرندوں کو پکڑنے والے اور سدھانے والے تھے۔ انکو تو ممکن ہے کہ آپ نے نہ دیکھا ہو۔ اور اب یہاں لاہور شہر میں میرا خیال ہے کہ شاید ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ عام طور پر لالہ جی صبح کے وقت سیر کے لیے نکلتے تھے' ان کے ہاتھ میں پنجرہ ہوتا تھا' یہ عام طور پہ چکور یا تیتر پالتے تھے' ان کو مقدس سمجھتے تھے' کیفیت یہ ہوتی تھی کہ وہ راوی کے کنارے باغات میں سے خالی پنجرہ ہاتھ میں لیے چلے جا رہے تھے' پنجرے کے پیچھے پیچھے تیتر بھاگا ہوا چلا آ رہا ہے' اِدھر اُدھر سے چہچہاتے ہوئے آزاد پرندے اس کو آواز دیتے تھے کہ ارے! تیرا مقام تو آزادی ہے' تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تُو خود اس قید خانے کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہے' وہ آتا تھا اور پنجرے پہ کھڑے ہو کر دروازے پہ چونچیں مارتا تھا' ہم تو روز یہ تماشہ دیکھتے تھے اور وہ چکور یا تیتر پنجرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا جاتا تھا۔ کہا ہے کہ ابراہیمؑ! تم نے دیکھا کہ ایک وحشی پرندے کو سدھانے والا کرتا کیا ہے؟ وہ کس طرح اسے اپنے ساتھ مانوس کرتا ہے؟ ایسا مانوس کرتا ہے کہ اس کے بعد خود فضا کو چھوڑ کر پنجرے کی طرف آتا ہے۔ اب انہیں اپنی طرف مانوس کرنا ہے تو اسکے لیے یوں پتہ مارنا پڑے گا' یہ بڑا صبر آزما مرحلہ ہے' بڑا لمبا مرحلہ ہے' استقامت چاہتا ہے۔ جب بھی کوئی سدھانے والا تھک گیا تو بس ساری محنت ختم ہوئی۔ اس کے ساتھ روز یہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کہا ہے کہ جب یہ کر دیا جاتا ہے تو پھر یہ قوم اس طرح سے گرویدہ ہو جاتی ہے کہ اگر تُو کسی وقت ان کو جھاڑ بھی دے تو پھر بھی وہ تیرا ساتھ دے گی۔

قرآن حکیم میں پرندوں کا قیمہ کرنے کا ذکر نہیں ہے

اصل چیز ان کو اپنے ساتھ مانوس کرنے کی بات ہے۔ یہ یہاں صُرۡهُنَّ (2:260) لفظ ہے جس کو انہوں نے کہا ہے کہ ذبح کرو۔ یہاں یہ لفظ ہے ہی نہیں کہ ذبح کرو اور قیمہ کرو' پھر سنیے! یہاں اس میں یہ ہے نہیں۔ وہ داستان تو بنتی نہیں ہے جب تک ان کا قیمہ نہ کیا جائے' لطف نہیں پیدا ہوتا۔ قرآن حکیم میں ذبح کرنے کا یہ لفظ نہیں ہے۔ یہاں صُرۡهُنَّ ہے۔ اسکے معنی سدھانے کے ہیں۔ کہا ہے کہ انہیں سدھاؤ۔ اور یہ ہے وہ مقام جہاں پھر قلب سلیم حاصل ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! جو کچھ قرآن حکیم نے کہا ہے یا خدا نے کہا ہے' اسکے متعلق یہ بات ہے کہ ہم اعتراضات کا جواب دیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ہم ان شکوک کو رفع کرنا چاہتے ہیں' یہ نہایت ضروری ہے۔ ان کے بغیر قلب سلیم یا قلب مطمئن حاصل ہو نہیں سکتا چونکہ یہ جو ہمارے ہاں کے مذہبی پیشوا ہیں' ان کے پاس جواب نہیں ہوتا' اور جواب ہوتا بھی ہے تو وہ جفر کی طرح ماتھے کے شکن ہیں' آنکھوں کی وہ سرخی ہے' منہ کی جھاک لاحول سے

---

❶ انہیں ''پکھی واس'' (پرندے پالنے والے) کہتے تھے۔

پیدا شدہ ہے اور اس کے بعد کفر کے فتوے ہیں۔ یہ ہے سب کچھ۔ اس کا نتیجہ یہ آج نوجوان کی دین سے برگشتگی ہے۔ کہا ہے کہ ان پرندوں کو سدھا کر دیکھو' سدھایا ہوا پرندہ بھاگ کر کہیں بھی نہیں جاتا ہے۔ 184الصّٰفّٰت

نوجوان نسل کی دین سے برگشتہ ہونے کی بنیادی وجہ اور علاج

یہ جو آپ کے ہاں کا نوجوان آج دین سے برگشتہ ہو رہا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے متعلق لاحول و لا قوۃ سے دل میں شک پیدا ہوتا ہے۔ پہلی چیز تو یہی ہے۔ ارے! اس کے دل میں شک پیدا ہو رہا ہے تو شک کی' پھانس کو نکالو' شک کی بجائے اطمینان دو۔ وہ قلب تو جب ہی مطمئن ہو گا جب یہ شک کی پھانس نکلے گی' ڈانٹ دینے سے تو شک کی پھانس نہیں نکل سکتی بلکہ اور پختہ ہو جاتی ہے۔ پہلے اگر وہ شک تھا تو پھر اس کی بات نفرت میں بدل جاتی ہے۔ دین یوں سمجھایا جاتا ہے' یوں اطمینان دلایا جاتا ہے۔ دین کے متعلق' عزیزانِ من! پھر یہ قلب' قلب مطمئن بنتے ہیں' قلب سلیم بنتے ہیں' جھکنے والے قلب بنتے ہیں۔ پہلی چیز ہی یہ ہے کہ قرآن کریم کی طرف یا دین کی طرف دعوت دینے والا جو ہے' اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے جو خلاف غلط تعلیم پھیلائی ہوئی ہے اس کی وجہ سے ان بچوں کے ذہنوں کے اندر کیا اعتراضات اٹھتے ہیں' کیا شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ جب تک آپ ان کے ان شکوک کو رفع نہیں کریں گے' اعتراضات کا اطمینان بخش جواب نہیں دیں گے' وہ کبھی مطمئن نہیں ہوں گے' وہ کبھی قلب سلیم حاصل نہیں کر سکیں گے۔

حضرت ابراہیمؑ کا قلبِ سلیم اور ان کے گھر کے ماحول کی صورتِ حال

پہلی چیز جو حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے' وہ ان کا قلبِ سلیم ہے۔ اب اس کے بعد اگلی بات یہ آتی ہے کہ اس قوم کی حالت کیا تھی۔ یہ بت پرست قوم تھی۔ یہ ظاہر ہے' خود باپ اس زمانے کا سب سے بڑا Chief Priest (اُسقفِ اعلیٰ) تھا۔ آج تو خواہ یہ مندروں کے پروہت ہوں یا ہمارے ہاں کے مسجد کے یہ ملّا ہوں' انکا کوئی خاص مقام نہیں ہوتا لیکن اس دور کے اندر تو راجے اور بادشاہ کا وہ مقام نہیں ہوتا تھا جو ہیڈ پریسٹ (اُسقفِ اعلیٰ) کا مقام ہوتا ہے یا ان کے ہاں جو پریسٹ (اُسقفِ اعلیٰ) تھے' ان کے مقام ہوتے تھے۔ بت پرستی تھی' اپنے گھر میں یہ کچھ ہوتا تھا' وہ بت ساز تھے جو والد تھے۔ وہ تو خیر بڑی بات تھی۔ گھر سے بات شروع ہوئی: اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ[1] (37:85)۔ یہ قوم کس کس چیز کی پرستش کرتی تھی؟ یہ بتوں کی پرستش کرتی تھی' ستاروں کی پرستش کرتی تھی' انہیں دیوی دیوتا مانتی تھی۔ ہندوؤں کے ہاں اب بھی یہ جو ستارہ پرستی ہے' ان کے ہاں بھی ہے۔ لیکن یہ جو پہلی اقوام تھیں' خاص طور پر یہ جو بابل

---

[1] اس نے (ان کی مخالفت کی پرواہ کیے بغیر) اپنے باپ اور ساری قوم سے برملا کہہ دیا کہ یہ بُت اور اجرام سماوی جنکی تم پرستش کرتے ہو (حتیٰ کہ تمہارا بادشاہ جس کی تم اس طرح محکومیت اختیار کیے ہو) ان کی حقیقت کیا ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1042)۔

184الصّٰفّٰت۔ نینوا کے علاقے کی یا فلسطینی علاقوں کی پہلی قومیں تھیں' یہ ساری بت پرستی کے علاوہ ستارہ پرست قومیں بھی تھیں' ستاروں کی بھی یہ پرستش کرتے تھے' ان کو دیوی دیوتا مانتے تھے۔بتوں کی پرستش کرتے تھے۔یہ تھی وہ قوم جس میں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے اور جس مُردہ قوم کو زندہ کرنے کا فریضہ ان کے سپرد ہوا تھا۔بات تو یہاں سے چلی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی قوم کی دین کی طرف دعوت

سب سے پہلے تو ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کہا' قوم سے کہا' آگے ہے کہ خود بادشاہ کے سامنے جا کر بھی یہ کہا کہ تم انسان ان مردہ پتھروں کی پرستش کرتے ہو' تمہاری سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آتی۔اس زمانے کا بادشاہ بڑا طاقتور تھا' عزیزانِ من! قوم اس زمانے کی یہ تھی' تنہا یہ شخص تھا جو دین اللہ کی طرف آواز دے رہا تھا۔کہا ہے کہ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ(37:86) یہ تمہارے خانہ ساز معبود ہیں جنہیں تم اپنا خدا سمجھ رہے ہو اور حقیقی خدا کو چھوڑ کر ان کے سامنے جھکتے ہو۔ اس آیت میں اس ایک لفظ اَئِفْكًا کی کیا بات ہے! یہ لفظ وہی سے جسے ذہن کا تراشیدہ افسانہ کہتے ہیں۔یہ جو تم خانہ ساز خدا بنائے ہوئے ہو' یہ تمہارے خدا ہیں' تمہارا جو ذہن ہے' یہ ان کو خدا بنائے ہوئے ہے تو یہ خدا بنے ہوئے ہیں۔اگر تمہارا ذہن ان کو پتھر سمجھ لے تو ان کی خدائی ختم ہو جائے گی۔کہا ہے کہ ان کی تو یہ حقیقت ہے' اَئِفْكًا ہے' یہ تمہارے ذہن کا تراشیدہ عقیدہ ہے جو ان کو خدا بنائے ہوئے ہے۔یہ وہ خدا ہیں کہ جب تک ان کے سامنے تم سجدہ کرتے رہو تو یہ خدا ہیں❶؛

تا یکے اندر قیام آئی فنا است

تم اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ' ان کی خدائی ختم ہو جائے گی۔کیا بات ہے صاحب! کہا ہے کہ یہ سارا ائفک ہے' ذہن کا تراشیدہ افسانہ ہے' یہ تمہارے اندر کی عقیدت مندی کا پیدا کردہ ہے' ان میں کچھ نہیں ہے کہ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (37:87) دوسری طرف وہ رب عالمین ہے' اس کے متعلق تمہیں معلوم نہیں کہ تم نے ذہن میں کیا سمجھا ہوا ہے۔یہاں جو بات قرآن مجید نے پہلے کہی ہے' وہ ستارہ پرستی کی ہے کہ وہ ستاروں کی پرستش کرتے تھے۔اب آگے پھر بات آئی کہ خدا اپنے اس نبی کے دل میں یہ حقیقت کیسے واضح کرتا ہے کہ یہ ستارے تو خود مجبورِ محض ہیں' یہ انسانوں کی تقدیروں کے حاکم کیسے بن سکیں گے' یہ صاحب اختیار و اقتدر' یہ نفع نقصان پہنچانے والے کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ تو خود مجبورِ محض ہیں۔یہ بات تھی جو انہیں کہی گئی۔آج یہ باتیں کچھ آسان ہو گئی ہیں کیونکہ اب ان کا علم عام ہو گیا ہے۔

---

❶ ایں خدا تا سجدہ اش کردی' خدا ست تا یکے اندر قیام آئی فنا ست

الصّٰفّٰتِ184

اگر پیر صاحب کو اس کے مرید کچھ کما کر نہ دیں تو یہ پیر بھوکا مر جائے

عزیزانِ من! اس دور کی بات دیکھیے۔ یہ چھ ہزار سال پہلے کی بات ہے۔اس دور میں ان کو یہ چیز سمجھانا کس قدر مشکل تھا' آج بھی یہ لوگ جو بت پرست ہیں' ستارہ پرست ہیں یا ان کی پرستش کرتے ہیں' آپ نہیں سمجھا سکتے' آپ پیر پرست کو نہیں سمجھا سکتے کہ حضرت صاحب کے ہاں کچھ نہیں ہے' وہ تمہارے میرے جیسا آدمی ہے' دو دن کما کر نہ لاؤ تو بھوکا مر جائے۔آپ انہیں نہیں سمجھا سکتے' وہ کہتا ہے: اوتوبہ توبہ توبہ' لاحول و لاقوۃ' اوکیا کہتے ہو بابا! تو چھ ہزار سال پہلے ان کو یہ کچھ سمجھانا کس قدر مشکل تھا۔انہی کی قوم کے اندر یہ نبی پیدا ہوتا ہے۔کیا انداز ہے قرآن کریم کا!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اطمینان قلب کے سلسلہ میں کائناتی حقائق کی وضاحت بطورِ ثبوت

عزیزانِ من! کہا کہ اس کے لیے ایمان' اطمینان اور قلبِ سلیم کس قدر ضروری تھا' انسان کن کن راستوں سے' کن مدارج سے' ایمان' اطمینان اور قلب سلیم تک کس طرح پہنچتا ہے؟ یہاں ستاروں کی بات آئی' افلاک کی بات آئی' اس زمانے میں علم الافلاک کی بات آئی۔ پہلے کہا ہے کہ وَ كَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ (6:76)۔ایمان تو اس کا تھا۔ہم نے کہا تھا کہ ان مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:76) میں اختیار نہیں' الْمُوْقِنِیْنَ ((6:76) کیا ضروری تھا؟ یقین پیدا نے کرنے کے لیے ضرورت تھی؟ ہم نے کیا کیا؟ ہم نے اسے دکھایا کہ یہ جو فضا میں کرّے ہیں' یہ جوارض ہے: مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:76) اس میں خود یہ چیزیں صاحب اقتدار نہیں ہیں' ہم نے ابراہیم ؑ کو دکھایا۔اب نظر آیا کہ یہ ایک اسٹیج ہے یقین تک پہنچنے کے لیے۔کہا ہے تاکہ وہ مُوْقِنِیْنَ (6:76) میں سے ہو جائے' یقین پیدا ہو جائے' نُرِیْۤ (6:76) ہے۔ یہاں یہ محض Abtract Talk (بسیط گفت وشنید) نہیں ہے' یہ Theoretical (نظری سی) بات نہیں ہے' یہ دکھانے کی بات ہے' یوں سمجھانے کی بات ہے۔ کہا ہے کہ یہ دوسرا طریقہ ہے' یہ سمجھانے کا طریقہ ہے! وہ لوگ ان کی پرستش کرتے تھے۔

حضرت ابراہیم ؑ کے متعلق ہماری افسانہ نویسی کی کیفیت

اب یہاں پھر ہماری افسانہ نویسی آ گئی۔قرآن حکیم میں ہے کہ فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (6:77)۔ ہمارے ہاں کے جو داستان گو ہیں' یہ سارے وعظ والے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ حضرت ابراہیم ؑ (نعوذ باللہ) بھی ان ستاروں کی پرستش کرتے تھے' ان کی بھی یہ حالت تھی کہ ستارہ چمکا تو انہوں نے بھی کہا ہے کہ یہ ہمارا دیوتا ہے۔ حضرت ابراہیم ؑ نے بھی کہا کہ ہاں میرا خدا یہ ہے۔ انہوں نے بھی کہہ دیا۔پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا کہ نہیں' نہیں' نہیں' یہ نہیں ہو

سکتا۔ پھر آگے ہے فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ (6:78) چاند نکلا تو وہ اس سے زیادہ چمکدار تھا یعنی انکے ہاں کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے 184الصّٰفّٰت ۔
کہا کہ ہاں ٹھیک ہے' بھئی! مانتا ہوں' یہ ہے معبود۔ گویا خدا کا یہ نبی ان چیزوں کو معبود مانتا ہے' وہ ان کے ساتھ ہی' خدا کا ایک پیغمبر بھی ہے۔ وہ دنیا کے تمام معبودان باطل کو مٹانے کے لیے آ رہا ہے۔ وہ مان رہا ہے کہ خواہ اس کے بعد خود ہی یہ کہہ دے کہ نہیں بابا! لیکن مان تو رہا ہے۔ پھر سورج نکلا۔ اس کے متعلق کہا کہ یہ ہے سب سے بڑا' جب وہ ڈوب گیا تو کہا کہ نہیں۔ قرآن کریم مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:76) سے بات شروع کرتا ہے۔

بات کرنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم اور حضرت ابراہیمؑ کا انداز بیان

قرآن حکیم میں خدا نے کہا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو مشاہدہ کرایا تھا۔ خدا مشاہدہ کراتا ہے کہ کس کا اقتدار ہے اور یہ کہ یہ اقتدار والے نہیں ہیں۔ تو کیا وہی خدا کا پیغمبر ان کو معبود ماننا شروع کر دے گا؟ کیا انداز ہے قرآن حکیم کا بات کے بیان کرنے کا! حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں ایک بات ہمیں نظر آتی ہے۔ ان کے بیان کا جو انداز ہے' بات سمجھانے کا جو اسلوب ہے' وہ دلنشینی کا ہے' وہ بڑا ہی اطمینان بخش ہے' اس کے اندر ایسا Logic (منطق) ہے کہ جواب نہیں بن پڑتا' وہ Logic (منطق) ہے جس میں وہ خواہ مخواہ کٹ حجتیاں نہیں کرتا۔ جب بادشاہ کے حضور پہنچ کر یہ کہا تھا تو پہلی دلیل یہ دی تھی کہ میرا خدا مردہ کو زندہ کرتا ہے' زندہ کو مردہ کر دیتا ہے اور تُو کیا کرتا ہے؟ وہ کہنے لگا کہ میں ابھی کر دیتا ہوں' یہ زندہ انسان ہے میں حکم دیتا ہوں تو تلوار سے اس کی گردن کٹ جائے گی اور یہ وہ ہے' جس کو پھانسی کا حکم ہوا ہے' میں اس کو معاف کر دیتا ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ یہ اس طرح سے اس طرف نہیں آئے گا۔ Logic (منطق) وہ ہے جس کا جواب نہ ہو۔ اس کے بعد انہوں نے آگے کچھ کہا ہی نہیں۔ اچھا! بات یوں کیجیے کہ میرا خدا مشرق سے سورج نکالتا ہے' تم ادھر سے نکال کر بتا دیجیے۔ یہ تھا انداز! Logic (منطق) ایسا ہونا چاہیے کہ کٹ حجتی آگے نہ چلے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ستارہ نکلا ہے' یہ ہے معبود؟ کہنے لگے: اچھا یہ ہے تمہارا جو معبود ہے تم مجھے کہتے ہو کہ میرا معبود ہے' ذرا تھوڑا سا توقف کیجیے' اب وہ ستارہ تھا تھوڑے وقت کے لیے' وہ سامنے رہا' اس کے بعد وہ ڈوب گیا۔ کہنے لگے: سرکار! یہ کہہ رہے ہو مجھے کہ جو معبود تھا اور ابھی نہیں ہے' میں اب اپنے اس خدا کو' معبود کو کہاں ڈھونڈوں' وہ تو ختم ہو گیا۔ اب وہ اس کو نکال کر باہر لانے سے رہے کہ دیکھ لو یہ ہے۔ چاند نکلا تو انہوں نے کہا کہ اس سے زیادہ چمکنے والا ہے' زیادہ دیر پا بھی ہے۔ کہنے لگے کہ یہ معبود ہے۔ کہنے لگے: اچھی بات' اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد جب وہ ڈوب گیا تو کہا کہ کیوں! اس کی بھی تو وہی حالت ہے۔ سورج کے متعلق اس نے کہا۔ انہوں نے کہا کہ بہت اچھا! شام تک انتظار کر لیتے ہیں' انتظار کیا تو ڈوب گیا۔

184الصّٰفّٰت۔

ذاتِ خداوندی کے علاوہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے

کہا ہے کہ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ(6:77) میں تو ایک اصول جانتا ہوں کہ وہ جو کبھی ہے' کبھی نہیں ہے' وہ خدا نہیں ہوسکتا۔ بہت بڑی چیز کہہ گیا ہے۔ جس میں تغیر ہے' جس میں Change آ سکتا ہے' وہ خدا نہیں ہوسکتا' وہ زندہ اور پائندہ نہیں ہوسکتا۔ اور آج پوری دنیا کی سائنس اور فکر اس پہ پہنچی ہے کہ تغیر ہی ہے ساری کائنات کے اندر' Change (تبدیلی) ہے ہر شے کے اوپر' تغیر جاری وساری ہے اور صرف خدا کی ایک ذات ہے جو تغیر سے ماورا اور بلند ہے اور اگر اس ذات کی صفات اپنے اندر منعکس کرتے چلے جاؤ تو انسان کی ذات بھی پھر خارجی تغیرات سے اثر پذیر نہیں ہوتی۔ برگسان (1859-1941ء) کے الفاظ میں "Changelessness in Change" (تغیر میں عدم تغیر) ہوجاتا ہے پھر انسانی ذات اگر صفات خداوندی کو اپنے اندر منعکس کرلے تو تغیرات کی دنیا میں غیر متبدل ہوجاتی ہے۔ تو خدا کی پہلی چیز جو حضرت ابراہیمؑ نے بتائی ہے' وہ یہ ہے کہ ''وہ ایسا نہیں ہو کہ کبھی ہے کبھی نہیں ہے' اس میں تغیر نہیں آنا چاہیے'' میں کسی تغیر آشنا شے کو اپنا خدا ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ دیکھ رہے ہیں کیا انداز اختیار کیا گیا ہے!

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے تھے (معاذ اللہ): بخاری کی ایک حدیث

اب ان کی طرف آیئے' ان کے بڑے بڑے میلے بھی لگتے تھے' یا تو ابھی ہوتی تھی اور یہ تو اب بھی ان کے بڑے بڑے میلے لگتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں جا کر دیکھیے' ہمارے ہاں جو عرس ہوتے ہیں آپ ان کو دیکھ لیجیے۔ وہ اس قسم کا بہت بڑا ایک میلا تھا' ستاروں کا کوئی جشن ہوگا۔ حضرت ابراہیمؑ سے آ کر ان لوگوں نے کہا کہ آپ اس میلے میں چلیے۔ قرآن کریم میں ہے کہ فَقَالَ اِنِّىْ سَقِيْمٌ (37:89)۔ اس آیت کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! میں بیمار ہوں' میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ تو میں نہیں جا سکتا۔ طبیعت اچھی نہیں ہے' چلیے اگر یوں بھی مان لیجیے تو کیا بات ہے صاحب! کہ ٹھیک ہے ہوگا کہ طبیعت مضمحل ہوگی۔ کہا ہے کہ نہیں جناب! اس میں داستان تو بنتی نہیں۔ پھر اس کے بعد لطف کیا پیدا ہوا۔ آپ حیران ہونگے کہ آپ کے ہاں یہ بخاری کی حدیث ہے جس کو سب سے زیادہ صحیح تریں کتاب کہا جاتا ہے۔ اس میں کہا یہ جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین دفعہ جھوٹ بولے تھے۔

نبوت پر ایمان لانے کی پہلی پرکھ: نبی کا صادق ہونا

اول' تو عزیزانِ من! جو نبی کا دعویٰ نبوت ہے' اس کی دلیل ہی یہ ہوتی ہے کہ ہم اسے سچا مانیں اور تو کوئی ثبوت نہیں ہوتا' وہ یہ چیز کہتا ہے کہ خدا کی طرف سے مجھے وحی ملتی ہے' نہ ہم وہ فرشتہ دیکھتے ہیں' نہ وہ آواز سنتے ہیں' ہمیں پتہ کیسے چلتا ہے کہ وہ جو کہے تھے کہ

میں یہ خود کہتا ہوں تو وہ قابلِ اعتماد چیز ہے کہ ٹھیک ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ میں خود نہیں کہہ رہا' خدا کی طرف سے مجھ پہ یہ وحی نازل ہو رہی ہے تو یہ کیسے تسلیم کیا جائے۔ بات تو آگے چلے گی کہ پھر ہم اس وحی کو پرکھ کر دیکھ لیں گے لیکن جب وہ یہ بات کہتا ہے' اگر اس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ یہ جھوٹ بولا کرتا ہے تو پہلی ہی بات پر آدمی اٹھ کر چلا آئے کہ جاؤ جاؤ یہ نہیں ہے۔ نبی کی جو زندگی ہے اس میں بات یوں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میرے دعوئ نبوت کی شہادت چاہتے ہو تو سنو! میں نے چالیس سال تمہارے اندر گزارے ہیں' ان چالیس سال میں تم نے دیکھا ہے کہ کبھی کسی معاملے میں' میں جھوٹا ثابت ہوا ہوں جو آج جھوٹ بولنے لگ جاؤں گا۔ یہ ہے پہلی چیز۔ پہلی بنیادی چیز اس دعویٰ کرنے والے کی کہ وہ اپنی زندگی کے اندر صادق ہو۔ اور پھر قرآن کریم نے تو خاص طور پر انبیائے کرام کو' حضرت ابراہیمؑ کو صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا کہا ہے' صادق بھی نہیں صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا کہا ہے۔ وہ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا ایک نبیؑ صدیق ہے دوسر انبی آخری الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اتنی ہی بلندیوں پر ہے' یہ نبی اس کے متعلق کہہ رہا ہے کہ انہوں نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا' یعنی وہ جھوٹ بولنے والے اور یہ اس جھوٹ کی تائید کرنے والے۔ یا اللہ! پھر وہ جھوٹ گنائے ہیں' ایک تو یہی گنایا کہ وہ اس دن بیمار نہیں تھے۔ انہوں نے جھوٹ ہی کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں۔ یعنی یہ چیز تو ہم بغیر سند کے مان سکتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ بیمار ہوں اور انہوں نے کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں لیکن وہ بیمار نہیں تھے' انہوں نے جھوٹ بولا۔ یہ ایک جھوٹ ہو گیا۔ پھر آگے وہ قصہ اور آئے گا کہ انہوں نے جا کر بت کدے میں ان کے بتوں کو توڑا تھا اور جب ان سے پوچھا کہ تم نے توڑا ہے تو انہوں نے کہا کہ نہیں' یہ جو بڑا بت ہے اس نے توڑا ہے۔ کہا کہ یہ دوسرا جھوٹ ہو گیا۔

پھر اب تیسرا جھوٹ تلاش کرنا پڑا۔ یہ دو باتیں تو بہر حال غلط معنی ہی لیے سہی' یہ دو تو قرآن کریم میں موجود ہیں' تیسری تو ہے ہی نہیں کہ صاحب! جب وہ ہجرت کر کے آ رہے تھے' بیوی ساتھ تھی' بیوی بڑی حسین تھی' مصر کے راستے سے آنا تھا اور معلوم ہوا کہ مصر کا جو بادشاہ ہے وہ جہاں بھی اس راستے سے کوئی اچھی حسین عورتیں گزرتی ہیں ان کو اپنے ہاں پکڑ کر لے جاتا ہے' وہ دوسروں کی بیویوں کو پکڑ کر لے جاتا ہے تو جب یہ حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی بی بی سارہ کے ساتھ ادھر سے گزرے تو اب کیسے بچیں' انہوں نے بیوی سے کہہ دیا کہ تمہیں وہ پوچھے گا تو کہنا کہ میں ابراہیمؑ کی بہن ہوں' بیوی نہ کہنا' پکڑ لے گا۔ تو اس نے بھی بہن کہا اور ان سے بھی جب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ میری بہن ہے تو یہ تیسرا جھوٹ ہو گیا۔ اس بات کا تو ذکر ہی کوئی نہیں ہے' یہ تورات میں ہے' قرآن کریم میں تو اس کا ذکر ہی کوئی نہیں ہے۔ اب دھڑلے سے یہ بخاری شریف کی روایت چلی آ رہی ہے۔

184الصّٰفّٰت۔

بخاری شریف کے متعلق اہل حدیث کے صدر سلفی صاحب کا فرمان

مولانا محمد اسماعیل سلفی (1968-1895ء) جو اہل حدیث جماعت کے صدر تھے' اب ان کا انتقال ہو گیا ہے' وہ لکھتے ہیں کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی کفر ہے تو دیکھیے! مجھے تو کافر ہونے میں شبہ نہیں' میرے خلاف ان ہزار علماء نے کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ اگر آپ نے اس کو کہہ دیا کہ یہ جھوٹ ہے تو یاد رکھو! تھوک کے بھاؤ کافر ہو جاؤ گے۔ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا (نعوذ باللہ) پھر دلیل یہ دی ہے کہ صاحب! یہ اصل میں دین کی خاطر تھا جو یہ جھوٹ تھا۔

مودودیؒ صاحب کی طرف سے جھوٹ بولنے کا فتویٰ

اب یہ بات آ گئی' اب آپ سوچیں گے کہ پھر ان کتابوں کے اندر یہ اس قسم کی روایتیں کیوں رہنے دی گئی ہیں۔ At the face of it (نظر بظاہر یہ باتیں) نظر آتی ہیں کہ بابا! یہ غلط ہیں۔ یہ کیوں رہنے دیں؟ اس سے بڑا فائدہ ہے۔ وہ جو (مولانا سید ابوالاعلیٰ) مودودی مرحوم (1979-1903ء) نے فتویٰ دے رکھا ہے کہ ''راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہوں میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے ❶ (ترجمان القرآن، مئی 1958ء) یعنی یہ جائز ہی نہیں ہے کہ آپ کا جی چاہے تو جھوٹ بول لیں بلکہ یہ واجب ہو جاتا ہے- واجب کے معنی ہوتا ہے کہ اگر اس کو ترک کیا جائے تو گناہ ہوتا ہے یعنی ''اوہدوں اگر سچ بول دیوتے پھڑے جاؤ گے'' ❷۔ کہنے لگے کہ صاحب! اس کی دلیل کیا ہے؟ مودودی مرحوم کہنے لگے کہ وہ جو بخاری کی حدیث ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا تو ضرورت کے لیے بولا تھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے بولا تھا اب میں جو کہہ رہا ہوں کہ ٹھیک ہے' اس کی سند تو مل گئی۔ اس لیے ان کتابوں میں یہ چیزیں رہنے دی گئی ہیں۔ اور جو پہلی بات حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہی تھی کہ مجھے دکھا تو دو کہ تُو مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے تو میں نے بات آپ کو بتا دی۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان پر حضرت ابراہیمؑ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شک تھا (معاذ اللہ)

بخاری شریف میں ہی ایک حدیث ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو اس میں شک تھا کہ خدا زندہ کر سکتا ہے یا نہیں کر سکتا؟ انہیں اس زندہ کرنے پر شک تھا اور آگے ہے' عزیزانِ من! کلیجہ پھٹ جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **نحن اشک**

---

❶ نیز دیکھیے طلوع اسلام جنوری 1968ء' ص۔3۔

❷ اگر اس وقت سچ بول دو گے تو پکڑے جاؤ گے۔

الصّٰفّٰت 184 ہم تو اِن سے بھی زیادہ شک کرنے کے مستحق ہیں۔ عزیزانِ من! یہ انبیائے کرامؑ کے قصے بیان ہو رہے ہیں۔ مِن ابراھیم ہم ابراہیمؑ سے بھی زیادہ شک کرتے ہیں۔ وہ خدا کا نبیؐ ہے' اسے بھی شک تھا اور یہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں کہ

لفظ ''سقیم'' کا مفہوم ''بیزار ہونا'' ہوتا ہے

صاحب! یہ لفظِ سقیم (37:89) کیا ہے؟ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ایک ایک ستارے کے متعلق اس قوم کو Logically (منطقیانہ طور پر) بتا رہے ہیں' Rationally (وجہ جواز سے) بتا رہے ہیں' مشاہدے سے بتا رہے ہیں کہ ابھی تھا' ابھی نہیں ہے' جو تغیر پذیر ہے' وہ خدا نہیں ہوسکتا' تغیر پذیر کو میں پسند ہی نہیں کرتا۔ یہ جو سقیم کا لفظ ہے' انگریزی زبان میں آپ نے یہ سنا ہوگا کہ I am sick of it ❶ یعنی یہ کسی چیز سے انتہائی بیزاری ہوتی ہے' اس کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ عربی زبان میں بھی یہی ہے۔ سقیم کے معنی ہی یہ ہیں۔ یہ انتہائی بیزاری کی چیز ہے' یہ الگ بات ہے کہ کوئی بیمار بھی ہو۔ تو انی سقیم کے معنی ہیں کہ میں تم کو بار بار سمجھا چکا ہوں' بتا چکا ہوں کہ بابا! یہ تمہارے ستارے' یہ تمہارے چاند' تارے' یہ تمہارے معبودان باطل (اَئِفْکًا)' تمہارے ذہن کے تراشیدہ ہیں۔ تمہیں میں بتا چکا ہوں کہ میں انہیں پسند نہیں کرتا I am sick of them (میں ان سے سخت بیزار ہوں)' تم مجھے کہتے ہو کہ ان کے تہوار میں جاؤ۔ وہ تو اس چیز کا اعلان ہے' او! اس میں یہ جھوٹ کونسا آ گیا۔

''سقیم'' کے اس مفہوم کی وضاحت خود قرآن حکیم سے

میں نے کہا ہے کہ قرآن حکیم تو خود تصریف آیات سے اپنا مفہوم واضح کر دیتا ہے۔ یہاں سقیم کہا ہے کہ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ (60:4)۔ یہاں برءٔو لفظ آ گیا صاحب! اس کا ترجمہ یہ ہے کہ میں بیزار ہوں' میں تم سے اور تمہاری ان حرکتوں سے بیزار ہوں کہ تم انسان جیتے جاگتے ہوئے' ان کو معبود بناتے ہو اور میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم اپنا معبود سمجھ رہے ہو۔ آپ دیکھیے! وہاں سقیم ہے' یہاں بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ (60:4) میں قرآن حکیم خود واضح کر رہا ہے کہ سقیم کے معنی یہاں کیا ہیں؛ میں ان سے بیزار ہوں اور تم مجھے کہتے ہو کہ ان کے جشن میں جاؤ اور میں تمہیں بار بار بتا چکا ہوں کہ میں تم سے بھی اور تمہارے ان معبودوں سے بھی بیزار ہوں۔ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ (37:90) انہوں نے یہ سنا تو منہ پھیر کر چل دیئے۔ اب یہ جو چیز ہے کہ منہ پھیر کر چل دیئے' یہیں سے وہی بات آ گئی کہ وہ ان کو سننا ہی نہیں چاہتے تھے' ان کے پاس Rationale کا' ان کے اس Reason کا' ان کی اس Logic کا' جواب دے نہیں سکتے تھے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ چلو بابا! یہ تو وہی اس کی ضد پڑی ہوئی ہے' پاگل ہو گیا ہے' باتیں کرتا ہے' اس سے کون مغز کھپائی

---

❷ میں اس سے انتہائی بیزار ہوں۔

کرے۔ اگلی بات پھر وہ آئی کہ فَرَاغَ اِلٰٓی اٰلِهَتِهِمْ (37:91) یہ نہیں کہ اسی وقت یہ بات ہوئی ہے۔ وہ ان کے سامنے ان کے بتوں الصّٰفّٰتِ184 سے تعریضاً کہتا ہے' وہ ان کے غلط عقائد کو بے نقاب کرنے کے لیے ایک اور انداز اختیار کرتے ہیں۔

بتوں کی بے بسی کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کی پکار کا انداز

قرآن کریم مختلف مقامات پر یہ داستانِ حضرت ابراہیمؑ بیان کرتا ہے' مختلف مقامات پہ اس کے ٹکڑے لاتا ہے۔ کہا ہے کہ دوسرے وقت میں وہ ان کے ساتھ ان کے بت کدے میں گئے' وہ بھی اس لیے کہ ان کو بات سمجھانی تھی کہ یہ بے بس ہیں' یہ تو اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے' یہ تمہیں خطرات سے کیا بچائیں گے' یہ تمہیں کیا نفع نقصان پہنچائیں گے۔ انہیں یہ بتانا تھا۔ کہا ہے کہ فَرَاغَ اِلٰٓی اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۔ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ (37:91-92) ان کے سامنے چلے گئے' بتوں کو دیکھا۔ اب وہ تو بتوں کے حضور بہت سی چیزیں لاکر رکھتے ہیں' پھول تو خیر نچھاور کرتے ہی ہیں' کھانے پینے کی جو چیزیں ہیں وہ لاتے ہیں' نذر نیاز کی چیزیں لاکر رکتے تھے' آپ بھی تو قبروں پہ لے کر جاتے ہیں۔ وہ چیزیں' ہاں! ان کے بتوں کے سامنے رکھی ہوئی ہیں۔

اب یہ انہیں سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ پتھر ہیں۔ ان سے کچھ نہیں کہتے' ان بتوں سے کہتے ہیں کہ کیوں بڑے میاں! کھاتے کیوں نہیں ہو' نظر نہیں آتا کہ آپ کے سامنے کیسی عمدہ عمدہ مٹھائیاں رکھی ہیں۔ کیا انداز ہے! انہیں بتانے کی بات ہے کہ ان کی پوزیشن یہ ہے۔ ان سے نہیں کہتے کہ تم نے یہ رکھی ہیں۔ یہ کھاتے نہیں' معبودوں سے کہتے ہیں کہ کھاتے کیوں نہیں ہو۔ کہا ہے کہ بھئی! بولتے کیوں نہیں ہو؟ ارے! کچھ جواب دو۔ بڑا انداز ہے ان کا!

قرآن حمید کہتا ہے کہ پھر اس کے بعد ایک دن ایسا بھی اتفاق ہوا کہ وہ گئے' یہ لوگ کہیں باہر گئے ہوئے تھے' وہاں سناٹا سا تھا' فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًام بِالْيَمِيْنِ ۔ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ (37:93-94) انہوں نے ایک کا بازو توڑا' دوسرے کا ہاتھ توڑا۔ یہ وہ بت شکنی نہیں ہے جس کا اعتراض کیا جاتا ہے' وہ تو میں نے کہا ہے کہ ایسی قوم کو اس انداز سے' محسوس طریقوں سے' سمجھانے چلے آرہے تھے کہ یہ شرفِ انسانیت کے خلاف ہے کہ اس قسم کے بتوں کو' پتھروں کی مورتوں کو' اپنا خدا بنالیا جائے۔ کہا ہے کہ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ (37:95) کہا کہ سوچو تو سہی' اس میں تو پتھر ہوتا ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا' تم اپنے ہاتھ سے اس کو گھڑ کر خدا بنا دیتے ہو یعنی اس پتھر کو اگر تم چاہو تو کچھ بھی بنا سکتے ہو۔ سنگ تراش اس میں سے چیزیں بناتا ہے۔ کہنے لگے کہ تم نے اس کی شکل کچھ آدمی سی بنا دی ہے' اوخود اپنے ہاتھ سے تراش کر اس کی شکل ایسی بناتے ہو پھر اس کے سامنے سجدے کرنے لگ جاتے ہو' کچھ تو سوچو۔ کہا ہے کہ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (37:96) خدا نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور ان پتھروں کو بھی' جنہیں تراش کر تم اپنے لیے یہ معبود بنا لیتے ہو۔

یہی بات کہی۔ بہر حال دوسری جگہ یہ ہے کہ ان مورتیوں‘ بتوں کے توڑنے پر بڑا شور مچا‘ طوفان برپا ہوا۔ وہ تو چاہتے تھے کہ کسی طرح ان 184الصّٰفّٰت۔ پر ہاتھ ڈالیں‘ ابھی تک ایسا موقع نہیں ملتا تھا‘ یہ ایسا موقع ملا‘ عوام کو مشتعل کرنے کے لیے یہ بڑی چیز سامنے آ گئی کہ دیکھو! تمہارے خداؤں کو اس نے کیا کر دیا۔ صاحب! کسی کے بت کی عام لفظی توہین ہی برداشت نہیں کی جا سکتی‘ اشتعال دلانے کے لیے یہ بڑی چیز ہوتی ہے چہ جائیکہ یہ کچھ کیا جائے۔

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کی وضع کردہ داستان کی نوعیت اور قرآن حکیم کا فرمان

قرآن حکیم نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ ان لوگوں نے کہا کہ بھئی! یہ ٹنٹا ختم کرو اور تو کوئی صورت نظر ہی نہیں آتی‘ ساری قوم متفقہ طور پہ یہ فیصلہ کر لے‘ یہ Resolution (قرارداد) پاس کر لے کہ انہیں جلا دو۔ اور دوسری جگہ ہے کہ اسے جلاؤ اور اس طرح اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ یعنی ان کی مدد کرو‘ وہ بیٹھے ہیں۔ قرآن حکیم نے یہاں اتنا سا ہی کہا ہے کہ **قَالُوا ابۡنُوۡا لَهٗ بُنۡيَانًا فَاَلۡقُوۡهُ فِى الۡجَحِيۡمِ** (37:97) انہوں نے کہا کہ اس کے لیے بھٹی بناؤ‘ آگ سلگاؤ‘ اس میں ڈال دیتے ہیں‘ یہ بھسم ہو جائے گا‘ بس یہ ایک طریقہ ہے۔ بڑا جوش تھا‘ بڑا غصہ تھا‘ بڑا غضب تھا‘ بڑا اشتعال تھا۔

عزیزانِ من! اب پھر ہمارے ہاں کے داستاں گو آ گئے۔ تفسیروں میں آپ پڑھیے کہ یہ ایک فرد ہے‘ ایک انسان ہے‘ صرف اس کو جلانا ہے‘ آپ تفسیر پڑھیے‘ پتہ نہیں کتنے میل لمبی چوڑی یہ ایک عمارت بنائی‘ دیواریں بنائیں‘ اس کے اندر پھر پتہ نہیں کتنے مہینے تک وہ لکڑیاں جمع کرتے رہے۔ یہاں یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں کی عورتیں منت مانتی تھیں کہ میرے ہاں یہ بچہ پیدا ہو جائے تو میں اتنی لکڑیاں جا کر ڈالوں یعنی اس قوم نے یہ کچھ کیا اور وہاں اتنی لکڑیاں جمع کیں کہ وہاں انبار لگ گیا۔ اب آئی اصل چیز کہ بھئی! ٹھیک ہے لکڑیاں جمع کیں‘ آگ لگائی‘ بھڑک اٹھی‘ ڈال دیا۔ آگے پھر وہ معجزہ آ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو پھول بنا دیا اور یہ بچ گئے ان لوگوں کے سامنے‘ جنہوں نے یہ سب کچھ کیا‘ اتنے بڑے شعلے والی آگ میں ڈالا اور آگ پھول بن گئی اور وہ کافر کے کافر ہی رہے۔ یعنی یہ آخری چیز ہے جو دکھادی جائے۔

آگ لگانے کے لیے آخر گرگٹ کی خدمات حاصل کرنا پڑیں

اب ادھر آ کر پھر ہمارے داستاں گو آئے کہ سب کچھ کر دیا‘ اتنی لکڑیاں جمع کر دیں‘ یہ سب کچھ ہو گیا‘ اب ان لکڑیوں کو آگ نہیں لگ رہی ”کتھوں گلّیاں توڑ لیاندیاں ہوندیاں“ ❶ کہ جی آگ نہیں لگ رہی۔ بڑے جتن کیے‘ کچھ نہیں ہو سکتا۔ پھر بخاری شریف آ گئی۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ گرگٹ ہوتی ہے‘ اور چڑیا گھر والا وہ جو اتنا گلپھڑ پھلاتا ہے جس کو گرگٹ کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ کچھ نہ بن پڑا تو

---

❶ کہیں سے گیلی لکڑی کاٹ لائے ہونگے۔

گرگٹ آیا‘ اس نے اپنی دھونکنی شروع کی۔ وہ جو اس کے گلپھڑے پھولتے ہیں‘ وہ دھونکنی ہے‘ اس کے دھونکنے سے اسے آگ لگ گئی
اور اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گرگٹ جہاں ملے تم اس کو مار دیا کرو کہ اس نے ابراہیمؑ کی آگ کو دھونک کر جلایا تھا اور وہ جل گئے تھے۔ گرگٹ کو مارنے سے ایک شہید کا ثواب ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اس بخاری شریف میں ہے۔

آگ کے اس سلسلہ میں قرآن حکیم کی وضاحت اور لفظ نجات کا قرآنی مفہوم

قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ ان کے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دلائل کا جواب کچھ نہ تھا‘ اس لیے وہ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے۔ انہوں نے باہمی مشورہ کیا کہ اس ''فتنہ'' کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک عمارت بناؤ اور اس کے اندر اسے آگ میں ڈال دو۔ یہ اس سورۃ کی 97 ویں آیت کا مفہوم ہے۔ اور اس کی اگلی ہی آیت ہے۔ کہا ہے کہ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا (37:98) وہ کسی خفیہ تدبیر کا ارادہ کر رہے تھے ''کید'' خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں اور ''ارادوا'' خود کہہ رہا ہے کہ وہ ابھی اس چیز کا ارادہ کر رہے تھے۔ یہاں تو یہ ہے کہ فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ (37:98) ہم نے ان کے ارادوں کو ہی ناکام بنا دیا۔ کیا کیا تھا؟ اس کے متعلق دو جگہ ہے۔ ایک تو نَجَّيْنٰهُ (21:71) ہے کہ وہ اس قسم کے ارادے ہی کر رہے تھے‘ ارادوں کو ناکام کیسے بنایا؟ یہاں لفظ نَجَّيْنٰهُ (21:71) آیا ہے۔ نجات کے معنی ہوتا ہے کسی خطرے میں پڑنے سے پہلے ہی اس سے دور لے جانا‘ اس کو محفوظ کر دینا‘ یہ نہیں کہ اس کے اندر چلا جائے اور پھر وہاں سے نکال لینا‘ وہ ہونے ہی نہ دینا اور اس سے پہلے ہی خطرے سے محتاط کر دینا۔ یہ کیا صورت تھی؟ یہ کس طرح سے ہوا تھا؟

حضرت ابراہیمؑ کی دوسرے مقام کی طرف ہجرت

قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ یہ ارادے ہی کر رہے تھے کہ ہم نے ناکام بنا دیا اور ابراہیمؑ کو اس خطرے سے محفوظ کر دیا جس کے اندر وہ ڈالنا چاہتے تھے۔ یہ ہے نَجَّيْنٰهُ (21:71) کہ ہم نے انہیں اس سازش سے محفوظ کر دیا‘ ہم وہاں سے ان کو ہجرت کے ذریعے سے اس ملک سے نکال کر لے گئے۔ قرآن کریم میں یہ دوسری جگہ موجود ہے۔ کہا ہے کہ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ (29:26) اور یہ انبیائے کرامؑ کی زندگیوں میں سنت ہے‘ یہ طریق ہے جو خدا اختیار کرتا ہے‘ ہر عظیم خطرہ جب اپنی انتہائی (Extreme) حالت پہ پہنچ جاتا ہے‘ اس وقت پھر یہ صورت ہوتی ہے کہ وہ نبی اس وطن کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس طرح سے ان کے جو ارادے ہیں‘ وہ ناکام رہ جاتے ہیں۔ قریب قریب ہر نبی کی داستان میں قرآن کریم نے بتایا ہے‘ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری ہجرت بھی یہی ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا ہے کہ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ (29:26) دیکھو! میں گیا اپنے خدا کی طرف۔

اور پھر عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو اپنے خدا کی طرف جانا ہے‘ اس میں یہ نہیں ہے کہ یہاں خدا نہیں تھا اور وہ وہاں تھا‘ جہاں وہ جا رہے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس مقام میں تو خدا کا ماننے والا کوئی نظر ہی نہیں آیا‘ میں یہاں سے چھوڑ کر وہاں جاؤں

گا جہاں کی فضا خدا کے نظام کے قیام کے لیے سازگار رہے۔ اور یہ وہاں اپنے وطن کو چھوڑ کر فلسطین کی طرف ہجرت کر کے آ گئے 184 الصّٰفّٰتِ۔ اور قرآن مجید نے کہا ہے کہ آپ بھی اور ان کے ساتھ ان کے بھتیجے حضرت لوط بھی تھے اور ان کے رفقاء بھی تھے۔ وہاں سے وہ وطن چھوڑ کر ہجرت کر کے چلے گئے‘ خدا نے ان کی اس سازش کو ناکام بنا دیا۔

اب سوال ہی نہیں کہ وہ اس میں ڈالے گئے ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض مفسرین کے مطابق وہ چالیس دن رہے‘ بعض کے مطابق پچاس برس رہے۔ پوچھو تو سہی کہ Source of Information (ذریعہ معلومات) کیا ہے صاحب! کہ چالیس دن رہے‘ پچاس دن رہے۔ اور بھی ہیں داستان گو جو کہتے ہیں کہ وہ آگ تو بھڑکا دی‘ اب وہ اتنی اونچی دیواریں بنا دی تھیں‘ اتنی اونچی وہ لکڑیاں تھیں کہ اب ان کو اس میں ڈالیں کیسے؟ یہ اور مصیبت آئی۔ یہ اہتمام ایک آدمی کو آگ میں ڈالنے کے تھے۔

روایات کے تحت حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کا طریق

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آگ میں کیسے ڈالیں۔ وہ کسی دوسری جگہ کا غالباً وہ ایران کا ہی کوئی انجینئر تھا۔ وہ جیسے آپ کے ہاں کرین ہوتے ہیں‘ اس زمانے کے اندر منجنیقیں ہوتی تھیں جو ایک چیز کو یوں پھینکتی تھیں۔ اس نے آ کر ایک منجنیق بنائی‘ کرین سا بنایا‘ اس منجنیق کے ساتھ ان کو باندھ کر پھر جیسے یہ توپ گولہ پھینکتی ہے‘ اس طرح سے ان کو الٹا کر کے پھر اوپر سے پھینکا اور اس طرح وہ اس آگ کے اندر گئے اور پھر اس کے بعد وہ آگ پھول بن گئی‘ گلزار بن گئی۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ ہم نے انہیں اس خطرے میں پڑنے ہی نہیں دیا‘ اس سے پیشتر ہی ان کو بچا کر لے گئے۔ کہا ہے کہ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ (37:99) وہ وہاں سے ہجرت کر کے دوسرے مقام پہ چلے گئے اور آگے وہ قصہ آتا ہے کہ وَقَالَ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَهۡدِیۡنِ (37:99) میں وہاں [1] گیا جہاں میرے پروردگار کے نظام کے قیام کے لیے ماحول سازگار تھا۔ پھر وہاں وہ مجھے بتائے گا کہ یہ جو سارا مشن ہے‘ وہ کس طرح کامیاب ہوگا۔

کہا ہے کہ رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ (37:100)۔ یہاں پھر اگلی بات شروع ہوتی ہے کہ وہاں جا کر اس نے کیا دعا مانگی‘ وہاں جا کر پھر کس طرح سے ان کے ہاں بیٹے پیدا ہوئے اور اگلی آیتوں میں پھر دو چار ذرا سخت مقامات آتے ہیں تو وہ ہے حضرت اسماعیلؑ کے ذبح کرنے کا واقعہ۔ اس میں بھی جو کچھ زیب داستان کیا ہوا ہے‘ وہ ہمارے سامنے آئے گا۔

عزیزانِ من آج تو وقت ہو گیا۔ ہم سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت 99 تک آ گئے‘ 100 ویں آیت سے ہم آگے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

---

[1] حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں سے ہجرت کر کے شام کی طرف چلے گئے تھے‘ جہاں ان کے مشن کو بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص 1043)

184 الصّٰفّٰت۔

پانچواں باب: سورۃ الصّٰفّٰت (آیات 100 تا122)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرۡنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیۡمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعۡیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی
فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ
الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾ فَلَمَّاۤ اَسۡلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلۡجَبِیۡنِ ﴿۱۰۳﴾ۚ وَ نَادَیۡنٰهُ اَنۡ یّٰۤاِبۡرٰهِیۡمُ ﴿۱۰۴﴾ۙ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡیَا ۚ اِنَّا
کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡبَلٰٓـؤُا الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۰۶﴾ وَ فَدَیۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۰۷﴾ وَ تَرَکۡنَا
عَلَیۡهِ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾ۖ سَلٰمٌ عَلٰۤی اِبۡرٰهِیۡمَ ﴿۱۰۹﴾ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا
الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱۱﴾ وَ بَشَّرۡنٰهُ بِاِسۡحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۱۲﴾ وَ بٰرَکۡنَا عَلَیۡهِ وَ عَلٰۤی اِسۡحٰقَ ؕ وَ مِنۡ
ذُرِّیَّتِهِمَا مُحۡسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ مُبِیۡنٌ ﴿۱۱۳﴾ۚ وَ لَقَدۡ مَنَنَّا عَلٰی مُوۡسٰی وَ هٰرُوۡنَ ﴿۱۱۴﴾ۚ وَ نَجَّیۡنٰهُمَا وَ قَوۡمَهُمَا
مِنَ الۡکَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۱۱۵﴾ۚ وَ نَصَرۡنٰهُمۡ فَکَانُوۡا هُمُ الۡغٰلِبِیۡنَ ﴿۱۱۶﴾ۚ وَ اٰتَیۡنٰهُمَا الۡکِتٰبَ
الۡمُسۡتَبِیۡنَ ﴿۱۱۷﴾ۚ وَ هَدَیۡنٰهُمَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ﴿۱۱۸﴾ۚ وَ تَرَکۡنَا عَلَیۡهِمَا فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۱۱۹﴾ۙ سَلٰمٌ عَلٰی
مُوۡسٰی وَ هٰرُوۡنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۲۲﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1980ء کی 12 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت 100 سے ہو رہا ہے: (37:100)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سلسلۂ کلام مختلف انبیائے کرام ؑ کے کوائف حسنہ سے ہوتا چلا آ رہا تھا اور آخر میں حضرت ابراہیم ؑ کی داستان حیات کے کچھ واقعات سامنے آئے تھے اور وہی سلسلہ آج بھی آگے جاری رہے گا۔

سب حضرات انبیائے کرامؑ پر ایمان لانا فرض ہوتا ہے' اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہو نہیں سکتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے الصّٰفّٰت 184 پہلے کے تمام انبیائے کرامؑ پہ پہلے ایمان لانا پڑتا ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہ ایمان لاتا ہے تو اس طرح سے مسلمان ہوتا ہے۔ اور ان میں سے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (2:285) ان کے رسول ہونے کے اعتبار سے ایک دوسرے میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خدا کے رسول تھے' وہ نبی تھے لیکن ان کے دائرۂ تعلیم و انقلاب کی رو سے بعض کو بعض پر فضیلت ہوتی ہے۔ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (2:253) قرآن کریم ہی کا قول ہے۔ یہ جو فرق ہے اس میں خود قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا مقام بہت اونچا ہے۔ وہ اتنا اونچا مقام ہے کہ قران کریم میں دو ہی ہستیاں ہیں جن کی زندگی کو اسوہ یعنی ماڈل قرار دیا گیا ہے۔ ایک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور دوسرے حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اس اعتبار سے آپ دیکھیے کہ حضرت ابراہیمؑ کی داستانِ حیات کی جو کڑیاں ہونگی وہ بڑی غور طلب ہونگی کیونکہ انہیں بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ ہمارے لیے اسوہ ہیں' ماڈل ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے دور میں مذہبی پیشوا کا مقام سر براہِ مملکت سے بھی اونچا تھا

اب اس میں جو کچھ سلسلہ چلا آ رہا تھا' یہاں تک ہی پہلے دیکھ لیجیے۔ آپ اس باپ کے گھر میں پیدا ہوئے جو اس دور کا ہیڈ پریسٹ تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ ہیڈ پریسٹ آج کا وزیر اعظم تو ایک طرف رہا' اس زمانے میں تو سر براہِ مملکت سے بھی زیادہ اختیارات اس کے پاس ہوتے تھے۔ یہ جو مذہبی پیشوا تھا' اس کا بنایا ہوا راجہ' راجہ بنتا تھا یا بادشاہ' بادشاہ بنتا تھا۔ یہ لوگ تھے بڑے ہوشیار' یعنی گائے کے سینگ تو راجہ کے ہاتھ میں دیتے تھے اور سارا دودھ خود دوہتے تھے' ذمہ داریاں ساری اس کی اور مفاد جتنے تھے سب سے زیادہ ان کے ہوتے تھے۔ ایسے ہیڈ پریسٹ کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ وراثت کے اعتبار سے اس منصب کا اہل تھا۔

حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ اور وقت کے بادشاہ کے سامنے دعوتِ حق کے ساتھ

وہ ہیڈ پریسٹ کا یہ منصب ان کو آنا تھا۔ یہ اتنا بڑا منصب ہے لیکن آپؑ نے پہلی چیز جو کی ہے' وہ خود باپ کے خلاف کی ہے۔ آپؑ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ خدا کی یہ وحی ہے جو میں پیش کرتا ہوں' اس کی بڑی تعلیم کو تو چھوڑ دیجیے' عقل و فکر سے کام لے کر تو بتایئے کہ ان بتوں میں یہ رکھا ہے کہ ایک پتھر ایک چٹان کا ٹکڑا ہے' اس میں کچھ بھی نہیں ہے' تم اپنے ہاتھوں سے اس کو تراش کر ایک شکل دیتے ہو اور جب وہ کچھ تھوڑی بہت شکل' جس قسم کی بھی ہو جاتی ہے' آتی ہے تو تم اس کی پرستش شروع کر دیتے ہو۔ آپ وہ ہندوؤں کے اب بھی بتوں کو دیکھیے کہ ان کی کس قسم کی گھناؤنی شکل ہوتی ہے۔ کچھ بھی ہو' شکل تمہارے اپنے ہاتھ کی دی ہوئی ہوتی ہے اور اسے تم خدا مان کر سجدہ کرتے ہو۔ کہا کہ تم ذرا عقل و فکر سے ہی کام لے کر دیکھو تو سہی۔ یہ باپ سے کہا جا رہا ہے۔ آپ سوچ لیجیے کہ یہ بات کہاں تک

پہنچتی تھی۔ باپ کو معلوم تھا کہ یہ کتنا خطرہ ہے جو یہ شخص مول لے رہا ہے۔ اس نے کہا کہ یاد رکھو! باز آ جاؤ ورنہ تمہیں گھر سے نکال دوں گا۔ اس نے کہا کہ یہ تو بات ہی کچھ نہیں ہے' اس گھر میں' میں رہنا ہی کہاں چاہتا ہوں جہاں اپنے ہاتھوں کی تراشی ہوئی مورتیوں کے سامنے جھکنا پڑے اور سجدہ کرنا پڑے۔ اور یہ بات بادشاہ تک پہنچی ہے۔ اندازہ لگائیے نمرود اور فرعون ❶ تو دنیا کے اندر اپنے جور و ستم اور جبر کے لیے مشہور ہیں۔ نمرود ❷ جیسا بادشاہ ہے اس کے ہاں پہنچتے ہیں اور وہاں کھڑے ہو کر بھی اس کو کہتے ہیں' اسی قسم کی بات اسے نہایت عمدہ دلائل کے ساتھ سناتے ہیں اور قرآن مجید کہتا ہے کہ اس قدر اسے شرمندہ ہونا پڑا کہ وہ بات ہی آگے نہیں کر سکا۔ بادشاہ کے آگے یہ کچھ دربار میں ہو رہا ہے اور پھر پوری قوم ہے۔ اس ساری قوم کو للکارا جا رہا ہے' ان کے بتوں کو توڑا جا رہا ہے۔ وہ یہاں تک ارادہ کرتے ہیں کہ اسکو پکڑو اور جلا دو۔ وہاں سے اپنا وطن چھوڑنا پڑتا ہے' ہجرت کر کے آنا پڑتا ہے' وہ دوسرے وطن میں آ جاتے ہیں۔ ایک صداقت کی آواز ہے جس کو بلند کرنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ تمام مرحلے طے کرتے چلے آ رہے ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش اور دعائے حضرت ابراہیم علیہ السلام

اب یہاں آئے تو ایک اور مرحلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہجرت کر کے آ گئے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ بڑھاپے کی عمر تک ان کے ہاں اولاد نہیں تھی' دعائیں کیں' حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے' جوان ہوئے۔ یاد رکھیے! یہ سب سے پہلے جو بیٹے تھے وہ حضرت اسماعیلؑ تھے' ان کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اب یہ ایک واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے' وہ ہے جسے ہم حضرت اسماعیلؑ کا ذبح کرنا کہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں یہی ہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد یعنی ہجرت کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (37:100) تُو عنایت فرما مجھے ایسا بیٹا جو صالحین میں سے ہو۔ ہر نیک آدمی کی پہلی دعا یہ ہوتی ہے کہ اولاد دے اللہ تعالیٰ تو نیک اولاد دے' سعادت مند اولاد دے۔ اور پھر صالحین کا لفظ اتنا جامع ہے کہ جس کی انسانی صلاحیتیں بھرپور ہو چکی ہوں' صلاحیت بھی اس کے اندر ہو' صالحیت بھی اس کے اندر ہو تو اولاد مانگنے کے ساتھ ہی پہلی دعا ہی یہ ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام صفتِ حلیم کے مالک تھے:

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ (37:101) ہم نے پھر اس کو ایک بیٹے کی بشارت دی اور وہ بیٹا حلیم تھا۔ یہ جو حلیم ہے' یہ خدا کی صفت بھی

---

❶ فرعون اور خاندانِ فراعنہ کے لیے دیکھیے: پرویزؒ مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ طٰہٰ' (مدیر: ڈاکٹر منظور الحق) طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص 119' نیز فٹ نوٹ 1' نیز مطالب الفرقان فی دروس القرآن' سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص 109' اور فٹ نوٹ 1۔

❷ نمرود کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ النور' (مدیر: ڈاکٹر منظور الحق)' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007ء فٹ نوٹ 3' ص 216۔

آئی ہے' حضرت ابراہیمؑ کی بھی ہے اور انبیائے کرامؑ کی بھی ہے۔ ہمارے ہاں تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ حلیم کسے کہتے ہیں۔ یہ وہ ہیں 184 الصّٰفّٰت ۔ ہے"کہ اوہدا دانہ وی ہن نہ ❶ رڑکے"۔ مومن کو تو "رکنا" پڑتا ہے اور پھر ابراہیمؑ جیسا! یہ عربوں کے ہاں کا بڑا جامع لفظ ہے۔ یہ جو کمزور قسم کے خواہ وہ انسان ہوں' خواہ وہ یہ جانور ہوں' وہ بڑے جذباتی اور زود مشتعل ہوتے ہیں' کمزور آدمی بڑی جلدی غصے میں آ جاتا ہے' چھوٹی چھوتی باتیں بھی برداشت نہیں کرسکتا لیکن اگر وہ بھرپور توانائیوں میں ہو' اس کو اتنی جلدی غصہ نہیں آتا' وہ اتنی جلدی مشتعل نہیں ہوتا۔ اس کے اندر سہار ہوتی ہے' برداشت ہوتی ہے۔ ان عربوں کے ہاں یہ صورت تھی کہ ایسے اونٹ جو بھرپور توانائیوں کے مالک ہوں' نہایت عمدہ تندرستی ہو' نہایت اعلیٰ درجے کی توانائیاں ان کے اندر ہوں تو اس اونٹ کی صورت یہ ہوتی تھی کہ وہ بیٹھا جگالی کر رہا ہے' وہ بچے آ رہے ہیں' کوئی اس کی گردن پہ چڑھ رہا ہے' کوئی اس کی پیٹھ پہ سوار ہو رہا ہے' کوئی اس کے کان کھینچ رہا ہے اور وہ نہایت مزے سے جگالی کیے جاتا ہے۔ اونٹ ایک دولتی مارے اور بچے یوں لڑھک جائیں لیکن وہ یہ نہیں کرتا' وہ ان سب چیزوں کو برداشت کرتا ہے کہ بچے ہیں' کوئی بات نہیں' کرتے چلے جائیں۔ اور جب وہ اپنا فریضہ انجام دینے کا وقت آئے گا تو پھر یہ سب سے آگے ہوگا۔ جس میں یہ صفت ہوتی تھی' کہا کہ اتنا بردبار ہو کہ چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے اوپر مشتعل نہ ہو جائے' اس کے اندر سہار ہو لیکن جب فرائض کی سرانجام دہی کا وقت آئے تو پوری توانائیوں سے کام لے۔ اسے وہ حلیم کہا کرتے تھے۔ خدا نے بھی اپنی یہ صفت رکھی ہے۔ کہا یہی ہے کہ اگر ہمیں بھی اس طرح سے' یہ کمزور انسانوں کی طرح یوں غصہ آ جائے تو یہ دنیا میں جو کچھ انسان کر رہے ہیں ان میں سے ایک بھی باقی نہ رہے۔ بات ٹھیک ہے' اگر اتنی جلدی غصہ آ جائے تو بس پھر ختم ہے لیکن وہ یہ نہیں ہے کہ وہ حلیم ہوتا ہے تو "رڑکتا" نہیں ہے' وہ توانائیاں تو بھرپور ہوتی ہیں۔ جب ان کی نمود کا وقت آتا ہے تو پھر وہ بھرپور توانائیوں سے بھی کام لیتا ہے۔ وہ حلیم ہوتا ہے۔ کہا کہ فَبَشَّرۡنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيۡمٍ (37:101) ایسے بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری دی جو بھرپور توانائیوں کا' صلاحیتوں کا مالک ہوگا لیکن بڑی سہار اور بردباری اس کے اندر ہوگی۔ اس سہار اور بردباری کا تو پہلا ہی واقعہ یہاں آ گیا کہ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعۡىَ (37:102) وہ بیٹا جو بھاگنے دوڑنے کے قابل ہوا' جوان ہوا تو باپ کے ساتھ کام کاج کرنے کے قابل ہوگیا۔

حضرت ابراہیمؑ کا حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کا خواب اور حضرت اسماعیلؑ کا جواب

کہا کہ قَالَ يٰبُنَىَّ اِنِّىۡۤ اَرٰى فِى الۡمَنَامِ اَنِّىۡۤ اَذۡبَحُكَ (37:102)۔ اب یہاں یہ جو بات ہے' یہ حضرت ابراہیمؑ کی ایک چیز خصوصیت سے آ رہی ہے۔ خواب میں دیکھ رہے ہیں' کہا کہ بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔

---

❶ کہ اسے کوئی کچھ بھی نہ سمجھے۔

یادرکھنا! یہ خواب میں دیکھا ہے۔اب یہ خواب کی جو چیز ہے' ہم آپ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے کس انداز سے اس کی تعبیر کی۔ انہوں الصّٰفّٰت 184
نے یہ کہا کہ یہ غالباً اشارہ (خداوندی) ہے۔قرآن کریم میں یہ کہیں نہیں ہے کہ خدا نے ان کو ایسا کرنے کا حکم دیا تھا' وہاں اتنا ہی تھا کہ انہوں نے خواب میں ایسا دیکھا۔ بیٹے سے پوچھا کہ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی (37:102) میں نے تو خواب ہی دیکھا ہے' تم ذرا غور وفکر کے بعد بتاؤ' تمہارا اس معاملے میں کیا خیال ہے تو بیٹے کا ابھی بتایا ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کا مالک تھا۔قرآن کریم نے کہا کہ قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (37:102) بیٹے نے کہا کہ آپ نے مجھ سے اسی لیے پوچھا ہے کہ میرا معاملہ درمیان میں آرہا ہے' آپ کا تو یہ ہے کہ آپ نے ذبح کرنا ہے' تو مجھے تو ذبح ہونا بھی ہے۔اب یہاں حضرت اسماعیلؑ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ آپ کو خدا کا حکم ہے تو پھر آپ کو اس میں قطعاً پس وپیش نہیں کرنا چاہیے۔میرے ہی متعلق بات ہے کہ خدا کا حکم ہے' اس کی تعمیل کرنے کے اندر' میں راستے میں نہ حائل ہو جاؤں یعنی آپ کرنا بھی چاہیں اور میں کہوں کہ میں تیار نہیں ہوں تو پھر تو تعمیل نہ ہو سکے گی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' اگر یہ خدا کا حکم ہے' آپ کو' تو میں اس کی تعمیل کرنے کے راستے میں حائل نہیں ہوں گا۔ میں تیار ہوں۔

یہ حضرت ابراہیمؑ کا اپنا ایک خواب تھا' خدا کا حکم یا وحی نہ تھی

قران کریم میں دو تین مقامات کے اوپر یہ بات آئی ہے اور اسی طرح سے آئی ہے کہ یہ حکم کی بات نہیں ہے' از خود یہ چیز ہے جو کہی گئی ہے اور بیٹے نے کہا کہ اگر ایسا ہوا تو آپ دیکھیں گے کہ میں اس کو برداشت کرلوں گا۔ فَلَمَّآ اَسْلَمَا (37:103)۔یہ دیکھیے یہاں اَسْلَمَا کا لفظ آیا ہے' اسی سے اسلام ہے۔ان دونوں باپ بیٹا نے اپنی دانست میں یہ سمجھ کر سر تسلیم خم کر دیا کہ یہ خدا کا حکم یا کم از کم اس کی طرف سے یہ اشارہ آیا ہے کہ وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (37:103) اور ذرا سے اونچے سے مقام پر' کسی ذرا سے بڑے ٹیلے' پر کنپٹی کے بل' بیٹے کو باپ نے لٹا دیا۔اس کے بعد لٹا بھی دیا ہے۔اب ظاہر ہے کہ ذبح کرنے کے لیے سیدھا نہیں لٹاتے' اس طرح سے لٹاتے ہیں تا کہ یوں چھری پھر جائے۔

باپ بیٹے کے پروگرام کی تکمیل سے پہلے وحی کا نزول: یہ تو تمہارا اپنا خواب تھا

یہاں تک وہ جو مقام ہے' پہنچ رہا ہے۔اب اگلی بات آتی ہے' جہاں سے نظر آتا ہے کہ یہ خدا کا حکم نہیں تھا' اپنے خواب سے انہوں نے خود ہی یہ خواب کی تعبیر نکالی کہ مجھے ایسا کرنا چاہیے کیونکہ جب عین ایسا وقت آیا ہے' اب ادھر سے بھی اللہ تعالیٰ کا پروگرام بھی عجیب وغریب ہے کہ اس سے پہلے ہی ابراہیمؑ سے نہیں کہہ دیا کہ یہ خواب کی بات ہے' تم خواہ مخواہ اس کو سچ سمجھ رہے ہو' اس کو چلنے دیا ہے کہ بہر حال باپ بیٹا ہیں' دیکھیں اس میں کہاں تک جاتے ہیں۔جب آخری مقام آتا ہے تو لٹا بھی دیا ہے اور اس کے بعد تو ظاہر ہے

کہ چھری ہاتھ میں ہوگی' عین اس وقت کہا کہ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ۔ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا (5-104:37) ابراہیم! ارے تُو نے الصّفّٰت 184
خواب کو سچا ہی سمجھ لیا۔ یہاں بات ساری واضح ہو جاتی ہے۔ کہا کہ یہ خواب کی بات تھی تُو نے سچ مچ ہی ذبح کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہاں ''ندا'' دی ہے۔ اگر خدا کا حکم یا خدا کی طرف اشارہ ہوتا تو جب وہ اس مقام تک آ پہنچے تو یہاں آنے کے بعد یہ کہنا کہ یہ تمہارا خواب تھا' تم نے خواہ مخواہ ہی اس کو سچ مچ ہی سچا کر دکھا دیا۔ یہ بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ اگر یہی بات ہوتی تو یہ کہا جاتا کہ یہ ٹھیک ہے' ہم نے حکم دیا تھا' اشارہ دیا تھا' تم نے ہمارے حکم کی تعمیل میں انتہائی فرماں برداری کا ثبوت دیا ہے' اللہ تمہیں خوش رکھے بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ تمہیں خواب آیا اور تم نے اس خواب کو سچا ہی سمجھ لیا۔ کہا کہ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (37:105) جو اس طرح سے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنے والے یا اپنی زندگی میں اس قدر حسن اور توازن پیدا کرنے والے ہوتے ہیں' ان کو ہم اس طرح سے بدلا دیتے ہیں کہ اس قسم کی چیزوں سے انہیں محفوظ بھی رکھ لیتے ہیں۔

وحی اور خواب میں فرق کی نوعیت

اب یہاں اس واقعہ میں یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا' خواب کی تعبیر اپنے ذہن سے یہ پیدا کی کہ اس میں خدا کا حکم یا اشارہ ہے۔ اس واقعہ کے اوپر عام طور پر یہ چیز آتی ہے کہ اب خواب ہی ہوتا ہے' اس کی تعبیریں قیاس پہ مبنی ہوتی ہیں' یہ ایک قیاس ہے۔ اس پہ اعتراض یہ کیے جاتے ہیں کہ صاحب! یہ دیکھیے کہ انہوں نے خواب دیکھا تھا بہر حال یہ ایک کا خواب تھا۔ یہ سوچیے! اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ یہ نبی یا رسول اللہ ہیں' اس میں شبہ نہیں ہے۔ ایک چیز تو خدا کی طرف سے وحی پہنچانے کا منصب ہوتا ہے۔ اس میں وہ کوئی غلطی نہیں کرتا' اس میں اس کی اپنی فکر کا' اپنے شعور کا' اپنے کسب و ہنر کا' کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ تو خدا کی طرف سے وحی کے الفاظ آتے ہیں اور وہ آگے پہنچا دیتا ہے' خود بھی ان پہ ایمان لاتا ہے' دوسروں کو بھی کہتا ہے کہ اس پہ ایمان لاؤ۔ ایک تو اس کا یہ منصب ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ نبی کا' رسول کا' کردار یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے احکام کی کبھی معصیت نہیں کرتا۔ یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ رسول معصوم ہوتا ہے۔ معصومیت کے معنی یہ ہیں۔ معصوم کا تو لفظ ہی وہ ہے جس میں معصیت کی بات آتی ہے یعنی وہ احکامِ خداوندی کی کبھی معصیت نہیں کرتا' کبھی ان سے سرکشی نہیں برتتا' دانستہ اس سے معصیت نہیں کرتا۔ نبی کی یہ دوسری صورت ہے۔ یہی اسکی بلندئ کردار اور حسنِ سیرت ہوتی ہے۔ باقی جو معاملات ہیں' ان کے تدبیری امور کو آپ نے اجتہادات کے ذریعے سے' قیاسات کے ذریعے سے' طے کرنا ہوتا ہے۔ نبی نے یہ بھی کرنا ہوتا ہے لیکن اب وہ نبی کی پوزیشن میں یہ نہیں کر رہا ہوتا۔ نبی کی حیثیت میں تو یہ ہے کہ اس پہ وحی آتی ہے' وہ اس پہ عمل بھی کرتا ہے' عمل کراتا بھی ہے۔ اب اس عمل کرانے کے جو طریقے ہیں' یہ تدبیری ہوتے ہیں' ان کو اجتہادی کہتے ہیں۔

وہ عقل وفکر کی رو سے یہ ساری چیزیں کرتا ہے۔ اس کے اجتہاد میں، اس کے قیاس کے اندر، غلطی بھی ہوسکتی ہے، اس میں جنگ کرنا پڑتی 184 الصّٰفّٰت ہے۔ کسی وقت اس کے اندر اجتہادی غلطی ہوتی ہے تو شکست بھی ہوجاتی ہے، نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ چیز اس کے منصبِ رسالت یا منصبِ نبوت کے منافی نہیں ہوتی۔

حج کا فریضہ ادا کرنے کے سلسلہ میں نبی اکرمؐ کا خواب

قرآنِ کریم جو رسول کے متعلق بار بار کہتا ہے کہ وہ تمہاری طرح کا ایک بشر ہے، تو بشریت کا یہ مقام تو کہیں آتا ہے، یہ نبوت کا مقام نہیں ہے۔ بشریت کے مقام کے اندر یہ چیزیں آجاتی ہیں اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو قابل اعتراض ہو۔ اگرچہ اس کی تاویلیں تو اور بھی ہوسکتی ہیں لیکن روایات میں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خواب کے متعلق یہ چیز آتی ہے اور بخاری میں آتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں ہجرت کر کے آگئے تھے تو مکے والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کا، مسلمانوں کا کعبے میں آنا بند کر دیا تھا حالانکہ حج وہ چیز تھی جس میں کسی قسم کی کسی پہ کوئی بندش نہیں ہوتی تھی۔ یہ ایسا مقام تھا کہ جس کا جی چاہے وہاں کعبے میں جائے لیکن انہوں نے خاص طور پر ان کے خلاف یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ یہ نہیں آسکتے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس تمام دوران میں حج کرنے کے لیے بھی نہیں گئے حالانکہ کعبہ تو اسلام سے پہلے، جاہلیت کے زمانے میں بھی، عربوں کا مرکز تھا لیکن قریش نے ان پر اتنی سختی برت رکھی تھی کہ یہ حج کرنے کے لیے بھی نہیں جاتے تھے۔ دل میں بڑی آرزو تھی، بڑی تمنائیں تھیں اور بڑی خواہش ہوتی تھی۔ یہ جسے حدیبیہ کی صلح (628ء) کہتے ہیں، اس میں ہوا یہ کہ ایک دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کی جماعت کے ساتھ حج کرنے کے لیے تشریف لے جارہے ہیں۔ اور آپ نے حج کیا۔ روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات عام کر دی تو اس سے زیادہ مقامِ مسرت کون سا تھا، جشن تھا، خوشی تھی۔ صحابہؓ کی ایک پوری جماعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساتھ کے چل پڑی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم گئے لیکن جب وہ مکے سے باہر ہی ایک منزل ادھر پہنچے ہیں تو قریش نے وہیں روک دیا کہ ہم آپ کو آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے پھر حج نہیں کرنے دیا، یہ بغیر حج کیے واپس لوٹ آئے۔ ان سے صلح نامہ ہوا، اس کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں کہ وہ اس کے بعد آسکتے ہیں، اس سال وہ حج نہیں کر سکتے۔ اور یہ چیز ہے کہ بغیر حج کیے واپس آئے۔ اس سے یہ بات پیدا ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہی تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ہم جارہے ہیں اور حج کر رہے ہیں تو وہ خواب تو صحیح نہ نکلا۔ قرآن حکیم میں یہ چیز ہے۔ کہا کہ ایک تو یہ ہمارا حکم نہیں تھا، ہمارا فیصلہ نہیں تھا جو تم نے خواب میں دیکھا اور خواب میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اسی سال حج کر لو گے۔ یہی چیز تھی کہ دل میں ایک آرزو ہے، خواب کی کیفیت بھی یہی ہوتی ہے۔

184الصّٰفّٰت۔

خوابوں کی ماہیت اور پھر آرزوں اور حسرتوں کا نفسیاتی پہلو

عزیزانِ من! میں دوسری طرف نکل جاؤں گا اگر میں بتاؤں کہ آج کل نفسیاتی طور پہ خوابوں کے متعلق اب کیا کیا انکشافات ہو رہے ہیں۔ یہ عجیب وغریب علم ہے لیکن بہرحال ایک چیز ہوتی ہے کہ دل میں شدت آرزو ہوتی ہے۔ وہ انسان کے نفس غیر شعوری کے اندر چلی جاتی ہے۔ جب رات کو سوتے میں انسان کا جو شعور ہوتا ہے، وہ معطل ہو جاتا ہے تو پھر وہ تمنائیں' آرزوئیں' حسرتیں جنہیں (مرزا اسداللہ خان) غالب (1867-1769ء) بعض اوقات ''ناکردہ گناہ'' بھی کہتا ہے، وہ ساری چیزیں پھر خواب کی شکل میں آتی ہیں۔ان کی اتنی ہی حیثیت ہوتی ہے یہی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حج کرنے کی شدتِ تمنا تھی، وہ خواب کی شکل میں یوں آئی اس میں یہ بات بھی نہیں تھی کہ یہ کہا گیا ہو کہ اسی سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج کریں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلے سال حج کیا ہے تو اس وقت یہ کہا گیا ہے کہ خدا نے تمہارے خواب کو سچ کر دکھایا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اسی سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج کر لیتے۔

خواب بہرحال خواب ہوتا ہے وحی یا خدا کا حکم نہیں ہوتا

میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ خواب ہوتے ہیں' خدا کے احکام نہیں ہوتے۔اگر اس کی تعبیر میں نبی کا کوئی قیاس ہوتا ہے تو قابلِ اعتراض بات نہیں ہوتی۔خدا کے احکام کی تفسیر میں' نبی غلطی نہیں کرتا' ان کی تعمیل میں غلطی نہیں کرتا۔وہ جو اس کے تدبیری طریقے ہوتے ہیں یا اپنے طور پر اس کے لیے اسکیم بنانی ہوتی ہے تو اسمیں سقم بھی رہ جاتا ہے' کمزوری بھی رہ جاتی ہے پھر تجربہ کے بعد اس کو رفع بھی کیا جا سکتا ہے۔رسول کی یہ حیثیتیں سامنے رکھنی چاہئیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے خواب کی تاویل کے متعلق ارشادِ نبوی

عزیزانِ من! یہ تھی وہ چیز جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت میں بھی آئی کہ ایک خواب آیا اور قرآن حمید نے جب یہ کہا ہے کہ ابراہیمؑ! تم نے اپنے خواب کو سچ مچ ہی حقیقت سمجھ لیا تو خدا جب یہ کہتا ہے تو بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ خدا کا حکم بھی نہیں تھا اور حضرت ابراہیمؑ کی یہ تاویل کہ میں بیٹے کو سچ مچ ذبح کر دوں' خود خدا نے یہ کہہ دیا کہ یہ بات نہیں تھی۔وہ خواب تھا' سچ مچ یہ بات یوں کرنے کی نہیں تھی لیکن یہ جو اسوہ ابراہیمیؑ ہے کہ اپنے طور پہ ہی سہی' سمجھ لیا کہ بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں اور اس کے ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے' یہ ایک بڑی عظیم چیز ہے۔ظاہر ہے کہ اپنے خواب کی بنا پر ہی وہ اس پہ تیار ہو گئے۔اگر سچ مچ کسی وقت خدا کا حکم آ جائے تو کونسا ایسا مقام ہے جس میں یہ نبی تعمیل ارشاد باری تعالیٰ میں پیچھے رہ جائے گا۔اپنے ذہن سے فیصلہ کر کے جو یہاں تک پہنچ گیا ہے اگر کسی چیز کے متعلق خدا کا حکم

ہوجاتا تو یہ کہیں پیچھے نہیں رہے گا۔ یہ ہے وہ چیز جو قرآن حمید نے کہی ہے۔ 184الصّٰفّٰتِ۔

ذات باری تعالیٰ کسی کی آزمائش نہیں کرتی بلکہ انسان اپنے آپ کو آزماتا ہے

کہا کہ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِیۡنُ (37:106)۔ ہمارے ہاں قرآن کریم میں الۡبَلٰٓؤُا کے یہ الفاظ آتے ہیں' ابتلا کا لفظ آتا ہے۔ یہ ہمارے ہاں اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ وہاں اردو میں اس کے معنی آزمائش ہوتا ہے۔ عربی میں معنی آزمائش نہیں کرنے چاہئیں۔ آزمائش کی یہ بات غلط ہے۔ عام طور پہ آپ ترجموں کے اندر دیکھیں گے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو آزمایا ہے' ہم اپنے مومن بندوں کو آزماتے رہتے ہیں۔ خدا ہے اور اپنے بندوں کو آزماتا رہتا ہے' تعجب خیز ہے' ہم اپنے دوستوں کو آزماتے ہیں۔ کس دوست کو آزماتے ہیں؟ جس پہ کامل یقین نہ ہو کہ واقعی وہ سچ مچ پورا اترے گا یا نہیں۔ ایسے دوست کو پھر آخر میں کہتے ہیں کہ ''میں تے ایویں آزماندا ساں تینوں [1]''۔ خدا تو کسی کو آزماتا نہیں۔ اسے تو ہر ایک معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیا ہے' کیا کرے گا' پورا اترے گا یا نہیں اترے گا۔ ''آزمانا'' اس لفظ کے معنی نہیں ہوتا۔ یہ لفظ بڑی عظیم چیز ہے۔

عزیزانِ من! خدا کسی کو نہیں آزماتا' وہ زندگی کے اندر ایسے مواقع پیدا کرتا ہے جس میں انسان خود اپنے آپ کو آزماتا ہے کہ میں کہاں کھڑا ہوں' اس میں اپنا ٹیسٹ ہوتا ہے' خدا اس کو ٹیسٹ نہیں کرتا۔ اور یہ کہا ہے کہ اپنا ٹیسٹ کرتے رہا کرو' یونہی اپنے ذہن میں نہ سمجھ لو کہ کوئی بات نہیں ہے' کوئی بھی وقت آ گیا' کسی قربانی کا بھی وقت آ گیا تو میں اس پہ پورا اتروں گا۔ ذہن میں یہ کہتے ہی نہ رہا کرو۔ اس قسم کے ٹیسٹ کے مواقع آتے ہیں' ان میں اپنے آپ کو ٹیسٹ بھی کرتے رہا کرو۔ یہ تو خود انسان کا امتحان خویش ہے' محاسبہ خویش ہے' اپنی خودی کے متعلق دیکھنا ہے کہ اس نے کتنی پختگی حاصل کر لی ہے ورنہ اپنے ذہن میں ہم سمجھے بیٹھیں کہ نہیں نہیں بالکل ٹھیک ہے صاحب! کوئی بھی مشکل آ کر پڑے گی تو ہم اس پہ پورا اتریں گے۔ اب یہ بات الگ ہے کہ اپنے آپ کو فریب دے لیا جائے۔

اگر کبھی اپنی خود کی پختگی کو دیکھنا مقصود ہو تو کبھی کبھی کسی پتھر کو ہلا کر دیکھ لینا چاہیے: قصہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا

اس بوڑھے آدمی سے کہا گیا کہ پہلوان! اب تم بہت بوڑھے ہو گئے ہو' اب وہ دم خم نہیں رہا ہے جو جوانی میں تھا۔ کہنے لگا: بالکل نہیں' یہ غلط ہے' آج بھی وہی بات ہے۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ہماری تو آج بھی وہی بات ہے۔ کہنے لگے: اچھا کیا تم وہی بات دکھا سکتے ہو؟ کہنے لگا کہ ہاں' دکھاتا ہوں۔ اکھاڑے میں چلے گئے۔ ایک بہت بڑا پتھر پہلوانوں نے اکھاڑے کے کنارے

---

[1] میں تو ایسے ہی آپ کو آزما رہا تھا۔

رکھا ہوا ہوتا ہے' وہ اس کو ہلاتے رہتے ہیں۔ گئے' جا کر اس پتھر کو یوں کیا' وہ ہلا ہی نہیں۔ کہنے لگے کہ دیکھا! یہ نہیں ہلا۔ کہنے لگا کہ عمر 184 الصّفّت میں کوئی فرق نہیں آیا' یہ جوانی میں بھی نہیں ہلا کرتا تھا۔''کدی کدی پتھراں نوں ہلا کے ویکھ لینا چھید اہیگا [1] ''۔ یہ ہے جو قرآن حکیم یہاں کہتا ہے۔ اس کے لیے میں نے جو مفہوم اپنے ہاں لکھا ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ خدا آزمائش خویش کے مواقع بہم پہنچاتا ہے' تم اپنے آپ کو ٹیسٹ کرتے جاؤ اور بڑی ضروری چیز ہے کہ اپنے آپ کو ٹیسٹ کرنے کے مواقع زندگی میں آتے چلے جائیں۔ خواب ہی سہی' یہ ایک بہت بڑا موقع تھا اپنے آپ کو ٹیست کرنے کا اور یہاں بھی ابراہیمؑ پورا اترا کہ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ (37:106) یہ محاسبہ خویش کے لیے ایک بہت بڑا موقعہ تھا جو ابراہیمؑ کی زندگی کے اندر آیا۔ میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ قرآن کریم نے ان تمام مواقع کو اکٹھا کر کے بات کیا کہی ہے۔ اگلے الفاظ ہیں کہ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (37:107) لٹا دیا ہوا ہے' یہ چھری ہاتھ میں لی ہوئی ہے' آواز دی ہے کہ ابراہیمؑ! تم نے خواب کو ہی سچا سمجھ لیا ہے۔ اگلے لفظ کے اندر بڑی عظمت آتی ہے کہ اسماعیلؑ کو ہم نے اس چھری سے اس وقتی قربانی سے بچا لیا جو ایک منٹ میں ختم ہو جانی تھی۔ اسے ہم نے بچا لیا' ایک ایسی قربانی کے لیے زندہ رکھ لیا جو اس کی ساری زندگی میں بھی رہنی تھی' اس کی نسلوں تک رہنی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ ہجرت کر کے شام فلسطین کے میدانوں میں آ گئے ہوئے تھے اور وہاں ان کی اپنی مملکت' بادشاہت تھی۔ قرآن کریم نے ملک عظیم کہا ہے اور وہ حضرت اسماعیلؑ کے حصے میں آنی تھی۔ خدا کے ارشاد کے مطابق حضرت ابراہیمؑ وہاں اسے نکال کر عرب کی سرزمین میں' حجاز میں' لے آئے۔ یہ حجاز اور عرب اور خاص طور پر یہ جو ٹکڑا ہے' جہاں آج کعبہ بنا ہوا ہے' یہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں تو ایک طرف رہا' وہاں یہ جو تیل کے چشمے نکلے ہیں یا یہ زمین جو سونا اگل رہی' یہ ابھی کل کی بات ہے' اس سے پیشتر وہ حجاز والے جو آپ احباب میں سے حج کرنے گئے ہیں' انہوں نے بھی دیکھا ہوگا اور یہاں تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ سارے وہاں کے وہ عرب سر کے اوپر عمامہ باندھے ہوئے' یہاں آیا کرتے تھے۔ کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارہ ہوتا تھا' خیرات مانگا کرتے تھے' اس ملک میں ہوتا کچھ نہیں تھا' وہاں پانی نہیں ہوتا۔ وادیٔ غیر ذی زرع تو قرآن حکیم نے خود اس کو کہا ہے۔ کہا کہ اسماعیلؑ یہ قربانی تو ایک منٹ میں ختم ہو جانی تھی' ہم نے تمہیں بچایا ہے۔ اب وہ فلسطین کے سبزہ زاروں کی ملکِ عظیم کی بادشاہت کی بجائے اس وادیٔ غیر ذی زرع کے اندر تمہیں بیٹھنا ہو گا' یہاں ہمارا ایک گھر بنانا ہوگا' اس گھر کی تولیت تمہارے حصے میں بھی آئے گی اور تمہاری اولاد بھی اس گھر کی نگران رہے گی۔ کہو ابراہیمؑ یہ قربانیٔ عظیم تھی یا وہ تھی جو تم کرنے لگے تھے؟ عمر بھر کی قربانی' یہ بڑی قربانی ہے۔ چنانچہ اسماعیلؑ کو وہاں بسا دیا۔ دوسرا بیٹا جو

---

[1] کبھی کبھی پتھروں کو ہلا کر بھی دیکھ لینا چاہیے۔

حضرت اسحٰق ؑ تھے ان کی نسل جن کے حصے میں وہ بادشاہت آئی جنہیں آپ بنی اسرائیل یا بعد میں یہودی کہتے ہیں' یہ بنی اسرائیل الصّٰفّٰتِ 84 تھے۔ اور یہ بنی اسماعیل تھے جو حجاز میں عربوں کے ہاں بسے ہیں۔ یہ حضرت اسماعیل ؑ کی اولاد تھی۔ خود بھی اسی طرح سے غیر ذی زرع کے اندر' پتہ نہیں' کیسے یہ لوگ بیچارے گزارہ کرتے تھے۔ اور پھر ان کے بعد ان کی نسل اس وقت سے لے کر آج تک وہ نسل یعنی اب تو میں نے کہا ہے کہ ایک یہ حادثہ ہوا ہے جو وہاں خوشحالی پیدا ہوگئی ورنہ کل تک ان کی یہی صورت تھی۔ آج بھی ان کے ان شہروں کو چھوڑ کر وہاں باہر چلے جایئے' وہی کیفیت ہے۔ اس سارے عرصے کے اندر شام فلسطین میں بادشاہتیں ملیں اور یہاں اسماعیل ؑ اور ان کی اولاد کے حصے میں یہ چیز آئی۔ اسے کہا کہ ہم نے اسماعیل ؑ کو ایک بہت بڑی قربانی سے بچا لیا۔ کہا کہ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ (37:108) یہ وہ چیز تھی جو اسماعیل ؑ تک ہی محدود نہیں رہی' اس کے بعد آنے والوں کے لیے بھی یہ چیز آگے چلی۔ یہ تھی وہ قربانی۔ قرآنِ کریم نے یہی کچھ کہا ہے۔ اب ہماری تفسیریں آتی ہیں کہ یہ جو ہم نے اسماعیل ؑ کو بچا لیا اور اسکی جگہ ذبح عظیم ایک دیدی' اسماعیل ؑ کی جان کا فدیہ دیدیا۔ اور پھر فدیہ والی' صدقہ والی بات ہمارے ہاں چلی ''سر صدقہ دے ایہدا'' اوصدقہ کی ہونداے اے: کالا بکرا''❶۔ یہ کیا تو ہم پرستیاں ہیں!

حضرت اسماعیل ؑ کی نسل در نسل کی اس قربانی کے برعکس ہمارے ہاں کا تفسیری بیان

اب آئی ہمارے ہاں کی تفسیر کہ جب حضرت ابراہیم ؑ ذبح کرنے لگے تو بیٹے نے کہا: ابا جان: میری آنکھوں پہ بھی پٹی باندھ دیجیے' اپنی آنکھوں پہ بھی پٹی باندھ دیجیے تا کہ ذبح کرتے وقت کہیں پدری محبت جوش نہ کر جائے اور میں آپ کو افسردہ نہ دیکھ سکوں گا۔ وہ پٹی باندھ کر چھری چلانے لگے' چھری چلا دی' ذبح کر دیا' پٹی کھولی تو دیکھا کہ اسماعیل ؑ تو اسی طرح سے بیٹھے مسکرا رہے ہیں' ایک مینڈھا ہے وہ اس کے اوپر چھری چلی ہوئی ہے۔ وہ جبریل ؑ جنت سے لے آئے اور وہ لٹا دیا۔

جنت میں ذبح ہونے والے مینڈھے کی غذا کے سامان کی تفصیل

پھر میں اس حضرت مینڈھا کی بات سناؤں جو ان تفسیروں میں آتی ہے تو پوچھو نہیں کہ وہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کس قسم کے جنت میں اس کے لیے سبزے اور گھاس اور پھل ہیں اور وہ گاندھی ❷ کی بکری کی طرح کیا کیا کچھ ہے۔ چوں نہ بیند حقیقت رہِ افسانہ زدند قصہ چلا ہوا ہے۔

-----

❶ اس کے سر کا صدقہ دو' وہ صدقہ کیا ہوتا ہے؟ جی یہ کالا بکرا ہوتا ہے۔

❷ موہن داس گاندھی (1948-1869ء) کی بکری مشہور تھی۔

184 الصّٰفّٰتِ ۔

یہ سارا افسانہ تورات کا بیان کردہ ہے جو بعد میں ہمارے ہاں وارد ہوا

یہ بات تورات سے آئی لیکن ہمارے ہاں تو یہ نہیں لکھا کہ تورات سے ہم یہ لکھ رہے ہیں۔ میں نے بار بار آپ سے کہا ہے کہ سب سے بڑی قیامت جو ہمارے ہاں آتی ہے‘ وہ یہ ہے کہ یہ بات لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ اس پر انسان کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ یہ تورات میں ہے‘ یہ قرآن کریم میں کہیں نہیں ہے۔ تورات کے قصے ہماری تفسیروں میں آئے ہوئے ہیں‘ ان کو روایت کی سند میں بیان کرتے ہیں اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر مانی جاتی ہے۔ تو یہ جو ذبح کیا تو وہ مینڈھا ذبح ہو گیا۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ (37:108) اور یہ جو آپ کے ہاں بڑی عید پہ قربانی آیا کرتی ہے‘ کہنے لگے کہ یہ ہے پھر جو آگے نسلوں میں چلائی۔ اسے سنت ابراہیمی ؑ کہتے ہیں۔ یہ سنت ابراہیمی ؑ اس طرح سے پوری ہو رہی ہے‘ وہ جو مینڈھا تھا اس پہ چھری چلی تھی تو یہ سنت جو ہے‘ وہ آخری مقطع کے بند سے شروع کرتے ہیں‘ جہاں مینڈھے پہ چھری چلی تھی‘ پہلے نہیں شروع کرتے‘ جہاں بیٹے کو لٹا دیا تھا۔ لٹاؤ سنت ابراہیمی ؑ پوری کرو چلاؤ چھری‘ تمہارے اس بیٹے کی جگہ بھی اگر مینڈھا آ جائے تو ٹھیک ہے‘ اس کو ذبح کرو گے ورنہ ابراہیم ؑ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے لٹایا تھا۔ یہ جو سنت ہے وہ تو پوری نہیں ہوتی ہے اور وہاں اتباع سنت ابراہیمی ؑ اتنا ہی حصہ رہ جاتا ہے اور مسلمان اس کے اوپر چلا ہوا ہے۔ یہ بہرحال اگلی بات ہے‘ وہ میں حج کی تقریب اگلے مہینے میں آئے گی‘ اس کے اوپر کچھ خطبات آئیں گے‘ درس آئیں گے تو میں یہ عرض کروں گا لیکن بہرحال ہمارے ہاں تفسیر میں یہ بات آئی ہے۔

قرآنِ حکیم کی نظر میں حضرت ابراہیم ؑ کا مقامِ بلند اور کوہ کنی کا طویل سفر

یہاں تک آنے کے بعد قرآنِ کریم نے ایک لفظ کہا ہے کہ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (37:109) سوچیے تو سہی کہ کتنا بڑا مقام ہے اور ہے بات ساری سلامتی کی ہی کہ شروع سے آخر تک ابراہیم ؑ ایسے منازل میں سے گزرے کہ ان میں سے ہر منزل قیامت سے کم نہیں تھی اور ہر منزل سے وہ سلامتی سے گزر گئے اور اسی لیے ہمارے سلام کا موجب بھی بن گئے۔

عزیزانِ من! اب مجھے یہاں پھر دہرانا چاہیے۔ باپ آذر کے گھر میں پیدا ہونے والا بیٹا‘ حضرت ابراہیم ؑ ہے۔ یہ پہلی قربانی کوئی چھوٹی قربانی نہیں تھی کہ ایک اتنی بڑی مملکت کے پیشوائے اعظم بننا تھا‘ اسے ٹھکرا کر رکھ دیا۔ نمرود جیسے بادشاہ کے سامنے حق کی آواز بلند کی‘ اسے بوکھلا کے رکھ دیا ”جینوں کہندے نیں پیانا بھیڑا[1]“ بالکل یہ بات ہوتی ہے۔ اس کی یہ کیفیت کر دی کہ وہ سامنے سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ نمرود جیسا بادشاہ ہے‘ اس کے دربار میں‘ اس کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں‘ اندازہ لگائیے۔ پوری قوم کو چیلنج ہے‘ ان کی

---

[1] یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ از حد شرمندہ ہوا۔

ستارہ پرستی کو چیلنج ہے، ان کی بت پرستی کو چیلنج ہے، ان کے بتوں کو توڑ کر انہیں سامنے رکھ کر، اس قوم کے سامنے یہ دلیل لینے کے لیے ڈٹ 184الصّٰفّٰت ۔ کھڑے ہو گئے، پوچھتے ہیں بتوں سے کہ تمہارے سامنے یہ مٹھائیاں رکھی ہیں، او نذر نیاز ہے، کھاتے کیوں نہیں ہو، او بولتے کیوں نہیں؟ کیا بات ہے ابراہیمیؑ دلائل کی۔ اب سوچ لیجیے کہ بت پرست قوم کے ساتھ یہ ہو تو کیا وہ کچھ نہیں کرے گی؟ انہوں نے اشتعال میں آ کر پورے عوام کو ان کے خلاف کھڑا کر دیا۔ انہوں نے وہاں شور وغل بپا کر دیا کہ اس کو پکڑ و، مار و، جلاؤ۔ وہاں سے پھر وہ اپنی مملکت ہی نہیں چھوڑی؟ ہجرت کی، دوسرے وطن آ گئے۔ یہاں آنے کے بعد بیٹے کو لیا اور وہ جو یہ ذبح ہونے کا واقعہ ہے، اس کو لیجیے اور پھر سچ مچ جو قرآن کریم کہتا ہے، ان کو ساتھ لیا، وادیٔ غیر ذی زرع حجاز میں، کعبے کی یہ بنیاد رکھی، وہاں اپنے اس بیٹے کو بسایا۔ یہ جو سارے مراحل تھے، یہ سارے مراحل قرآن کریم نے طے کیے۔ اب آپ نے یہ دیکھا جو کہا ہے کہ تمہارے لیے ابراہیمؑ کی زندگی میں اسوہ حسنہ ہے۔ کیا زندگی ہے جسے اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے! کہا کہ وَاِذِابۡتَلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ (2:124) محاسبہ خویش کے ابراہیمؑ کی زندگی کے اندر بڑے مقام آئے اور فَاَتَمَّهُنَّ (2:124) وہ ایک ایک مقام پہ پورا اترا۔ یہی وہ مقام ہیں جہاں وہ ایک ایک مقام پہ پورا اترا ہے۔ اس کے بعد کیا ہی بڑی غور طلب چیز ہے عزیزانِ من! قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (2:124) تُو نوع انسانی کی لیڈرشپ کا مستحق قرار پایا ہے۔ یہ اسوہ صرف ذریت ابراہیمیؑ کے لیے ہی نہیں تھا، ہمیں ہی نہیں تھا بلکہ للناس کہا ہے کہ انسانیت نے بھی اگر سمجھنا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی ماڈل ہونا چاہیے بلکہ امام کہا ہے تو اس کو اسوۂ ابراہیمیؑ اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ انسانیت کے لیے امامتِ کبریٰ، انسانیت کی لیڈرشپ کی ان مقامات سے گزرنے کے بعد ہاتھ آتی ہے۔ یہ جو آیت ہے کہ جس کا ترجمہ کیا کہ ''ان باتوں میں آزمایا خدا نے'' وہ پورا اترا، تو ہم نے کہا کہ اب تُو فٹ ثابت ہوا ہے، نوعِ انسانی کی امامت کے لیے''۔

تفسیر ابن کثیر کے ہاں امامت کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کے 10 کارناموں کا ذکر

آپ کو پتہ ہے کہ پھر تفسیر میں یہ کیا مقامات بتائے گئے ہیں کہ کیا کیا باتیں ابراہیمؑ سے ہم نے کہی تھیں اور وہ ان میں پورا اترا تو نوعِ انسانی کی امامت اس کے حصے میں آئی۔ ابن کثیر ❶ کی تفسیر بڑی اور معتمد بڑی معتبر گنی جاتی ہے۔ اصل میں ہمارے ہاں جو سب سے پہلی تفسیر ہے، وہ امام طبری ❷ کی تفسیر ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں حافظ ابن کثیر نے اپنے ہاں اس کو مختصر کیا ہے، یہ ابن کثیر کی تفسیر زیادہ مروج

---

❶ حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوع بن کثیر القریشی البصروی الدمشقی، کنیت ابوالغداء اور لقب عمادالدین (778-700ھ) ان کی تفسیر کا نام تفسیر ابنِ کثیر ہے۔ یہ چار جلدوں میں مکتبہ اسلامیہ لاہور 2005ء میں بھی چھپی ہے۔

❷ ابوجعفر محمد بن جریر الطبری (838-923 AD)۔

ہے۔اس میں ہر تفسیر کے ساتھ یہی کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے ۔ یہ جو آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَاِذِابۡتَلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ (2:124) بہت سی باتوں میں خدا نے آزمایا ابراہیمؑ کو (بقول ان کے ترجمے کے) تو اس کے بعد تفسیر دی ہے کہ کیا کیا باتیں تھیں جو خدا نے ان سے کہیں' ان میں ان کو آزمایا فَاَتَمَّهُنَّ (2:124) پھر وہ ان پر پورا اترا اور اس کے بعد کہا کہ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (2:124) اب تو نوع انسانی کی امامت کے لیے فٹ قرار پایا ہے۔ وہ چیزیں کون سی تھیں جس میں آزمایا؟ تفسیر ابن کثیر میں کہا گیا ہے کہ وہ دس باتیں تھیں جو کہی گئی تھیں: مونچھوں کا ترشوانا' کلی کرنا' ناک صاف کرنا' مسواک کرنا' سر کے بال منڈانا' ناخن لینا' زیر ناف بال لینا' بغل کے بال لینا' استنجا کرنا' ختنہ کرنا۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق نبی اکرمؐ کی یہ گواہی کہ آپ نے زندگی میں تین جھوٹ بولے تھے (معاذ اللہ)

آپ کو یاد دلا دوں کہ تفسیروں نے ہمارے ہاں حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کو کیا پیش کیا ہے۔ پہلی چیز تو وہی ہے جو انہوں نے یہ کہی کہ جب انہوں نے کہا کہ اس میلے میں چلو تو اس میں انہوں نے کہا تھا اِنِّیۡ سَقِیۡمٌ میں بیمار ہوں ۔تو اب آپ کے ہاں یہ تفسیر ہے' میں تفسیر میں کہہ رہا ہوں' بخاری کی یہ روایت ہے۔ میں روایات کہوں تو یہ ناگوار گزرے۔ روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا' یعنی ایک نبی یہ گواہی دے رہا ہے' دوسرے نبی کے متعلق یہ کہہ رہا ہے کہ تین دفعہ جھوٹ بولا تھا۔ایک تو یہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں حالانکہ وہ بیمار نہیں تھے یعنی خود ہی یہ طے کر لیا کہ وہ بیمار نہیں تھے' جھوٹ موٹ کا تھا۔ دوسرا جھوٹ وہ تھا جو وہاں بتوں کو توڑا تھا۔ وہ مقام آتا ہے' میں عرض کروں گا۔انہوں نے کہا تھا کہ کیا یہ تم نے توڑا ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا تھا کہ میں نے نہیں توڑا۔ یہ دوسرا جھوٹ تھا۔ بات وہاں اور ہوئی تھی۔ وہ تو ان کے دلائل سے ثابت کرنا چاہتے تھے کہ یہ مٹی کے مادھو' پتھر کی مورتیں' جو نہ کھانا کھاتے ہیں' نہ بات کرتے ہیں' نہ تمہاری بات کا جواب دیتے ہیں' نہ سنتے ہیں' ان سے یہ کہنا تھا کہ یہ سب سے بڑا بت تو اسی طرح سے بیٹھا ہوا ہے' تم مجھ سے جو پوچھتے ہو کہ یہ کس نے کیا ہے؟ یہ بیٹھا ہوا ہے جو تمہیں غیب کی خبریں سناتا ہے' تمہاری مرادیں بر لاتا ہے' آسمان کی باتیں بتاتا ہے تو اس سے پوچھو کہ یہ کس نے کیا ہے۔ کیا بات ہے! قرآن حکیم کہتا ہے کہ اس کے بعد انہوں نے جو وہاں کے پروہت اور متولی تھے آپس میں کہا کہ بابا! اس سے آگے بات نہ کرو' ''ایہہ تے پَنڈ ھ دے گا[1]'' کیا انداز ہے ابراہیم کا۔ان کو اس کے قائل کرنے کے لیے کہ ان مورتیوں کی حیثیت کیا ہے جن کو تم نے خدا بنائے بیٹھے ہو! یہ بات کرنے کا کیسا عمدہ مقام تھا! کہا کہ اس سے پوچھو جو تمہیں آسمان کی خبریں دیا کرتا ہے۔ اس سے ذرا پوچھو کہ یہ کس نے کیا ہے۔ کہا کہ جی دوسرا

---

[1] یہ تو جھوٹا کر کے بدنام کر دے گا' خجالت میں ڈال دے گا' تم اس کی دلیلوں کا جواب نہیں دے سکو گے۔

جھوٹ یہ بولا۔ تیسرا جھوٹ یہ کہا کہ جب آپ ہجرت کر کے آ رہے تھے تو ان کی بیوی ان کے ساتھ تھیں اور انہوں نے مصر سے گزرنا تھا الصّٰفّٰت 184۔ مصر کا بادشاہ بڑا ظالم تھا' جو بھی ادھر سے گزرتا تھا' اگر اسکی بیوی خوبصورت ہوتی تھی تو وہ اس کو اپنے ہاں کر لیتا تھا۔ اب وہاں سے گزرنا تھا' بیوی ساتھ تھی' بیوی خوبصورت تھی' میں یہ روایت بیان کر رہا ہوں تو اب کیا کیا جائے؟ حضرت ابراہیم ؑ نے بیوی سے کہا کہ اگر وہ پوچھے تو کہنا کہ نہیں' میں تو اس کی بہن ہوں' بیوی نہیں ہوں' اس کو بھی سکھایا کہ جھوٹ بولنا اور جب ان سے بھی پوچھا تو انہوں نے کہا کہ نہیں میری بہن ہے۔ آگے بات چھوڑ دیجیے کہ اس پہ بھی کیا ہوا۔ یہ تیسرا جھوٹ ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت ابراہیم ؑ جن کا اسوہ قرآن کریم نے' ان کی زندگی آنے والی نسلوں تک کے لیے ماڈل قرار دیا ہے ان کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ بولا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہادت دے رہے ہیں کہ انہوں نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ یہ کچھ کیا۔ وہ جو بات آپ نے سنی تھی کہ وہ پرندے لے کر ذبح کرو اور ان کا قیمہ کرو' پہاڑوں کے اوپر رکھو' آواز دو' پھر پھر کر کے آ جائیں گے۔ میں نے پچھلے درس میں یہ سارا کچھ جو تھا آپ کو یہ بتایا تھا۔ اس میں یہ چیز تھی کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (2:260)۔ تو اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ کیا تمہارا اس پہ ایمان نہیں ہے کہ ہم مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ یہ میرا ایمان ہے کہ ہو سکتا ہے' میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ جو مردہ قوم ہے' مجھے وہ طریقہ بتایا جائے کہ ان کو میں زندہ کیسے کروں۔ وہ یہ بات پوچھ رہے تھے۔ وہیں تو بات صاف ہو گئی تھی جو خدا نے کہا تھا کہ کیا تمہیں ایمان نہیں ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ میرا ایمان ہے کہ تُو زندہ کر سکتا ہے لیکن میرا یہ سوال ہے' کہ یہ کَیْفَ (2:260) کیسے ہے میں تو پوچھنا یہ چاہتا ہوں۔ بخاری کی یہ روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) فرمایا کہ ابراہیم ؑ نے اس میں شک کیا تھا کہ خدا زندہ کر سکتا ہے یا نہیں اور بقول بخاری شریف کی حدیث کے کہ نَحْنُ اَشَکُّ ہم اس سے بھی زیادہ شک کرنے والے ہیں۔ اف میرے اللہ! دونوں ہستیوں کا ہی اسوہ ہے جو قرآن کریم نے ماڈل قرار دیا ہے۔ یہ دونوں کی باتیں ہو رہی ہیں' وہ کرنے والا ہے یہ تصدیق کرنے والا ہے اور انہی کی زندگیوں کو ماڈل قرار دیا ہے۔

آج کرّہ ارض پر قرآن حکیم کے علاوہ دینِ خالص کہیں موجود نہیں ہے

اب میں بار بار کیا عرض کروں' عزیزانِ من! سن رکھیے' شاید یہ موقع ملے یا نہ ملے' کہ اسلام کبھی نہیں آ سکتا جب تک قرآن کریم سے خارج' جس چیز کو دین کہا جاتا ہے' آپ اس کو ختم نہ کر دیں۔ آپ حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ کے اوپر آئیں گے' قرآن حکیم کسی خارج کی تفسیر کا محتاج ہی نہیں ہے' یہ تو اپنے معانی آپ بیان کرتا ہے۔ جونہی آپ اس تفسیر و معانی سے نکل کر باہر جائیں گے' یہ ساری چیزیں آ جائیں گی۔ یہ کچھ جو بیان ہو رہا ہے' میں نے کہا کہ یہ پہلی سازش کا بیج بویا گیا جب اس طبری ابوجعفر محمد بن جریر الطبری:

(838-923ء) نے تفسیر لکھی اور ہر آیت کی ہر تفسیر کے بعد جو روایت خود لکھی ہے اور کہا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا تھا۔ یہ پہلی سازش کا بیج بویا گیا تھا اور وہاں سے یہ بات چلی ہوئی ہے اور آج تک روایت کی صورت میں وہ نقل ہوتی چلی آ رہی ہے اور اسی طرح یہ باتیں نقل ہو کر چلی آ رہی ہیں۔ یہ باتیں آپ کے ہاں کی احادیث کی کتابوں کے اندر' بخاری مسلم وغیرہ کے اندر' بھی ہیں پھر وہاں کے اس حوالے سے یہ کچھ تفسیر کی کتابوں کے اندر ہے۔ یہ پرانے زمانے کی بات نہیں ہے' آج بھی جو تفسیر لکھتے ہیں' اس میں آپ کے لیے یہی چیزیں لکھتے ہیں۔ اور یہ ہے جو آج آپ کا اسلام ہے۔

ان تفاسیر کے علاوہ ان تراجم پر اٹھنے والے اعتراضات اور نوجوان نسل کی پریشان نظری

ان تفاسیر کے پھر ترجمے ہوتے ہیں اور باہر (بیرون ملک) جاتے ہیں۔ ان تفاسیر کے تراجم نہ بھی ہوں تو بھی وہ فاضل تو ہم سے زیادہ عربی جانتے ہیں' جب وہ اعتراضات کرتے ہیں تو یہ لٹھ لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ صاحب! یہ اسلام کے خلاف اعتراضات ہیں' اب آپ بتائیں کہ اگر کوئی ان چیزوں پر اعتراض نہیں کرے گا تو کیا کرے گا۔ وہ تو پھر بھی صرف اعتراض ہی کرتے تھے' آپ کے ہاں کی جو اگلی نوجوان نسل ہے' وہ ان چیزوں کی وجہ سے برگشتہ ہو گئی ہوئی ہے' وہ اسلام سے برگشتہ نہیں ہوئی' وہ ان چیزوں سے برگشتہ ہوئی ہے جو آپ کے ہاں کا ملاّ اسلام کے نام پر کرتا ہے۔ کیا افسانے ہیں انبیائے کرامؑ کے اوپر! کتنے الزامات ہیں' جو عائد کیے جا رہے ہیں۔ کیسے یہ کہا جا رہا ہے؟ عزیزانِ من! میری مشکل یہ ہے کہ شعر ہوتا بھی فارسی میں ہے اور بعض اوقات تو (مرزا اسد اللہ خاں) غالب کا (1797-1869ء) کا شعر ویسے بھی مشکل ہوتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس انداز سے وہ اصل بات کہہ گیا ہے کہ یہ کچھ یہ ملاّ کیوں کرتا ہے' کیوں یہ کچھ بولتا ہے' میری نظر میں اس سے جامع بات نہیں گزری لیکن یہ شعر کہنے سے قبل میں کچھ عرض کر دوں۔

بنی اسرائیل کے لیے سامری کی طرف سے بچھڑے کی تیاری

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ اس (سامری) نے یہ ان کا معبود بنا دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ انہی کا زیور لے کر یہ سب کچھ بناتے ہیں ''اپنے گھروں سے اک پیسہ وی نہیں لاندے' پیسہ ہوندا ای نہیں ایہناں دے کول ❶'' سامری نے بچھڑا بنایا۔ اب بچھڑا تو بنا دیا۔ کیا یہ خالی ایسا ہی بچھڑا تھا تو اس کے سامنے کون جھکتا؟ کوئی نہیں۔ یہ روایت میں ہے کہ بچھڑا بولنے لگ گیا۔ جب حضرت موسیٰؑ واپس آئے تو انہوں نے آ کر جو کچھ کیا وہ تو اور بات سمجھیں' انہوں نے سامری سے کہا کہ باقی سب کچھ تو میں سمجھ گیا' یہ بتاؤ کہ یہ بولنے کیسے لگ گیا۔ کہنے لگے کہ جی! جان کی امان پاؤں تو سچ سچ بتاؤں۔ کہنے لگے کہ ہاں' سچ سچ بتا دو۔

---

❶ یہ اپنے گھروں سے ایک پیسہ بھی نہیں لگاتے۔ ان کے پاس روپیہ پیسہ ہوتا ہی نہیں ہے۔

افسانے کو دل نشیں بنانے کے لیے مزید افسانہ نگاری اور اس کے لوازمات

184الصّٰفّٰت۔

اب اس کے بعد آگے افسانہ در افسانہ چلا۔ در بزم تو می خیز د افسانہ ز افسانہ۔ اس افسانے سے آگے افسانہ سنیں۔ کہنے لگے کہ جی! صاحب! آپ بنی اسرائیل کو مصر لے کر چلے تھے تو آپؑ سمندر میں یا دریا میں اتر آئے تھے' پیچھے پیچھے فرعون آ رہا تھا۔ وہ جو فرعون تھا وہ اور اس کا یہ سارا لشکر گھوڑوں پہ آ رہا تھا' فرعون سب سے آگے آگے لیڈ (Lead) کر رہا تھا۔ جب وہ سمندر کے کنارے پہ آیا ہے تو وہ رک گیا' آگے نہیں بڑھا۔ اب اس کو آگے بڑھانے کے لیے کیا کیا جائے؟ ہوا یہ کہ جبریلؑ گھوڑی پہ آئے' انہوں نے گھوڑی کو اس کے آگے رکھ دیا' وہ گھوڑی چلی اور اس کے پیچھے پیچھے فرعون کا گھوڑا تھا' اس طرح سے اس کو سمندر میں لے آئے' درمیان میں آ کر وہ ڈوبنے والا ہوا' یہ تو بیچ میں سے نکل گئے۔ کہا کہ وہ جو جبریل کی گھوڑی آئی تھی' اس کے پاؤں کے نیچے سے میں نے کچھ مٹی اٹھالی تھی۔

جبرئیل کی گھوڑی کے پاؤں کی مٹی بچھڑے کے منہ میں

عزیزانِ من! اب یہ دیکھیے کہ اس مٹی کی نسبت کہاں گئی' جبریل کی گھوڑی کے پاؤں کی مٹی کتنی مقدس ہے! کہنے لگے کہ وہ جو مٹی ہے' اس میں سے کچھ مٹی میں نے اس کے منہ میں ڈال دی اور یہ بولنے لگ گیا۔ آپ دیکھیے کہ اس روایت کے اندر یہ یہودی مسلمانوں کو کیا کہہ گئے ہیں؟ کہ یہ جو بھی باطل ہے' یہ جو اس قسم کا بت بول رہا ہے اور لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے' یہ سب کچھ تمہارے جبریل ہی کا تو کرتا ہے۔ چھوڑ دو ان باتوں کو کہ اس میں کیا کیا چیزیں آتی ہیں' یہ افسانے والے بڑے ہی ظالم تھے کہ اس سامری نے کہا کہ مجھے کیا کہتے ہو' میں نے مٹی وہاں سے لی ہے۔ یہ سارا قصہ (مرزا اسداللہ خاں) غالب کا شعر سمجھانے کے لیے میں نے سنایا ہے۔ غالب کا شعر' میں نے عرض کیا ہے کہ جامع طور پر یہ کہا ہے کہ یہ آپ کے جسے مذہبی پیشوا ملاّ کہتے ہیں' یہ اس قسم کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ غور سے سنیے' عزیزانِ من! اس سے جامع شعر میری نظر سے نہیں گزرا۔

در قالب ملاّ اثرش پردہ کشا شد
خاکے کہ قضا در تن گو سالہ فرو ریخت

ملاّ کے بیان کردہ یہ تمام کے تمام افسانے تورات کے بیان کردہ ہیں

وہ مٹی جو گئو سالہ کے منہ میں تھوڑی سی ڈال دی تھی' اس کی ایک چٹکی اس نے ملاّ کے منہ میں بھی ڈال دی تھی۔ کیا بات ہے اس شخص

کی! کیا آپ نے اس سے جامع بات کہیں اور بھی اس انداز سے سنی؟ یہ شخص کہاں سے بات لایا! 184الصّٰفّٰت۔

در قالب ملاّ اثرش پردہ کشا شد

وہاں تو وہ بات تھی، وہ قصہ ختم ہو گیا' اس کے قالب میں پہنچ کر اس مٹی کا جو اثر تھا' یہاں آ کر وہ پردہ کشا ہوا:

خاکے کہ قضا در تن گو سالہ فرو ریخت

وہ مٹی جو سامری نے گئو سالہ کے منہ میں ڈالی تھی' وہ جو یہاں آئی ہے تو یہاں آ کر دیکھیے کہ اس کا اثر کیسے ہو رہا ہے۔گئو سالے کی نسبت سے یہ بڑی گہری چیز ہے۔ یہودیوں کی ساری تاریخ ان کے تورات سے افسانے ہیں۔ یہ ہے وہ سارا کچھ جو ملاّ کے منہ سے بولا جا رہا ہے۔ یہ بھی یہی کہے گا کہ میں نہیں بول رہا' یہ تو جبریل کی گھوڑی کی خاک ہے جو بول رہی ہے۔ کہنے لگے کہ یہ ہیں وہ افسانے جو آج ''در قالب ملاّ اثرش پردہ کشا شد''۔ کیا بات ہے ان لوگوں کے بات کہنے کی بھی' عزیزانِ من!

در قالب ملاّ اثرش پردہ کشا شد

خاکے کہ قضا در تن گو سالہ فرو ریخت

مقامِ حضرت ابراہیمؑ کے لیے قرآنِ حکیم کی روشنی میں لفظ مصلی اور صلوٰۃ کا مفہوم

قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے تمام موقع حسنہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ وہ دیکھو کس طرح سے وہ ایک ایک مقام کے اوپر پورا اترتا چلا آتا ہے اس لیے سَلَامٌ عَلٰٓی اِبۡرٰهِيۡمَ (37:109) ''او جیوندا رہو''[1]۔ اور پھر اس کے بعد خدا نے امتِ مسلمہ سے کہا کہ یہ ہے ابراہیمؑ یہ ہے روشِ ابراہیمیؑ۔ تمہارے لیے ضروری ہے کہ وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى (2:125)۔ آپ دیکھ لیجیے کہ مقام ابراہیمی لفظ کتنا جامع لفظ ہے! کہا ہے کہ وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى (2:125)۔ عربی زبان میں مُصَلًّى کسے کہتے ہیں؟ یہ جو ریس کورس کے اندر راستہ ہوتا ہے جس کے اوپر ریس کے گھوڑے دوڑتے ہیں' اس میں بات یہ ہوتی ہے کہ ہر ایک دوسرے سے آگے جانے کی' سبقت کرنے کی' کوشش کرتا ہے۔ وہ جو راستہ ہوتا ہے' اسے عربی زبان میں مصلیٰ کہتے ہیں یعنی دوڑنے کا راستہ۔ دیکھیے یہ قوم کہاں تک پہنچی تھی! راستہ تو سڑک بھی ہوتی ہے مگر اس راستہ میں خصوصیت یہ ہے کہ ہر دوڑنے والا آگے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ مصلی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو پہلے گھوڑے سے دوسرے نمبر پہ ہو اور مصلیٰ اس ریس کورس کے راستے کو کہتے ہیں۔ یہ سارا کچھ بیان کرنے کے بعد خدا نے کہا یہ تھا وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى (2:125) تم مقام ابراہیمیؑ کو اپنا مصلیٰ بناؤ' دوڑنے کا مقام

---

[1] جیتے رہو' صدا خوش وخرم رہو۔

بناؤ' چلواس راستے کے اوپر جو مصلیٰ ہے مقام ابراہیمی ؑ کا' اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اس کا نام صلوٰۃ ہے۔ 184 الصّٰفّٰت۔

اگر کسی مقام پہ رک جانے کا نام جہنم ہے تو پھر صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہی زندگی ہے

عزیزانِ من! ارتقا کی منزلوں کے اندر جہاں کوئی رک جاتا ہے' اسے جحیم کہتے ہیں' جہنم کہتے ہیں' جہاں آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جہنم کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ جہنم وہ مقام ہے جہاں کوئی رک جاتا ہے۔ جہنم کے متعلق ہے کہ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَ اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ (16:62) خود لفظ جحیم کے بھی یہی معنی ہیں جہاں کوئی رک جائے اور یہاں تو اس کو واضح کر دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی دوڑ میں کھڑے ہو گئے تھے' رک گئے تھے' آگے نہیں بڑھ رہے تھے اور اس کے مقابلے میں اہل جنت کے متعلق ہے کہ وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ - اُوْلٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ (56:10-11) ایک دوسرے سے اور آگے بڑھنے والے''اگلے نوں موڈھا مار پچھاں سٹ کے اگے ودھن والے نہیں ❶'' یہ لوگ خیرات کے اندر آگے بڑھنے والے' نیکیوں میں آگے بڑھنے والے ہیں۔ یاد رکھیے! جنگ بھی انسان کی ارتقائی منزل کے اندر آخری مقام نہیں ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ انکی جو سرچ لائٹ ہوگی' وہ ان کے آگے کے راستے روشن کرتی چلی جائے گی۔ اور پتہ نہیں کہ مقام کہاں ہے۔ کہا ہے کہ وَاِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَهٰی (53:42) اس خدا کی طرف جانے کے راستے ہیں۔ یہ بات اور طرف چلی جائے گی۔ یہاں جو آگے بڑھنے والے ہیں' ان کے متعلق بتایا ہے کہ وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26) یہ ہیں وہ مقامات جہاں راستے میں کوئی بند نہیں لگا ہوا' جس کا جی آگے بڑھنے کو چاہے وہ آگے بڑھتا چلا جائے' آگے ہی بڑھتا چلا جائے۔ دیکھا! کہ اب مصلیٰ کے معنی کیا آ گئے' کس طرح بات سمجھ میں آ گئی۔ یہ ہر ریس کورس میں آگے بڑھنا نہیں ہے' مقام ابراہیمی ؑ والا ریس کورس جو ہے' اس پہ چلو اور نیک کاموں میں' نوع انسانی کی منفعت کے کاموں کے اندر' ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اب سمجھ میں آیا کہ جو اسوۂ حسنہ تھا اس میں حضرت ابراہیم ؑ کی زندگی کو قرآن کریم نے اسوۂ حسنہ کیوں کہا تھا۔ یہ مقام ابراہیمی ؑ کو مصلیٰ بنانا ہے' زندگی کی وہ روش اختیار کرنا ہے اور اس طرح ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنا ہے۔

ہمارے ہاں کعبہ کے حرم میں نماز کے لیے کھینچی ہوئی چند لائنوں کا نام مصلیٰ ابراہیمی رکھ دیا ہے

قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (2:125)۔ آپ کو پتہ ہے کہ پھر قرآن کریم کے اس حکم کی تعمیل کیسے کی؟ کعبہ کے حریم میں جو کعبہ کے باہر وہ مقام ہے' وہاں ایک حصہ تھا' وہاں کچھ لائنیں کھینچیں۔ کہا کہ حضرت ابراہیم ؑ نے یہاں نماز پڑھی تھی۔ اسے مصلیٰ ابراہیمی ؑ کہتے ہیں اور حاجی وہاں جا کر دو نفل پڑھ لیتے ہیں اور خدا کے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ کہا ہے کہ

---

❶ اپنے سے آگے جانے والے کو کندھا مار کر' پیچھے چھوڑ کر' خود آگے بڑھ جانے والے نہیں۔

وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (2:125)۔''جتھے ابراہیمؑ نے نماز پڑھی' سی او تھے نماز پڑھیا کروجا کے ❶''۔آپ میں سے بہت سے صاحب حج کرنے گئے ہونگے' ان کو تو یہ معلوم ہے۔اب سنا ہے کہ انہوں نے اس کو ذرا محفوظ کر دیا ہے لیکن بہر حال وہ مقام ہے' اس کو مصلیٰ ابراہیمی ؑ کہتے ہیں اور وہاں نماز پڑھتے ہیں۔وہ اس آیت کی جو تعمیل تھی' وہ یوں ہوگئی کہ مقام ابراہیمی ؑ کو مصلیٰ بھی بنالیا۔اسوہ یہ ہوا (معاذ اللہ) خدا کی بات میں شک کرنے والا' ان ان باتوں کے اندر جھوٹ بولنے والا اور اس کو مصلیٰ ابراہیمی ؑ بنالیا۔اب وہ سارے اپنے آپ کو ہر مسجد سے' ہر محراب سے' ملتِ ابراہیمی ؑ کہتے ہیں اور ملت ابراہیمی ؑ کی جو حالت ہے اس کے بیان کرنے کے لیے پھر بات آئے گی تو آجائے گی پھر اس فارسی کے شعر میں لیکن میں کیا کروں' ہے ہی یہاں یہ بات۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک مقام ابراہیم کی طرف نسبت کرنے والوں کی حالتِ زار

سنیے! وہ کیا کہتا ہے ❷ کہتا ہے کہ ابراہیم ؑ کی طرف نسبت کرکے' ان کے متبعین ہونے کا دعویٰ کرکے' کیفیت کیا ہوتی ہے:

پسر را گفت پیرے خرقہ بازے ❸

بوڑھا خرقہ باز' بیٹے کو جاتے جاتے نصیحت کرکے جاتا ہے کہ

ترا ایں نکتہ باید حرزِ جاں کرو ❹

بیٹا! ایک بات تمہیں سمجھا کر چلتا ہوں۔میں تو جارہا ہوں' پتے کی بات لے' پکی سن لو اور اس کو تعویذ بنا کر اپنی جان پر رکھو' بس یہی ہے اور ایک راز کہ

بہ نمرودان ایں دور آشنا باش ❺

اس زمانے کے جو نمرود ہیں' ان سے یارانہ گانٹھ کے رکھ اور ❻

ز فیضِ شاں براہیمیؑ تواں کرد ❼

پھر ان کے فیض سے براہیمی ؑ کرتے چلے جاؤ

---

❶ جہاں حضرت ابراہیم ؑ نے نماز پڑھی تھی' وہاں نماز پڑھا کرو۔

❷ یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے اور یہ اشعار ''ارمغان حجاز'' سے ہیں۔

❸ ایک درویشی سے ناآشنا خرقہ درویشی (درویشی چغہ) پہن کر اپنی درویشی کی نمائش کرنے والا پیر' اپنے بیٹے کو کہنے لگا۔

❹ اس رمز یا ایک بات کو اپنی جان کا تعویذ بنالے یعنی ہر دم اپنے سامنے رکھ۔

❺ اس دور کے نمرودوں سے آشنائی اور دوستی رکھ۔ ❻ دوستی بنا

❼ ان کے فیض سے (ان کی عنایات سے) ابراہیمی کی جاسکتی ہے۔

184الصّٰفّٰت۔

بہ نمرودان ایں دور آشنا باش

وہ جاتے جاتے کیا پتے کی بات کہہ گیا ہے کہ اس دور کے نمرودوں سے یارانہ گانٹھ کر رکھ اور ''ز فیض شاں براہیمی تواں کرد''۔یہی ہیں وہ براہیمی کرنے والے جن کے متعلق اس نے کہا ہے کہ

چہ گویمت ز مسلمانِ نامسلمانے

یہ جو مسلمان ہے، مسلمان ہے، میں اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہوں کہ:

جز ایں کہ پورِ خلیل است و آزری داند

ابراہیم کا بیٹا ہے اور آزری کرتا پھرتا ہے، بت پرستی کرتا پھرتا ہے، بادشاہوں کے دربار میں مقرب بنتا پھرتا ہے۔

کہا ہے کہ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (2:125)۔اب یہ بھی ہو گیا، وہ دس باتیں بھی بتادیں جو حضرت ابراہیم نے پوری کی تھیں، وہ بنا اسوہ۔اسی لیے آپ دیکھتے ہیں یہ حضرات ان چیزوں پہ کتنا زور دیا کرتے ہیں۔اس لیے کہ ان کے پورا کرنے سے تو وہ جو خدا نے جن باتوں میں آزمایا تھا، یہ اس آزمائش پہ پورے اترے ہیں۔اور یہ کرنے کے بعد پھر ملت ابیکم ابراھیم ہے، اس پہ پورا اترتے ہیں کہ انہوں نے مقامِ ابراہیمی پہ مصلیٰ بچھایا ہوا ہوتا ہے اور اس کے بعد کہا کہ ''بہ نمرودان ایں دور آشنا باش''۔اس دور کے نمرودوں سے یارانہ گانٹھ لو۔یہ کچھ کر لیجیے تو اسوہ ابراہیمی کی پیروی ہو گئی۔

انسان کے لیے اس کا بلند ترین مقام تو خدا کا عبد بننا ہے

قرآن کریم نے کہا کہ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (37:109) سلامتی ہو حضرت ابراہیم پر۔اس کے بعد کہا کہ **كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ** (37:110-11) ہمارا عبد، ہمارا محکوم، ہمارا اطاعت گزار مومن ہے۔ ایمان تو صرف تسلیم ہی کرنے کی بات ہے کہ میں اس صداقت کو مانتا ہوں۔عزیزانِ من! صرف ماننے ہی سے کام نہیں چلتا، اس کے بعد جو عبد بننا ہے اور بلند تریں مقام جو خدا نے بتایا ہے، وہ خدا کا عبد بننا ہے۔ہر نبی نے خدا کا عبد بننے کا اعلان کیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر کے ساتھ اعلان کیا کہ میں خدا کا عبد ہوں۔اور پھر یہ عبدیت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، جو اتنا بڑا مقام تھا کہ ہمارے ہاں کلمۂ شہادت کے اندر اس کو رکھ دیا کہ **اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ** یعنی جو عبدیت ہے اس کا اقرار کرنے سے مسلمان مسلمان ہوتا ہے۔اور پھر آپ کے ہاں تو پانچ وقت میں، میناروں پر، کھڑے ہو کر ساری دنیا کی مساجد کے اندر یہ چیز دہرائی جاتی ہے کہ **اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ**۔ مینارے پہ وہ یہ کچھ کہہ رہے ہوتے ہیں اور نیچے اتر کر جب منبر پر کھڑے ہوتے ہیں تو پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ تم کیا جانوں مقامِ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' ہم تو اس مقام کو بیان نہیں کر سکتے۔ 184الصّٰفّٰت۔

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفیٰؐ ہو کر
(معاذ اللہ)

اور

چہ گویمت ز مسلمانِ نامسلمانے
جز ایں کہ پورِ خلیل است و آزری داند

عزیزانِ من! کبھی سنا ہے کہ کسی نے اس طرح سے عبدیت کی گواہی دی' اتنی احتیاط برتی کہ بار بار ان سے کہلواتے چلے گئے۔ عبد کی منادی کرنے والا نیچے آتا تو بتاتا یہ ہے کہ

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفیٰؐ ہو کر
(معاذ اللہ)

قرآن کہتا ہے کہ اِنَّہٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (37:111)۔وہ تو وَبَشَّرۡنٰہُ بِاِسۡحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ (37:112) پھر اس کے بعد دوسرے بیٹے کی بھی بشارت دی۔ یہ بیٹا بھی کبرسنی یعنی بڑھاپے میں اس وقت پیدا ہوا جب حضرت اسماعیلؑ دوڑنے پھرنے کے قابل یعنی بارہ چودہ سال کے ہو گئے' جب کعبے کی بنا رکھی ہے۔اس کے بعد حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے تو حضرت اسحٰقؑ خاصے چھوٹے ہیں حضرت اسماعیلؑ سے وَبٰرَکۡنَا عَلَیۡہِ وَعَلٰۤی اِسۡحٰقَ (37:113) ان کو بھی ہم نے برکت دی۔ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِہِمَا مُحۡسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفۡسِہٖ مُبِیۡنٌ (37:113) اور ان کی نسل میں بھی ہم نے برکت رکھی یعنی ابراہیمؑ کی نسل اور اسحٰقؑ کی نسل میں۔ دیکھیے! یہاں یہ دو الفاظ کہے ہیں حالانکہ جو اسحٰقؑ کی نسل تھی' وہ ابراہیمؑ کی بھی نسل ہو سکتی تھی لیکن ابراہیمؑ کی نسل تو اور بیٹے سے بھی چلی تھی۔ کیا بات ہے قرآن حمید کی! وہ اس لیے کہ یہودیوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ یہ صرف حضرت اسحٰقؑ کی اولاد میں سے ہیں۔

میں عرض کروں کہ یہ بنی اسرائیل بنتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسحٰقؑ تھے اور ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ' حضرت یعقوب کا لقب اسرائیل تھا یعنی خدا کا پہلوان۔ یہ لفظ اسرائیل وہی ہے جسے عبرانی زبان میں طاقتور کہتے ہیں۔ اسرائیل کے آگے جو اولاد ہے' وہ بنی اسرائیل ہے۔ یہ اپنی نسبت اسرائیل کی طرف کرتے ہیں اور یہ بنی اسماعیلؑ ہیں جو حجاز یعنی عرب میں ہیں جس کی شاخ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ قرآن حمید نے جو یہاں کہا کہ اسحٰقؑ کی ذرّیت میں بھی برکت ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ

ابراہیمؑ کی ذریت میں بھی برکت ہے۔ گویا حضرت اسحٰقؑ کی ذریت ہے لیکن وہ ذریت ابراہیمیؑ اس کے علاوہ اور بھی ہے' اس کو الصّٰفّٰتِ 184 بھی قرآن حمید نے ساتھ لے لیا ہے۔ کیا بات ہے! ایک ضمیر کے بدلنے سے مفہوم کتنا صاف کر گیا۔ اور شاید آپ اس کی اہمیت نہیں سمجھ سکتے اس کے لیے جو Comparison of Religion (تقابل ادیان) ہے' اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہودیوں کی ساری کوشش یہ بتانے کی ہے۔ یہ جسے شاخ اسماعیلیؑ کہتے ہیں حضرت اسماعیلؑ نہ ان کے بیٹے تھے' نہ یہ ان کی اولاد ہے' نہ ان کے ہاں برکت ہے' نہ خدا کے یہ مقرب ہیں' یہ سب کچھ حضرت اسحٰقؑ کی اولاد میں ہی تھا کیونکہ وہ بنی اسرائیل میں ہیں۔ قرآن حمید ذرا ذرا سی بات پہ یہ کہہ جاتا ہے کہ ٹھیک ہے ذریتِ اسحٰقؑ میں بھی برکت تھی' وہ ذریت ابراہیمیؑ تھی لیکن ذریت ابراہیمیؑ اور بھی تھی' اس میں بھی برکت ہے۔

کعبے کی تعمیر پر حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور پھر خدا تعالیٰ کا فرمان

جب کعبے کی تعمیر ہوئی تو اسکے بعد حضرت ابراہیمؑ نے جو دعا مانگی' وہ بڑی عظیم دعا ہے اور اس میں یہ بات بھی کہی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ ہم تمہاری دعا قبول کرتے ہیں' ہم یہ بات جاری رکھیں گے۔ آپؑ نے کہا تھا کہ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ (2:128) میری نسل میں بھی یہ بات رہے گی۔ یہ قرآن کریم ہے اور یہ قرآن کریم کا خدا ہے۔ جذباتی طور پہ تو کہا جاتا ہے کہ ٹھیک ہے۔ کہا کہ تمہاری نسل میں سے جو شخص اس عہد پہ پورا اترے گا' اس سے ہمارا یہ وعدہ ہے لیکن جو اس سے پھر جائے گا اس سے وعدہ نہیں ہے۔ کیا بات ہے! یعنی یہ وراثتی بات نہیں ہے کہ تمہاری اولاد میں سے چونکہ وہ نسل ابراہیمیؑ میں سے ہیں اس واسطے ہمارے یہ وعدے ان کے ساتھ قیامت تک پورے اتریں گے' بالکل نہیں۔ ان میں سے جو اس راستے سے پھر جائے گا' اس کے ساتھ ہمارا یہ وعدہ نہیں ہے۔ یعنی ایک لفظ میں قرآن کریم اتنے اتنے باطل کے عقائد کی تردید کر جاتا ہے' انہیں جڑ سے کاٹ دیتا ہے جن کے لیے دلائل کے انبار لگنے چاہئیں۔

عزیزانِ من! یہ وراثۃً یا خون کا رشتہ نہیں ہے۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا ہونا کوئی حیثیت نہیں رکھتا' اگر وہ ایمان نہیں لاتا تو وہ ڈوبنے والوں کے ساتھ ڈوبے گا' اگر حضرت لوطؑ کی بیوی ایمان نہیں لاتی تو وہ بھی ڈوبے گی' پیچھے رہ جائے گی' وہ بھی ہلاک ہو جائے گی۔ کسی کا بیٹا ہونا' کسی کی بیوی ہونا' کسی کے ساتھ کوئی رشتہ ہونا' کچھ معنی نہیں رکھتا۔ نسلِ ابراہیمیؑ کے متعلق کہہ دیا کہ نہیں' ان میں سے جو اس راستے سے پھر جائے گا' محض تمہاری نسل میں سے ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ ہمارا وعدہ نہیں رہے گا۔ یہ نسلی تفاوت کو' فوقیت کو' اولیت کو' اس طرح کاٹنے والا قرآن حکیم ہے۔ ہمارے ہاں آپ دیکھ لیجیے ''سید دے سرنوں سلام اے'' آج تک ہمارے ہاں یہ چیز چلی آ رہی ہے۔ بہر حال یہ بات دوسری طرف نکل جاتی ہے۔

میں نے کہا یہ ہے کہ قرآن کریم نے جب یہ کہا کہ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ (37:113) ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے وہ بھی ہو جو نیکوکار ہونگے' اس راستے پر چلنے والے' وہ بھی ہوں گے جو اپنے اوپر ظلم کریں گے' زیادتی کرنے والے بھی ہونگے۔ ان کے ساتھ ہمارا یہ وعدہ نہیں ہے۔ بات ٹھیک ہے' صاف صاف بات بتا دی۔ ''سخی نالوں شوم بھلا جیہڑا ترت دیوے

جواب ❶''۔ بات بتا دی کہ محض ابراہیمی ؑ نسل میں سے ہونے کی بنا پر یہ کچھ نہیں ہو سکے گا۔ اور اس کے بعد پھر یہ قصہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ اس سورۃ میں قرآن مجید حضرات انبیائے کرام ؑ کے قصوں میں سے یونہی ذرا ذرا سے ٹکڑے بیان کرتا چلا جاتا ہے' ان کی تفاصیل دوسرے مقامات کے اوپر آپ کو ملتی ہے۔

ذکر حضرت موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ کا اور مرزا کی خود ساختہ نبوت کا تذکرہ

قرآن مجید نے بتایا کہ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ ❷ (37:114)۔ اب بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرف آ گئے۔ حضرت موسیٰ ؑ و ہارون ؑ دونوں بھائی تھے' دونوں نبی ؑ تھے' ان کی الگ الگ نبوت تھی' الگ الگ کتاب تھی۔ اس کو یاد رکھنا' یہ بڑی اہم چیز تھی۔ یہ جو احمدی حضرات کہتے تھے کہ ایسے نبی بھی آئے ہیں جن کو کتاب نہیں ملی یعنی نبی آ گیا ہے اس کے پاس خدا کی کچھ کتاب ہی نہیں ہے۔ کتاب تو حکم کو کہتے ہیں یعنی کوئی وحی جو خدا کی طرف سے آتی ہے۔ وہ مرزا ❸ کہتا تھا کہ ''من نیستم رسول نیاوردہ ام کتاب'' کہ میں کتاب نہیں لایا اس واسطے کوئی بات نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ پھر آپ ہیں کیا؟ کہنے لگے کہ نبی ہوں میں' وہ دیکھیے کہ ضروری نہیں کہ ہر نبی ساتھ کتاب لائے۔ عزیزانِ من! یاد رکھیے! قرآن کریم بار بار یہ کہتا ہے کہ ہر نبی کو ہم نے کتاب دی تھی۔

کتاب کے بغیر نبوت چہ معنی؟

مرزائی ❹ عام طور پہ یہ پیش کیا کرتے ہیں کہ دیکھیے! حضرت موسیٰ ؑ کو تورات ملی تھی' حضرت ہارون ؑ کو کتاب ملی ہی نہیں تھی' وہ بغیر کتاب کے آئے تھے' اسی طرح سے یہ مرزا صاحب ❶ آ گئے تھے۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ۔ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ۔ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ❺ (37:115-117) ان دونوں کو ہم نے کتاب دی تھی۔ نبی بغیر کتاب کے معنی ہی کچھ نہیں رکھتے۔

تورات اور عہد عتیق کی نوعیت

بہرحال یہ یاد رکھیے کہ یہ جسے تورات کہتے ہیں' یہ حضرت موسیٰ ؑ کی کتاب نہیں ہے' یہ تمام کتابوں کا مجموعہ ہے جو انبیائے بنی

---

❶ سخی سے شوم بھلا جو ترت دے جواب۔

❷ اور بنی اسرائیل میں ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو بھی اپنی نعمتوں سے نوازا (اور انہیں نبوت عطا کی)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1045)۔

❸ یہ اشارہ مرزا غلام احمد آف قادیاں (1835-1908ء) کی طرف ہے جس کے متبعین اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں۔

❹ مرزا کی نسبت سے انہیں مرزائی کہا جاتا ہے۔

❺ اور انہیں' اور ان کی قوم کو ایک جانکاہ مصیبت سے نجات دلائی۔ انہیں ہم نے مدد دی اور وہ فرعون کی قوم پر غالب آ گئے اور ان دونوں (موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام) کو ہم نے واضح کتاب دی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1045)۔

اسرائیل کو وقتاً فوقتاً ملتی رہیں۔اس کو اٹھا کر دیکھیے‘ آنہیں Old Testament یا عہد عتیق کہتے ہیں‘ اس میں قریباً انتالیس چالیس 184 کے قریب مختلف چھوٹے چھوٹے صحیفے ہیں۔قرآن حمید میں بھی تورات کو حضرت موسیٰ ؑ کی کتاب نہیں کہا گیا بلکہ وَاٰتَیۡنٰهُمَا الۡکِتٰبَ الۡمُسۡتَبِیۡنَ❶ (37:117) کہا گیا ہے۔سورۃ الاعلیٰ میں کہا کہ صُحُفِ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ مُوۡسٰی(87:19)‘ صحیفے جو حضرت ابراہیم ؑ اور حضرت موسیٰ ؑ کے تھے مگر یہ مرزائی کہا کرتے ہیں کہ تورات حضرت موسیٰ ؑ کو ملی تھی تو بتاؤ حضرت ہارون ؑ کو پھر کون سی کتاب ملی تھی۔انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ تورات حضرت موسیٰ ؑ کو نہیں ملی تھی‘ وہ تو تمام کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے جسے تورات کہا جاتا ہے۔بات میں سے بات نکلی۔دونوں کو کتاب ملی تھی۔کہا کہ وَهَدَیۡنٰهُمَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ(37:118) وہ دونوں نبی تھے‘ صراط مستقیم کی طرف ان کی ہدایت ہم نے کی تھی۔وَتَرَکۡنَا عَلَیۡهِمَا فِی الۡاٰخِرِیۡنَ (37:119) ان کی یہ بھی جو زندگی تھی‘ اور ان کی زندگی کے جو واقعات تھے‘ وہ بھی ہم نے آنے والی نسلوں کے لیے قرآن کریم کے اندر محفوظ کر کے رکھ دیئے۔صحیح واقعات قرآنِ کریم کے اندر ہی ہیں اور وہ بھی محفوظ کر دیئے ہیں۔ان کی داستان تک‘ جو انبیائے کرام کی داستانیں ہیں‘ قرآن کریم میں محفوظ ہیں۔مقصد یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ہدایت کا‘ رہنمائی کا کام دیتی ہیں۔وہ نہ تاریخ کی کتابیں ہیں‘ نہ وہ افسانوں کی (معاذ اللہ) کتابیں ہیں۔ہر نبی ؑ کی زندگی میں ہمارے لیے کوئی نہ کوئی ہدایت کا مقام ہے اور ابراہیمی ؑ زندگی تو ہم نے ساری کی ساری دیکھ لی ہے جس کا مقام وہ یہ کہتے ہیں کہ وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّی❷ (2:125)۔کہا کہ وَتَرَکۡنَا عَلَیۡهِمَا فِی الۡاٰخِرِیۡنَ (37:119) یہ دونوں بھی نبی وہی ہیں‘ ان کی داستانِ حیات کو بھی ہم نے آنے والوں کے لیے موعظمت کا باعث بنایا۔اس لیے کہا کہ سَلٰمٌ عَلٰی مُوۡسٰی وَ هٰرُوۡنَ(37:120) حضرت موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ پر سلام ہو۔بہت بلند انقلاب لائے تھے حضرت موسیٰ ؑ جو صاحبِ ضربِ کلیم تھے۔اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ (37:121) یوں ہم ان لوگوں کو جو حسن کارانہ انداز سے ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں‘ یہ ان کو بدلا دیتے ہیں کہ ان کی زندگی میں ہی نہیں‘ قیامت تک کے لیے ان کے نام کے ساتھ درود و سلام ہوتا ہے اِنَّهُمَا مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (37:122) وہ دونوں بھی ہمارے مومن بندے تھے‘ عبد تھے‘ ہر ایک نبی تھا۔اس کے بعد حضرت الیاس ؑ کا ذکر ہے‘ اس کے بعد حضرت لوط ؑ کا ذکر ہے۔اب چونکہ وقت تھوڑا ہے اس لیے ان کی بات میں نہیں چھیڑتا۔

عزیزانِ من! سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت 122 تک ہم آ گئے‘ 123 سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

---

❶ اور ان دونوں (موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام) کو ہم نے واضح کتاب دی (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص 1045)۔

❷ اگر تم بھی مقامِ ابراہیم کو حاصل کرنا چاہتے ہو‘ تو اس کے مسلک و منہاج کے پیچھے پیچھے چلو (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔45)۔

184 الصّٰفّٰت ۔

چھٹا باب: سورة الصّٰفّٰت (آیات 123 تا 157)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٢٣﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٢٤﴾ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا
وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿١٢٥﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٢٦﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ
لَمُحْضَرُوْنَ ﴿١٢٧﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿١٢٨﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٢٩﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى
اِلْ يَاسِيْنَ ﴿١٣٠﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٣١﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٢﴾ وَاِنَّ
لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٣٣﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٣٤﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿١٣٥﴾ ثُمَّ
دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿١٣٦﴾ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿١٣٧﴾ وَبِالَّيْلِ ط اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ ﴿١٣٨﴾ وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٣٩﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ
الْمَشْحُوْنِ ﴿١٤٠﴾ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿١٤١﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ
وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿١٤٢﴾ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿١٤٣﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ
يُبْعَثُوْنَ ﴿١٤٤﴾ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿١٤٥﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ
يَّقْطِيْنٍ ﴿١٤٦﴾ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿١٤٧﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى
حِيْنٍ ﴿١٤٨﴾ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿١٤٩﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِنَاثًا
وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿١٥٠﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿١٥١﴾ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ
لَكٰذِبُوْنَ ﴿١٥٢﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿١٥٣﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿١٥٤﴾ اَفَلَا
تَذَكَّرُوْنَ ﴿١٥٥﴾ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥٦﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٥٧﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1980ء کی 19 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت 123 سے ہورہا ہے الصّٰفّٰت 184 (37:123)

انبیائے کرام کی داستان کو بیان کرنے کا مقصد اور وحی کی خصوصیتِ کبریٰ

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں انبیائے کرام ؑ کا ذکر چلا آ رہا تھا اور وہ مسلسل آگے بھی بڑھے گا۔ آخری دو آیات کے اندر حضرت موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ کا ذکر تھا کہ ان دونوں کو خدا نے نبی بنایا اور نبی کے معنی یہ ہیں کہ ان کو صاحبِ کتاب کیا' صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دی۔ کہا کہ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ (37:119) ان کی پاکیزہ انقلاب آفریں داستانوں کی جو سرگذشت تھی' اسے ہم نے آنے والی اقوام کے لیے باقی رکھا اور سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (37:120) موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ پر سلام ہو۔ یہ وہی الفاظ ہیں' جو پہلے انبیائے کرام کے ساتھ آئے تھے۔ ہر نبی کے بعد قرآن کریم یہ الفاظ دہرائے چلے آ رہا ہے کہ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (37:121) ہم اس طرح ہر اس شخص کو امن و سلامتی کا مقام عطا کر دیتے ہیں جو ہمارے قوانین کے مطابق حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے۔

اب آپ دیکھیے کہ یہ ٹھیک ہے کہ نبوت تو انہیں وہبی طور پر ملتی ہے یعنی بلا کسی کسب و ہنر کے ملتی ہے' ان کی کسی اکتسابی کوشش کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا' وہ نہ ان کی فکری کاوشوں کا نتیجہ ہوتی ہے' وہ تو اس طرح سے خدا کی طرف سے ملتی ہے لیکن اس نبوت ملنے کے بعد جب نبی اس پر عمل کرتا ہے تو اس میں نبی کا اپنا کیریکٹر ہوتا ہے' اپنا کردار ہوتا ہے' اپنے اعمال ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو نبی بھی اسی طرح اپنی وحی پر ایمان لاتا ہے جس طرح سے دوسرے لوگ ایمان لاتے ہیں۔ اس ایمان لانے کے بعد وہ اپنے آپ کو وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163) کہتا ہے کہ میں اس کی تابعداری کرنے والوں میں سے پہلا فرمانبردار ہوں۔ خود اس وحی کے سامنے جھکتا ہے' اس کی اطاعت کرتا ہے' اس جماعت کا ایک فرد بنتا ہے جو اس وحی کے مطابق نظام کو قائم کرنے کے لیے کوشش کرتی ہے۔ اس کا اعلان کرتا ہے کہ میں اگر صحیح راستے پر ہوں تو اس وحی کی بنا پر ہوں اور اگر مجھ سے کہیں غلطی ہوتی ہے تو وہ میری اپنی طرف سے ہوتی ہے۔ جسے آپ اجتہادی تدبیری غلطیاں کہتے ہیں' وہ بھی بشریت کے اعتبار سے اس سے سرزد ہو جاتی ہیں' وہ کوئی قابل مواخذہ چیز نہیں تھی البتہ نبی معصیت نہیں کرتا تھا۔ معصیت کے معنی ہیں ''احکام خداوندی کی دانستہ سرکشی برتنا'' اس کی خلاف ورزی کرنا۔ اس میں یہ چیز نہیں تھی۔ باقی اس کا حسن کردار تھا' اس کی سیرت تھی' اس کا عمل تھا جو دوسروں کے لیے بھی نمونہ بنتا تھا اور اسے بھی خدا کا فرمانبردار عبد بناتا تھا۔ قرآن کریم نے اس کی سب سے بڑی خصوصیت' سب سے بڑی بلند ترین صفت جو بیان کی ہے' وہ یہ ہے کہ وہ خدا کا عبد رہتا تھا۔ اسی طرح سے خداوندی احکام و قوانین کی فرمانبرداری کرتا تھا جیسے کہ ایک غلام اپنے آقا کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ یہ تھی خصوصیت جو نبی کی

تھی۔ باقی دنیا کے جتنے معاملات ہیں مِّثْلُكُمْ (41:6) قرآن کریم بار بار کہتا ہے کہ میں تمہارے جیسا یہ انسان ہوں۔خود وہ نبی بھی اس الصّٰفّٰتِ 184
کا اعلان کرتا ہے۔

بشریتِ نبی کا اصل مقصد

نبوت ایک ایسی چیز ہے جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ خدا کی طرف سے مہبط تھی' باقی بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (41:6) تمہارے ہی جیسا میں ایک انسان ہوں۔ اور وہ مخالفین یہی اعتراض کرتے تھے کہ یہ کس قسم کا نبی ہے کہ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے' سودا سلف لاتا ہے' اس کے بیوی بچے بھی ہیں' ہمارے جیسا ایک انسان ہے۔ جواب یہ دیا گیا کہ یہ ٹھیک ہے' یہ تمہارے ہی جیسا انسان ہے۔ یہ چیز یہ بتانے کے لیے ہے کہ اس وحی پر ہر انسان عمل کرسکتا ہے' یہ ناممکن العمل نہیں ہے۔ اگر مجھے فوق البشر مان لیا جائے اور میں اس کے اوپر عمل کروں تو پھر تم کہہ سکتے ہو کہ بھئی! آپ تو اس پہ عمل کر سکتے ہیں کیونکہ آپ تو ایک Super Human (فوق البشر) واقع ہوئے ہیں اور ہم عام انسان ہیں۔ جیسے آج کل ہم کہتے ہیں ''اسی تے بندے بشر ہوئے نا''۔ عام انسان اس پر عمل کیسے کرسکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں اور دیکھو اس پر عمل کرتا ہوں۔ اس لیے یہ ناممکن العمل پیغام یا تعلیم نہیں ہے اور اسی جہت سے یعنی رسول کی جہت سے امت کے لیے جو اس کے سامنے موجود ہے اور جو آنے والے ہیں' ان سب کے لیے ان کی ذات اسوۂ حسنہ قرار پاتی ہے' بہترین نمونہ قرار پاتی ہے۔ اگر رسول یہ چیزیں فوق البشر قوتوں کے سہارے کرتا ہو تو دوسروں کے لیے وہ نمونہ بن ہی نہیں سکتیں۔ اس صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ صاحب! رسول کو تو خدائی قوتیں حاصل تھیں' وہ تو یہ سب کچھ کر گئے' اب ہم کیسے کر سکتے ہیں۔ یہی ہے جو بار بار اس پر Stress (زور) دیا جاتا ہے کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (41:61)۔ اتنی تاکید کے ساتھ صرف اس لیے ہے کہ یہ نہ کہا جا سکے کہ اس پر دوسرے انسان عمل نہیں کر سکتے' یہ ناممکن العمل ہے۔

ہر نبی کی زندگی حسن کارانہ اعمال کا حسین مرقع ہے

یہی چیز ہے جو قرآن حمید نے ہر نبی کے بعد بتائی ہے کہ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ (37:121) ان کی جو حسن کارانہ زندگی تھی' یہ اس کا بدلہ تھا' یہ اس کا معاوضہ تھا جو ہم نے ان کو دیا ہے کہ انہیں بھی زندگی کی یہ خوشگواریاں اور کامرانیاں نصیب ہوئیں اور آنے والوں کے لیے بھی ان کی داستانیں موعظت اور عبرت کا سامان بنیں۔ یہ کس بنا پر بنیں؟ کہا کہ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ (37:121) یہ نبوت کی بنا پر نہیں' تو وہ صرف یہ ہیں کہ وہ مہبطِ نبوت ہوتے ہیں' ان کو نبوت ملتی ہے لیکن وہ جو ساری چیزیں انہیں بعد میں حاصل ہوتی ہیں' وہ ان کی اپنی حسن کارانہ زندگی کی بنا پر حاصل ہوتی ہیں اور یہی چیز دوسروں کے لیے اسوہ بنتی ہے۔ اس لیے

رسولوں کی زندگی کے اندر اگر فوق الفطرت یا Super-Natural چیزیں یا Elements (عناصر) شامل ہوجائیں تو وہ پھر بشر نہیں 184 الصّٰفّٰت ۔ رہتے' اس کے بعد تو پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ صاحب! ہمیں تو یہ کچھ نصیب نہیں ہے اس لیے ہم یہ کر ہی نہیں سکتے' وہ تو اس لیے یہ کر گئے کہ یہ قوتیں ان کے حصے میں آئی تھیں۔

کوئی نبی بھی فوق الفطرت قوتوں کا مالک نہیں ہوتا' وہ عبد ہوتا ہے

دین کو ایک ممکن العمل ضابطۂ حیات ثابت کرنے کے لیے ضروری تھا کہ جو سب سے پہلا داعی ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' **المختصر** بزرگ ترین ہستی ہے لیکن ایک انسان ہے' بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ تو فوق الفطرت قوتوں کا مالک نہیں ہے۔ اور یہی چیز ہمارے لیے اسوہ یا ماڈل بنتی ہے۔ اسی لیے کہا ہے کہ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (37:121) ہم اس طرح ہر اس شخص کو امن وسلامتی کا مقام عطا کر دیتے ہیں جو ہمارے قوانین کے مطابق حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے اور اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ (37:122) یہ دیکھ لیجیے کہ وہ دونوں ہمارے مومن ہیں اور عبد ہیں۔ میں نے اس (ایمان اور عبد) کا فرق بتایا تھا' یہ بڑا اہم ہے۔ ایمان تو دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے بعد ایک صداقت کو تسلیم کر لینا ہے کہ ہاں صاحب! یہ صداقت ہے' یہ صحیح ہے۔ عبد اس وقت بنتا ہے جس صداقت کو تسلیم کیا ہے' اس کی اطاعت بھی کرے۔ میں نے کہا تھا کہ محض تسلیم کر لینا تو Thinking ہے' یہ تو فکری سی چیز ہے' یہ ساری دماغی چیز ہے صرف سمجھنے کی چیز ہے۔ مثلاً یہ سمجھ لیا میں نے کہ ٹھیک ہے صاحب! دیانتدار بننا بہت اچھا ہے' ہر شخص یہ کہے گا۔ اس کے کہہ دینے سے یا یہ کہنے سے کہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ دیانتداری اچھی چیز ہے' کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ فائدہ دے گی جس وقت وہ خود دیانتدار بنے گا۔ یہ ہے عبدیت۔

مومن کے بعد عبد کا درجہ

پہلی چیز تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اتنا تو ایمان ہے میں نے اس کو مان لیا ہے کہ دیانتداری بہت اچھی چیز ہے۔ ٹھیک ہے' ایک تو وہ یہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ سب بکواس ہے' دیانتداری کا یہ سب قصہ کچھ یونہی سا ہے ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی''۔ یہ تو کفر ہو گیا کہ میں اسے تسلیم ہی نہیں کرتا کہ دیانتداری اچھی چیز ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ دیانتداری بہت اچھی چیز ہے' میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ یہ واقعی صداقت ہے تو یہ وہ ہے جس نے اس بات کو مان لیا کہ دیانتداری اچھی چیز ہے۔ اس سے یہ صرف اتنا سا فرق ہوا' عملاً اس سے بھی آگے فائدہ کچھ نہ ہوا۔ اس مومن کے بعد تو آپ کو عبد بننا پڑے گا۔ اگر آپ دیانتدار بنیں گے تو پھر کام چلے گا۔ آپ کا ایمان بھی اسی صورت میں آپ کے لیے مفید ہو سکے گا جب آپ اس صداقت پہ جسے آپ نے صحیح تسلیم کیا ہے' اس کے مطابق آپ

عمل کریں گے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو قرآن حمید نے تو یہ کہا ہے کہ ان سے کہو کہ اپنے آپ کو مومن نہ کہیں کیونکہ وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (49:14) ابھی ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا اس لیے ان سے کہا کہ ان سے یہ کہو کہ ہم صرف اس کے سامنے جھک گئے ہیں، ہم نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے، ہم نے اپنے آپ کو اس نظام کے سامنے Submit کر دیا ہے۔ ایمان کی بات اس وقت ہوگی جب یہ دل کی گہرائیوں میں اترے یعنی پھر ان کے عمل سے اس کی شہادت ملے کہ واقعی انہوں نے اسے صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ یہ وہ چیز ہے۔

دوسری قوموں کی طرح دنیا بھر میں ہماری حالت بھی صرف مسلمان قوم ہی کی ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ ہم تو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ہمارا شمار کس میں ہو جائے گا۔ ہم تو ایمان بھی نہیں لائے ہیں، ہم تو محض قومی اعتبار سے ایک مسلمان قوم کہلاتے ہیں، جس طرح عیسائی قومی اعتبار سے عیسائی کہلاتے ہیں، یہودی قومی اعتبار سے یہودی کہلاتے ہیں۔ ہم بھی قومی اعتبار سے مسلمان کہلاتے ہیں اس لیے کہ ہم نے تو دل اور دماغ کی تسکین کے بعد ان صداقتوں کو صحیح نہیں مانا ہے، ان پر ہم نے کبھی غور و فکر ہی نہیں کیا۔ اگر کر لیتے تو کم از کم دماغی طور پر تو ہم مومن ہو جاتے۔ اسے بار دگر کہہ ڈالوں کہ اگر غور و فکر، علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی بنا پہ ان صداقتوں کو ہم تسلیم کرتے تو بہر حال ذہنی طور پر تو ہم مومن بن سکتے تھے۔ اس کا اگلا قدم یہ ہے کہ پھر اس کے مطابق ہماری زندگی ہو، پھر ہم عبد بن سکتے تھے۔

اسلام کا پیش کردہ دین آگے کیوں نہ چلا؟

اب عام طور پہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر اسلام ایسا ہی بلند ترین انسانیت کا نظام تھا تو اس کے بعد وہ کچھ وقت کے لیے چلا پھر آگے چلا کیوں نہیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ اسلام آگے نہیں چلا ہے۔ یعنی یہی مثال اپنے سامنے رکھیے، بات صاف ہو جائے گی۔ انسانی اخلاق کی تاریخ کا پہلا ورق لیجیے، جہاں سے اخلاقیات کی، Ethics کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے، دنیا کے ہر مذہب میں وہی نہیں، جن کو Universal Ethics کہتے ہیں یعنی دنیا کا ہر شخص عالمی ضابطۂ اخلاق مانتا ہے۔ کیا مانتا ہے؟ یہ کہ دیانتداری بہت اچھی چیز ہے۔ یہ پہلے دن سے مانتے چلے آ رہے ہیں اور آپ نے کوئی دور بھی ایسا نہیں دیکھا کہ تمام انسان دیانتدار ہو گئے ہوں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ صاحب! پھر جو دیانتداری ہے، یہ اصول تو دنیا میں فیل ہو گیا، یہ اصول چلا ہی نہیں ہے۔ انسان فیل ہو گئے ہیں کہ وہ دیانتدار نہیں بنے۔ دیانتداری کا اصول فیل ہو گیا اس لیے کہ دیانتداری اچھی ہے، یہ تو پھر سارے انسان بھی مانتے ہیں کہ یہ اچھی ہے۔ ہر بددیانت سے جو تجربہ ہوتا ہے اس کے بعد انسان یہ کہتا ہے کہ صاحب! دیانتداری بڑی عجیب چیز ہے، بددیانت انسان کے ساتھ معاملہ پڑنے سے تو یہ ہوا۔ اگر یہ دیانتدار ہوتا تو ایسا نہیں ہوتا۔ یعنی ہر تجربے کے بعد انسان کا قدم اسی طرف اٹھتا ہے کہ دیانتداری اچھی چیز ہے۔

ہر تجربے کے بعد انسانت کا ہر قدم دین اسلام کی طرف ہی اٹھ رہا ہے

جیسا کہ میں نے اپنے پیشتر مضامین میں یہ لکھا ہے اور وہ آخری مضمون جو میرا مقالہ ہے کہ ''کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟'' وہ چھپا ہوا ہے۔ میں نے اس میں کہا یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ سے اس نتیجے پہ نہ پہنچیے کہ اسلام آگے نہیں چلا۔ اسلام کو دیکھیے کہ اس نے انسانوں کی زندگی کے جو اصول دیئے تھے' انسان اپنے اپنے خود تراشیدہ' اپنے وضع کردہ اصول قواعد نظام قوانین کے تجربے کے بعد جب ناکام رہتا ہے تو اس کے بعد اس کا جو قدم اٹھتا ہے' وہ اس منزل کی طرف ہے جو قرآن حکیم نے متعین کی تھی یا اس کے برخلاف جاتا ہے۔ تاریخ کے اندر انسانیت میں ملوکیت اور بادشاہت اور ڈکٹیٹر شپ اور آمریت اور شخصی حکومت چلی آ رہی تھی۔ قرآن حکیم نے آ کر کہا کہ یہ باطل چیز ہے' کسی انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جھکنا نہیں چاہیئے' یہ احترامِ انسانیت کے خلاف ہے۔ ملوکیت اور آمریت کو اس نے حرام قرار دیا۔ عملاً کر کے بھی دکھا دیا۔ ایک گروہ' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذین معہ نے' عملاً دکھا دیا کہ یہ جو اصول ہے' یہ ممکن العمل ہے' انہوں نے یہ کر کے دکھایا۔ اس کے بعد آگے چلیے جیسے باقی دنیا کے انسان تھے' اسی قسم کے یہ مسلمان انسان ہو گئے' انہوں نے بھی ملوکیت اپنے ہاں رائج کر رکھی تھی۔ یہ نہیں ہے کہ اسلام کا جو اصول تھا کہ کسی انسان کا دوسرے انسان پہ حق حکومت نہیں' وہ ناکام رہ گیا' وہ باطل ہوا' یہ بات نہیں ہے۔ یہ کیسے ثابت ہوا کہ یہ بات غلط ہے۔ اس چودہ سو سال کی تاریخ کو لیجیے۔ ہر نظام حکومت کے تجربے کے بعد انسان اس نتیجے پر پہنچے کہ نہیں صاحب! یہ انسانوں پر انسانوں کی حکومت نہیں جچتی' پھر انہوں نے ایک نیا طریقہ وضع کیا۔ اسی طرح سے آہستہ آہستہ تاریخ کا یا انسانوں کا جو Trial & Error (سعی وخطا) کا طرز عمل ہے' ایک چیز کو اپنایا' تجربہ کیا' ناکام ثابت ہوئی' اسے چھوڑا پھر دوسرا لیا تو اس ناکام تجربوں کے بعد جو انسانیت چلی آ رہی ہے آپ غور کیجیے کہ اس کا ہر قدم اپنے تجربے کی ناکامی کے بعد' جو اگلا قدم اٹھتا ہے' وہ اس منزل کی طرف ہوتا ہے' جو قرآن حکیم نے متعین کی ہوئی ہے۔ یہ بات ہم بر بنائے عقیدت نہیں کر رہے' یہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے' ایک Historical Fact ہے۔ اس کی جو ایک شق ہے' آپ اس میں دیکھیے۔ اسلام نے کہا کہ نظام سرمایہ داری' نظام زمینداری انسانیت کے خلاف ہے' یہ نظام نہیں چل سکتا۔ اس نے ایک وقت میں کر کے دکھا دیا۔ انسان اپنی مفاد پرستی کے پیچھے چلے' انہوں نے پھر جو پرانا ہی نظام تھا اسی کے اوپر چلتے آئے۔ اب چودہ سو سال کی تاریخ کے بعد آج دیکھیے' جن قوموں میں ابھی تک نظام سرمایہ داری ہے' وہ بھی اس پہ لعنت بھیجتے ہیں۔ یہ جو عقل کا Trial & Error (سعی وخطا) کا طریق ہے' اس کی رو سے بھی انسان اپنے ہر ناکام تجربے کے بعد' جو قدم اٹھاتا ہے' وہ اس منزل کی طرف اٹھاتا ہے۔

انسانیت کی آخری منزل' اس کا آخری نصب العین' وحی کی طرف سے متعین کردہ نظام حیات ہی ہے

میں نے دوتین دفعہ جومنزل کی بات کہی' اس سے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ وحی یا دین' منزل کا تعین کرتا ہے' آپ کوآئیڈل دیتا ہے 184 الصّٰفّٰت۔ زندگی کا آخری نصب العین دیتا ہے کہ انسانیت نے یہاں پہنچنا ہے۔اب انسانیت ایک راستے پہ چلے آ رہی ہے' اس نے جوراستہ تجویز کیا تھا' اسے صراطِ مستقیم کہا ہے کہ یہ سیدھا راستہ ہے جوتمہیں وہاں لے جائے گا' اگراسی پہ چلتے رہوگے۔وہ اس پرنہیں چلے۔ انسان نے دوسرے راستے اختیار کر لیے۔وہ نصب العین، وہ منزل' جواس نے متعین کی تھی' وہ اپنے مقام پہ موجود ہے۔اس پوری تاریخ میں کہیں بھی انسانیت کے کسی گروہ نے یہ نہیں کہا کہ وہ منزل غلط ہے۔جس طرح کہ پوری تاریخ انسانیت یہ کہتی چلی آ رہی ہے کہ دیانتداری بہت اچھی چیز ہے' یہ انسانیت کی منزل ہے لیکن انسانوں کی اپنی مفاد پرستیاں' جذبات پرستیاں' دیگر کئی قسم کے عناصر اور وجوہات ہیں جن سے وہ بددیانت ہوتا چلا جاتا ہے۔جب بددیانتی کے تلخ تجربے حاصل ہوتے ہیں' انفرادی طور پہ بھی اور قوموں کی زندگی میں بھی' ہر دھوکا کھانے والا' دھوکا کھانے کے بعد یہی کہتا ہے کہ صاحب! دیانتداری ایک چیز ہے' اسی سے انسانیت آگے چل سکے گی۔وہ نصب العین جووحی یا دین نے مقرر کیا تھا' اس نصب العین کوآج تک انسانیت نے کبھی غلط قرارنہیں دیا۔

آج یواین او(UNO) کا چارٹراس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے

اس قدر استبداد' اس قدر استحصال کے باوجود مثلاً جوآج بھی ہورہا ہے وہ یہی ہے کہ دیانتداری ایک اچھی چیز ہے' اسی سے انسانیت آگے چل سکے گی اوراس میں نصب العین احترام انسانیت ہے۔ یہ چیز یواین او کے چارٹر کے اندر بھی داخل ہوگئی ہے کہ منزل احترام انسانیت ہے' اسے کسی نے غلط نہیں کہا۔عزیزانِ من! یہ چیز جو میں نے کہی ہے کہ یہ جواقدار یاValues یا بلند نصب العین یا اصول زندگی دیئے جاتے ہیں' انہیں یوں کہیے کہ وہ امام ہوتے ہیں' وہ اپنے زمانے سے بہت آگے ہوتے ہیں' انسانیت کے کارواں کے لیے وہ منزل متعین کی جاتی ہے کہ اسے اس طرف جانا ہے۔

وحی انسانیت کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے جس سے صدیوں کا سفر مہینوں میں طے ہوجاتا ہے:

انسان کسی دور میں بھی اگراپنے اندروہ خصوصیات پیدا کر لے جواس سے پیشتر ایک گروپ' ایک حزب نے پیدا کی تھیں' جومحمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذین معہٗ نے پیدا کی تھیں تو پھر وہ بات' وہ نتائج' وہ سالوں صدیوں کی بات' دنوں میں متعین ہوکر محسوس شکل میں سامنے آجاتی ہے۔اگروہ نہ ہوتو پھر انسانیت کواس کی تاریخ پہ چھوڑ دیا جائے' کائناتی رفتار پہ چھوڑ دیا جائے تواللہ تعالیٰ کا جوفرمان ہے کہ ہمارا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے' پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے تو وہ انقلاب یا غلط نظام' اس غلط طریقے کی طرف آنے کے لیے اگر ہزار سال بھی لگ جائیں تو خدا کے نزدیک تو وہ ایک دن ہوتا ہے۔اور جو میں کہا کرتا ہوں کہ یہ

184الصّٰفّٰت۔

ٹھیک ہے:

عاشق صبر طلب اور تمنا بے تاب

ہمارا جی تو یہ چاہتا ہے کہ وہ کل کا ہوتا ہوا کسی طرح سے آج ہی ہو جائے [1]

عزیزانِ من! ہمارا جی یہ کیوں چاہتا ہے کہ جو کل کا ہونا ہے وہ جلدی سے آج ہی ہو جائے' وہ اس لیے کہ ہمیں مرجانا ہے' ہمیں موت آجانی ہے' ہمیں نظر آجاتا ہے کہ صاحب! اتنی عمر گزر گئی' اب تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے' اب ہمارے سامنے تو ہوگا نہیں۔ اللہ میاں کو اس چیز کی پرواہ نہیں' اس نے مرنا ہی نہیں ہے تو اس کا ایک ایک دن پچاس پچاس ہزار سال کا بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ دن تو وہ گنتا ہے جس نے ایک دن مرنا ہے۔ بس یہ ہے' دونوں کا فرق۔ وہ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ (2:255) ہے۔ اپنی زندگی کے حساب شمار سے یہ کچھ دیکھتا ہے ''بندے بشر نوں کون پچھدا اے''[2] لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذین معہٗ نے اپنے اندر صفاتِ خداوندی منعکس کر لیں تو وہ جو یہی پچاس پچاس ہزار سال کا دن تھا تو وہ ایک ایک دن کے اندر تبدیل کر لیتے ہیں۔ تاریخ انسانیت کا کئی سال کا بھی کوئی عرصہ ہے تو انہوں نے عالمگیر انقلاب برپا کر کے دکھا دیا' یہ بھی بتا دیا کہ اس قسم کے انسان اگر اپنے اندر یہ سیرت پیدا کر لیں تو پھر دیکھیے کہ وہ جو کہتا ہے کہ ہمارا ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے' وہ کہا جائے گا کہ آپ کا ہوتا ہوگا' ہمارا نہیں ہے۔ وہاں تو ایک دن میں انقلاب برپا ہوتا تھا۔ یہ انقلاب ہے وہ جو کہ آئیڈیل ہے' جو سامنے نصب العین ہے' وہ صحیح ہے' متعین ہے' اس کی طرف چلنے کا راستہ متعین ہے۔ اب یہ جو چلنے والے ہیں' ان کے پاؤں میں حرکت ہونی چاہیے' قوت ہونی چاہیے' آنکھوں میں روشنی ہونی چاہیے' چلنے کی خواہش ہونی چاہیے' پھر اس کے بعد چل پڑنا چاہیے تو پھر وہ اس منزل کی طرف پہنچے گا۔ یہ منزل' نصب العین آئیڈیل غلط نہیں ہے۔ آج تک کسی نے نہیں کہا کہ یہ غلط ہے۔ جب بھی یہ کہتے ہیں کہ اسلام ناکام ہوا تو وہ مسلمانوں کی ناکامی کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اسلام کامیاب ہوتا تو تمہاری یہ حالت کیوں ہوتی؟ یہ سوال گہری سوچ کا تقاضا کرتا ہے۔

ہم نے اپنے آپ کو فریب دینے کا ایک طریق اختیار کر رکھا ہے

عزیزانِ من! ہمیں دنیا کے سامنے جرأت سے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ آج مسلمانوں کے اندر اسلام نہیں ہے۔ اس کے بجائے

---

[1] عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک (غالب)

[2] محض بندے بشر کو کون پوچھتا ہے۔

کہ آج ایک Apologetic (معذرت خواہانہ) طریقہ اختیار کیا جاتا ہے محض اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے کہ نہیں جی، پھر بھی دیکھیے ہمارے ہاں اب بھی اچھا ہے۔ بھئی! کیا اچھا ہے؟ آپ وہاں دیکھیے، وہاں کتنی فحاشی ہے جی! وہاں شراب پیتے ہیں، وہاں جوا کھیلتے ہیں۔ آپ کے ہاں آپ کو اپنی فحاشیاں نظر نہیں آتیں۔ اور یہ بات اتنی ہی نہیں ہے کہ شراب نہ پیو، فحاشی نہ کرو تو صحیح نظام حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے صحیح منزل، نصب العین اور صراط مستقیم درکار ہے اور ہمیں یہ جرأت کرنی چاہیے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔

اپنی غلطی کا اعتراف انسان کو کئی قسم کی نفسیاتی الجھنوں سے محفوظ کر دیتا ہے

ہم یہ کہنے کی اس لیے جرأت نہیں کرتے کہ اگر ہم اعتراف کریں کہ ہم بھی اسلام پہ نہیں ہیں تو پھر ہم مسلمان کیوں کہلاتے ہیں پھر ہم یہ سوچتے ہیں۔ اعتراف کرو کہ جب آپ مسلمان نہیں ہیں تو کیوں اس کا اعتراف نہیں کرتے۔ اس کا اعتراف کرنے سے آپ کی کئی الجھنیں حل ہو جائیں گی۔ ہم یہ کہہ کر کہ اسلام ہمارے اندر ہے، دنیا میں اسلام کو کیوں بدنام کرتے ہیں۔ اور ہماری یہ صورت ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے انبیائے کرامؑ سے متعلق بھی کہا کہ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ۔ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (37:121-122) یہ اسلام کی شرط ہے۔ پیدائشی اعتبار سے تو کوئی بچہ بھی نہ مومن ہوتا ہے، نہ کافر ہوتا ہے۔ مومن ہونا پڑتا ہے، کافر بننا پڑتا ہے اور وہ ہوتا ہے جیسا قرآن حکیم کہتا ہے کہ علی وجہ البصیرت قلب و دماغ کے اطمینان کے بعد، ان اقدار کی صداقتوں پر یقین رکھنا کہ یہ واقعی یہی چیز ہے۔ اس سے تو صرف ہم نے اعتراف اور ایمان کہا اور اس کے بعد پھر اس کی عبدیت آتی ہے، صرف ایمان نہیں۔ پہلے ہی ورق، پہلی ہی سورۃ، پہلی ہی آیات کے اندر، جو آپ کو دہرانے کے لیے کہا گیا ہے وہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) ہے۔ آپ یہ کہتے ہیں اور اپنی عبدیت کا اقرار کرتے ہیں لیکن اس عبدیت کا اقرار جو ہم کر رہے ہوتے ہیں، نہ ہمارا قلب و دماغ علی وجہ البصیرت اس پر مطمئن ہوتا ہے کہ ہم یہ کیا کر رہے ہیں، نہ ہماری زندگی کے اندر عبدیت مشہود ہوتی ہے کہ ہم اس کے عبد ہیں۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ کی بے حرمتی زندگی کو تاریک راہوں کی طرف لے جاتی ہے

ہم نے اپنے لیے کیا کر لیا؟ یہ کہ اپنے لیے اس لفظ کا ترجمہ کر کے فریب دے لیا کہ ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں۔ اس پرستش سے معاملہ ختم ہو گیا۔ یہ ٹھیک ہے جی کہ ہم بتوں کو پوجتے نہیں ہیں جو اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) وہ تو پورا ہو گیا صاحب! ہم نے عبادت کے معنی پرستش کر لیا تو پرستش تو ٹھیک ہے، نماز پڑھ لی، اس کو سجدہ کیا۔ اب اس کے بعد آپ کے ہاں نگاہ اسی میں رہ گئی کہ صاحب! قبروں کو سجدہ کرنا شرک ہے، یہ جو پرستش کرنے میں سجدہ ہے، یہ اسلام ہے۔ ارے خدا تو قرآنِ کریم میں وہاں پرستش کہتا ہی نہیں ہے، وہ تو محکومیت کہتا ہے، وہ تو اطاعت کہتا ہے، وہ تو فرمانبرداری کہتا ہے، وہ تو عبدیت کہتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح سے پھر یہ اس

اعتراف کی جرأت نہ رکھنے والے جو ہیں کہ واقعی ہم اس کے عبد نہیں ہیں' وہ اس طرح سے اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں۔ میں نے کہا 184 الصّٰفّٰتِ ہے کہ اس فریب سے نکلنے کے بعد کم از کم دنیا میں ہم اسلام کو تو بدنام نہ کریں کہ وہ ناکام رہ گیا ہے۔ ابدی صداقتیں بھی کبھی ناکام نہیں رہتی ہیں۔ میں نے تو وہ مثال دی ہے کہ جو اسلام کی بھی آپ کہیے کہ بلند قدر ہے۔ یہ ہے دیانتدار ہونا۔ یہ ساری دنیا کی قدر(Value) ہے دہریئے بھی یہ کہتے ہیں' فاسق و فاجر بھی یہ کہتے ہیں کہ دیانتداری بہت اچھی چیز ہے۔ یہ تو غلط نہیں ثابت ہوئی' یہ ناکام ثابت نہیں ہوئی' انسان ناکام ثابت ہوئے ہیں کہ انہوں نے زبان سے اس کا اقرار کیا ہے' عمل سے اس کو مشہود نہیں کیا۔ ناکام تو یہ انسان ہیں۔ ہم ناکام رہ گئے ہیں کہ اسلام کو ہم نے عملاً اپنی زندگی میں رائج نہیں کیا ہے' اسلام ناکام نہیں رہا ہے' وہ کبھی بھی نہیں رہ سکتا۔ کہا ہے کہ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ (37:122)۔ وہ دونوں ہمارے مومن بندے تھے۔ اب اس کے بعد دو چار اور انبیائے کرام ؑ ہیں' ان کا بھی ذکر آتا ہے۔

دنیا کی ہر قوم کی طرف آنے والے رسول پر ہمارا ایمان ہے

کہا ہے کہ وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (37:123) حضرت الیاس ؑ بھی ہمارے سولوں میں سے تھے' جنہیں ہم نے بھیجا تھا۔ حضرت الیاس ؑ کا نام ایک تو یہاں آیا ہے اور صرف ایک جگہ سورۃ انعام میں اور ہے' وہاں صرف باقی انبیائے کرام کے زمرے میں نام ہی آیا ہے۔ جس طرح سے باقی اولوالعزم انبیائے کرام ؑ کی پوری داستانیں آئی ہیں' تفصیلات آئی ہیں' ان کے کارنامے آئے ہیں' بعض انبیائے کرام ایسے ہیں جن کے صرف نام ہی آئے ہیں۔ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ قرآن حمید کی رو سے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (2:136) ان کے رسول ہونے کے جہت سے ہم ان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ قرآن حمید نے جسے رسول کہا ہے' ہم اسے رسول کہیں گے بلکہ اس سے بھی آگے ایک قدم بڑھیں گے۔ قرآن حمید نے کہا ہے کہ ہم نے ہر قریۂ ہر بستی میں' ہر ملک میں' ہر قوم میں' اپنے رسول بھیجے تھے' ان میں سے بعض کا بہ نص صریح قرآن حمید میں ذکر کر دیا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کا ہم نے اس طرح سے ذکر نہیں کیا۔ ان کا ذکر کیا ہو یا نہ کیا ہو' ہمارا یہ ایمان ہے کہ دنیا کی ہر قوم کے اندر رسول آئے تھے اور ہم ان کے رسول ہونے کی جہت سے کسی میں فرق نہیں کرتے۔ لہٰذا کوئی قوم اپنے ہاں کہتی ہے' ہمارا وہ بانئ مذہب تھا تو ہم اپنے ہاں تسلیم کر لیں گے کہ غالباً یہ اسی زمرہ کے اندر ہیں جن کا قرآن حمید نے کہا ہے کہ وہ رسول تھے لیکن ہم نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ ہم ان کا بھی احترام کریں گے۔

قرآنِ حکیم کے علاوہ کوئی آسمانی کتاب ایسی نہیں جو محرف نہ ہو چکی ہو

ہم ان کی تعلیم کو صحیح نہیں مانیں گے جو ان کے ہاں رائج ہوگی کیونکہ ان کی وہ آسمانی کتب تو محرف ہوگئی ہیں۔ ان کے ہاں رائج تعلیم

میں سے صرف اسی چیز کو صحیح مانیں گے جو قرآن حکیم کے مطابق ہوگی کیونکہ قرآن حکیم نے اپنے آپ کو مُهَيۡمِنًا (5:48) کہا ہے 184 الصّٰفّٰت ۔ جتنی بھی وحی کے ذریعے سے' رشد و ہدایت اور تعلیم اور پیغام آ تا رہا ہے وہ اس نے اس تمام کو اپنے اندر لے کر' یہ اس کا محافظ اور نگہبان بن گیا ہے۔اب دنیا کا کوئی مذہب ان کے ہاں جو بھی تعلیم رائج ہے' اس میں اگر کوئی تعلیم ایسی ہے جو قرآن حکیم کے مطابق ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ اپنی اصلی شکل میں ہے' جو ان کے نبی کو ملی تھی۔اور اگر اس کے خلاف ہے تو ہم کہیں گے کہ اس میں تحریف ہوگئی ہوئی ہے اور سب سے پہلے تو ہمیں اپنے آپ کو کہنا چاہیے کہ جو اسلام ہمارے ہاں رائج ہے' یہ بھی اسی طرح سے ہے جیسا کہ ان باقی قوموں کے اندر ان کے نبی کی تعلیم نہیں تھی' یہ ان کی اپنی خود ساختہ تعلیم تھی جو رائج ہے۔ہم بھی اسی طرح سے ہیں فرق اتنا ہے کہ ہمارے ہاں خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ وہ اگر چاہیں کہ اپنے نبی کی صحیح تعلیم پر عمل پیرا ہوں تو ان کے لیے ممکن نہیں کیونکہ ان کے پاس اپنے نبی کی صحیح کتاب نہیں ہے۔ ہمارے لیے اس کا امکان ہے کہ ہم اگر چاہیں تو اس کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے احکام اور حقائق پوری انسانیت کے لیے ہیں

ہم اس اصلی تعلیم پر عمل کریں یا نہ کریں' وہ تو انسانیت کا نصب العین ہے' منزل ہے' وہ ہماری آپ کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے کہ ہم ادھر چلیں گے تو وہ سچا قرار پائے گا' ہم ادھر نہیں جائیں گے تو سچائی پہ حرف آ جائے گا۔ ہمارا یا کسی اور کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ تو ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (38:87) ہے یعنی وہ تمام نوع انسانی' تمام اقوام عالم کے لیے' کاروان انسانیت کے لیے منزل ہے جو بھی اس طرف کا رخ کر کے ادھر چلا جائے' وہی مومن ہے' وہی عبد ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ ان انبیائے کرام کا تفصیلی ذکر نہیں ہے' نام تو ہے۔قرآن حکیم تو کہتا ہے کہ اگر کسی کا نام بھی نہیں آیا ہے اور کوئی قوم اپنے ہاں کہتی ہے کہ ہمارے ہاں ہمارے مذہب کا بانی تھا تو ہم قیاس کر لیں گے کہ یہ ہوسکتا ہے۔اب دیکھیے کہ دین اسلام یا قرآن حکیم اس قدر امن و آشتی کا پیامبر ہے کہ دنیا کی ہر قوم' جسے وہ اپنے ہاں کا مذہب کا بانی قرار دیتی ہے' اس پہ ایمان لانے والے اس کے سامنے بھی احترام میں سر جھکاتے ہیں کہ یہ بھی ان انبیاء کے زمرے میں ہوسکتا ہے جس کا قرآن حکیم نے ذکر نہیں کیا تھا۔ اور انبیاء میں تو ہم فرق نہیں کرتے۔ یہ عظیم چیز ہے لیکن اب خدا کی ہدایت صرف قرآن حکیم کے اندر ہے' کہیں اور موجود نہیں ہے۔اسی لیے وہ ان کو بھی دعوت دیتا ہے کہ تم اگر اپنے نبی کی صحیح تعلیم پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہو تو اس کتاب کی اطاعت کرو۔ یہ نہ کہو کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب ہے' ہم اس پہ عمل کر کے ان کے کیوں بنیں۔انہوں نے کہا کہ یہ تمہارے نبی کی بھی کتاب ہے۔ حضرت الیاس ؑ اور اس قسم کے اور انبیائے کرام ؑ کے نام آتے ہیں جن کا تفصیلی ذکر نہیں ہے۔ یہاں بھی ان کے متعلق یہی کہا ہے کہ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوۡنَ (37:124) کیا تم خدا کے احکام کی نگہداشت نہیں کرو گے۔ یہ وہی خدا کے احکام کی دعوت ہے۔

نوسوسال قبل مسیح حضرت الیاسؑ کی قوم بعل کی پرستش کرتی تھی:

کہا ہے کہ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ۔ اللّٰہَ رَبَّکُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ(37:125-26)۔ یہاں یہ لفظ بعلاً آ گیا ہے۔ کہا کہ کیا تم بعل کو نہیں چھوڑو گے اور اس کو چھوڑ کر اس خدا کی اطاعت‘ فرماں برداری اختیار کرو گے جو تمہارا بھی رب ہے‘ ربوبیت دینے والا ہے‘ تمہارے اسلاف کا بھی رب ہے۔ یہ جو تم کہتے ہو کہ ہمارے اسلاف نے بعل کو اپنا خدا بنا لیا تھا اس لیے ہم ان کی اطاعت میں یہ کہتے ہیں کہ ان کا رب بھی وہی بعل خدا تھا۔ یہ قوم بعل (دیوتا) کی پرستش کرتی تھی۔ تورات میں حضرت الیاسؑ کا ذکر آتا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ قریباً نوسوسال قبل مسیح یہ تشریف لائے تھے اور وہ قوم جس بت کو پوجتی تھی اسے بعل کہتی تھی۔ اب عبرانی میں یہ لفظ بھی مشہور ہے۔ اس کے معنی ”بہت زیادہ استبداد کی طاقت والا“ ہے‘ وہ کہتے تھے کہ سورج دیوتا تھا‘ یہ اس کی پرستش کرتے تھے۔ بہر حال یہ جوان کا معبود تھا‘ جس کی وہ پرستش کرتے تھے‘ اسے وہ بعل کہتے تھے اور ان کی زبان میں بعل کے معنی ”بہت زیادہ قوی‘ صاحب اقتدار‘ قوت والا‘ استبداد والا تھا۔ چلتے چلتے ذہن میں ایک عجیب بات آ گئی۔ عربوں کے ہاں شروع میں ان زبانوں کے اثر کے اعتبار سے ممکن ہے کہ ان کے ہاں یہ بھی ہو۔ میں نے یہ تحقیق نہیں کی کہ اس قوم میں بھی یہ Concept (تصور) تھا یا نہیں ❶۔

عربوں کے ہاں دور جاہلیت میں عورت کا مقام اور خاوند کا رتبہ

بہر حال عربوں کے اوپر عبرانی زبان کا یا یمن کی زبانوں کا اثر ہے۔ یہ ساتھ ساتھ تو رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاں‘ عربی زبان میں جو جاہلیت کی تھی‘ خاوند کے لیے بعل کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس سے نظر آ جاتا ہے کہ اس دور میں ان کے نزدیک میاں صاحب کی کیا حیثیت ہوتی تھی اور بیوی کی کیا حیثیت تھی۔ ایک لفظ سے ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنے بڑے اقتدار اور قوت والا یہ سب کچھ تھا لیکن ایک چیز دیکھ کر مجھے اس قوم کے اوپر حیرت ہوتی ہے کہ قوم تو جاہلیت کی تھی‘ انہوں نے یہ لفظ بھی اپنے ہاں کسی زمانے میں خاوند کے لیے رائج کر لیا لیکن میں دیکھتا ہوں کہ عرب جیسی حمیت وغیرت کی قوم اور وسعت قلب والی قوم نے عورت کا یہ مقام اپنے ہاں یوں نہیں رکھا تھا۔ بعل کا لفظ انہوں نے رکھا لیکن یہ لفظ انہوں نے عورت اور مرد دونوں کے لیے استعمال کیا‘ بعل کا تانیث کا صیغہ انہوں نے اپنے ہاں بعلۃ بنایا۔ وہ جو یہ ازدواجی تعلق تھا‘ جیسے زوج کا لفظ تھا‘ میں نے کہا کہ ہمارے ہاں تو زوجہ ہی ہوتی ہے‘ ہم زوج کو کبھی خاوند کہتے ہی نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاں یہ دونوں الفاظ رکھے۔ اسی طرح سے یہ بھی مجھے یاد آیا کہ ان کے ہاں بعل کا لفظ خاوند کے لیے چلا آ رہا تھا لیکن

---

❶ بعل سامی قبائل میں سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ شام میں خصوصیت سے اس کی پرستش ہوتی تھی۔ تورات میں اس کا ذکر اکثر آتا ہے۔ (مثلاً تواریخ) بحوالہ پرویزؒ: لغات القرآن (جلد اول) ادارہ طلوع اسلام‘ 1960‘ ص 333۔

چونکہ اس کے اندر بڑے استبداد اور قوت اور زبردستی پائی جاتی تھی تو انہوں نے اس کے لیے مذکر کا صیغہ بعل خاوند کے لیے اور مونث کا الصّٰفّٰت 184 ۔ صیغہ بعلۃ عورت کے لیے اپنے ہاں رکھا اور اس اعتبار سے کہا کہ یہ جو اس سے Original Meaning (اصلی و ابتدائی معنی) ہیں وہ اس کے اندر نہیں آئیں گے' اس کے معنی صرف میاں بیوی ہونگے ۔ گویا ان کے ذہن میں بھی یہ بات تھی کہ خاوند کو بعل دیوتا کی حیثیت دے کر عورت کے اوپر اتنا صاحب مقدرت بنا دینا' یہ ان کے ہاں انسان کا تصور تھا۔ آپ دیکھیے کہ یہ کس طرح اس میں جھلک رہا ہے۔ انہوں نے یہ بعل کا لفظ رہنے دیا لیکن اس کی مونث بعلۃ ساتھ ہی بنا دی اور وہ یہ لفظ عورت کے لیے بھی استعمال کرنے لگے۔

خاوند کا مجازی خدا کہلوانے کے لیے ایک خود ساختہ روایت

ہم جو گلا پھاڑ پھاڑ کر کہتے ہیں کہ صاحب! اسلام نے عورت کو وہ حقوق عطا کیے کہ وہ دنیا میں کسی اور نے نہیں کیے۔ عزیزانِ من! اسلام نے تو عطا کیے تھے مگر اسلام کے معنی یہ اپنا اسلام لیتے ہیں اور اسلام میں کہتے ہیں کہ حقوق اتنے بڑے عطا کیے کہ خاوند کو مجازی خدا کہلوایا۔ آپ کے ہاں یہ روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (معاذ اللہ) اگر خدا کے سوا کسی کو بھی سجدے کی اجازت ہوتی تو میں عورتوں سے کہتا کہ خاوندوں کو سجدہ کریں۔ میں کہہ یہ رہا تھا ان عربوں کو ہم عرب جاہلیت کہتے ہیں' ان کے ہاں عرب جاہلیت میں بھی یہ تصور آیا کہ خالی خاوند کو ہی جو بعل کہنا ہے اس میں تو بہت زیادتی آ جاتی ہے' انہوں نے اس لفظ کا استعمال بیوی کے لیے بھی جائز رکھا۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے عائلی قوانین کی مخالفت

وہ جو مساوی حقوق کے دعوے کیے جاتے ہیں' وہ آپ کے ہاں جو عائلی قوانین یا Family Laws تھے' اس میں کیا کچھ عورتوں بیچاریوں کو دے دیا گیا تھا۔ ذرا سی رعایتیں تھیں کہ دوسری شادی کرنا چاہو تو اس کی رضامندی لے لو' نکاح کو فسق کرنے کا حق یعنی طلاق کا حق جس طرح سے مرد کو ہے' اسی طرح عورت کو بھی ہے' عدت کے دوران اس کے نان نفقہ کا انتظام مرد کے لیے نہایت لازم قرار دیا گیا ہے۔ صرف اتنی سی چیزیں اس کے اندر ہیں۔ اس زمانے سے آج تک یہ اس کے پیچھے لٹھ لے کر پھر رہے ہیں کہ یہ بھی حقوق نہیں دیئے جا سکتے کہ یہ جو عورتیں ہیں سر پڑ جاتی ہیں۔ اور اب یہ اس قسم کی Move ہو رہی ہے' تحریک ہو رہی ہے کہ ان کو بھی منسوخ کیا جائے[1]۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ عورت کو مساوات کے حقوق دے رکھے ہیں۔ یہ تو چیز اتنی سی ہے:

مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

---

[1] یاد رہے کہ یہ بات ستمبر 1980ء کی 19 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

اس طبقے کو اتنا کچھ دینے کے لیے بھی ہم تیار نہیں ہیں مگر مساوات انسانیہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ 184الصّٰفّٰت۔

عزیزانِ من! بعل کے لفظ سے بات چلی تھی کہ ان کے ہاں یہ دیوتے کا نام تھا۔ یہ بڑا زبردست دیوتا تھا۔ انہوں نے اپنے ہاں خاوند کے لیے یہ لفظ استعمال کیا۔ عربی زبان میں بھی یہ منتقل ہو گیا لیکن ہم دانشوروں کے مقابل میں وہ جاہل عربوں نے اس لفظ کو پھر مرد کے لیے مخصوص نہیں رکھا' اس کا صیغۂ مونث بعلۃ عورت کے واسطے بھی بنا دیا۔ یہاں (37:125) میں یہ لفظ اس دیوتا کے لیے استعمال ہوا ہے کہ اَتَدۡعُوۡنَ بَعۡلًا وَّتَذَرُوۡنَ اَحۡسَنَ الۡخَالِقِیۡنَ۔ اللّٰہَ رَبَّکُمۡ وَرَبَّ اٰبَآئِکُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ(37:125-26)۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم بعل (دیوتا) کی پرستش کرتے ہو اور اس خدا کو چھوڑ رہے ہو جو بہترین پیدا کرنے والا ہے یعنی اس خدا کی جو تمہارا ابھی پروردگار ہے اور تمہارے آباؤ اجداد کا بھی۔ حضرت الیاس ؑ نے اپنی قوم کو خدا کے راستے کی طرف دعوت دی تو فَکَذَّبُوۡهُ (37:127) انہوں نے تکذیب کی کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔

تکذیب کا قرآنی مفہوم: کسی بات کا زبانی اقرار کرنا لیکن عملی طور پر انکار کرنا

آگے کہا کہ فَاِنَّهُمۡ لَمُحۡضَرُوۡنَ(37:127) پس وہ اپنی غلط روش کے نتیجے میں عذاب میں ماخوذ ہو گئے۔ عزیزانِ من! جو قوم بھی حقائق کی تکذیب کرتی ہے خواہ وہ زبان سے اقرار کرے لیکن عملی طور پر انکار کرے اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ زبان سے بہت کم جھٹلاتے ہیں۔ تکذیب کا لفظ بڑا عجیب ہے جو قرآن کریم استعمال کر رہا ہے۔ ابھی دیانتداری کی مثال لے لیجیے۔ یہ کوئی بھی نہیں کہے گا کہ دیانتداری بری چیز ہے اور بددیانتی بہت اچھی چیز ہے۔ یہ تکذیب تو نہیں ہوئی لیکن جو دیانتدار نہیں بنتا' بددیانت بنتا ہے تو یہ چیز تکذیب کہلاتی ہے۔ ''کسی چیز کا زبانی اقرار کرنا عملاً اس کے خلاف جانا'' یہ تکذیب ہے۔ جس طرح اس کے مقابل میں لفظ تصدیق ہے' اس کے معنی ہوتا ہے کہ ''جو کچھ زبان سے کہے عملاً اس کو سچ کر دکھائے''۔ مصدق کے معنی ہوتا ہے ''سچ کر کے دکھانے والا''۔ اسی کے مقابل میں یہ لفظ تکذیب ہے۔ اس کے معنی ہیں ''زبان سے کہنا' عملاً اس کو جھوٹا ثابت کرنا۔ کہنا کہ دیانتداری بہت اچھی چیز ہے اور زندگی کا معاملہ بددیانتی پہ رکھنا'' تو آپ کے عمل نے تو اس قول کو جھٹلا دیا۔ اسے تکذیب کہتے ہیں۔ ہم تو سب مکذبین میں سے ہیں' اسی لیے کہا ہے کہ فَاِنَّهُمۡ لَمُحۡضَرُوۡنَ(37:127) اپنی غلط روش کے نتیجہ میں وہ عذاب میں ماخوذ ہو گئے اور اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِیۡنَ (37:128) ان میں سے وہ لوگ محفوظ رکھے گئے جو ان سے الگ ہو کر الیاس ؑ کی دعوت کے پیروکار ہو گئے تھے۔ اسے یوں کہیے کہ خدا کے جو مخلص بندے ہیں ان کی یہ صورت نہیں ہوتی۔ اخلاص نام ہی اس کا ہے کہ ''جس چیز کو زبان کہے کہ صحیح ہے اور عمل سے اس کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچائے'' یہ مخلص ہوتے ہیں۔ کہا کہ وَتَرَكۡنَا عَلَيۡهِ فِى الۡاٰخِرِيۡنَ ۔ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلۡ يَاسِيۡنَ

(37:129-30) ان لوگوں کی سرگزشتیں ہم نے آنے والے زمانوں کے لیۓ ایک سچائی کی روشنی کے مینار کی طرح قرآن مجید کے دامن میں محفوظ رکھیں۔ ان کے اوپر سلام ہے۔ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ (37:131) ہم اسی طرح ان لوگوں کو ان کے حسنِ عمل کا بدلہ دیا کرتے ہیں جو ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں۔ پھر وہی بات کہی جو چلی آ رہی ہے کہ اِنَّہٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (37:132) وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔

حضرت لوطؑ کی داستان اور قرآن حکیم کے بیان کرنے کا طریق

اب پھر آگے حضرت لوطؑ کا ذکر آتا ہے۔ کہا کہ وَاِنَّ لُوۡطًا لَّمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ (37:133)۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ حکیم ہر بار ہر جگہ پوری تفصیل نہیں دیتا' مختلف مقامات پر ان چیزوں کو لاتا ہے' وہاں تفصیل کے مختلف حصے اور ٹکڑے ہوتے ہیں اگر ان سب کو اکٹھا کیا جائے تو ایک مسلسل مربوط داستان بن جاتی ہے۔ قرآن حکیم کا طریق یہ ہے' اس کا بیان کرنے کا انداز یہ ہے۔ یہاں بھی اس کی تفصیل نہیں دی کہ اس قوم نے کیا کیا ہوا تھا۔ حضرت لوطؑ کا ذکر آتا ہے کہ ''وہ بھی اسی طرح ہمارے فرستادگان میں سے تھا''۔ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے ہاں وطن میں تھے تو وہاں یہ ہے کہ جب وہ وہاں سے ہجرت کرنے پہ مجبور ہوئے ہیں' انہوں نے وطن کو چھوڑا تو ان کے ساتھ ہجرت کر کے حضرت لوطؑ بھی تشریف لائے۔ تاریخ میں ہے اور تورات میں بھی ہے کہ آپؑ ان کے بھتیجے تھے اور قرآن حکیم میں یہ ہے کہ اس زمانے میں حضرت لوطؑ ابھی نبوت سے سرفراز نہیں کیے گئے تھے کیونکہ وہ چیز یہ تھی کہ حضرت ابراہیمؑ پر لوطؑ ایمان لائے تھے۔ ایک نبی تو دوسرے نبی پہ اس طرح سے ایمان نہیں لاتا جیسے اس کے متبع امتی ایمان لاتے ہیں۔ بہرحال' یہاں جو آئے ہیں تو قرآن حکیم نے پھر ان کا ذکر انبیائے کرامؑ کے سلسلے میں کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ تو ادھر شام کے قریب' فلسطین کی وادیوں میں آ گئے اور یہ جو وہیں ذرا آگے چل کر جسے آج Dead sea (بحر مردار) کہتے ہیں' جس کا پانی تیزاب ہے' اس میں کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی' اس کے گرد جو بستی تھی اس قوم کی طرف آپؑ مبعوث ہوئے اور نبی تھے۔

قرآنِ حکیم نے حیوانی سطح کے بالمقابل انسانیت کے اندر جنسی اختلاط کو قدر کی شکل میں پیش کیا ہے

اس قسم کی بدعملی کے متعلق قرآنِ کریم نے صرف چند اشارے کیے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے اور میں نے کئی دفعہ عرض کیا تھا کہ جو Physical Life (طبعی زندگی) حیوانات میں اور انسان میں مشترک ہے' اس میں جنسی اختلاط تو افزائش نسل کا ذریعہ ہے لیکن انسانیت کی سطح کے اندر آ کر قرآن کریم اس کو ایک قدر قرار دیتا ہے' Value قرار دیتا ہے اور قدر بھی وہ جو غیر متبدل ہے۔ جنسی اختلاط ان حدود کے اندر رہتے ہوئے جائز ہے جو وحی نے متعین کیے ہیں' ان سے باہر نکل جائیے تو حیوانیت کی زندگی آ جاتی ہے' انسانیت کی نہیں

رہتی۔ اس وقت ضرورت نہیں کہ میں اور تفصیل میں جاؤں اس کے متعلق بڑی تفصیل سے باتیں ہو چکی ہیں۔ اس کو ہی قرآن کریم 184 الصّٰفّٰت ۔ عصمت کہتا ہے اور اس پہ بڑا زور دیتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے عصمت کے متعلق ایک مرد اور ایک عورت کی داستان نہایت حسین اور طویل بیان کی ہے۔ حضرت یوسفؑ کی داستان مردوں میں سے ہے اور حضرت مریمؑ کی عورتوں میں سے ہے۔ یہ داستان مثال کے طور پر بیان کی ہے اور وہ اس لیے ہے کہ وہ بڑے ہی نازک مقامات تھے جن کے اندر انہوں نے اپنی عصمت کو برقرار رکھا اس لیے ان کی مثالیں دی ہیں ورنہ ایک تعلیم کی حیثیت سے، ایک Value (قدر) کی حیثیت سے، اس نے عصمت کو بڑا ہی بلند مقام عطا کیا ہے۔ اس قوم کی کیفیت یہ تھی کہ اس معاملے کے اندر جیسے قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ **وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۔ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ** (29:28-29) اور اسی طرح لوطؑ کی سرگزشت ہے جب اس نے نبوت کے بعد اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک ایسی بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو جسے اس سے پہلے دنیا جہاں میں کسی نے اختیار نہیں کیا تھا۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم جنسی جذبہ کی تسکین کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو اور اسی طرح اس راستے کو منقطع کرتے ہو جسے فطرت نے افزائش نسل کے لیے تجویز کیا ہے نیز تم اپنی مجلسوں میں نازیبا حرکتیں کرتے ہو۔ ان کے خلاف یہ جرائم قرار دیتا ہے۔

جنسیاتی بدنہادی کے متعلق قرآنی اقدار کے برعکس آج اہل یورپ کی حالتِ زار

میں یہ الفاظ بیٹیوں بہنوں کے سامنے کچھ صریح نہیں بیان کروں گا۔ یہاں یہ ایسی چیز ہے۔ یہاں میں زبان کے لحاظ سے بہت زیادہ محجوب اور متحمل ہو جایا کرتا ہوں۔ یوں سمجھیے کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک لفظ لواطت آ رہا ہے، یہ قومِ لوط سے ہی آ رہا ہے۔ انگریزی زبان میں جو لفظ Sodomy ہے، اسی سے ہی Sodom (سدوم) ان کا دار الخلافہ یا سنٹرل سٹی تھا۔ اس شہر کی نسبت سے ان کے ہاں یہ لفظ جسے آپ خلاف وضع فطرت کہتے ہیں یہ چیز تھی۔ ان کے ہاں نظر آتا ہے کہ پوری قوم میں یہ برائی عام ہو گئی ہوئی تھی۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ اس قسم کی فحاشی، دنیا جہاں میں نہ کہیں دیکھی گئی، نہ سنی گئی۔ اور واقعی آج بھی یہاں یہ بات سنتے ہیں تعجب ہوتا ہے کہ اس دور تہذیب وتمدن میں علم وبصیرت میں جہاں کی تہذیب نگاہوں کو بقول اقبالؒ (1877-1938ء) چکا چوند کر دیتی ہے ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انگلستان میں یہ جو چیز ہے، انہوں نے چند سال ہوئے اپنے ہاں قانون پاس کیا ہے۔ اس کو انہوں نے اپنے ہاں پوری قوم میں قانوناً جائز رکھا ہے۔ یہ وہی عہدِ جاہلیہ کے افسانے نہیں ہیں۔ انسان جب بھی وحی کا دامن چھوڑتا ہے تو اسی مقام پہ جا

پہنچتا ہے جسے اس نے حیوانات کا مقام کہا ہے' کوئی دور بھی کیوں نہ ہو۔ اس قوم کا یہ جرم گنایا ہے یہاں تَقْطَعُوْنَ الصّٰفّٰت 184 السَّبِيْلَ (29:29) آیا ہے جو قطع سبیل ہے' یہ محاورہ ہے: ''راہ کاٹنا''۔اس کے معنی راہزنی بھی ہوتا ہے۔اب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بھی ساتھ ہی کرتے ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ افزائش نسلِ انسانیت کا جو راستہ تھا انہوں نے اس راستے کو مسدود کردیا' منقطع کردیا۔ یہ بھی اس کا ترجمہ ہوسکتا ہے۔

اگر کسی برائی کو برائی سمجھنے کا تصور ہی باقی نہ رہے تو پھر اصلاح کی گنجائش ختم ہوجاتی ہے

بہرحال یہ جرم ہے اور یہ بات اتنی عام ہوگئی ہے کہ وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (29:29) ایک دوسرے سے حیا بھی نہیں کرتے' بے حیاء اتنے ہوگئے ہو کہ اپنی مجلسوں میں کھلے بندوں اس کا تذکرہ کرتے ہو۔ جب کسی قسم میں یہ چیز قانوناً بھی جائز قرار دی جائے تو پھر تو ہر وقت اپنے ہاں اس کا تذکرہ کرنا معیوب ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ جب کوئی برائی اس قدر عام ہوجائے کہ وہ Epidemic یا وبائی مرض کی طرح پھیل جائے تو پھر وہ قوم اس کو معیوب ہی نہیں سمجھتی' مذموم ہی نہیں سمجھتی۔ اور جب اس حد تک برائی عام ہوجائے تو اس میں اصلاح کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اصلاح کی گنجائش اس وقت ہوتی ہے جب کم از کم برائی کو برائی تو سمجھے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ شیطان کرتا یہ ہے کہ ان کے برے اعمال کو ان کی نگاہوں کے اندر مزین کرکے دکھا دیتا ہے' ان کی نگاہوں کے اندر وہ برائی' برائی نہیں رہتی۔ اس حد تک جب کوئی قوم چلی جائے پھر کوئی اس کی بازآفرینی کی شکل باقی نہیں رہا کرتی۔

حضرت نوحؑ کے بیٹے کی بے رخی' حضرت لوطؑ کی بیوی کا ردعمل' حضرت ابراہیمؑ کی اپنے باپ کی مخالفت اور فرعون کی بیوی کی عظمت

قرآن حکیم نے حضرت نوحؑ کے ضمن میں کہا کہ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ۔ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ (37:134-35) ان کا جو بیٹا تھا وہ ایمان نہیں لایا تھا' وہ ان لوگوں کے ساتھ تھا جو اس کے مخالف تھے تو وہ ڈوب گیا تھا۔ حضرت لوطؑ کے متعلق کہا ہے کہ ان کی بیوی ان کے ساتھ نہیں تھی' یہ قوم کو وارننگ دے کر وہاں سے ہجرت کر کے نکل گئے کہ تم تباہ ہونے والے ہو۔ وہ اپنی جماعت کو ساتھ لے کر نکلے اور جو بیوی تھی وہ ایمان نہیں لائی ہوئی تھی' وہ پیچھے رہ گئی' وہ تباہ ہوئی تھی۔ قرآن حکیم نے یہ مثالیں اس لیے دی ہیں کہ کسی کے ساتھ خون کا رشتہ ہونا خدا کے عذاب سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ یہ رشتہ داریاں کوئی شے نہیں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ باپ کو وہ کہہ رہے ہیں کہ تم کیا کررہے ہو؟ اپنے ہاتھوں سے پتھر تراشتے ہو' پھر اس کے سامنے جھکتے ہو۔ آپؑ یہ کچھ بیٹا ہو کر باپ کو کہہ رہے ہیں' ادھر نوحؑ ہیں' وہ بیٹے سے کہہ رہے ہیں' یہاں بیوی کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ ان کے ساتھ نہیں گئی۔ ان کا باپ ہونا' اس کا بیٹا

ہونا' ان کی بیوی ہونا' خدا کے عذاب سے ان کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ رشتے داری کا تعلق ایمان سے نہیں ہے۔ جب نبی کو خود اپنی وحی پہ اسی طرح ایمان لانا پڑتا ہے تو جو نبی کے رشتے دار ہیں وہ محض رشتے دار ہونے کی حیثیت سے کس طرح مومن تسلیم کر لیے جائیں گے۔ اس لیے قرآن حکیم نے ان چیزوں کو بیان کیا ہے۔ یہاں بیوی کے متعلق کہا ہے کہ ثُمَّ دَمَّرۡنَا الۡاٰخَرِیۡنَ (37:136) وہ قوم جو باقی تھی' وہ تباہ و برباد ہو گئی۔ آگے کہا کہ وَ اِنَّکُمۡ لَتَمُرُّوۡنَ (37:137)۔ یہ چیز جو قرآن حکیم نے کہی ہے اس کی تفصیل نہیں دی۔ اس زمانے کے مخاطب جو عرب تھے' ان کے قافلے مکے سے شام کی طرف' یمن کی طرف' مصر کی طرف آتے جاتے رہتے تھے' ان کا ذریعہ معاش ہی یہ تھا۔ ایک شاہراہ عظیم ان کے راستے میں پڑتی تھی' یہ بستیاں ان راستوں میں پڑتی ہیں۔ قرآن حکیم نے اسی لیے ان کا نام لے کر زیادہ تفصیل نہیں بتائی کیوں کہ وہ لوگ تفصیل جانتے تھے۔ یہ وجہ ہے کہ انہوں نے پوچھا نہیں ہے کہ صاحب! یہ کون تھے جسے آپ کہتے ہیں؟ یہ کہاں تھے؟ کون سی ان کی بستیاں تھیں؟ قرآن حکیم کہتا ہے کہ وَ اِنَّکُمۡ لَتَمُرُّوۡنَ عَلَیۡہِمۡ مُّصۡبِحِیۡنَ۔ وَ بِالَّیۡلِ (37:137-38) تم تو ان کی بستوں کے کھنڈرات پر سے صبح شام گزرتے رہتے ہو' تم تو ان کو دیکھتے ہو لیکن آگے ایک ٹکڑا ہے کہ قرآن حکیم نے یہ بات کیوں کہی۔

بیان کردہ قرآنی واقعات کا مقصد انسانی عقل و بصیرت کی راہنمائی کرنا ہے

کہا کہ یہ بات تو ٹھیک ہے Archaeological Excavation کے ماتحت یہ جو ہمارے ہاں کھدائیاں کرتے ہیں اور پرانے شہر نکالتے ہیں تو ہمارے ہاں تو اتنی سی چیز ہے کہ صاحب! فلاں سن میں فلاں قوم نے اس شہر کو بنایا اور اس میں یہ خصوصیت ہے' انفرمیشن اس کی لی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ادھر سے گزرتے ہو تو اتنی سی بات ہی ذہن میں نہ رکھو کہ یہاں قوم لوط ؑ بستی تھی اور یہ اس کی بستیوں کے کھنڈرات ہیں۔ کہا کہ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (37:138) عقل و بصیرت سے کام لو' ان بستیوں کے کھنڈرات کو دیکھ کر سوچو کہ یہ کیوں تباہ ہوئیں۔ قرآن کریم عقل و دانش' کو اپیل کر رہا ہے جس قرآن کریم کی یہ کیفیت ہے کہ اجڑی ہوئی قوموں کے کھنڈرات کو دکھا کر بھی کہتا ہے کہ انہیں دیکھ کر عقل سے کام لو' زندہ قوموں کے احوال و کوائف پہ وہ عقل سے کام لینے کو کہے گا اور ہماری اپنی زندگی جو ہے اس پہ وہ کیوں عقل و فکر سے کام لینے کے لیے نہیں کہے گا' ضرور کہے گا۔

ہم شیشے میں اپنا عکس دیکھ کر شیشے کو توڑ دیتے ہیں

مشکل یہی ہے کہ اگر ہم عقل و فکر سے کام لیں تو اس شیشے کے اندر' اس آئینے کے اندر جو ہمیں اپنا عکس نظر آتا ہے' ہم اسے ہی توڑ دیتے ہیں۔ وہ مشہور ہے کہ حبشی کو شیشہ ملا تھا۔ اس نے جب اپنا عکس دیکھا تو اس کو اس میں جن نظر آیا تو اس نے پتھر پہ مار کر وہ شیشہ

توڑ دیا۔ہم آئینوں کے اندر جب اپنی شکل دیکھتے ہیں تو وہ ایسی نظر آتی ہے کہ ہم آئینے کو توڑ دیتے ہیں' غلاف میں لپیٹتے ہیں' بالائے طاق رکھ دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے اس کے پڑھنے کا ثواب ہو گیا۔اس آئینے ❶ میں ہم اپنی شکل نہیں برداشت کر سکتے۔

قرآن حکیم کی پیش کردہ تعلیم کے برعکس حضرت یونسؑ کے سلسلہ میں تورات کی افسانہ نگاری

اب اگلی بات آئی اور پھر اور نبی آئے وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (37:139) یونسؑ بھی خدا کے رسولوں میں سے تھا۔ان کے متعلق بھی تورات میں خاصا ذکر ہے اور ہمارے ہاں تو ایک سورۃ بھی سورۃ یونس مشہور ہے۔ان کے اعتبار سے ان کے قصے میں ایک اہم بات آئی ہوئی ہے۔ وہ پہلے عرض کروں۔افسانے تو تورات میں بہت ہیں' آپ کے ہاں کی تفسیروں میں بہت ہیں لیکن بات اصل میں قرآن حکیم نے دوسری جگہ کہی ہے۔نبی اپنی قوم میں آتا ہے' پوری کوشش اور محنت کرتا ہے کہ وہ اپنی تباہی کو چھوڑ کر صحیح راستوں کے اوپر آجائے' وہ بڑی ہمت کرتا ہے لیکن اس کے لیے جیسا حضرت ابراہیمؑ کی داستان میں ہم دیکھ چکے ہیں اس قدر صبر آزما مراحل ہوتے ہیں' اتنی سہارا اور برداشت کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ ایک وحشی پرندے کو سدھانے کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔نبی کے بڑے محنت طلب اور صبر آزما مراحل ہوتے ہیں۔جب اس میں آخری صورت آجاتی ہے اور نظر آتا ہے کہ اب اس قوم میں سے جس جس نے بھی اس دعوت کو قبول کرنا تھا وہ چند ادھر آ گئے ہیں اور یہاں کوئی امید باقی نہیں رہی ہے تو پھر وہ خدا کے ارشاد کے مطابق وہاں سے ہجرت کرتا ہے۔ہجرت اس مقام کی طرف کرتا ہے جہاں اس نظام کے قائم ہونے کے لیے حالات زیادہ سازگار ہوتے ہیں۔یہ ہوتا ہے اس قوم کو چھوڑ کر دوسری طرف جانے کا قصہ۔

مقامِ نبوت خود ہی اپنی مرضی سے کسی قوم کو نظر انداز نہیں کر سکتا

حضرت یونسؑ کے قصے میں قرآن کریم نے ایک لفظ کہا ہے جس میں وہ ساری بات کہہ گیا ہے کہ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ ❷ (21:87)۔یہ نہیں تھا کہ حالات وہاں تک پہنچ چکے تھے اور اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اب وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (73:10) ان کو چھوڑ دو اور تم دوسری طرف چلے جاؤ' یہ بات نہیں ہوئی۔وہ خود ہی اس قوم سے ناراض ہو گئے اور غصے میں آ کر وہاں سے چھوڑ کر چلے گئے۔کیا بات ہے قرآن حمید کی! ایک لفظ میں فرق کر گیا۔چھوڑ کر تو دونوں ہی چلے جاتے ہیں' ابھی حضرت

---

❶ یہ آئینہ قرآن مجید ہے۔اسے غلافوں میں لپیٹے ہیں اور صرف ثواب حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔رویّے اور عمل اس کے مطابق نہیں بناتے۔

❷ اور اسی طرح ذوالنونؑ کا معاملہ بھی ہے۔وہ اپنی قوم کے لوگوں سے تنگ آ کر غصہ میں وہاں سے چلا گیا (حالانکہ اسے ابھی ہجرت کا حکم نہیں ہوا تھا لیکن اس نے یہ فیصلہ کسی سرکشی کے ارادے سے نہیں کیا تھا) اس نے خیال یہ کیا تھا کہ چونکہ یہ فیصلہ خدا کے کسی حکم کے خلاف نہیں اس لیے خدا اس پر مواخذہ نہیں کرے گا اور مجھے کسی سختی میں نہیں ڈالے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔744)۔

الصّٰفّٰت 184 ابراہیمؑ بھی چھوڑ کر گئے ہیں، ابھی حضرت لوطؑ کا قصہ ہے، وہ بھی چھوڑ کر گئے ہیں لیکن وہ قوم سے غصے ہوکر نہیں چھوڑ کر گئے، یہ ناراض ہوکر نہیں گئے تھے۔ان کے متعلق یہ چیز کہی ہے کہ ابھی وہ آخری وقت نہیں آیا تھا جہاں قوم کی طرف سے مایوسی ہوجاتی کہ اب ان میں امکان نہیں ہے۔آگے چل کر قرآن حمید کہتا ہے کہ اس قوم میں امکان تھا لیکن یہ قبل از وقت، از خود ان کو چھوڑ کر ناراض ہوکر چلے آئے۔ ایک نبیؑ کے لیے تو یہ جو چیز بھی ہے، یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اسکو جرم کہیں، بہرحال قرآن حمید نے ایک لغزش تو کہا ہے کہ خود فیصلہ کیا اور ان کا اجتہادی فیصلہ صحیح نہیں تھا۔اس قوم میں راہ راست پہ آجانے کے ابھی امکانات تھے۔اب یہاں سے بھی بات ہوئی کہ اگر کسی مریض میں صحت یاب ہونے کا امکان باقی ہے تو مشفق طبیب کو یہ نہیں چاہیے کہ اس کے ہاں سے اٹھ کر چلا جائے۔کیا بات ہے انبیائے کرامؑ کی! خود فیصلہ کر کے کہ صاحب! ان میں اس کی صلاحیت کا امکان نہیں رہا خود اٹھ کر چلے جانا قرآن حمید نے اس کو بھی نبی کے لیے لغزش قرار دیا ہے ''جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے'' ان کے لیے جو معیار ہے وہ بہت اونچا معیار تھا۔ اوکونسی بات ہے کسی کو چھوڑ کر چلے جانے کی کہ ''جا کھسماں نو کھا' مینوں کی۔نہیں مندا تے نہ من' مرن تے ای توں آیا ایں تے جا مر فیر''❶ لیکن جو خدا کے بندے ہیں ان کی ذہنیت یہ نہیں ہونی چاہیے۔وہ تو یہ ہے کہ مریض مر بھی رہا ہے، ہدایات کی برخلافی بھی کر رہا ہے، دوائی پی بھی نہیں رہا ہے، آپ پھر بھی اس کے ساتھ محبت اور شفقت ہی کرتے ہیں۔قرآن حمید نے کہا ہے کہ ان کو چھوڑ کر چلا جا لیکن ان تک پیغام پہنچا تا رہ تا کہ کوئی شخص اس لیے ہلاک نہ ہوجائے کہ تیری بات ان تک نہیں پہنچی تھی۔''بڑا من مارن والی گل اے صاحب❷''۔

قرآن حکیم کی اس نورانی تعلیم کے برعکس ہمارے ہاں کے تفسیری قصوں کی نوعیت

یہاں کہا ہے کہ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا (21:87) وہ غصہ میں وہاں سے چلا گیا۔ یہ تھی لغزش۔اب آگے قصہ آتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ یہ وہاں سے غصے میں آئے، ادھر سے اللہ میاں کو (معاذ اللہ) غصہ آیا، انہوں نے کہا کہ ''چل کتھے چلنا ایں❸'' یہ آئے اور آکر وہاں سے دریا پہ پہنچے، سمندر پہ پہنچے تو اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (37:140) وہاں آئے تو کہیں دوسری جگہ جانا تھا۔راستے میں دریا پڑتا تھا یا بحیرہ پڑتا ہوگا۔قرآن کریم نے یہ تصریح نہیں کی ہے۔تو وہاں آئے، کشتی تھی، اس میں خاصی سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں، کشتی بھری ہوئی تھی، وہ بھی اس میں بیٹھ گئے۔یاد رکھیے! یہ اس لیے نہیں ہے کہ خدا نے یہ کچھ ان سے بدلا لیا کہ تم یہ کرتے ہو تو دیکھو ہم تمہیں ڈبوتے

---

❶ کہ جاؤ، اپنوں کا سر کھاؤ، مجھے کیا! نہیں مانتے ہو تو نہ مانو۔اگر تم مرنے پر ہی تلے ہوئے ہو تو جاؤ مرو۔

❷ یہ بڑی ہی پتہ مار کر کام کرنے والی بات ہے۔

❸ چلو تو! دیکھیں کہاں جاتے ہو۔

الصّٰفّٰت 184 ہے کہ ہیں۔اس کا اس سے تعلق نہیں ہے۔ وہ اتنی سی بات ہے جوان سے کہی ہے کہ تمہارا فیصلہ ٹھیک نہیں تھا' اس کے لیے آگے بات آتی ہے کہ پھر حضرت یونسؑ کو کہا گیا کہ اس کا ازالہ کس طرح سے کرو جو تم سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے۔ پھر میں دہرا دوں' یہ نہیں ہے کہ ان سے یہ ہوا تو خدا نے کہا کہ اچھا دیکھو کہاں جاتے ہو تم ''ساڈے محلے وی توں اونا ای اے ناں اک دن ❶'' خدا اس قسم کے انتقامات کے جذبے سے بڑا بلند ہے۔ یہ واقعہ دوسرا ہے کہ وہ وہاں آئے' کشتی بھری ہوئی تھی' وہ اس میں بیٹھ گئے۔ اب آگے اس آیت میں ایک لفظ آیا ہے کہ **فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ** (37:141)۔ یہ لفظ **فَسَاهَمَ** ہے۔ یہ ٹھیک ہے عربوں کے ہاں ساھم وہ تیر بھی ہوتے تھے جن سے وہ قرعہ ڈالتے تھے اور آپس میں گوشت تقسیم کیا کرتے تھے' یہ اس تیر کو کہتے تھے جس سے قرعہ ڈال کر حصے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس تیر سے یہ بھی چیز ہو جاتی ہے۔ یہاں سے ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ کشتی ڈگمگانے لگی' ملاحوں نے کہا کہ ہم میں کوئی شخص ایسا ہے جو کسی جرم کو کر کے بھاگا ہے' مفرور مجرم ہے' اس کی وجہ سے کشتی ڈوب رہی ہے۔ اب پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون ہے۔ انہوں نے قرعے ڈالے اور قرعہ حضرت یونسؑ کے نام پہ نکل آیا اور انہوں نے ان کو اٹھایا اور دھڑام سے دریا میں پھینک دیا۔ عزیزانِ من! یہاں قرعہ اندازی کی بات نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے **سَاهَمَ** میں یہ ہے۔ جو چیز بھی کی جائے' وہ کچھ مل کر کی جاتی ہے۔ عرب اس مل کر کرنے کے لیے اس لفظ کو استعمال کرتے تھے۔

قرعہ اندازی کو ناجائز بھی کہا جاتا ہے اور پھر اسی کے مطابق حج بھی ہوتا ہے

ہمارے ہاں شریک وسہیم کے الفاظ ہیں۔ سہام ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے۔ شیعہ حضرات کے ہاں جو امام کا حصہ ہوتا ہے اس میں سے وہ دوسروں کو دے تو وہ سہم امام ہوتا ہے' یہ سارے اس میں شریک ہوتے ہیں' نظر یہ آتا ہے کہ وہاں اس کے معنی میں یہ قرعہ اندازی کی بات نہیں آتی۔ اگرچہ اس زمانے کے اندر ممکن ہے' وہ لوگ یہ بھی کرتے ہوں۔ آج آپ کے ہاں یہ کہتے ہوئے کرتے ہیں کہ قرعہ اندازی اسلام میں ناجائز ہے پھر قرعوں کے ذریعے سے حج بیت اللہ کے متعلق فیصلہ کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ کشتی کی سواریوں کے اندر شریک ہو گیا' کشتی بھری ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود ان کے اندر بیٹھ گیا۔ **فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ** (37:141) اس کے بعد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کشتی ڈگمگائی یا یہ کہ یہی بیٹھتے بیٹھتے یہ صورت تھی' جگہ نہیں تھی' کہیں جیسے وہ بھری ہوئی گاڑی کے باہر وہ دروازے پہ کھڑے ہو جاتے ہیں' یہ بھی ہو سکتا ہے۔ بات کچھ بھی ہو قرآن کریم تو اس کی تصریح نہیں کرتا کہ ہوا کیا ہے۔ ہوا یہ ہے کہ پاؤں ڈگمگایا ہے اور دریا میں گر گئے۔

---

❶ ہمارے محلے میں بھی تو تمہیں ایک دن آنا ہی ہے (پھر وہاں تمہیں دیکھ لیں گے)

حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ میں جانے کا تصور صحیح نہیں

184الصّٰفّٰت۔

کہا ہے کہ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ (37:142) اب وہاں کوئی بڑی مچھلی ہے اس نے ان کو دبو چا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ اس نے نگل لیا اور جیسا کہتے ہیں کہ نگل لیا اور یونسؑ ان کے پیٹ میں چلا گیا اور وہ وہاں رہا۔ یہ جولقمہ اجل ہے' یہ تو کسی چیز کو دبوچ لینے کو کہتے ہیں۔ کوئی بڑی مچھلی ہے' اس نے ان کو دبوچ لیا ہے۔ اب حضرت یونسؑ کے ذہن میں یہ احساس پیدا ہوا کہ میں جو اس طرح سے چھوڑ کر غصے کے عالم میں چلا آ رہا ہوں تو غصہ فرو ہو گیا۔ یہ واقعہ پیش آیا تو جیسے ہم بھی دو واقعوں کو آپس میں ملا دیتے ہیں حالانکہ وہ چانس سے ہوتا ہے کہ صاحب! یہ اس لیے ہوا کہ میں جو وہاں مزار شریف سے واپس آیا ہوں تو میں نے پیٹھ ادھر کر دی تھی اس لیے میرا اس سائیکل والے کے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا حالانکہ ان دونوں کے اندر کوئی ربط نہیں ہوتا۔ ربط ہمارا ذہن پیدا کر دیتا ہے جو اپنے ہاں کے ضمیر کی آواز ہے۔ ضمیر نے ملامت کی۔ کہا ہے وَهُوَ مُلِيْمٌ (37:142) میں نے اچھا نہیں کیا۔ اور اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ چیز بھی ہو' اسی کی وجہ سے آج یہ سارا کچھ پیش آ رہا ہے۔ یہ بات میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ پھر ہوا کیا ہے۔ کہا ہے کہ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ- لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (37:143-44)۔ ہمارے ہاں تو تسبیح کا لفظ عام ہو ہی گیا ہے۔ اس کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اگر وہ وہاں تسبیح نہ کرتا تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتا اور آپ کے ہاں تسبیح وہ ہے جو بڑی مشہور ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (21:87)۔ یہ تسبیح ہے اور اس کے ورد کرایا کرتے ہیں۔

ایک اجتہادی غلطی پر حضرت یونسؑ کی نفسیاتی کیفیت اور ان کا تیراکی کا عمل

یہ یہاں آیا ہے کہ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (21:87) ان مشکلات کی تاریکیوں میں اس نے پھر خدا کو پکارا کہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ میں تیرے اقتدار سے بھاگا نہیں تھا' میرا تو ایمان یہ ہے کہ الٰہ تُو ہی ہے' مجھ سے واقعی ایک اجتہادی لغزش ہو گئی تھی۔ ایسے وقت میں جب انسان پہ مصیبت پڑتی ہے تو آپ دیکھیے کہ یہ ساری چیزیں بڑی نیچرل ہیں جو یہ ہو رہی ہیں۔ ذہن کے اندر ہوتا ہی اس طرح سے ہے کہ یا اللہ! مجھے معاف کر دے' اپنے ضمیر کی جو ملامت ہے' یہ اس کا اظہار ہوتا ہے' خدا کی طرف سے یہ چیز نہیں ہوتی۔ اور وہ جو بات میں نے کہی کہ نبی ہر بات خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے نہیں کرتا' وحی تو صرف نبوت ہوتی ہے وہ نبی تو بشر بھی ہوتا ہے اور یہ عین تقاضائے بشریت ہے۔ اب یہ ہے کہ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ (37:143)۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی۔ اب الْمُسَبِّحِيْنَ کو انہوں نے تسبیح کرنے والا کہا ہے اور تسبیح وہ ہوئی جو آج ہمارے ہاں رائج ہے۔ آپ کو تسبیح کا مفہوم معلوم ہے' اس سے پہلے تسبیح کا مفہوم آ چکا ہے۔ اس کا مادہ (Root) ''س ب ح'' ہے۔ عربی زبان میں ''کسی کام کے

لیے انتہائی جدوجہد کرنے کو کہتے ہیں'' اور انہوں نے یہ کیا۔ وہاں سے تیراک جو پورے ہاتھ پھیلا کر تیرتا ہے' اس تیراک کو **مسبّح** [184] الصّٰفّٰت کہتے ہیں اور اس عمل کو تسبیح کہتے ہیں۔ بات تو سیدھی سی ہے کہ اگر وہ اس سے نکلنے کی انتہائی جدوجہد نہ کرتا اور اگر وہ ایسا تیراک نہ ہوتا تو قیامت تک وہاں اس کے منہ میں رہتا۔ یہ بات سیدھی سی ہے۔

قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہنے کو بطور محاورہ استعمال کیا گیا ہے

وہ زیب داستان کے لیے بڑھانا ہے' اس کے بغیر کوئی لطف نہیں آتا ''جے اینی گل دتی جائے بھئی! او تیر کے نکل آئے سن' او تے کچھ گل بنانی پیندی ہیگی' تاں ای تے وعظ اچ آئے گا اگلی واری وی کہ چلو ایت کی سینیے کہ فیر کی ہوسی یونسؑ دے نال [1]''۔ اور یہ چیزیں جو عام حالات میں بتائی جائیں تو پھر اس میں لطف نہیں رہتا۔ سیدھی سی بات ہے قرآن حکیم نے کہا ہے کہ اس نے حضرت یونسؑ کو دبوچ لیا فَلَوْ لَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ (37:143) اگر وہ اتنا بڑا ماہر تیراک نہ ہوتا اور جدوجہد نہ کرتا۔ یہ دونوں الفاظ اس کے اندر آ جاتے ہیں کہ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو پھر ٹھیک ہے' جیسا اس نے دبوچ لیا تھا۔ وہ جو ہوتا ہے کہ قرآن حکیم میں جو یہ الفاظ آتے ہیں تو پھر ہمارے ہاں اس کے اوپر روایات آ جاتی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ(37:133)۔ اب ہمارے ہاں پھر اس کے اوپر روایات بنی ہوئی ہیں کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں تھا اگر وہ تسبیح نہ کرتا۔ وہاں لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (21:87) کی تسبیح نہ پھیرتا تو پھر وہ۔۔۔۔۔۔۔ اب آگے وہ یہ کیا کہ خود ہی ایک مشکل پیدا کرتے ہیں اور پھر اس کے حل کرنے کے لیے چلتے ہیں کہ اگر وہ مچھلی کے پیٹ میں چلے جاتے تو یہاں کہا ہے کہ پھر وہ قیامت تک اس میں رہتے تو گویا وہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی۔ اب یہ بات سوچنی پڑی کہ اگر مچھلی مرجاتی تو پھر اندر والا زندہ ہی نہیں رہ سکتا' مردہ جسم کے اندر ایک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور قیامت تک کے لیے مچھلی کا جو جینا ہے یہ بڑا محال نظر آتا ہے تو پھر معجزہ آیا۔ اس مچھلی کا معجزہ آیا۔ یہ سارا کچھ اگر خدا کے حکم سے ہو رہا تھا تو مچھلی کا قیامت تک زندہ رہنا کونسی ایسی ناممکن العمل بات ہے' وہ زندہ رکھ سکتا ہے' وہ قادر مطلق ہے' جو چاہے وہ کرے ٹھیک ہے جی۔ اس میں سیدھی سی بات یہ ہے کہ زبانوں کے محاورے ہوتے ہیں کہ تم قیامت تک یہ نہیں کر سکتے' یہ قیامت کا انتظار یوں ہے کہ جب کسی چیز میں محاورے میں کہنا ہو کہ یہ بڑے لمبے عرصے کے لیے ہے اور مدت متعین نہ کرنی ہو تو یہ زبان کے محاورے ہیں' عربی زبان کے محاورے اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اور يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ہیں' یعنی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے' لمبی مدت کے لیے۔ کہا کہ اگر وہاں یہ صورت نہ ہوتی' وہ اپنے آپ کو نہ

---

[1] اگر یہ اتنی سی ہی بات دی جائے کہ بھئی! وہ تیر کر نکل گئے تھے تو یہ کوئی (مزیدار) بات ہی نہیں بنتی۔ وہ تو کوئی بات بنانی پڑتی ہے تاکہ وہ اگلی دفعہ وعظ میں آ سکے کہ چلو بھئی! اس کی سنیں کہ پھر حضرت یونسؑ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

چھڑاتا' اچھا تیراک نہ ہوتا تو پتہ نہیں کب تک اسی طرح سے اس کے منہ میں دبو چا ہوا رہتا۔ کہا کہ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ (37:145) سیدھی سی بات تھی کہ اس نے ہاتھ پاؤں مارے' تیراک بھی تھا' یہ کچھ کیا اور اچھل کے ساحل کے اوپر آ گرا لیکن بڑا ہی کمزور ہو گیا ہوا تھا' پانی میں بھی ڈوبا ہوا' مچھلی کے بھی قابو آیا ہوا' جدوجہد کرنے میں بھی معلوم نہیں کہاں کتنی کوشش کرنا پڑی۔ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ وہ بہت کمزور ہو گیا ہوا تھا اور جہاں وہ لبِ ساحل پھینکا ہے وہاں کوئی سبزی وغیرہ نہیں ہوتی لیکن کہا کہ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ (37:146) وہاں بڑے بڑے چوڑے پتوں والی ایک بیل تھی یا ایک پودا تھا یا ایک پیڑ تھا۔ قرآن حکیم نے شجرہ کہا ہے' اسے درخت ہی کیوں نہ کہیں' انہوں نے تو کہا ہے کہ کدو کی بیل تھی یعنی وہ تو یہاں تک متعین کر دیتے ہیں کہ بیل بھی بتا دی کہ کدو کی تھی۔ انہیں سائے کی ضرورت تھی وہ بیل بڑے بڑے پتوں والی تھی۔ اب وہ وہاں تندرست ہوئے۔

حضرت یونسؑ کو واپس اس قوم کی طرف جانے کا حکم

اب یہاں ان سے کہا گیا ہے کہ مغاضباً (21:87) ناراض ہو کر وہاں سے تم چل پڑے تھے۔ وہ قوم ابھی اس درجے تک نہیں پہنچی تھی کہ وہ راہ راست پر نہ آتی' اسے کوئی دن اور بھی دیئے ہوتے:

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

اپنی غلطی تسلیم کر رہا ہے۔ یہ کہا ہے کہ وہ قوم راہ راست پہ آ جاتی' یونسؑ کوئی دن اور وہاں رہتے وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ (37:147) وہ بہت بڑی قوم تھی' لاکھ لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ اور وہاں کہا ہے کہ یونسؑ واپس جاؤ' ان میں ابھی امکان ہے فَاٰمَنُوْا (37:148) وہ وہاں گئے اور وہ قوم ایمان لے آئی۔ فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (37:148) تو اس کے بعد پھر واقعی زندگی کی خوشگواریاں ان کو ایک مدت معینہ کے لیے مل گئیں۔ اس واسطے حضرت یونسؑ کا یہ اقدام کہ خود فیصلہ کر لینا کہ ان میں یہ صلاحیت نہیں اور غصے میں آ کر وہاں سے چلے جانا' بس یہ ہے ساری بات جو اس میں کہی گئی ہے۔ طبیب مشفق کو کبھی غصے میں آ کر مریض کے سرہانے سے اٹھ نہیں آنا چاہیے:

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

حضرت یونسؑ کی قوم کی خصوصیت

دوسری جگہ قرآن کریم نے اس قوم کی Exception(استثنا) بتائی ہے جیسے حضرت یونسؑ کی بھی ایک Exception(استثنا) ہے۔سورۃ یونسؑ میں ہے کہ فَلَوْ لَا کَانَتْ قَرْیَۃٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِیْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ(10:98) کہنے لگے کوئی اور قوم ایسی نہیں تھی جو وہ تباہی سے پہلے ایمان لے آئی ہو اور تباہی سے بچ گئی ہو۔ ایک قوم یونسؑ ایسی تھی کہ اگرچہ یونسؑ انکو چھوڑ کر چلے آئے تھے، اور ان کے ذہن سے ان کے Calculation(حساب شمار) کے مطابق نظر یہ آتا تھا کہ یہ قوم تباہ ہونی تھی لیکن نہیں، یہ قوم ایسی تھی کہ وہ دوبارہ بھی ان کے پاس گئے ہیں اور ان سے جا کر کہا ہے تو وہ ایمان لے آئی اور اس طرح سے وہ قوم تباہی سے بچ گئی۔

قوموں کی اس داستان کے اندر ایک ابدی اصول بیان کر دیا گیا ہے

یہاں ہمارے لیے یہی سبق ہے کہ ''بڑی چھیتی اچ نہیں پے جانا چھیدا ہیگا[1]'' بڑے صبر آزما مرحلے ہوتے ہیں۔حضرت یونسؑ کے قصے میں بات اتنی ہے، باقی وہ سارا اجتنا بھی ہے، وہ ساری زیبِ داستان ہے۔یہ بالکل روزمرہ کی زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے اسی قسم کی چیز ہے۔انبیائے کرامؑ کے جو قصے شروع ہوئے تھے، وہ اس آیت یعنی 148 پر ختم ہوئے۔اب یہ قوم جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخاطب ہے، ان کے ہاں مذہب کے میدان میں یہ ساری توہم پرستیاں، یہ ساری جہالتیں موجود تھیں۔قومی حیثیت سے ان کا کردار بڑا بلند تھا۔ان کے ہاں ایسی ایسی خوبیاں تھیں جو دوسری جگہ قوموں میں نہیں ملیں گی۔یہ ان کے عقائد کے متعلق جہالت کی چیزیں تھیں۔

قوموں کی ذہنی تطہیر کے بغیر ان کا زاویہ نگاہ کبھی بدلا ہی نہیں جا سکتا اس لیے قرآن مجید تفکر و تدبر و شعور کی بات کرتا ہے

قرآن مجید نے سب سے پہلے ان چیزوں کو لیا ہے اور ان کو اس نے رفع کیا ہے۔جب تک ذہنیت میں تطہیر نہیں ہو جاتی، فکر صحیح نہیں ہوتی، صحیح قدم آگے اٹھ ہی نہیں سکتا۔بادلوں کی گرج سے، ڈرنے والی قوم، چاند کو دیوتا سمجھ کر پوجنے والی قوم، چاند پہ کیسے چڑھ جائے گی۔ جو ہمارے ہاں چیچک کو ماتا کہتے تھے وہ ہندوؤں کے ہاں چیچک کی ایک ماتا دیوی ہے تو جو چیچک کو دیوی سمجھ کر جب کہیں چیچک کی وبا پھوٹتی تھی تو اسکے ہاں جا کر سندور میں ملا، وہاں حلوہ چڑھاتے تھے، وہ اس کا علاج ایسے کر سکتے تھے۔جہالت کا قوم سے دور کرنا اوّلیں قدم ہے۔یعقلون، تفکر، تدبر، شعور، قرآن مجید قدم قدم پہ کہتا ہے۔ یہ قدمِ اول ہے۔

خدا کے ہاں اولاد اور بیٹوں کا غلط تصور: پھر بیٹی کی پیدائش پر ملال کیوں؟

اسی لیے قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّکَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ (37:149) ایک تو تمہاری یہ جہالت ہے کہ

---

[1] بڑی عجلت پسندی میں نہیں آجانا چاہیے۔

کہتے ہو کہ خدا کی اولاد ہے۔ یہ دیویاں خدا کی بیٹیاں ہیں اور خود اپنے لیے بیٹے پسند کرتے ہو۔ یہی جہالت کوئی کم نہیں تھی۔قرآن حکیم کہتا 184 الصّٰفّٰت ہے کہ پھر ذرا سوچو تو سہی کہ اولاد میں تمہاری اپنی حالت یہ ہے کہ اگر تمہیں کہیں بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر ملتی ہے تو غصے اور رنج کے مارے تمہارا منہ سیاہ ہو جاتا ہے [1]۔یعنی ان عربوں کے ہاں بیٹیوں کے متعلق یہ صورت تھی۔ کہا ہے کہ تمہاری پہلی یہ جہالت ہے کہ کہتے ہو کہ خدا کی اولاد ہے اور اگلی چیز یہ ہے کہ تمہیں کوئی بیٹی کی خبر سنا دے تو تمہارا منہ کالا ہو جاتا ہے اور کہتے یہ ہو کہ خدا کے ہاں بیٹیاں ہیں۔ کہنے لگا ''اینا تے تھوڑا جیا رعایت رکھ لو' جیہڑی چیز تسی اپنے لئی جائز نہیں سمجھدے [2]'' یعنی کیا انداز ہے قرآن حکیم کے سمجھانے کا! کہا ہے کہ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا(37:150) یہ فرشتوں کو پوجتے تھے اور فرشتوں کو کہتے تھے کہ وہ بیٹیاں ہیں۔ کہنے لگے کہ کیا ان کو ہم نے Female(مؤنث) پیدا کیا ہے؟ کیا انداز ہے قرآن حمید کا! کہا ہے کہ وَهُمْ شٰهِدُوْنَ (37:150) ''تسی اوتھے کھلوتے ہوئے سوجدوں اسی فرشتیاں نوں پیدا کیتا اے' تسی اپنی اکھاں نال ویکھیا اے؟''[3] جہالت کی تردید اس طرح سے کی کہ یہ جو تم کہتے ہو تو کیا تم اس کے شاہد ہو؟ ان سے یہ بات کہی اور ادھر یہ کہا کہ اس کو مذاق نہ سمجھنا۔ اَلَآ (37:151) او سنو' کھڑے ہو جاؤ' خبردار! اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ۔ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (37:151-52) یہ ان کے خود ذہن کی تراشیدہ داستانیں اور افسانے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ خدا کی اولاد بھی ہوتی ہے اور یہ جو چیز ہے' یہ اس کے لیے جھوٹ بولتے ہیں' اپنے ذہن سے اسے تراش لیتے ہیں۔ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ (37:153) اور پھر یہ بات ان کے کہنے کی ہے کہ اپنے ہاں اس نے بیٹیوں کو تجویز کیا' ان کے لیے بیٹوں کو بنایا۔ اگر اس کے ہاں تم بیٹیاں سمجھتے ہو کہ خدا کے ہاں بیٹیاں فخر کا باعث ہیں تو اپنے ہاں کیوں نہیں بیٹیاں باعثِ فخر کہتے۔ کہا کہ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (37:154)۔اس میں دونوں باتیں آ گئیں۔ کہا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کس قسم کے فیصلے کرتے ہو کہ خدا کی اولاد ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اپنے ہاں بیٹی پیدا ہو تو منہ کالا ہو جاتا ہے اور خدا کے ہاں بیٹی بھی کہہ رہے ہو' تمہارے ہاں کیا کیا فیصلے ہیں! سنو! نہ بیٹی باعثِ ذلت ہوتی ہے' نہ خدا کے ہاں اولاد ہوتی ہے۔اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (37:155) اتنی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔

ہمیں سب سے پہلے ''اسلامی'' کا مفہوم معلوم کرنا ہوگا

پہلی چیز تو یہ ''تَذَكَّرُوْنَ'' کی بات کہی اور اگلی بات وہ ہے عزیزانِ من! جو میں پچاس برس سے کہتا چلا آ رہا ہوں' آپ بھی کہتے چلے

---

[1] حوالہ (16:58) ہے۔

[2] اتنی تو تھوڑی سی رعایت رکھ لو کہ جو چیز تم اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے' اسے دوسروں کے لیے کیوں جائز سمجھتے ہو۔

[3] کیا تم وہاں کھڑے ہوئے تھے جب ہم نے فرشتوں کو پیدا کیا تھا؟ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا تھا؟

جایئے' میرے بعد بھی کہتے چلے جایئے۔ میں کہتا یہ ہوں کہ جب بھی آپ کسی چیز کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ اسلامی ہے' یا اسلامی مملکت 184 الصّٰفّٰتِ ۔ اسلامی قانون' اسلامی شریعت' اسلامی نظام' اسلامی معاشرہ کہتے ہیں تو پہلے اسے Define کرو' متعین کرو کہ اسلامی کس کو کہتے ہیں۔ جب آپ لفظ ''اسلامی'' کا متعین مفہوم بنا لیں گے تو پھر یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ یہ بات واقعی اسلامی ہے یا نہیں ہے۔ اور اگر اسی کو آپ نے مبہم رکھا تو جس کا جی چاہے آپ اسلامی کہہ لیجیے' جسے جی چاہے غیر اسلامی کہہ لیجیے۔ کوئی پہچان' کوئی کسوٹی' کوئی پرکھ ہوگی اس کی بنا پر۔ آپ کسی چیز کو اسلامی یا غیر اسلامی کہتے ہیں۔ اس کے لیے میں ہمیشہ یہ کہا کرتا ہوں کہ پہلے کوئی تو سند ہونی چاہیے' اس چیز کے لیے اتھارٹی ہونی چاہیے' یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ کچھ یہ کہتے ہیں مگر اَمۡ لَکُمۡ سُلۡطٰنٌ مُّبِیۡنٌ (37:156) کیا اس کے لیے تمہارے پاس کوئی سند اور دلیل ہے؟ اور وہ دلیل یا سند مبین ہونی چاہیے' مبہم نہیں ہونی چاہیے۔ قرآن مجید ہر ایک سے یہ تقاضا کرتا ہے' ہم سے بھی وہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ جب آپ کسی عقیدے مسلک کے متعلق اعلان کریں کہ یہ اسلامی ہے تو تمہارے پاس اس کے لیے سُلۡطٰنٌ مُّبِیۡنٌ (37:156) ہونی چاہیے۔ اور اگلی چیز یہ ہے کہ فَاۡتُوۡا بِکِتٰبِکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (37:157) اگر سچے ہو تو پھر اپنی کتاب سے سند لا کر دکھاؤ۔

پچاس سال سے میری یہی پکار ہے کہ سند صرف اور صرف قرآنِ حکیم ہے

عزیزانِ من! میں پچاس برس سے یہی چیز کہہ رہا ہوں بابا! سند اور حجت اور معیار خدا کی کتاب ہے' اس کتاب سے سند لاؤ' وہاں سے دلیل لاؤ پھر جو اس کے مطابق ہوا اسے کہو کہ یہ اسلامی ہے اور یہ (معاذ اللہ) یہ نہیں ہے کہ میں نے خود یہ چیز وضع کی ہے۔ اس نے پہلے ہی یہ کہا ہے کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) کفر اور اسلام میں حدِ امتیاز یہ ہے کہ جو حکومت' جو فیصلہ' قرآن حکیم کے مطابق ہے' جو اس کے مطابق نہیں ہے وہ کفر ہے۔ جو لوگ بھی قرآن حکیم کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' فیصلے نہیں کرتے' انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ یہ قرآن حکیم کی آیت ہے۔ سند اور حجت تو ہمارے سامنے یہ قرآن فرقان ہے' سلطٰن بھی یہی ہے۔ کتاب بھی یہی ہے۔ کہا کہ لاؤ پیش کرو' بتاؤ' دلیل لاؤ Rationally لاؤ پھر ہم Accept (قبول) کریں گے اور اس کے لیے کتاب اللہ سے سند لاؤ کہ یہ ہے اتھارٹی' پھر فیصلہ ہو جائے گا ورنہ تم اپنے ہاں رہو گے کہ یہ حق ہے' ادھر والے یہ کہتے رہیں گے کہ یہ حق ہے' اس کے لیے فیصلہ کیسے ہو سکے گا۔ چلنے سے پہلے متعین کرو کہ تمہارے اور ہمارے درمیان قولِ فیصل کیا ہوگا اور پھر آگے بات کرو۔ عزیزانِ من! سلطٰن مبین اور کتاب کی اتنی سی بات جو قرآن مجید نے کہی تھی کہ اگر یہ ہمارا معیار اور دلیل اور حجت ہو جائے تو یہ جتنے الجھاؤ پیدا ہو رہے ہیں' جتنے تفرقے پیدا ہو رہے ہیں' جتنے فسادات ہوتے ہیں' یہ سارے مٹ سکتے ہیں۔

اسلام کے یہ مدعی اس حکم خداوندی سے عملاً کیوں انکاری ہیں

184الصّٰفّٰت۔

یہ جتنے بھی اسلام کے مدعی ہیں' ان سے پوچھو کہ کیا تم اس بات کو مانتے ہو یا نہیں کہ خدا کی جو کتاب ہے' وہ ہے قولِ فیصل۔ زبان سے سب کہیں گے کہ ہاں' ہم اسے مانتے ہیں۔ اس کے بعد کہو کہ اس پر عملاً آؤ' ان کو عملاً اس پہ لائیے تا کہ وہ اب اپنے اپنے عقائد اور اپنے اپنے مسالک اس پر پرکھتے چلے جائیں کہ آیا وہ اس کے مطابق ہیں' پھر جو اس کے خلاف ہوگا اسے چھوڑنا پڑے گا۔ یہ پرکھ ہو جائے گی' یہ فیصلہ ہو جائے گا' نہ کوئی اختلاف رہے گا' نہ تفرقہ رہے' نہ فرقہ بازی ہوگی لیکن اس کے اوپر کون آئے۔ انہیں پتہ ہے کہ اگر یہ معیار مقرر کر دیا گیا تو جس چیز کو بھی آج ہم اسلام سمجھ کر اپنے فرقے کے اندر بیٹھے ہیں' وہ سارے کا سارا چھوڑنا پڑے گا اور وہ کوئی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

ہمیں از سرِ نو مسلمان ہونا پڑے گا

عزیزانِ من! قرآن مجید نے بہ نص صریح کیا ہے کہ **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:31-32) یاد رکھو! ایمان لانے کے بعد' پھر سے مشرک نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین کے اندر فرقے پیدا کر لیے پھر خود بھی ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے۔ پھر کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ جو کچھ بھی اس کے ہاں کے عقائد و مسالک ہوتے ہیں' اس پہ مگن ہوتا ہے کہ یہی سچ ہے' باقی سب جھوٹ ہے۔ کہا کہ ایسا نہ کرنا۔ اس کے لیے تو از سرِ نو مسلمان ہونے کی ضرورت ہوگی۔

عزیزانِ من! اب وقت ہو گیا ہے۔ آج ہم سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت 157 تک آ گئے ہیں' آگے بھی ان کی اس جہالت کا یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے' اس کے لیے اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ



184 الصّٰفّٰت

ساتواں باب: سورة الصّٰفّٰت (آیات 158 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۙ﴿۱۵۸﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا
يَصِفُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ۙ﴿۱۶۱﴾ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا
مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۙ﴿۱۶۴﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۚ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ
الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ۙ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا
الْمُرْسَلِيْنَ ۚۖ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۠﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى
حِيْنٍ ۙ﴿۱۷۴﴾ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ
صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۙ﴿۱۷۸﴾ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ
الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۚ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۚ﴿۱۸۱﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1980ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت 158 سے ہو رہا ہے: (37:158)۔

نزولِ قرآن کریم کے وقت پوری انسانیت جہالت میں ڈوبی ہوئی تھی

سابقہ آیات میں عہدِ جاہلیت کے عربوں کی توہم پرستیوں اور جہالت کا ذکر ہو رہا تھا۔ عربوں کا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں جہالت پھیلی ہوئی تھی: دیوی دیوتاؤں کو خدا بنا لینا' فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں تسلیم کر لینا' جنات پر اعتقاد رکھنا کہ بڑی قوتوں کے مالک ہیں۔ ساری دنیا میں ہی یہ چیز پھیلی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے' اولیں مخاطب چونکہ عرب قوم تھے' اس لیے ان کو مخاطب کر کے یہ بات کہی گئی

ورنہ یہ بات ساری دنیا سے کہی گئی تھی۔ عجیب چیز ہے' دنیا کا کوئی مذہب لیجیے' اس میں کوئی نہ کوئی Super-Natural Element (مافوق الفطرت عنصر) ضرور آئے گا' مثلاً تو ہم پرستی کی کوئی چیز' فوق الفطرت کی باتیں' مذہب کے بانیوں کے متعلق فوق البشر چیزیں۔ اسلام میں' میں جب بھی اسلام کہوں گا تو اس کی سند قرآنِ کریم ہوگی۔ انسان کو علم اور بصیرت سے روشناس کرانے کے لیے اور جہالت اور توہم پرستیوں کو مٹانے کے لیے قرآنِ کریم آیا۔ اس میں ایک عنصر تو ایسا ہے' جو حقیقتاً فکرِ انسانی سے ماوراء ہے اور وہ وحی ہے۔ 184الصّٰفّٰت۔

قرآنِ حکیم نے اپنے بیان کردہ حقائق کو ہمیشہ دلائل و براہین کی بنیاد پر پیش کیا ہے

جب میں نے فکرِ انسانی سے ماوراء کہا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بات فکرِ انسانی کی سمجھ میں نہیں آتی بلکہ صرف یہ کہنا ہے کہ اس کا جو سرچشمہ ہے' وہ علم جہاں سے ملتا ہے' وہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے' وہ براہ راست خدا کی طرف سے اس کے ایک برگزیدہ نبی کی طرف آیا' وہ منزل من اللہ تھا' اسے وہ علم براہِ راست' وہبی طور پہ ملتا تھا۔ ایک یہ عنصر تو ایسا ہے۔ اس عنصر کی بھی یہ کیفیت ہے کہ ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ وہ کس طرح سے ملتا تھا۔ جو کچھ ملتا تھا اس کے متعلق تاکید یہ ہے کہ اسے آپ غور اور فکر' شعور اور تدبر' علم اور بصیرت کی بنا پہ سمجھو۔ اس بنا پر اگر اس کی صداقت تمہاری سمجھ میں آ جائے تو اس پہ ایمان لاؤ اور اگر یہ بات نہیں ہے تو وہ ایمان نہیں ہوگا۔

آپ نے دیکھا کہ صرف اتنی سی چیز ہے کہ وحی کا سرچشمہ علم خداوندی ہے جو براہ راست ایک برگزیدہ ہستی کو ملتا تھا۔ قرآنِ کریم میں اتنی سی چیز تو ہے کہ جو دین اس نے پیش کیا' جسے اب مذہب کہتے ہیں' اس میں اتنا Element (عنصر) تو ہے۔ آپ اسے فوق الفطرت کہیے' فوق البشر کہیے کہ یہ اتنا حصہ تو اسکے اندر ہے کہ وحی کا سرچشمہ علم خداوندی ہے جو براہِ راست ایک برگزیدہ ہستی کو ملتا تھا لیکن اس کا بھی میں نے یہ کہا ہے کہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ فکرِ انسانی کی تخلیق نہیں ہے' اس علم کا سرچشمہ ماورائے فکرِ انسانی ہے۔ غیر مسلم محققین بھی اس نتیجے پہ پہنچے ہیں۔ قرآن مسلم یا مومن تو کہتا ہی اسے ہے جو علیٰ وجہ البصیرت قرآنِ کریم کی اس حقیقت پر یقین لے آئے' تسلیم کر لے' اس پر علم و بصیرت کی رو سے ثابت ہو جائے کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے تو اب اس درجے میں یہ عنصر بھی فوق الفطرت نہ رہا' وہ تو فکرِ انسانی کے تحت آ گیا۔ ہم اس پہ ایمان ہی اس صورت پہ لائیں گے جب فکرِ انسانی اس کی تائید کرے کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ اتنا حصہ تو اس میں آپ کہیے' اس سے الگ اور کوئی چیز ایسی نہیں جو ذہنِ انسانی کی سمجھ میں آنے والی نہ ہو۔ تو ہم پرستیوں کی جس قدر تاریکیاں تھیں' قرآن کریم نے سب مٹا دیں۔ اس نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ یہ جو تمہارا عالم محسوسات ہے' یہ کائنات ہے' جسے آپ Physical (طبعی) کہتے ہیں' اب تو اس کو Physical (طبعی) بھی نہیں کہنا چاہیے۔

184الصّٰفّٰت۔

آج کی سائنس کائنات کی Physical (طبعی) حدود سے بھی تجاوز کر رہی ہے

سائنس کی تحقیقات اس سے بھی آگے چلی گئی ہیں لیکن بہر حال یہ جسے آپ عالمِ محسوسات کہیں گے' یہ کچھ چیزیں تو وہ ہیں جو نظر آتی ہیں' محسوس ہوتی ہیں' دیکھ سکتے ہیں' چھو سکتے ہیں۔ یہ Five Senses (حواس خمسہ) کہلاتی ہیں۔ اپنے حواس خمسہ کی رو سے ہم اسے محسوس کر سکتے ہیں لیکن کچھ قوتیں ایسی ہیں جنہیں آپ دیکھ نہیں سکتے' چھو نہیں سکتے' محسوس نہیں کر سکتے۔ یہ قوتیں ہیں مثلاً آج ہی سائنس اس نتیجے پہ پہنچ رہی ہے کہ جسے ہم Matter (مادہ)' جسے ہم ٹھوس مادہ Material Things کہتے ہیں' ان کو بھی جب Reduce (کم) کیا جائے' آہستہ آہستہ پیچھے لے جایا جائے تو اس سے پیشتر تو وہ کہتے تھے کہ یہ ایٹم پر پہنچتا ہے۔ اور ایٹم سے مراد ہوتی تھی وہ چھوٹے سے چھوٹا ذرہ جسے مزید تقسیم نہ کیا جا سکے۔ ایٹم سے متعلق یونان سے یہ بات چلی تھی' ایسے ذرات جو آگے تقسیم نہ ہو سکیں' انہوں نے ایٹم اس کو اس طرح تصور کیا تھا کہ کسی ایک لکڑی کو لے کر اس کا برادہ بنانا شروع کیجیے اور اس کے ذرات کو اتنا تقسیم کرتے چلے جایئے' کاٹتے چلے جایئے کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ آگے Divisible (تقسیم کے قابل) نہ رہے' ان کے نزدیک ایٹم اتنا ہی تھا لیکن آج تو بات ہی کچھ اور ہو گئی ہے۔

مظاہر فطرت کی وہ قوتیں جو حواس خمسہ سے بالاتر ہیں

سائنسدانوں نے اس سے آگے جا کر جب اس Matter (مادہ) کو Reduce (کم) کیا ہے' یہ بات کچھ فنی سی آ جائے گی' سائنس کی آ جائے گی' اس کی تفصیل میں جانے کی مجھے ضرورت نہیں' وہ مالیکیول وغیرہ کے اوپر آئے۔ آج جس کو ایٹم کہتے ہیں یہ مادے کے وہ چھوٹے چھوٹے ذرے نہیں ہوتے' یہ وہ توانائی ہے جو آپ کے حواس خمسہ یا جو Physical Senses (طبعی حواس) ہیں' ان کی رو سے آپ کی گرفت میں آتی نہیں ہے لیکن اس کے مظاہر ایسے ہیں کہ وہ تو ایٹم کا ایک بم پورے کے پورے شہر کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے' اس ایٹم کی توانائی کا ایک ذرہ انسان کو چاند پر پہنچا رہا ہے۔ مواصلات کا کوئی ذریعہ آپس میں نہیں ہے یعنی چاند کے اوپر تو جو انسان ہے' اس کے دل کی دھڑکن زمین کی لیبارٹری میں ریکارڈ ہو رہی ہے۔ اب یہ یہاں تک پہنچے ہیں کہ انہوں نے اس کا نام ہی Pure Energy (خالص توانائی) رکھا ہے۔ یہ بڑی دلچسپ چیز ہے جسے Pure Energy (خالص توانائی) کہتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ بجلی ہے لیکن ہمیں کیسے معلوم ہوا؟ وہ جو کوئی Electrified Object (برقایا ہوا جسم) ہوتا ہے جس شے کے اندر وہ بجلی کی لہر ہوتی ہے' آپ اس کو ٹچ کرتے ہیں' اس سے آپ بلب جلاتے ہیں' اس سے آپ کام بھی لیتے ہیں۔ جب وہ توانائی محسوس چیزوں میں آتی ہے' تو آپ کو پتہ چلتا ہے کہ کوئی توانائی ہے۔ اگر وہ اس محسوس شے میں نہیں آتی تو آپ کو معلوم نہیں ہوتا حالانکہ ہم اس کا نام روز

لیتے ہیں۔ اب تو اس کا استعمال اتنا عام ہو گیا ہے کہ ذرا ذرا سی چیزیں بھی بجلی سے چلتی ہیں۔ بجلی (Electricity) کی جو توانائی ہے وہ 184 الصّٰفّٰت ۔ کیا ہے، یہ کسی کو پتہ نہیں ہے۔ اس کے محسوس کرنے کے ہزاروں طریقے ہیں، یہ توانائیاں ہیں۔ ان کو انہوں نے Pure Energy (خالص توانائی) اس لیے کہا ہے کہ وہ مادی یا Physical یا طبعی شکل کے اندر موجود نہیں ہیں۔ ان کی وہ ایسی شکل ہے جو آپ کے Senses (حواس) کی گرفت میں نہیں آتی لیکن اس کے مظاہر ایسے ہیں جن کو آپ دیکھ بھی سکتے ہیں، چھو بھی سکتے ہیں۔ وہ آپ کے Senses (حواس) میں آتی ہیں۔

عربی زبان میں لفظ ملائکہ کا استعمال اور اجرام فلکی کا تصور

یہ جو اس قسم کی قوتیں ہیں جو نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں، عربی زبان میں اس کے لیے ایک لفظ ''جن'' ہے۔ ''جن'' کے معنی ہیں ''نگاہوں سے اوجھل رہنے والی شے'' یا اس کے متعلق خود عربی زبان کے اندر ''م ل ک'' کا جو مادہ ہے، اسکے معنی ''توانائی'' کے ہیں، ''قوت'' کے ہیں۔ وہاں یعنی ''م ل ک'' سے لفظ ملائکہ قرآن حمید نے Use (استعمال) کیا ہے، وہ بھی توانائیاں ہیں۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ مدبرات امر (79:5) ہیں، خدا کے عالمِ امر کا جو پروگرام ہے، یہ اس کی تدبیریں کرنے والے ہیں، یہ مشیت خداوندی کو بروئے کارلانے والی قوتیں [1] ہیں۔ انہیں یوں کہہ لیجیے۔ یہ ساری کائنات غیر مرئی (Invisible)، غیر محسوس (Imperceptible) قوتوں کے سہارے چل رہی ہے۔ یہ اتنے اتنے بڑے عظیم الجثہ کرّے فضا کی پہنائیوں کے اندر معلق کھڑے ہیں، کھڑے ہی نہیں ہیں بلکہ اس قدر تیزی سے محوِ گردش ہیں کہ آپ ان کی گردش کی رفتار کو بھی آسانی سے نہیں ماپ سکتے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ فضا کے اندر کوئی ایسا ستون نہیں ہے جسے تم دیکھ سکو، وہ ہوتا ہی نہیں ہے مگر کسی سہارے کے بغیر کروڑوں کی تعداد میں یہ اتنے اتنے بڑے کرّے ہیں کہ ہم ان کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ یہ ہمارا اتنا کرۂ ارض ہے، یہی کچھ کم چھوٹا نہیں، اس کا قریب تریں جو سراج ہے وہ اس سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے اور یہ سورج بمعہ اپنے پورے ساتوں کروں [2] کے جسے نظام فلکی کہتے ہیں محوِ گردش ہے۔ ان کے متعلق یہ فلکیات والے کہتے ہیں کہ یہ ایسے ہیں جیسے ریگستان میں ریت کا ایک ذرہ ہو، یہ Universe (کائنات) کے اندر اتنے ہیں۔

کائنات کے اندر اَن دیکھی قوتوں کے کردار کے متعلق عقلِ انسانی کی کیفیت

یہ اتنے اتنے عظیم الجثہ کرے، فضا کی پہنائیوں کے اندر، اس قدر تیزی سے محوِ گردش ہیں۔ وہ نہ آپس میں ٹکراتے ہیں، نہ نیچے گر پڑتے ہیں، نہ اوپر اٹھتے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے جس سے یہ تمام کرّے اس قدر تیزی سے محوِ گردش ہیں؟ اس کا نام ہم نے رکھا ہے ''مرکز مائل،

---

[1] انہیں مقسمت امرا (51:4) بھی کہا گیا ہے ''یعنی تقسیم امور کرنے والی قوتیں'' اور مدبرات امراً (79:5) تدبیر امور کرنے والی قوتیں۔

[2] اب یہ تعداد تحقیق سے بڑھ رہی ہے۔

قوتِ ثقل‘‘یعنی وہ جوایک دوسرے کی باہمی کشش ہے۔ہم نے سمجھنے کے لیے یہ چیز کہی ہے‘ کسی کو پتہ نہیں کہ وہ ثقل کی قوت جسے ثقل کہتے ہیں‘ وہ کشش ثقل کیا ہے؟اس کا کسی کوعلم نہیں ہے‘ سمجھنے کے لیے،ہم نے نام رکھ دیا ہے کیونکہ اب تجربوں نے بتایا ہے کہ ایک خاص بلندی کے اوپر جا کر زمین کی وہ کشش ختم ہوتی ہے‘ کسی اور کرّے کی شروع ہو جاتی ہے۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ ساری قوتیں ہیں۔ عربوں کی زبان میں ان کو اَن دیکھی (Invisible) قوتیں کہتے ہیں۔اب اس کے لیے انہوں نے اپنے ہاں یہ تقسیم کر رکھی تھی کہ جوتو نیک کام کرنے والی‘ بھلائی کرنے والی قوتیں ہیں‘ان کو وہ ملائکہ کہتے تھے۔یہ کہتے تھے کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں‘ معصوم بیچاری شرارت کر ہی نہیں سکتیں۔اور یہ جو وہاں اس قسم کی وہ قوتیں ہیں جو تخریب کرتی تھیں‘ بیماریاں لے آتی تھیں‘ چمٹ جاتی تھیں‘ عمارتوں کو ڈھا دیتی تھیں‘ آندھیاں آ جاتی تھیں‘ طوفان ہوتے تھے‘ وہ ان کو جنات کہتے تھے۔یہ وہی Invisible (غیر مرئی) قوتیں ہیں۔یہ نام رکھے ہوئے تھے۔جب یہ ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا تو وہ بیچارہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ ہوتا کیسے ہے‘ بادل کیسے گرجتا ہے‘ بجلی کیسے کڑکتی ہے‘ بارش کیسے ہوتی ہے‘ طوفان کیسے آتا ہے حتیٰ کہ وہ تو یہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ چیچک کیسے آتی ہے‘ وبائی امراض کیسے آتے ہیں؟اس کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ بخار کیسے چڑھتا ہے؟’’ویدوں‘‘ کے اندر ان کو بھی دیوتا تسلیم کیا گیا ہے‘ بخار کو دیوتا تسلیم کیا گیا ہے۔ انہیں تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ جو نائی کا استرا❶ ہے یہ شیو کیسے کرتا ہے‘ وہ اس کے سامنے بھی ہاتھ جوڑتے تھے۔یعنی عہدِ طفولیت میں انسان کے ذہن کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ان چیزوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔

بچپن میں پڑھائی جانے والی سعدی کی گلستاں بوستاں کی نوعیت

اب اس کے لیے بچنے کا طریقہ کیا تھا؟ وہ انسان نے ایک ہی طریقہ سمجھ رکھا تھا کہ

نہ سزا را چو بینی بختیار
آن کہ لا تسلیم کردن ہوشیار

بچپن میں جس زمانے میں ہم پڑھتے تھے‘ سعدی کی گلستاں بوستاں وغیرہ تھیں‘ پہلے یہی پڑھائی جاتی تھی‘اس میں اس قسم کی چیزیں آتی تھیں کہ

اگرشہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پرویں

---

❶ نائی بمعنی حجام

اگر بادشاہ دن کو کہے کہ رات ہے تو کہو: سبحان اللہ صاحب! یہ دیکھو' چاند چڑھا ہوا ہے' یہ تارے ہیں! 184الصّٰفّٰت۔

نہ سزائے رہا چو بینی بختیار

آن کہ لا تسلیم کردن ہوشیار

جو کسی طرح سے وہ نالائق نا ہنجار Unqualified اقتدار کو سنبھال لے اور آ جائے تو اس وقت عقل کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے سامنے جھک جائے۔ اس وقت سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ شخص کیا تعلیم دے رہا ہے۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ شخص کس دور میں تھا جب اس کو یہ تعلیم دینی پڑی۔ یہ جو دور تھا' یہ ذہنِ انسانی کا ابتدائی دور ہے کہ جس کو صاحبِ قوت دیکھو' اس کے لیے اور کوئی طریقہ نہیں ہے' بس اس کے سامنے جھک جاؤ' ہاتھ جوڑ دو' ڈنڈوت بجالاؤ' اس کی پرستش کرو' اس کی پوجا کرو کہ اس کو رحم آ جائے:

کام آخر جذبۂ بے ختیار آ ہی گیا

دل کچھ اس طور سے تڑپا کہ پیار آ ہی گیا

وہ پیار لانے کے لیے دل کو تڑپاتے تھے۔ اس کو پرستش کا عہد کہتے ہیں یعنی یہ Age of Worship ہے۔

صاحبانِ علم الانسان کے نزدیک انسانیت کے مختلف ادوار کی نوعیت: عہدِ پرستش پہلا دَور

علم الانسان کے جو ماہرین ہیں' انہوں نے پوری تاریخِ انسانیت کے مختلف ادوار مقرر کر رکھے ہیں۔ پہلا دور Age of Worship (عہد پرستش) کا ہے۔ پھر ان میں کچھ کاروباری ذہنیت کے زیادہ کاریگر لوگ اٹھے' انہوں نے کہا کہ ان جہلا کی اس توہم پرستی کی عقیدت کا Exploit (استحصال) کرنا چاہیے۔ وہ چاند سورج ستاروں کو پوجتے تھے تو وہ تو کوئی Exploit (سلب ونہب) نہیں کرتا تھا۔

سورج' چاند' ستاروں کی پرستش کے بعد مذہبی پیشوائیت کا طریق کار: عہدِ سحر کا دوسرا دَور

مذہبی پیشواؤں نے یہ کہا کہ یہ قوتیں ہمارے قابوں میں ہیں' ہم تمہیں ان سے کام لے کر دے سکتے ہیں۔ یہ لو تعویذ' یہ لو تاگا' یہ لو منتر' یہ لو ورد' یہ لو وظیفہ' کچھ تم کرو اور کچھ ہم کرتے ہیں اور لاؤ اس کے لیے کچھ نذر و نیاز' ہم اپنے لیے نہیں مانگتے' ان کے لیے مانگتے ہیں۔ قرآن حکیم ان مذہبی پیشواؤں کا یہ کہتا ہے کہ یہ عجیب چیز ہے کہ کچھ تو یہ براہ راست کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارا حصہ ہے' باقی جو ہوتا ہے اس کے لیے کہتے ہیں کہ یہ تمہارے مُردے کو پہنچانا ہے' یہ بھی ہمیں دے جاؤ: ''ڈاک خانے اچ پارسل جمع کروا دیو''۔ [1] انہوں نے یہ انداز

---

[1] ڈاک خانے میں پارسل جمع کرادو۔

اختیار کیا کہ ان قوتوں سے کام لینے کے لیے ہمارا ذریعہ اختیار کرو۔ اب یہ بزنس (کاروبار) کے لیے دکانداری شروع ہوگئی۔ اسے184الصّٰفّٰت۔ Age of Magic (عہدِ سحر) کہتے ہیں۔

ان دونوں ادوار میں مذہب کی توہم پرستیاں چھائی ہوئی تھیں

اب آپ دیکھیے کہ وہ جو عہدِ پرستش ہے اس میں بھی جو ذریعہ ہے وہ کوئی میٹریل یا مادی نہیں ہوتا۔ اس میں آپ ہاتھ جوڑتے ہیں ڈنڈوت بجالاتے ہیں تو آپ اس کا کچھ اثر پیدا کرتے ہیں یہ نہیں ہوتا کہ اس کو دھکا دے کر گردن پکڑ کر جھکا لیتے ہیں۔ اس کو طبعی طور پر جھکاتے نہیں ہیں غیر طبعی طور پہ جھکاتے ہیں۔ اسی طرح سے یہ جو آگے Age of Magic (عہدِ سحر) آیا ہے اس کے اندر یہ اس زمانے کی جتنی چیزیں تھیں وہ آ گئیں۔ اس زمانے کے وہ منتر جنتر (Mumbo Jumbo) یہ ان کی رسومات اس کے بعد آپ کے ہاں کے یہ ورد وظیفے یہ سب درآئے۔ یہ کس طرح سے کرتے ہیں؟ ان کے لیے کوئی طبعی چیز نہیں ہوتی کہ جس سے یہ آرام ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر دوائی دیتا ہے تو بخار کو آرام ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ چار الفاظ پڑھتے رہو اس سے آرام ہوجائے گا۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بھی غیر مرئی (Invisible) چیزیں ہیں۔ یہ ساری توہم پرستیاں چلی آ رہی تھیں پوری انسانیت کی دنیا میں مذہب کی دنیا کے اندر اور اس زمانے میں تو ہر جگہ مذہب ہوتا تھا اس کی شکلیں کچھ بدل جاتی تھیں رنگ بدل جاتا تھا ہوتا وہ مذہب ہی تھا۔ یہ بالکل لامذہبیت والے تو کبھی ایک آدھ کہیں یونان کے اندر نکل آتے تھے ان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا۔ جو مذہب کی دنیا تھی وہ تو ساری توہم پرستیوں پر مبنی تھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد نوعِ انسانی کو اس قسم کی تمام زنجیروں سے آزادی دلانا ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے قرآن کریم نے بتا دیا ہے کہ یہ بعثت اس لیے ہوئی ہے کہ ان پروہتوں نے اور پھر مذہبی پیشواؤں نے تمہارے سر کے اوپر جو یہ اتنے اتنے بڑے سِل رکھے ہوئے ہیں اِن زمین پہ خدا کا سایہ بننے والوں نے خدا کے ایشور اور اوتار بننے والے راجاؤں اور بادشاہوں نے تمہاری گردنوں میں جو زنجیریں ڈالی ہوئی ہیں وہ انہیں اتار پھینکے۔ کہا ہے کہ یہ ہمارا رسول ان سلوں کو اتار پھینکے گا ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا۔ قرآن کریم نے آ کر توہم پرستی اور فوق الفطرت کی کوئی چیز باقی نہیں رکھی۔ اس نے انسانیت کو کتنی آزادی دلائی ہے! جس انسان کی داستان کا آغاز یہ کہہ کر ہوتا ہے کہ ملائکہ اس کے حضور سجدہ ریز ہو گئے اندازہ لگائیے اس کا مقام کتنا اعلیٰ ہے! مگر یہاں دیکھیے کہ جن قوتوں کو اس وقت تک کی جو پوری عالم انسانیت تھی وہ انہیں انسان کے اوپر غالب مانتی چلی آ رہی تھی وہ ان کے غلبہ سے چھوٹنے کے لیے نہیں تھی وہ ان کو راضی رکھنے کے لیے تھی اس کے لیے کبھی پرستش کی جاتی

تھی، پوجا پاٹ ہوتی تھی، کبھی ورد وظائف ہوتے تھے لیکن تصور یہی تھا کہ یہ قوتیں غالب ہیں اور انسان ان سے مغلوب ہے۔ قرآن کریم نے آ کر یہ پہلے ہی پارے میں پہلی ہی داستان آدم جہاں سے شروع کرتا ہے، کہا ہے کہ فَسَجَدُوۡٓا (2:34)۔ وہ تمام قوتیں اس کے سامنے جھک گئیں اور سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مِّنۡهُ (45:13)۔ آپ غور فرمائیے کہ یہ پہلا ''ما'' ہی کچھ کم نہیں تھا کہ جو کچھ کائنات میں، ارض وسما کے اندر ہے اور پھر جَمِيۡعًا کا اور کہہ کر اس میں Exception (استثنا) ہی کسی چیز کی نہیں رکھی ہے، کہا ہے کہ یہ سب ہم نے تمہارے لیے تابع تسخیر کر دیئے ہوئے ہیں۔ یہ ایک انقلاب ہے جو قرآن کریم عالمِ انسانیت میں لایا ہے۔

ہمارے ہاں انقلاب کا کبھی تذکرہ ہی نہیں ہوا

یہ انقلاب کیا چیز ہے؟ ہمیں تو مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں مذہب بن گیا ہے، کبھی اس دین کی بات ہی نہیں ہوتی کہ یہ انقلاب عظیم کیا لایا تھا۔ بات اس لیے نہیں ہوتی کہ ان کی جو اپنی خدائی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے، اس لیے یہ بات نہیں کرتے ورنہ یہ نہیں ہے کہ کوئی ڈھکے چھپے ہوئے راز ہیں جو کسی کو معلوم نہیں ہیں۔ یہ قرآن مجید ہی کی آیات ہیں جو میں پیش کر رہا ہوں۔ اس سے ان کا کچھ باقی نہیں رہتا، نہ ملوکیت کا، نہ مذہبی پیشوائیت کا، نہ سرمایہ داری کا، نہ درود وظائف کا۔ قرآن مجید نے آ کر یہ انقلاب عظیم دیا۔ زنجیریں توڑ دیں، سلیں اٹھا کر پھینک دیں، انسان کو صحیح معنوں میں آزادی نصیب ہوئی۔ فطرت کی قوتیں مسخر کر دیں، ملائکہ اس کے سامنے جھک گئے، جنات تو شے ہی کچھ نہیں۔ یہ جو اس زمانے کے جہلاء کے ان عقائد کا قرآن مجید ذکر کرتا ہے تو وہ اس لیے ذکر کرتا ہے کہ انسانیت ان زنجیروں میں جکڑے ہوئے چلی آ رہی تھی۔ پہلے کہا ہے کہ یہ ملائکہ کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں تو اس کی تردید کی۔ پھر آگے، کہا ہے کہ یہ جنات کے متعلق بھی یہ کہتے ہیں کہ وَ جَعَلُوۡا بَيۡنَهٗ وَبَيۡنَ الۡجِنَّةِ نَسَبًا (37:158) یہ لوگ، خدا میں اور کائنات کی ان قوتوں میں جو ان کی آنکھوں سے اوجھل ہیں، رشتے جوڑتے ہیں۔ محض الفاظ آئے ہیں ادراک نہیں حاصل ہوا۔

کائناتی قوتوں کے سلسلہ میں ذہنِ انسانی کی کیفیت

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ عربی زبان میں ''جن'' کا لفظ تو ہر اس شے یا قوت کے لیے بولا جاتا ہے جو نگاہوں سے مخفی ہو Invisible ہو، نظر نہ آ سکتی ہو۔ یہ جیسے اب تک بھی ہمارے ہاں ''جن'' کہتے ہیں، جو چمٹ جاتا ہے اور جو یہ کچھ ہو جاتا ہے، وہ بھی ان کے نزدیک غیر مرئی ایک قوت تھی۔ انسان کا ذہن ابھی جسے Pure Energy (خالص توانائی) کہتے ہیں کہ وہ قوت میٹریل (مادی) شکل کے اندر نہ آئے اس کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ابھی یہ الفاظ سیکھ لیے ہیں کہ Electric Energy (بجلی کی توانائی) ہے۔ Atomic Energy (ایٹمی

توانائی) ہے۔ ہم ابھی سمجھ نہیں سکتے کہ یہ انرجی (Energy) ہوتی کیا ہے؟ وہ توانائی جب اپنے آپ کو کسی پیکر کے اندر مشہود کر دے تو اس مظہر سے ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں وہ Energy (توانائی) ہے۔ یہ پنکھا ہمیں بتا رہا ہے کہ ایک قوت ہے جس سے یہ چل رہا ہے۔ وہ قوت ہے کیا؟ اس کا نام ہمیں پتہ ہے مگر اس کا پتہ نہیں ہے۔ انہیں بھی اس کا علم نہیں تھا کہ یہ کیا ہے مگر وہ اسے ''جن'' کہہ کر پکار لیتے تھے یعنی تخریبی طور پر جو قوتیں کام کرتی ہیں، وہ انہیں ''جن'' کہہ کر پکار لیتے تھے اور جن قوتوں کے لیے وہ سمجھتے تھے کہ نیک ہیں' بھلائی کا کام کرتی ہیں، ان کو وہ ''ملائکہ'' کہتے تھے۔ ان سب کو خدا کی بیٹے بیٹیاں کہتے' وہ بھی دیوی دیوتا ہی تھے' ان کی پرستش ہوتی تھی' ان سے ڈرتے تھے' کانپتے تھے۔ وہ یہ کچھ کرتے تھے۔ اب یہ چیز تھی کہ ان کو یہ قوتیں کیسے حاصل ہوئی ہیں؟ وہ خدا کے ساتھ ان کی نسبت جوڑتے تھے۔ میں نے کہا ہے کہ فرشتوں کو تو وہ براہ راست کہتے تھے کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ ان کے متعلق بھی جو رشتے داریاں تھیں' تو وہ جتاتے تھے کہ وہاں سے یہ اپنی قوتیں لیتے ہیں۔

توہم پرستیوں کے سلسلہ میں ہماری متضاد عملی

عزیزانِ من! یہ ساری توہم پرستیاں ہیں۔ قرآن حمید ان تمام کی تردید کرتا چلا جاتا ہے۔ ہم بڑے فخر سے ان آیتوں پہ آ کر کہتے ہیں کہ قرآن حمید نے ان توہم پرستیوں کو ختم کر دیا اور جتنی توہم پرستیاں قرآن مجید گنا رہا ہے' ان سب میں ہم جکڑے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ ''جن'' آپ کے ہاں ہیں' روز کسی نہ کسی بیچاری بچی کو' جو ہسٹیریا کی مریضہ ہوتی ہے' چمٹ جاتا ہے' ڈھولکوں والے اور باجے والے آ کر نکالتے ہیں۔ اور روز یہ اخباروں میں خبریں آتی ہیں کہ اس نے اس کو اتنا عذاب دیا کہ وہ بیچاری بچی مر ہی گئی' مار مار کر اس کو جان سے ہی مار دیتے ہیں۔ یہ اس طرف سے ''جن'' نکالنے والے آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صاحب! یہ اصل میں جہلا ہیں۔ جی! یہ جہلا نہیں ہیں' یہ جید علما ہیں۔

دنیا بھر میں دارالعلوم دیوبند کے علمائے کرام کا کردار

آج بھی یہ جتنے بڑے بڑے عالمِ دین آپ کو نظر آتے ہیں' اس سے پہلے بھی جتنے تھے' یہ سب ان جنات کو مانتے تھے۔ ان کے ہاں یہ ''جن'' پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ ذرا ان کے ہاں کی یہ روداد یں دیکھیے۔ دیوبند شریف جسے آپ مرکز دارالعلوم کہتے ہیں' ساری دنیا میں یہاں کے علماء پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ اکابرین ہیں' ہمارے ہاں انہیں ''گلابی وہابی'' بھی کہتے ہیں۔ وہابی ان کو کہتے ہیں جو ان چیزوں کو نہیں مانتے تھے۔ جن کو وہابی بھی کہتے ہیں وہ بھی مانتے ہیں' یہ جو جنات وغیرہ ہیں وہ بھی مانتے ہیں۔ یہ علمائے دیوبند جن کو عام طور پر گلابی کہتے ہیں' ان کے ہاں تو یہ داستانیں موجود ہیں۔ وہ پڑھایا کرتے تھے' آج بھی ان کے ہاں یہ صورت ہے۔ یہ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (1957-1879ء) ہیں' کچھ سال قبل ان کی وفات ہوئی ہے' ان کی داستانین پڑھیے' ان کی اپنی

لکھی ہوئی کرامات پڑھیے کہ ''جن'' پڑھتا تھا جی! یعنی طالب علم کی حیثیت سے آدمی کی شکل میں پڑھتا تھا' پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ ایک دن 184 الصّٰفّٰتِ۔ وہاں بچے صحن مسجد کے اندر جسے لکن چھپائی ❶ کہتے ہیں' کھیل رہے تھے۔ وہ ایک لڑکا دوسرے لڑکے کے پیچھے بھاگا' اس کو کہیں چھپنے کی جگہ نہیں ملی تو وہ لوٹے میں چلا گیا۔ اب وہ جو باقی بچے تھے' ڈر کے مارے بھاگ گئے کہ یہ ہوا کیا ہے۔ وہ مولوی صاحب آئے تو انہوں نے اسے آ کر کہا کہ برخوردار! آ جاؤ لیکن اب چلے جاؤ' اب اصل میں راز فاش ہو گیا ہے لیکن وہ جو لڑکا تھا' جو اس کا دوست بھاگا تھا' جاتے جاتے اس نے کہا کہ بھئی! تم جا تو رہے ہو' مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر مجھے کبھی مدد کی ضرورت پڑی تو میری مدد کرو گے' کہنے لگا کہ ہاں' یہ لوسم سم کے چار حروف جو ہوتے ہیں' تالا کھولنے والے' وہ اسے بتا گیا۔

عزیزانِ من! یہ الف لیلیٰ جورات کو آپ بچوں کو دکھاتے ہیں' آپ ہنستے ہیں' یہ ہنسنے والی الف لیلیٰ نہیں ہے' یہ علماء حضرات' یہ جو مشائخ حضرات ہیں' یہ ان سب کے اپنے کارنامے ہیں کہ یہ پڑھ لیا کرو۔ چنانچہ یہ ہے کہ اس کے بعد جب کبھی بھی اس لڑکے کو ضرورت پڑتی تھی تو وہ کھل جا سم سم پڑھ لیتا تھا اور وہ جن جھٹ آ جاتا تھا۔ آپ کی مدد کرتا تھا۔ یہ تمام علماء و مشائخ یہ سب مانتے ہیں۔ اور ورد وظائف تو آپ پوچھیے ہی نہیں' کوئی بھی ان میں سے ہو' کسی فرقے کا ہو' وہ علمائے کرام ہوں یا مشائخ عظام ہوں' وہ سارے ورد وظیفے پہ چلتے ہیں۔ جنتر منتر (Mumbo Jumbo) کہیے تو لاحول ولا قوۃ کافر ہو گئے' شرک ہو گیا۔ ورد وظائف کہیے تو سبحان اللہ۔ ارے یہ کیا ہے؟ کہ جی! وہ کالا علم ہے' یہ نوری علم ہے' بس ایک دوسرا نام رکھ دینے سے وہ کافروں کی بات ہو گئی' یہ مومنوں کی بات ہو گئی' باقی وہی ورد وظیفے ہیں۔

یہ ورد اور وظیفہ' یہ تعویذ اور گنڈا' یہ کیا چیز ہے؟ یہ جو اثر کرتے ہیں' وہ Visible (مرئی) اور محسوس تو نہیں ہوتا' ان دیکھا (Unseen) ہوتا ہے کہ اتنی دفعہ یہ پڑھیے اور آپ کا جو دشمن ہے' وہ مغلوب ہو جائے گا' اتنی دفعہ یہ پڑھیے' فلاں مرض چلا جائے گا' اتنی دفعہ یہ چیز باندھ کر جائیے' وہ حاکم جو ہے راضی ہو جائے گا۔ یہ کیا قوت ہے جو یہ کراتی ہے؟ یہ ان دیکھی قوت (Unseen Power) کیا ہے؟ یہی تو وہ لوگ مانتے تھے کہ کوئی ان دیکھی قوت (Unseen Power) ہے جو یہ کچھ کرتی ہے۔ آپ کے ہاں سب مانتے ہیں۔

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری
یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

قرآن کریم کے مفہوم کی بجائے اس کے الفاظ کے اندر تاثیر کا عقیدہ اور پرویزؒ کی آپ بیتی

عزیزانِ من! ہر جگہ یہ جتنی بھی اس قسم کی توہم پرستیوں کی خرافات ہیں وہ چھائی ہوئی ہیں اور قیامت یہ ہے کہ وہ تو پھر بھی کفار ہیں' کچھ جاہل ہیں مگر جو یہ آتے ہیں' یہ بیچارے ڈھول بجانے والے ہیں' ان کے ہاں کالا علم سہی' یہ قرآن کریم کی آیات کو اس طرح استعمال کرتے ہیں'

---

❶ لکن چھپائی: Hide and Seek

کہ اف! یا اللہ! جن چیزوں کو مٹانے کے لیے قرآن کریم آیا تھا' وہ ان چیزوں کے ثبوت کے دلائل کے لیے قرآن کریم کی آیات لاتے ہیں' قرآن کریم کا مفہوم نہیں لاتے' قرآن کریم کے معنی نہیں لاتے' آیات لائے ہیں۔ Age of Magic (دورِ سحر) میں عقیدہ یہ ہوا ہے کہ الفاظ خود اپنے اندر ایک تاثیر رکھتے ہیں' الفاظ کے معنی یہ تاثیر نہیں رکھتے یعنی وہ لفظ اپنے اندر تاثیر رکھتا ہے۔ یہ ہوتا ہے جسے آپ جادو (Magic) کہتے ہیں کہ لفظ اپنے اندر ایک تاثیر رکھتا ہے۔ اس کو اتنی دفعہ دہرائے چلے جایئے تو وہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ کے معنی یہ اثر نہیں پیدا کرتے' مفہوم بھی یہ اثر نہیں پیدا کرتا۔ یہ ہے جسے Magic (جادو) کہتے ہیں۔ یہی چیز جب ورد وظائف میں ہوتی ہے تو وہ یہی چیز ہوتی ہے کہ اس آیت کا اتنی دفعہ ورد کرو' یہ جو لفظ ہے' اسے اتنی دفعہ پڑھو۔ یہ پڑھاتے تھے۔ کراتے تھے' میں نے عرض کیا ہے کہ میں اپنی داستانیں زیادہ نہیں بیان کیا کرتا وہ تو میری سرگزشت ہے۔ جب ورد کرتے تھے تو ایک بہت بڑا ورد ہمارے ہاں ہوتا تھا اور الفاظ جو صفات خداوندی ہیں' ان کے ہوتے تھے۔ اس میں ایک ورد ہمیں بہت بڑا بتایا جاتا تھا: ''یا بدھوح''! یہ ہماری سمجھ میں' اس زمانے میں نہیں آتا تھا' آج بھی نہیں آتا۔ ہم نے کہا کہ ''ایہہ تے آوے دا آوا ای سارا بدھو ہیگا اے۔ اوکلھا بدھو نہیں ہیگا''[1] یہ ہمیں اس مقام پر لے گئے۔ ذہنِ انسانی کا جو دورِ طفولیت' بچپن کا زمانہ تھا' یہ اس زمانے میں لے گئے تھے۔ اب بھی ہمارے ہاں جو بچہ ہوتا ہے' وہ اس قسم کے افسانوں سے' جیسا میں نے کہا ہے کہ انہوں نے یہ الف لیلیٰ شروع[2] کیا ہے' بچہ بڑی دلچسپی سے دیکھتا ہے۔ جو بات سمجھ میں نہیں آتی' اس میں بڑی دلچسپی لیتا ہے۔ انہوں نے ہمیں وہاں لا کھڑا کیا ہے۔ کرامات حضرت صاحب کی' جو کسی کی سمجھ میں نہ آئیں' وہ ہوتی ہیں' قرآن کریم کی آیات کے ورد وظائف ہیں۔ اور آپ حیران ہونگے کہ قرآنِ کریم نے ایمان کے بعد اعمال پہ زور دیا ہے' بات ہی ساری یہ ہے کہ کام کیا کرو' یہ کام ہی ہے' جس کا نتیجہ نکلتا ہے' ایمان تو صحیح فارمولا ہوتا ہے' اس کے مطابق جب آپ لیبارٹری میں عمل کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ نکلتا ہے۔

قرآنِ کریم کی آیات کو ورد وظیفے کی شکل میں لکھنے کا استعمال

دنیا میں سارے کاموں میں' پہلے اس کے طریق کا جو گر ہوتا ہے' وہ ایمان ہوتا ہے' اس کے مطابق کیجیے تو نتیجہ نکلتا ہے' اس کو عمل کہتے ہیں' اعمال اس کی جمع ہے۔ ان علما حضرات کی کتاب میں اعمالِ قرآنی ہیں' اس میں قرآن شریف کی آیتوں کے ورد اور وظیفے لکھے ہوئے ہیں اور اس کا نام اعمالِ قرآنی ہے۔ عامل تو آپ کے ہاں دیکھا ہی ہوگا کہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ فلاں جگہ وہ عامل ہے۔ اب عامل کے معنی وہ قرآن کریم کے مطابق عمل کرنے والا' کام کرانے والا' ورد وظیفے کرنے والا' تعویذ گنڈے دینے والا عامل ہے' یہ سب عملیات ہیں اور پھر چونکہ یہ سارے ہوتے ہی اس طرح سے بھنگڑ ہیں' ہمارے ہاں تو پھر پوچھتے یہ ہیں کہ ''کیہڑ اعمل کرداوے''؟[3] آپ نے پہلی دفعہ یہ لفظ

---

[1] یہ تو آوے کا آوا ہی بدھوؤں کا ہے۔ وہ اکیلا ہی بدھو نہیں ہے۔
[2] یہ اس زمانے میں ٹیلیوژن پر آنے والے پروگرام ''الف لیلیٰ'' کی طرف اشارہ ہے۔
[3] وہ عمل کونسا کرتا ہے؟

سنا ہوگا۔ میں نے جیسا تلفظ بھی اس کا دیا ہے' وہی عمل' اب بھنگ پوست ڈوڈے' ان میں سے جو کچھ وہ جس نشے کا عادی ہو' وہ اس لیے الصّٰفّٰت 184 عمل کہلاتے ہیں۔ اب یہاں پہنچ گئے ہیں۔ میں ان جہلا کی بات نہیں کرتا۔ آپ کے ہاں کے جید علمائے کرام کی اعمالِ قرآنی عملیاتِ قرآن موجود ہیں۔ یہاں آپ عمل پہ آ گئے' قرآن کریم کو یہاں لے آئے۔

کائنات کو مسخر کرنے کی تعلیم رکھنے کے باوجود ذلت کے عذاب میں مبتلا قرآن کریم کی حامل قوم کی حالت

میں پوچھتا یہ ہوں کہ وہ جو قرآن کریم نے جاہلیت کے متعلق کہا تھا کہ ان لوگوں کو دیکھیے کہ یہ ان ملائکہ کو بھی کہتے ہیں کہ یہ قوتیں ہیں' یہ ان کے قابو آ جاتی ہیں' یہ جنات کے متعلق کہتے ہیں' مخفی قوتوں کے متعلق یہ ایمان رکھتے ہیں' یہ عقائد رکھتے ہیں۔ یہ کس قدر وجۂ تذلیل انسانیت ہے کہ انسان جس کو ہم نے اتنی بلندیوں پر پیدا کیا تھا کہ کائنات کی ہر قوت اس کے لیے مسخر کر دی تھی' یہ ان قوتوں کے سامنے اب بھی جھکا ہوا ہے۔ ان سے قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ ان کو دیکھو' ان کی کیا کیفیت ہے' اس قدر ذلیل ہو رہے ہیں' آج ہم قرآن کریم ہاتھ میں لے کر' عزیزانِ من! اسی مقام پر ہیں۔ عام وظائف ہوتے ہیں' تعویذ لکھے جاتے ہیں' ورد بتائے جاتے ہیں' گنڈے ہوتے ہیں۔

ورد کرنے کی خاطر کھجوروں کی گٹھلیاں کرایہ پر حاصل کی جاتی ہیں: آنے والے نسل کی بربادی کے اسباب

ہم تو ڈوبے ہی تھے' دکھ ہوتا ہے یہ آنے والی نسل چھوٹی چھوٹی بچیاں ہیں جب امتحان قریب آتا ہے تو کھجوروں کی گٹھلیاں رکھ دی جاتی ہیں اور ان کے بعد وہاں صاحب آیت کریمہ کا ورد ہوتا ہے' سوا لاکھ مرتبہ وہاں وہ پڑھاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس میں بھی کیا ملتا ہے یعنی ہر بات کاروباری ہوتی ہے۔ پتہ چلا کہ وہ جو کھجوروں کی گٹکیں (گٹھلیاں) ہیں وہ کرائے پہ ملتی ہیں' ''یعنی کھجوراں تے اس قوم دی قسمت اچوں نکل گیاں''[1] ان کی جو گٹھلیاں ہیں' یہ ان کی گٹھلیوں پر کاروبار کرتے ہیں۔ میرے لیے یہ ایک بالکل نیا انکشاف تھا۔ یقین مانیے کہ ہم نے یہ سارا کچھ کیا ہوا تھا' ہمارے زمانے میں یہ کاروبار یہاں تک نہیں پہنچا تھا کہ یہ جو گٹھلیاں ہیں وہ بھی کرائے پہ ملیں۔ اب معلوم یہ ہوا کہ وہاں سے گٹھلیاں کرائے پہ ملتی ہیں' بچیوں کو چادر بچھا کر وہاں یہ آیہ کریمہ کا ورد پڑھا جاتا ہے۔ اب وہ ہمارے جیسے بدنصیب بچیوں کے ایسے گھرانے بھی ہیں' جن کو شروع سے یہ سکھایا گیا ہے کہ ہر چیز دلیل پہ' علم پہ' بصیرت پہ' قرآن کریم کی رو سے مانتے ہیں تو بچی نے اپنی مس سے کہہ دیا کہ سسٹر! ایک دفعہ سال بھر آپ یہ کہتے ہیں کہ محنت کرو تو پاس ہو جاؤ گے' آج آپ کہتے ہیں کہ سوا لاکھ بار پڑھو تو پاس ہو جاؤ گے' دونوں میں سے کون سی چیز ٹھیک ہے۔ اسے اسکول سے نکال دیا۔

---

[1] یعنی کھجوریں تو اس قوم کی قسمت سے نکل گئیں۔

عزیزانِ من! آنے والی نسلوں کے ذہنوں میں ابھی سے یہ بیج بویا جارہا ہے' قرآن حکیم کو سمجھنا نہیں۔ اس کے الفاظ کا ورد کرنا ہے 184 الصّٰفّٰتِ۔ وظیفہ کرنا ہے' تعویذ لکھنا ہے' جن نکالنے ہیں' ان کے ذہنوں میں ابھی یہ جن ہے۔ یہ جن اور بھوت اور پریت اور پریاں ذہنوں میں موجود ہیں۔ میں یہ عرض کررہا تھا کہ یہ بات عام طور پہ سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآن حکیم ان باتوں کا کیا ذکر کرتا ہے' کیا اہمیت ہے؟ ان چیزوں کی یہ اہمیت ہے۔ یہ عظیم کتاب ہے' یہ خدائے خبیر کی کتاب ہے' اسے قیامت تک کا ان کا بھی پتہ تھا کہ انہوں نے اس طرف نہیں آنا' ان کا بھی پتہ تھا کہ انہوں نے ان کے بعد قرآن مجید الگ رکھ کے یہ کچھ کرنا ہے۔ اس لیے وہ تردید کرتا ہے۔ ان کی کیفیت وہ ہے کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں' جنات بدی کی قوتیں ہیں' تباہیاں لاتی ہیں' ان کی پوجا پاٹ کرو' ان کو نذرانے پیش کرو' ان کی نذر نیاز مانو۔ محفوظ رہو گے۔

اگر کچی قبر کو مقبرے میں تبدیل کر دیا جائے تو پھر مرنے والا قطب بن جاتا ہے' سب کے دلوں پہ خوف پیدا کر کے حکومت کرتا ہے

پھر آگے تو ابھی مُردوں کی بستی آتی ہے۔ ہر وہ کسی غریب کی قبر' جو کچھ بنا دی جائے' تو وہ صرف قبر ہوتی ہے۔ پکی بن جائے تو مقبرہ بن جاتا ہے' اس کے اوپر گنبد ہو تو مرنے والا قطب ہو جاتا ہے۔ یعنی پتہ نہیں کتنے اور بڑے نیک مسلمان مرے ہونگے جن کی قبریں کچی ہونگی' کوئی نہیں سمجھتا کہ کوئی ولی اللہ اس کے اندر دفن ہے۔ جونہی گنبد بنا اور جو مدفون ہے' وہ قطب بنا' سارا قصہ اوپر کے گنبد کا ہے۔ یہ پروپیگنڈے کا ایک طریقہ ہے۔ وہاں جا کر جہاں گنبد والی قبر ہوتی ہے' مراد مانگتے ہیں۔ یہ پورا قبرستان بھرا ہوا ہوتا ہے' ان کی تو بخشش کی دعا مانگتے ہیں جیسے وہ عذاب میں مبتلا ہیں اور جو گنبد والی قبر ہے' وہاں جا کر اپنی مرادیں مانگتے ہیں۔ فرق دونوں میں اس گنبد کا ہی تو ہے۔ کہاں سے نکالا تھا مسلمان؟ کہا جاتا ہے کہ مردہ بدست زندہ تو بات تو یہی ہوتی ہے کہ جو مر جائے تو جو زندہ ہوتے ہیں جو جی میں آئے اس کے ساتھ کریں۔ یہاں پوری زندوں کی دنیا ایک مردے کے بس میں ہوتی ہے کہ حضرت صاحب چاہیں تو سارے لاہور کو غرق کر سکتے ہیں۔ ''اوکوئی نیک کم وی کراؤ کسے کولوں''[1]۔ ڈر پیدا کرتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم انسانی نفسیات کو خوف وحزن کی گرفت سے آزادی دلا کر دیتی ہے

پہلی چیز خوف ہوتا ہے جس سے آدمی ادھر آتا ہے' یہ خوف ہوتا ہے جو سڑک کے اوپر کھڑا ہو کر سٹین گن لے کر کہتا ہے: نکال لو سارا کچھ' یہ ایک تکنیک اور راز ہے کاروبار کا: تباہ کر دیں گے حضرت صاحب! برباد کر دیں گے' دیکھا نہیں فلاں تھا' اسنے جاتے وقت پشت ان کی طرف کر دی تھی' تیسرے دن ہی بیٹا مر گیا تھا۔ یہ ہے خوف پیدا کرنے کی تکنیک۔ قرآن حکیم انسان کو ان چیزوں سے بلند لے

---

[1] ابے! کسی سے کوئی نیک کام بھی کرا لو۔

جانے کے لیے آیا ہے۔ کہتا ہے کہ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:62) یہ مومن کا شعار تھا' نہ خارجی خطرات' نہ دل کے اندر حزن اور افسردگی۔ جتنی کائنات کی قوتیں ہیں' ساری اس کے سامنے مسخر ہیں' ساری اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ یہ مقام تھا عزیزانِ من! اب ہم اپنے ہاں مومن ڈھونڈتے پھرتے ہیں' وہ ❶ سچ کہہ گیا ہے:

ب آدمے نرسیدی' خدا چہ می جوئی

زخود گریختہ آشنا چہ می جوئی! ❷

(جاوید نامہ)

''اوتو بندے دا پتر تے بن' فیر رب ول چلیں''❸ آدم نہیں ہے تو آدمی کے مقام کے اوپر نہیں ہے۔ تُو خدا کی باتیں کر رہا ہے۔ قرآن حکیم نے جو مسجود ملائکہ بتایا ہے' وہ آدم کو بتایا ہے کہ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا (2:34) کائناتی قوتوں سے کہا کہ آدمی کے سامنے جھکو' مومن کا تو مقام ابھی کتنا اور آگے ہوتا ہے۔ یہ تو آدمی کا مقام ہے۔ ہمیں مقامِ آدم کے اوپر بھی نہیں لانے کی اجازت ملتی۔

مذہب اور تصوف کے پودوں کی جتنی زیادہ آبیاری ہوگی یہ اتنا ہی زیادہ کڑوا پھل دیں گے

عزیزانِ من! جتنا زیادہ یہ آپ کے ہاں مذہب اور تصوف پھیلے گا' تو ہم پرستیاں اتنی زیادہ ہو جائیں گی' اتنے ہی آپ شرفِ انسانیت کے مقام سے نیچے گرتے چلے جائیں گے۔ قرآن حمید یہ کہنے کے لیے آیا تھا۔ کہا ہے کہ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (37:158) (اور یہ لوگ' خدا میں اور کائنات کی ان قوتوں میں رشتے جوڑتے ہیں۔ کبھی آسمانوں کی بجلی کو دیوی قرار دے کر' کبھی بادل کو دیوتا سمجھ کر اس کا ناطہ خدا سے جوڑتے ہیں اور کبھی فرشتوں کو اس کی بیٹیاں ٹھہراتے ہیں) اور جو پوچھو ان سے کہ صاحب! ان ''جنوں'' میں قوت کیا ہے؟ ''کیندے نیں تہانوں پتہ نہیں ہیگا خدا نال رشتہ داریاں اینادیاں ❹'' خدا کے ساتھ کچھ رشتہ داریاں بتاتے ہیں اس کی۔ کہا ہے کہ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (37:158-159) جتنی یہ غیر مرئی قوتیں ہیں' قرآن حمید نے بتایا ہے کہ یہ جو قوتیں ہیں' یہ صاحبِ اختیار نہیں ہیں' ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ جو جو فریضہ ان کے ذمے لگایا گیا ہے وہ اس کی سرانجام دہی میں ساری زندگی اس کے اندر سرگرداں ہوتی ہیں: وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ (21:19) اور ان سے کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتیں' ان میں سے کوئی ایک قوت بھی سرکشی برت لے تو نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے۔

---

❶ یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

❷ تُو تو آدمی تک نہیں پہنچا' خدا کیوں ڈھونڈ رہا ہے۔ تُو تو خود سے بھاگا ہوا ہے' تُو آشنا کیا تلاش کرتا ہے۔

❸ تم پہلے آدم تو بنو' پھر رب کی طرف چلو۔

❹ کہتے ہیں کہ تمہیں معلوم نہیں ہے ان کی تو خدا کے ساتھ رشتہ داریاں ہیں۔

سورج سے کہیں کہ کبھی اپنی مرضی سے نکلے' اس پروگرام کے مطابق طلوع نہ ہو جو اس کے لیے خدا نے مقرر کیا ہوا ہے تو اب دیکھو پھر کیا 184 الصّٰفّٰتِ ۔ بنتا ہے۔ کہا ہے کہ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ (37:159) بہت بلند ہے' وہ خدا کی ذات ان تمام باتوں سے' جو یہ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

یہ بے اختیار کائناتی قوتیں' باختیار انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں

ان کے متعلق تو یہ بات ہے اور ہم جو کہتے ہیں کہ خدا کے کلام میں یہ اثر ہے جو اتنی دفعہ پڑھو۔ کہا ہے کہ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ (37:160) یہ ہیں خدا کے مخلص بندے فَاِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ - مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَيۡهِ بِفٰتِنِيۡنَ (37:161-162) تم اور یہ جن کی تم پرستش کرتے ہو' جن کو بڑی بڑی قوتیں سمجھتے ہو' سارے مل بھی جاؤ' تو اس انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے' جو ان چیزوں کے اوپر اعتقاد نہیں رکھتا۔ ''پیر مندیاں نوں کھاندااے''[1] کئی دفعہ میں کہہ چکا ہوں' بڑی عجیب بات ہے صاحب! ان میں کچھ نہیں ہوتا' جو اثر اور قوت آپ نے اس کے اندر خود منسوب کر دی ہے' اس سے آپ مرعوب ہو جاتے ہیں' وہ اس کی قوت ہوتی ہے' اُس کی اپنی قوت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ طبعی یا فزیکل چیزوں کے اندر تو اپنی قوت ہوتی ہے' سنکھیا کے اندر یہ قوت ہے کہ وہ ہلاک کر دیتا ہے' پانی کے اندر یہ قوت ہے کہ وہ زندگی بخشتا ہے اور یہ جتنی تو ہم پرستیاں ہیں ان کے اپنے اندر قوت ہی نہیں ہوتی' آپ انہیں صاحبِ قوت تسلیم کر لیں یعنی پہلے آپ جھک جائیں' وہ اوپر چڑھ جاتے ہیں۔

''چوں یکے اندر قیام آئی فنا است''[2]

آپ کھڑے ہو جائیں تو وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ کیا تم اور یہ جو تمہارے اتنے اتنے دیوی دیوتا' جن کی تم پرستش کرتے ہو' سارے اکٹھے ہو جاؤ' خدا کے ان بندوں کے اوپر تم کبھی قابو نہیں پا سکتے؟ نہیں' تم ان کو نہیں ورغلا سکتے۔

جہنم کی طرف تو انسان خود راغب ہوتا ہے

کسے ورغلا سکتے ہو' کسے بہکا سکتے ہو؟ کہا ہے کہ اِلَّا مَنۡ هُوَ صَالِ الۡجَحِيۡمِ (37:163)۔ ایک لفظ میں ساری بات طے کر دی۔ وہ لفظ ہے صَالِ الۡجَحِيۡمِ یعنی جو خود ہی جہنم کی طرف جانا چاہتا ہے' وہ ہے جو ورغلایا جاتا ہے۔ جہنم کی طرف تو آدمی خود جاتا ہے تو وہ جو جہنم کی طرف جا رہا ہے' جانے والا ہے' بس صرف وہ ہے جن کو ان اعتقادات میں لا کر بہکا سکتے ہو۔ اب آپ سوچ لیجیے کہ جتنے لوگ خواہ وہ مسلمان نام رکھیں یا کچھ بھی رکھیں' ان معتقدات کے اندر گرفتار چلے آ رہے ہیں یا اس وقت ہیں وہ صَالِ الۡجَحِيۡمِ کے اندر آتے ہیں

---

[1] پیر اسی سے کھاتا ہے جو اسے مانتا ہے۔

[2] ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست چوں یکے اندر قیام آئی فناست

وہ جہنم کی طرف خود لپک کر جانے والے ہیں۔ کہا ہے کہ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ - وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ (37:164-165) جو اللہ 184الصّٰفّٰت۔
کے بندے ہیں وہ یہ جانتے ہیں' وہ کہتے ہیں ہمیں پتہ ہے کہ ہمارا مقام کیا ہے۔

اس کائنات کے اندر سب سے بڑی نعمت' انسان کا اپنے مقام سے آگاہ ہونا ہی ہے

کیا بات ہے صاحب! وہ اپنے مقام سے واقف ہوتے ہیں۔ اور دنیا میں بڑی چیز' عزیزانِ من! انسان کا اپنے مقام سے واقف ہونا ہے۔ قرآن مجید آیا ہی اس لیے تھا کہ انسان کو اس کے مقام سے آشنا کردے۔ کہا ہے وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ (37:165) ہمارا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ ہم اس کے نظام' اس کے پرگرام' کو بروئے کام لانے کے لیے میدان میں صف بستہ کھڑے ہو جائیں۔ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ (37:166) اور عمر بھر اس کے لیے سرگرمِ عمل رہیں مگر ہمارے ہاں اب پھر آ گیا وہ ترجمہ کہ ہم جو ہیں اس کے لیے تسبیحیاں پڑھتے رہتے ہیں۔ چل بھئی! وہ تسبیحیوں کو ہی تو اس نے وہاں منع کیا تھا۔ تسبیح کیا ہے؟ ان کے مطابق یہ کہ سو دفعہ یہ نام یوں لے لو' اس کا یہ اثر ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ چیزیں گنتی کے حساب سے ہوتی ہیں۔ مُسَبِّحُوْنَ یعنی ہمیشہ سرگرداں رہنا' کہا یہ ہے کہ ہم اس کی مشیت کے پروگرام کی تکمیل کے لیے ہمیشہ سرگردان رہتے ہیں۔ اب کہاں ان لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ - لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ - لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ (37:167-169) یہ کہا کرتے تھے کہ صاحب! ہمارے پاس تو خدا کی کتاب ہے ہی نہیں' اس کی تعلیم ہی نہیں ہے' ہم کیا کریں' مجبور ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے ہاں بھی خدا کی تعلیم آ جاتی تو ہم بھی اس کے مخلص بندے بنتے۔ اب خدا کا پیغام آ گیا ہے' اس کی کتاب آ گئی ہے تو فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (37:170) اس کے بعد اس سے انکار و سرکشی برت رہے ہیں۔ کہا ہے کہ یہ کرتے تھے کہ جب خدا کا پیغام آ گیا ہے تو اب سرکشی برت رہے ہیں۔

اتمام حجت کے لیے خدا کا پیغام تیرہ سو سال سے ہمارے پاس موجود ہے

عزیزانِ من! یہ سن کر آپ آگے نہ بڑھ جایئے۔ اس نے کہا ہے کہ جب خدا کا پیغام آ گیا ہے اور ان کے پاس اس کی کتاب آ گئی ہے تو اب اس سے کفر برت رہے ہیں۔ بتایئے کہ کیا خدا کی کتاب ہر گھر میں ہمارے ہاں موجود ہے یا نہیں؟ یہ جو اس نے کہا ہے کہ جب ان کے پاس وہ کتاب آ گئی ہے تو یہ اس سے کفر برت رہے ہیں۔ اب بتایئے کہ کیا ہم میں سے ہر ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟: کیا ہم اس کتابِ عظیم سے کفر نہیں برت رہے؟ ان کی حجت تو پوری ہو گئی۔ چلیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کہ ایک رسول آ گیا' اس نے کتاب دے دی' وہ کہہ سکتے تھے کہ ہمارے ہاں کتاب نہیں تھی۔ اب ہمارے ہاں تو یہ کتاب تیرہ سو سال سے' ایک ایک گھر کے اندر چلی آ رہی ہے' کروڑوں حفاظ کے سینوں کے اندر محفوظ ہے' یہ اتنی دہرائی جاتی ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اتنی نہیں دہرائی

جاتی' ایک ایک رات میں آپ اس کتاب کو دہراتے ہیں۔ کیا آپ ان کی طرح کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس کتاب ہوتی تو ہم فخر نہ 184 الصّٰفّٰتِ ۔ کرتے؟ آپ تو یہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ کہا ہے کہ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (37:170) دیر نہیں لگے گی' جلدی ان کو معلوم ہو جائے گا کہ صحیح تعلیم آ جانے کے بعد اس سے کفر برتنے کا نتیجہ کیا تباہی ہوا کرتی ہے! یہ وہ ہیں جو خود اپنے آپ کو جہنم میں لیے جا رہے ہیں۔ کتاب کا آ جانا' اتمام حجت ہوگئی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آ جانا' اتمام حجت ہوگئی اور اس کے بعد تو اب کوئی رسول بھی نہیں آنا۔ اگرچہ آپ نے اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے یہ کر رکھا ہے کہ نہیں صاحب! ہمارے بس کی بات نہیں ہے' آخری زمانے میں امام صاحب آئیں گے اور وہ اکیلے ہی نہیں ہونگے' حضرت عیسیٰ ؑ ساتھ آئیں گے' وہ اسلام کا غلبہ کریں گے انشاءاللہ یہ غلبہ ضرور ہوگا لیکن وہ آ کر کریں گے' اب آپ نہیں کریں گے۔ کہا ہے کہ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۔ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۔ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (37:172-173) ہم نے پہلے یہ قانون مقرر کر دیا ہے' جہاں بھی خدا کے متعلق یہ قرآن حمید میں آئے کہ ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے' ہم نے ان سے کہہ رکھا ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ اس مقصد کے لیے ایک قانونِ خداوندی مقرر ہو چکا ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ خدا کے پیغامات اور اس کے نظام پر عمل کرنے والوں کو ہمیشہ کامیابی حاصل ہوگی وَاِنَّ جُنْدَنَا (37:173) اور یہ ہمارا لشکر ہوگا جو ہمیشہ غالب رہے گا۔

مسلم دنیا کے نام پر مراکش سے انڈونیشیا تک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی حالت زار اور اسرائیل کی مملکت

عزیزانِ من! کسی کسوٹی پہ پرکھ لیجیے' کہا جا رہا ہے کہ مسلمان نوے کروڑ ❶ ہیں' یہ ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک چلا آ رہا ہے یعنی جغرافیائی طور پر بھی زمین کی بیلٹ کا ایسا حصہ ان کے پاس ہے جس میں وہ مسلمان مسلسل چلے آ رہے ہیں مگر پچیس تیس سال ❶ سے رو رہے ہیں' ویسے تو رونا ان کے مقدر میں پتہ نہیں کب سے لکھا ہوا ہے۔ ان کے عین قلب کے اندر چڑیا سے بھی کم ایک چھوٹی سی اسرائیل کی' دوسروں کی مدد سے ایک مملکت قائم ہوئی ہے۔ نوے کروڑ مسلمان تیس سال سے رو رہے ہیں کہ اسرائیل کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔ پہلی جنگ عظیم (1918-1914ء) میں ہمارے ہاں یہ نعرہ بلند ہوا تھا کہ ان کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔ یہ مسلمان رو رہے ہیں۔ پندرہ بیس لاکھ ہر سال عرفات کے میدان میں' جہاں کہتے ہیں کہ ہر دعا منظور ہو جاتی ہے' مقبول ہوتی

---

❶ یاد رہے کہ بات ستمبر 1980ء کی 26 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

ہے' روروکر دعائیں مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! اسرائیل کا بیڑہ غرق کردے۔ حج سے واپس آتے ہیں تو اپنی کشتی ڈوبی ہوئی ہوتی ہے 184 الصّٰفّٰتِ ۔
قرآنِ کریم نے 'عزیزانِ من! واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (37:173) یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار کو مومنین کے اوپر غلبہ حاصل ہو جائے۔ اسی لیے تو قرآن کریم کو سامنے نہیں لانے دیتے۔

ہمارے ہاں اسلامی اصطلاح کا حشر

انہوں نے ایک اصطلاح ''اسلامی'' کے نام سے وضع کر رکھی ہے اور اسلامی قانون' اسلامی شریعت' اسلامی نظام کا کھلے عام تحریر وتقریر میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ متعین ہی کچھ نہیں ہے کہ وہ ''اسلامی'' کیا ہے' اسلامی کہنے سے کیا مفہوم متعین ہوتا ہے؟ وہ اسلامی کہتا ہے۔ اس کے ثبوت میں وارث شاہ (1722-1798ء) کا شعر پڑھ دیتا ہے کہ ''دیکھو جی وارث شاہ جی کہہ گئے نیں ہور کی گل ہو گئی'' جس کو جی چاہیے اسلامی کہہ دیجیے۔ قرآنی نہ کہیے' یہ چیز کہنا بڑا جرم ہے' اسلامی کی جگہ قرآنی لے آئیں گے تو پھر وہاں وہ آئے گا کہ قرآن کریم میں تو یہ لکھا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار مومنوں کے اوپر غالب آجائیں۔ کفار تو ہمارے سامنے ٹھیک ٹھاک ہیں' وہ ہمارے اوپر غالب آئے ہوئے ہیں۔ کیا نتیجہ نکلا؟ یہ کہ ہم مومن نہیں ہیں۔ قرآن کریم یہ کہتا تھا اور ہم آئینہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ آئینہ نہ دیکھنے سے' عزیزانِ من! محاورے کے اعتبار سے جو حبشی ہے' وہ کوہ قاف کی پری تو نہیں بن سکتا' آئینہ نہ دیکھے اپنا لیکن رہے گا تو وہ حبشی ہی۔ قرآن کریم کو اس لیے سامنے نہیں آنے دیتے کہ اس میں یہ چیزیں ملیں گی' اس میں کسوٹی ہوگی' اس پر پرکھنا ہوگا' ایک آئینہ ہوگا جس میں یہ نظر آئے گا۔

مومن ہونے کی پہچان یہ ہے کہ اس پر کفار کبھی غالب نہیں آسکتے

عزیزانِ من! کہا ہے کہ انتم الاعلون (3:139) تم دنیا میں تمام اقوام عالم سے بالا ہو۔ یہ قرآن حکیم کی آیت ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ کفار مومنوں کے اوپر غالب آجائیں وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (37:173) یہ ہمارے لشکر غالب رہیں گے۔ اب ان کی جو بے معنی تلاوت ہے اس میں سارا ثواب ملتا ہے' جونہی قرآن مجید کے یہ معنی سامنے آئے یہ ختم ہوئے۔ اس فریب نفس سے نکلنا پڑے گا۔ رسول سے کہا ہے کہ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ (37:174) جب ان کی کیفیت یہ ہو گئی ہے' یہ سب کچھ ان کے سامنے پیش کیا ہے' اس کے باوجود یہ اس سے منہ موڑے ہوئے ہیں تو ٹھیک ہے' ضد کا تو کوئی علاج نہیں ہے۔ اتمام حجب ہم نے کر دی ہے' بات انہیں سمجھا دی ہے' کچھ بھی تو اور باقی نہیں رہا' اس کے باوجود ضد کرتے ہیں تو کوئی بات نہیں' تم نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ ایک وقت تک کے لیے ذرا ان سے الگ ہٹ جاؤ لیکن وَاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ (37:175) ان کے اوپر نگاہ رکھو کہ یہ مخالفت میں کیا کیا تدبیریں کرتے ہیں' عنقریب یہ خود دیکھ لیں گے کہ ان کی اس بدخویشی کا انجام کیا ہوتا ہے' اپنی تباہی کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لیں گے۔ کہا ہے کہ یہ بار بار تم سے کہتے ہیں کہ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ (37:176) جس تباہی کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو' اس کو لاتے کیوں نہیں' اسے بہت جلد لاؤ۔ کہا ہے

184الصّٰفّٰت۔ کہ اس طرح سے یہ تقاضا کرتے ہیں جیسے عید کے چاند کے متعلق کہتے ہیں کہ تیس کی بجائے انیتس ہی کا نکل آئے تو ٹھیک ہے۔

صحنِ خانہ میں اترنے والی تباہی بڑی خوف ناک ہوتی ہے

کہا ہے کہ انہیں پتہ نہی ہے کہ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ (37:177) جب وہ تباہی ان کے صحنِ خانہ میں اترے گی تو وہ صبح کس قدر ان کی منحوس ہوگی۔ کیا حسین انداز سے بات کہنے کا۔ ''ان کے صحن خانہ میں'' انکے الفاظ کس قدر معنی خیز ہیں۔ یہ تباہی خود مکے میں اتر آئی تھی جب آئی تھی۔ کہا ہے کہ وہ صبح ان کے لیے کس قدر منحوس ہوگی! مگر ہوتا یہ ہے کہ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ (37:178) کچھ وقت کے لیے تھوڑا سا مہلت کا وقفہ ہوتا ہے لیکن وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ (37:179) ان کے اوپر نگاہ رکھو' عنقریب اس کا انجام ان کے سامنے آئے گا۔

اب اس سورۃ کی آخری آیات آ گئیں' عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ سورۃ کی آخری آیات میں قرآن کریم اپنا مضمون Sum-up (خلاصہ) کرتا ہے۔ کہا ہے کہ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (37:180) خدا' جو قوت اور اقتدار کا مالک ہے 'وہ ان تمام چیزوں سے بلند اور بالا ہے جو یہ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ خدا کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ان کی ان توہم پرستیوں سے بلند ہے۔ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (37:181) جو خدا کے پیغامات پہنچانے والے ہیں' وہ ہمیشہ امن وسلامتی کے اندر رہتے ہیں۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (37:182)۔ حمد [1] کا مفہوم میں نے عرض کیا ہوا ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ میں تو اردو زبان بولوں گا یا دوسری کوئی زبان بھی' انگریزی بولوں یا پنجابی' اس کا ترجمہ کرنا پڑے گا مگر اس حمد کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ترجمے میں یہی کہیں گے کہ سب تعریف خدا کے لیے ہے۔ اس سے کچھ بات نہیں بنتی ہے۔ عربوں سے پوچھیے' وہ بتائیں گے کہ حمد میں اور مدح میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہ اس کا ترجمہ تعریف نہیں کرتے' کسی بلند پایہ تصنیف کے عظیم النظیر 'ماسٹر پیس' شاہکار کو دیکھ کر' بے ساختہ زبان کے اوپر جو واہ واہ کا لفظ آتا ہے' اسے حمد کہا جاتا ہے۔ ان کے مرسلین کے ہاتھوں سے جو نظام قائم ہوتا ہے' اسے دیکھنے کے بعد ہر انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ واقعی وہ بڑی بلند ہستی ہے جس کا نظام اس قسم کے نتائج انسانیت کو دیتا ہے۔ یہ تھا طریقہ دنیا کے سامنے اسلام پیش کرنے کا۔

عزیزانِ من! آج سورۃ الصّٰفّٰت ختم ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

---

[1] اس کی مفصل وضاحت وصراحت کے لیے ملاحظہ ہو: پرویز: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ الفاتحۃ' پرویزؒ: (مدیر پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007ء ص ص۔ 78 تا 93۔

سورۂ صٓ

193ص

پہلا باب: سورۃ صٓ (آیات 1 تا 8)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صٓ وَ الۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ؕ﴿۱﴾ بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ ﴿۲﴾ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ فَنَادَوۡا وَّ لَاتَ
حِیۡنَ مَنَاصٍ ﴿۳﴾ وَ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ ۫ وَ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ۖ﴿ۚ۴﴾ اَجَعَلَ الۡاٰلِہَۃَ اِلٰـہًا
وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ ہٰذَا لَشَیۡءٌ عُجَابٌ ﴿۵﴾ وَ انۡطَلَقَ الۡمَلَاُ مِنۡہُمۡ اَنِ امۡشُوۡا وَ اصۡبِرُوۡا عَلٰۤی اٰلِہَتِکُمۡ ۚۖ اِنَّ ہٰذَا لَشَیۡءٌ
یُّرَادُ ۖ﴿ۚ۶﴾ مَا سَمِعۡنَا بِہٰذَا فِی الۡمِلَّۃِ الۡاٰخِرَۃِ ۚۖ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا اخۡتِلَاقٌ ۖ﴿ۚ۷﴾ ءَاُنۡزِلَ عَلَیۡہِ الذِّکۡرُ مِنۡۢ بَیۡنِنَا ؕ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ شَکٍّ
مِّنۡ ذِکۡرِیۡ ۚ بَلۡ لَّمَّا یَذُوۡقُوۡا عَذَابِ ؕ﴿۸﴾ اَمۡ عِنۡدَہُمۡ خَزَآئِنُ رَحۡمَۃِ رَبِّکَ الۡعَزِیۡزِ الۡوَہَّابِ ۚ﴿۹﴾

عزیزانِ من! سورۃ صٓ' 38ویں سورۃ' کی ابتدا ہوتی ہے ❶۔ مضمون کا تسلسل قرآن میں چلا آتا ہے۔ یہ مربوط کتاب ہے۔ اس کی سورۃ میں' آیات میں' تسلسل ہے اور سورۃ کی ترتیب میں بھی تسلسل ہے۔

قرآنِ حکیم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے دعوے کا ثبوت خود آپ ہے اور یہ ثبوت نظری بھی نہیں ہوتے۔ کہا ہے کہ صٓ وَ الۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ((38:1۔ حروفِ مقطعات کے متعلق میں پہلے بتا چکا ہوں کہ عربوں کے ہاں یہ اسلوب بیان ہوتا تھا کہ وہ پورے لفظ کی جگہ اس کا جو ایک حرف تھا جس کو آپ Abbreviation (مخفف) کہتے ہیں' اس کو رکھ دیتے تھے۔ کہا ہے کہ صٓ وَ الۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ((38:1۔ یہاں ''وَ'' کے معنی اور نہیں ہیں ''وَ'' کے معنی شہادت اور گواہی کے ہیں۔ قرآن کریم جو ''ذی الذکر'' ہے' یہ بڑے شرف اور مجد کا مالک ہے' خود اپنے دعاوی کی صداقت کا آپ ثبوت ہے۔ یہ عظیم چیز ہے کہ یہ آپ خود اس کا ثبوت ہے جو یہ بتاتا ہے۔

مثلاً جب وہ کہتا ہے کہ مومن ہمارا حزب یا ہمارا جند ہے' وہ غالب آئے گا تو وہ مومن بن کر دیکھیے وہ غالب آ جاتا ہے' یہ اس کے دعوے کا ثبوت ہے۔ کہا ہے کہ بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ ((38:2 یہ وہی چیز ہے جو پیچھے سے چلی آتی ہے کہ جو اس سے انکار کرنے والے ہیں' وہ محض جھوٹی قوت کے گھمنڈ میں' مخالفت کے زعم میں اور تکبر اور نخوت کی بنا پر اس سے انکار کیے چلے جاتے ہیں' یہ دلیل و برہان کی رو سے انکار نہیں کرتے۔ کہا یہ ہے کہ کیا بتائیں ان لوگوں کو ہم کہ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ ((38:2 ہم نے'

---

❶ یہ اگست 1980ء کی 28 تاریخ کے درس کا ہی حصہ ہے۔ یہ سورۃ الصّٰفّٰت کے فوراً بعد شروع کر دیا گیا تھا۔

اپنے قانونِ مکافات کی رو سے' ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو تباہ کر دیا! میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم اپنے ان دعاوی کی صداقت 193 صٓ کے ثبوت میں تاریخ کی شہادتیں پیش کیا کرتا ہے اور یہ بڑی محکم شہادتیں ہوتی ہیں' نظری یا Theoretical بات تو ذہنی ہوتی ہے لیکن جب کسی کو بتا دیا جائے کہ دیکھو! اس نے سنکھیا پھانکا تھا' یہ مر گیا ہے' یہ بڑا بیّن ثبوت ہوتا ہے' اس ثبوت کا بھی بڑا اثر ہوتا ہے۔ یہ تو وہ اقوام ہیں جو ہمارے سامنے ہیں۔ گزری ہوئی اقوام بھی ہیں' ان کی ہسٹری' ان کی تاریخ مثلاً The History of the Decline and Fall of the Roman Empire❶ آپ پڑھ کر دیکھیے' نظر آتا ہے کہ قوموں کی تباہی کے قوانین کیا ہیں۔

قرآنِ حکیم نے قوموں کے عروج وزوال کے قوانین دیئے ہیں مگر اور ہماری تاریخ کے مرتب کرنے میں نہ کوئی سند ہے' نہ کوئی پیمانۂ تحقیق

قرآن نے تاریخ کو بڑی اہمیت دی ہے۔ ہم نے تو اپنے ہاں کیا بتائیں کہ کیا کیا ہے۔ ہمارے ہاں لٹریچر میں' تاریخ میں' بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ جو تاریخ ہے اس میں قرآن نے ان اقوام عالم کے عروج وزوال یا جسے استخلاف واستبدال کہتے ہیں کہ ایک قوم بدل کر اس کی جگہ دوسری قوم کیوں آجاتی ہے' اس کے قوانین دیئے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ساری تاریخ میں صرف ایک ابن خلدون ❷ کا مقدمہ ہے جس میں وہ کسی حد تک یہ چیز لایا ہے' اس کے علاوہ تو ہماری کوئی بھی تاریخ اس انداز سے لکھی ہی نہیں گئی' اصل تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں کی وہ تاریخ ہی نہیں ہے۔ تاریخ تو وہ ہے جس کی کوئی سند ہو۔ آپ ہمارے ہاں کی کوئی بھی تاریخ اٹھا کر دیکھیے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ یہ حضرت آدمؑ سے شروع کرتے ہیں بلکہ ان سے بھی پہلے' ان کے ہاں' جنت کی زندگی بھی بیچ میں آتی ہے کہ وہ وہاں کیسے رہتے تھے۔ مورخ جس نے تاریخ کے اعتبار سے یہ چیز لکھی ہے' وہ حضرت آدمؑ سے تاریخ شروع کرتے ہیں۔ جب کہ قرآن تو حضرت آدمؑ کا کہیں ذکر ہی نہیں کرتا' اس تاریخ کے لیے کوئی اتھارٹی نہیں' کوئی سند نہیں' کوئی ثبوت نہیں' کوئی ریسرچ نہیں ہے۔ یہ ہو ہی کیسے سکتی ہے۔ اس سے آگے بڑھتے ہیں تو جو کچھ تورات کے اندر لکھا ملتا ہے' وہ آپ اپنے ہاں درج کرتے چلے جاتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ یوں تو آپ کے ہاں کی ہسٹری (تاریخ) مرتب ہوتی ہے۔

---

❶ اس کا حوالہ یہ ہے:

Gibbon Eward: The History of the Decline and fall of the Raoman Empiere (6 Volumes), Strahan and Cadell, Landon, 1776-1789 (vol.I in 176; vols.II & III in 1781; Vol.iv,v& vi in 1788-89).

❷ ابن خلدون کا اصل نام عبدالرحمن بن محمد (1406-1332ء) ہے۔ انہوں نے دنیا کو دو نئے علوم "فلسفۂ تاریخ اور عمرانیات" سے آشنا کیا۔

قرآن حکیم کے نزدیک ہسٹری (تاریخ) کو بیان کرنے کا انداز

قرآن ان عربوں کو اس زمانے کی اولیں مخاطب قوم کی ہسٹری دیتا ہے کہ جاؤ! جن راستوں پہ تم سفر کرتے ہو اپنے قافلے لے جاتے ہو ان راستوں میں تمہیں کئی اجڑی ہوئی بستیاں ملتی ہیں۔ وہ سب ان بستیوں سے واقف تھے کہ یہ عاد کی ہے، یہ ثمود کی ہے، یہ لوط کی ہے، یہ قوم نوح والوں کی ہے۔ ان کے ہاں ان کی داستانیں موجود تھیں۔ یہ جاتے تھے اور راستے سے وہ بستیاں بھی نظر آتی تھیں، بہر حال پھر ان کی باتیں تو ہوتی ہیں اور باتیں ہوتی تھیں۔ یہ جو قرآن کریم نے انہی انبیائے کرامؑ کا ذکر کیا ہے تو یہ Semitic Race (سامی النسل) والے تھے۔ اسے دینے کی غایت یہ ہے کہ وہ لوگ اس سامی نسل سے واقف تھے۔ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ یہ دیکھو! قوم ثمود کی بستی ہے اور اس میں یہ کیا کچھ ہوا تو انہیں پتہ تھا کہ ثمود کون تھا، اس کی قوم کون تھی، کہاں رہتے تھے، ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ان کے ہاں ان داستانوں کا عام چرچا تھا۔ ان سے اگر کہا جاتا کہ کنفیوشس (Confucius:c.551-479 B.C) ایک پیغمبر تھے، اس کی قوم نے یہ کچھ کیا تھا تو وہ منہ دیکھتے رہ جاتے کہ صاحب! آپ کیا کہہ رہے ہیں، ہم نے تو یہ لفظ ہی آج سنا ہے۔ بحث یہاں سے چل پڑتی کہ وہ کوئی تھا بھی یا نہیں تھا۔ قرآن نے وہ بات کہی ہے جس کی وہ تردید ہی نہیں کر سکتے تھے، انکار ہی نہیں کر سکتے تھے۔

عزیزانِ من! قرآن ان کی بستیوں کو بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّ لَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ((38:3 یہ دیکھو! کتنی قومیں تھیں! جنہیں ہم نے اس سے پہلے تباہ کر دیا۔ ان کے رسول بار بار ان کو سمجھاتے رہے، نہیں مانے، جب تباہی آئی تو پھر انہوں نے ہمیں پکارا لیکن وَّ لَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ((38:3 اس وقت تو کوئی مقام ایسا رہ ہی نہیں گیا تھا جہاں جا کر وہ پناہ لے لیتے۔ قرآن مہلت کا وقفہ دیتا ہے۔ قوموں کا اصول بھی یہ ہے کہ کوئی قوم اسی دن نہیں پکڑی جاتی، وہ آہستہ آہستہ بتدریج تباہی کی طرف جاتی ہے اور اس دوران ان کو یہ وارننگ دی جاتی ہے، بتایا جاتا ہے کہ یہ چیز تمہیں تباہی کی طرف لیے جا رہی ہے، اب بھی پرہیز کر لو، وہ نہیں مانتی تو پھر تباہی کا وہ ایک دن آ جاتا ہے۔ یہ جو درمیانی وقفہ ہوتا ہے، یہ ان کو سمجھانے کا ہے، بتدریج تباہی کی طرف جانے کا ہے۔ یہ جو مہلت کا وقفہ کہلاتا ہے لیکن جب وہ آخری لمحہ آ جاتا ہے تو پھر تو کہیں بھی بچاؤ کی صورت نہیں ہوتی، وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ میں وہ ہندی دوہا وہاں پڑھا کرتا ہوں، بات تو ان کے اپنے تصور کی ہے لیکن بات بڑی عمدہ ہے کہ

دکھ میں تو ہر کو بھجیں اور سکھ میں بھجیں نہ کو
جو سکھ میں ہر کو بھجیں تو دکھ کاہے کو ہو

اس نے اچھی بات کہی ہے۔ اس دوران میں اگر وہ راہِ راست پہ آ جاتے تو تباہی نہیں آتی۔ جب تباہی آتی ہے تو پھر عام طور پہ انسان کی

صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس وقت دہائی مچاتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ اس وقت دہائی کوئی کام نہیں دیتی۔ 193ص

رسولوں کے متعلق مخاطب قوموں کا اعتراض

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ رسولوں کے متعلق مخاطب قومیں اعتراض کرتی ہیں کہ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ((38:4 تعجب ان کو کس بات پہ آتا ہے؟ کہ صاحب! یہ کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں' یہ ہمارے ہی جیسا انسان ہے' ہم میں سے ہی خدا کا ایک رسول ہے۔ذہن انسانی کی وہی بات ہے کہ وہ اسے کوئی فوق البشر دیکھنا چاہتے تھے۔قرآن میں یہ ہے کہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس رسول کو دیکھیے' یہ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے' دکانوں سے سودا سلف لیتا پھرتا ہے' اس کے بیوی بچے بھی ہیں۔ان کے تصور میں یہ تھا کہ اس کو کوئی فوق البشر ہونا چاہیے تھا' یہ نہیں ہے کہ یہ کیا کہتا ہے' اس کو سنو۔وہ کہتے ہیں کہ دیکھو تو سہی کہ اس کی ہیئت کذائی کیسی ہے' وہ معجزے کس قسم کے دیتا ہے' یہ ہم میں سے ہی ہے' ہمارے ہی جیسا ہے۔اور وہ رسول بار بار ان کے جواب میں کہتے تھے کہ ہاں اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ((18:110 ٹھیک ہے کہ میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔اور دوسری جگہ یہ واضح کیا ہے کہ اگر تمہاری جگہ ملائکہ بستے تو پھر ملائکہ میں سے کوئی رسول آتا۔رسول انہی میں سے آتا ہی اسی قسم کا ہے جس قسم کی وہ قوم ہوتی ہے تاکہ انہیں بتادے کہ یہ ہے پیغام' یہ ممکن العمل ہے' دیکھو! میں اس پر عمل کر رہا ہوں' یہ اس کا نتیجہ نکلتا ہے' جو انسان بھی اس پر عمل کرے گا نتیجہ وہی نکل آئے گا۔اس کا تو مثلِ بشر ہونا نہایت ضروری ہے۔اور وہ یہی اعتراض کرتے تھے اور اس پہ تعجب بھی کرتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کا وہ اسوۂ حسنہ جو نوع انسانی کے لیے بالیدگی ہے وہ شاعری میں مبالغہ آمیزی کی نذر ہو گیا

عزیزانِ من! پھر اپنی طرف آجایئے۔نبی اکرم ﷺ کا تذکار جلیلہ ہمارے لیے وجۂ روح اور قلب کی بالیدگی کا باعث ہے۔ آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی یاد ہمارے سامنے سیرت و کردار کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے۔حضور ﷺ کے دور کی (632ء تک کی) تاریخ' اقوام عالم کی عروج و زوال کے قوانین کی مشہود شہادت پیش کرتی ہے۔حضور ﷺ اور حضور ﷺ کے دور کی یہ چیزیں ہیں جو ہمارے سامنے آنی چاہیے تھیں۔اس سے تو وہ ایک بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ سامنے آتا ہے' لڑائیوں میں شکست بھی ہوتی ہے' فتح بھی ہوتی ہے' زخم بھی لگتے ہیں' بیمار بھی ہوتے ہیں' فوت بھی ہو جاتے ہیں' بھوک بھی لگتی ہے' پانی نہیں بھی ملتا' بیاسی بیاسی غزوے کرنے پڑتے ہیں' اتنی لڑائیاں لڑنا پڑتی ہیں۔اس رسول ﷺ کا وہ یہ کچھ ہے۔

ایک تو ہمارے ہاں کی جو شاعری ہے' اس میں تو ہوتا ہی مبالغہ ہے۔اس شاعری کے اندر آپ اُنہیں ان چیزوں میں دیکھیے جنہیں نعت کہتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ کی شان میں نعت نہایت ضروری ہے' یہ حضور ﷺ کے کارناموں کی یادداشت ہیں' وہ سرگزشتیں ہیں جو

حضور ﷺ انقلاب لائے تھے لیکن ہماری نعتیں کیا ہوتی ہیں؟ یہ کہ ان میں زلف عنبری کی باتیں ہیں، چشم سرگیں کی باتیں ہیں، قدرعنا کی 193 ص باتیں ہیں، وہ خرام حسنہ کی باتیں ہیں۔ آپ یہ ساری نعتیں دیکھیے کہ ان کے اندر یہی سب چیزیں بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ یا پھر جب یہ شاعر عجائبات کی طرف آئے ہیں تو آپ ﷺ کے ہاں کے عرش معلیٰ پہ جانے والے معجزات گنائے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی بات بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کی سامنے نہیں لائی جاتی۔ ہمارے ہاں بھی وہی تصور پیدا کیا ہے جو ان کے ذہن میں تھا کہ رسول کو عام انسانوں جیسا انسان نہیں ہونا چاہیے۔

حضور ﷺ کے متعلق فوق البشر کی صورت میں اٹھنے والا اعتراض اور کفر کا فتویٰ

ہم بھی رسول ﷺ کا ایک تصور قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں جو بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کا تصور نہیں ہوتا، فوق البشر کا تصور ہوتا ہے۔ حضور ﷺ اگر فوق البشر تھے، ان کو وہ تائیدیں اور قوتیں حاصل تھیں تو قرآن نے جو کہا ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:2)) رسول کی زندگی تمہارے لیے ماڈل ہے۔ تو اس کی زندگی ہمارے لیے ماڈل کیسے بن سکتی ہے۔ ماڈل تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ہو۔ ایک بشر کی حیثیت سے آپ ﷺ نے جو کچھ کر دکھایا، وہ انہی قرآنی قوانین کی رو سے بشر کر سکے گا، وہ اسی صورت میں مومنوں کے لیے اسوۂ حسنہ بن سکتا ہے لیکن ہم نے تو آپ دیکھ لیجیے گا جو تصور پیدا کیا ہوا ہے، وہ فوق البشر کا ہے۔ اگر اس تصور سے کوئی بات ذرا کم کہہ دی جائے، مثلاً کہہ دیا جائے کہ وہ بشر تھے تو کفر کے فتوے لگتے ہیں، عوام کو بھڑکا دیا جاتا ہے، اسے (معاذ اللہ) حضور ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی گنا جاتا ہے۔ آج بحثیں ہی یہ چل رہی ہیں کہ حضور ﷺ نور تھے یا بشر تھے۔ اس پر کتابوں کے اتنے اتنے انبار لگے ہوئے ہیں حالانکہ قرآن بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ، بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کہہ رہا ہے، مگر یہ کہتے ہیں کہ کہتے جاؤ! ہمیں بھلا اس سے کیا! قرآن کہتا ہے کہ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (38:4)۔ یہ لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ انہیں زندگی کی غلط روش سے آگاہ کرنے والا تباہیوں سے ڈرانے والا، انہی میں سے انہی جیسا ایک شخص کیسے ہو گیا؟ نہیں صاحب! ہمارے ہی جیسا، ہم میں سے ہی، انسان ہے اس لیے اس کا یہ دعویٰ کہ میں خدا کا رسول ہوں، جھوٹ ہے۔ اس فوق البشر ہونے کے تصور کی بنا پر ہی وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے، خدا کا رسول ہمارے جیسا انسان نہیں ہونا چاہیے۔

خدا تعالیٰ کی حکمرانی کے برعکس ہمارے ہاں بت سازی کی کیفیت

اگلی بات سنو! یہ اقبالؒ (1938-1877ء) کیا کہتا ہے! ہندو بتیس کروڑ دیوتا مانتے ہیں، عیسائی کم از کم تین تو مانتے ہیں، اور دو تو مجوسی بھی مانتے تھے اور ہمارا تو پوچھو ہی نہیں کہ کتنے ہیں:

رہ مدہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را

93 ص

شیخ حرم! یہ اقبال کعبے میں آ رہا ہے‘ اس کو گھسنے نہ دینا اس لیے کہ یہ بڑا سازشی ہے:

ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

آ تا تو احرام پہن کر ہے لیکن پتہ نہیں کس آستین کے اندر ہر وقت یہ ایک نیا خدا رکھتا ہے۔

می تراشد فکر ما ہردم خداوندے دگر

کتنے خدا ہیں جن کو ہم اپنے ذہنوں کے اندر لیے ہوئے کعبے کا طواف کر رہے ہوتے ہیں اور کتنے ہیں جو خود خدا بنے ہوئے اس کعبے کا طواف کر رہے ہوتے ہیں! ہماری کیفیت یہ ہے کہ

رست از یک بند تا افتاد در بند دگر

(اقبالؒ: پیام مشرق)

کسی طرح خدا خدا کر کے ایک خدا سے چھٹکارا ملتا ہے تو ایک اور خدا ہمارے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ ان معترضین کو بھی یہ اعتراض ہے کہ یہ اتنے خدا ہیں‘ یہ انہیں مانتے ہیں اور یہ کہتا ہے کہ اَجَعَلَ الْاٰلِھَۃَ اِلٰـھًا وَّاحِدًا (38:5) نہیں‘ ان کی بجائے صرف ایک خدا ہے۔ اور یہ ازراہِ تمسخر کہتے ہیں کہ ذرا اس شخص کی طرف دیکھنا، یہ کہتا ہے کہ صرف ایک خدا ہے۔ ارے وہ صرف ایک خدا اتنا کام کیسے کرے گا‘ ان کے لیے ہر شعبہ کا خدا الگ ہونا چاہیے‘ ہر ڈیپارٹمنٹ کا الگ ہونا چاہیے‘ امپورٹ کا لائسنس لینا ہے آپ کو اور خدا چاہیے‘ بندوق کا چاہیے تو آپ کو‘ اور خدا چاہیے‘ ہر مقصد کے لیے الگ خدا چاہیے۔ بیماری کے لیے ان کے ہاں الگ تھا‘ دولت کے لیے ان کے ہاں لکشمی دیوی تھی‘ اولاد کے لیے اور تھا۔ کہتا ہے کہ یہ شخص توحید میں آ جاتا ہے کہ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ صرف ایک خدا ہے۔ اس کے سوا کسی کو کوئی اقتدار اور اختیار حاصل نہیں۔ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (38:5) ارے یہ بھی جو بات ہے یہ بڑی تعجب انگیز ہے‘ اچنبھے کی بات ہے‘ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارے ہاں تو اس کام کے لیے فلاں حضرت صاحب ہیں‘ اُس کام کے لیے فلاں مزار شریف ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ مختلف مزاروں کی مختلف کرامات ہوتی ہیں‘ یہ جو ماتا اور چیچک ہے اس کے لیے وہ الگ مزار شریف ہوتا ہے اور بخار کے لیے الگ۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ عجیب قسم کا شخص ہے جو کہتا ہے کہ قوت کا سرچشمہ ایک خدا ہے اور یہ کہ یہ ہمارے سب معبود ختم ہو جائیں گے اور اس کا پیش کردہ ایک الٰہ باقی رہ جائے گا اور پھر وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْھُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِھَتِکُمْ (38:6) تم نے یہ باتیں کیں‘ ان کے یہ بڑے بڑے رؤسا‘ اور سردار‘ بیٹھے ہوئے تھے‘ انہوں نے یہ سارا کچھ سنا‘ جواب تو کوئی بن نہیں پڑتا تھا‘ اٹھ کر چل دیئے اور اپنے لوگوں سے‘ اپنے متبعین سے‘ کہا کہ اپنے اپنے خداؤں کی پرستش پر ثابت قدمی سے جمے رہو‘ اس کی کوئی بات نہ سنو۔ ایسا لگتا ہے کہ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ (38:6) یہ شخص تو کوئی بہت بڑی سازش‘ کوئی بہت بڑا پلان بنا کر آ رہا ہے‘ خطرہ نظر آتا ہے‘ یہ ہر خدا سے انحراف سکھا رہا ہے‘ سرکشی سکھا رہا

ہے۔نظر آتا ہے کہ اس نے تہیہ کر رکھا ہے کہ یہ اپنی بات منوا کر رہے گا اس میں اس کی کوئی بہت بڑی غرض مضمر ہے۔ صٓ 193

عزیزانِ من! وہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارونؑ فرعون کی طرف گئے تھے تو اس نے بھی ان سے یہی کہا تھا کہ یہ جو باتیں کہہ رہے ہیں' انہیں خدا کی باتیں نہ سمجھو' یہ تو تمہارا تختہ الٹ کر نیا نظام قائم کرنے کی فکر کر رہے ہیں۔ یہ خداوندانِ عالم کیوں خدائے واحد کی طرف آنے دیں! ان کا تو نام ہی خداوندان ہے' اور وہ بھی خداوندان نعمت ہے۔ اسی لیے اس نے جل بھن کر کہا تھا کہ ''تم خداوند ہی کہلاؤ' خدا اور سہی'': اِنَّ ھٰذَا لَشَیۡءٌ یُّرَادُ ((38:6 یہ بہت بڑی سازش ہے' بہت بڑا پلان ہے جو یہ لے کر آیا ہے اور مَا سَمِعۡنَا بِھٰذَا فِی الۡمِلَّۃِ الۡاٰخِرَۃِ اِنۡ ھٰذَاۤ اِلَّا اخۡتِلَاقٌ ((38:7 جو باتیں یہ پیش کرتا ہے' ہم نے انہیں اپنے اسلاف کے مسلک میں کہیں دیکھا سنا نہیں۔ یہ ایک بالکل نیا دین ہے جسے اس نے خود ہی گھڑ لیا ہے اور جو کچھ یہ کہتا ہے وہ بالکل بناوٹ ہے' جھوٹ ہے۔ ارے بھئی! کیوں جھوٹ ہے؟ کیونکہ ہمارے اسلاف میں سے کسی نے بھی یہ بات نہیں کہی۔ چل بھئی! یہ آئے اسلاف! یہ اسلاف کیا ہوتے ہیں؟ یہ کہنے والے جو آج موجود ہیں' یہ نہیں کہتے کہ ہم ایسا کہتے ہیں۔ یہ اسلاف وہ ہے جو کل مر گیا ہے وہ اسلاف میں داخل ہو گیا۔ یہ ان کا حوالہ دیتے ہیں۔ جو ان میں سے آج مر جائے گا' یہ اسلاف میں داخل ہو جائے گا۔ یعنی جیتے جی تو یہ قابلِ سند نہیں تھا' جونہی مرا' اسلاف کی فہرست میں داخل ہو گیا۔ کہا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے یہ افترا ہے' بناوٹ ہے' اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے اسلاف میں سے کسی نے یہ بات نہیں کی۔

اسلاف پرستی کے دبیز پردے عقل انسانی کے چراغ کی روشنی کو اپنے دامن سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتے

عزیزانِ من! آج بھی یہی دلیل دی جاتی ہے۔ آپ ان سے قرآن کی کوئی بات کہیے' کہتے ہیں کہ کیا سلف صالحین میں سے کسی نے اپنے ہاں یہ بات کہی ہے' کسی تفسیر میں یہ آئی ہے' کسی حضرت صاحب کے ہاں سے یہ چیز ملی ہے؟ اگر کہو کہ نہیں تو کہتے ہیں کہ لو بھئی! وہ جو اتنے اتنے عظیم بزرگ تھے وہ تو گویا قرآن سمجھتے ہی نہیں تھے' یہ ایک نئے آ گئے صاحب! قرآن بتانے والے۔ انہیں تو بس اسلاف کے طریقے پر چلنا ہے۔ برادرانِ عزیز! وقت تھوڑا ہے ورنہ میں آپ کو اسلاف کے طریقے کی مثالیں دیتا کہ یہ اس کی کیا کیا چیزیں بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اِنۡ ھٰذَاۤ اِلَّا اخۡتِلَاقٌ((38:7۔ کیا بات ہے قرآن کی! کہتے ہیں کہ یہ ہماری دکھتی ہوئی ایک ایک رگ پکڑتا جاتا ہے' یہ آج کی ہماری باتیں کر رہا ہے' آج کی ہماری دلیل و سند یہ ہے کہ اسلاف میں سے کسی نے یہ کچھ نہیں کہا اور نہ ہم سے سنا ہے اور یہی آج دلیل دی جاتی ہے۔ یہ تو ایک نیا دین ہے جسے اس نے خود ہی گھڑ لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ءَاُنۡزِلَ عَلَیۡہِ الذِّکۡرُ مِنۡۢ بَیۡنِنَا بَلۡ ھُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّنۡ ذِکۡرِیۡ بَلۡ لَّمَّا یَذُوۡقُوۡا عَذَابِ ((38:8۔ بھلا دیکھو تو سہی! یہ ہمارے ہی جیسا تھا' چالیس سال ہمارے اندر گزارے' اسی طرح سے

ہمارے اندر رہتا سہتا کھاتا پیتا تھا' یار باش تھا' سب کچھ جیسے کہتے ہیں ایک دوسرے سے کرتا رہا۔ یہ حضور ﷺ کے کردار کا اعتراف تھا لیکن تھا تو ہم میں سے ہی ایک' پتہ نہیں یہ راتوں رات کیا بات ہوگئی کہ یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔ جیسے یہ یار باش کو کہتے ہیں کہ ''یار کی ہوگیا اے تینوں اج❶''۔ کیا باتیں ہیں! یہ ہم میں سے ہے' اچھا بھلا تھا' آج کہہ رہا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ یہ من بیننا کہہ کر قرآن نے عجیب بات کہی ہے' یہ بات دوسری جگہ بھی کہی ہوئی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے لیے قرآن حکیم کی طرف سے صبر و استقلال کی نوید

کہا ہے کہ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِنْ ذِكْرِيْ (38:8) بھلا دیکھو تو سہی! اس شخص میں وہ کون سی خصوصیت تھی جس کی بنا پر' ہم میں سے اُسی کو وحی کے لیے چُن لیا گیا اور کسی کو اس کے قابل سمجھا ہی نہیں گیا۔ ان کے یہ کچھ کہنے کا جذبہ مجرکہ بھی وہی جھوٹی عزت کا احساس ہے۔ اس لیے حضور ﷺ سے کہا گیا ہے کہ ان کی ان باتوں سے افسردہ خاطر نہ ہوجائیے' دل پہ ملال نہ لائیے۔ اور عظیم چیز ہے عزیزانِ من! جو قرآن نے کہی ہے' اور انہوں میں سے بھی کسی نے اس کی تردید نہیں کی۔ یہ بات یہاں بھی کہی ہے' دوسری جگہ بھی کہی ہے' جو واضح تر الفاظ میں ہے۔ میں یہاں وہ بات لاتا ہوں۔ کہا ہے کہ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ (6:33) جو باتیں یہ کرتے ہیں' اے رسول! ہمیں اس کا احساس ہے کہ تمہیں اس سے بڑا ملال اور حزن گزرتا ہے' افسردگی ہوتی ہے۔ کہنے لگے کہ بالکل نہیں! افسردہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ شہادت کی عظیم چیز ہے۔ قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (6:33) اے رسول! یہ تجھے جھوٹا نہیں کہتے' انہوں نے تمہارے دعوئے نبوت سے پہلے کی زندگی میں بھی کبھی جھوٹا نہیں کہا تھا' آج بھی یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے' یہ تو ہمارے قوانین کو جھٹلاتے ہیں۔ کیا بات ہے! قرآنِ کریم نے دونوں چیزوں میں فرق کیا ہے۔ یہی چیز تھی کہ حضور ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ آپ ﷺ کا دعوئے رسالت کا ثبوت کیا ہے کہ آپ ﷺ سچے ہیں' تو آپ نے فرمایا تھا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10:16) میں کوئی نیا نہیں ہوں' مریخ سے نہیں ٹپک پڑا' کہیں باہر سے نہیں آیا' تمہارے اندر میں نے اس سے پہلے اپنی چالیس سال کی زندگی گزاری ہے' تم چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ یہ جو چالیس سالہ زندگی ہے ایک سچے کی زندگی ہے یا جھوٹے کی زندگی ہے۔ جو تمہارا جواب ہوا وہ میرا جواب ہے۔

اہل عرب کیریکٹر کے لحاظ سے تو بے مثال تھے

یہ عرب اتنی شدید مخالفت کرنے والے تھے لیکن وہ مخالفین بھی' عزیزانِ من! ہمارے جیسے ظنی الطبع نہیں تھے۔ عرب کا کیریکٹر بڑا اونچا

---

❶ اے دوست! تجھے یہ آج کیا ہوگیا!

تھا۔ کسی ایک نے بھی نہیں کہا کہ ہاں، تم جھوٹے تھے، تم نے جھوٹ بولا ہے۔ یہی نہیں کہ سامنے نہیں کہا بلکہ ہرقل کے دربار میں جا کر بھی جب، ابوسفیان حضور ﷺ کی جماعت کے خلاف، اس کی مدد لینے کے لیے گیا تھا، اُس نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی اس سے پوچھا تھا کہ وہ جو مدعی ہے وہ تم میں سے ہی ہے یا باہر سے آیا ہے؟ اُنہوں نے کہا تھا کہ ہم میں سے ہی ہے۔ پھر اس نے پوچھا تھا کہ کیا اس کی تمہارے اندر زندگی گزری ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں۔ پھر پوچھا کہ وہ زندگی کیسی تھی؟ یہ تھا عرب کا کردار، اتنا بڑا دشمن مدد مانگنے کے لیے گیا ہے، ابوسفیان کہنے لگا کہ جی! وہ زندگی تو اس شخص کی بڑی پاکباز تھی اس میں تو کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جس پہ ہم انگشت رکھ سکیں۔ ہرقل نے کہا تھا کہ نفسیات انسانی یہ ہے کہ جس کی چالیس سالہ زندگی اس قسم کی ہو، راتوں رات وہ شخص فریب کار نہیں ہوسکتا۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ حضور ﷺ سے کہا کہ افسردہ خاطر نہ ہوئیے، یہ تمہیں نہیں جھوٹا کہہ رہے، تمہیں تو یہ اس وقت بھی سچا کہتے تھے، آج بھی سچا کہتے ہیں، یہ ہمارے قانون کی تکذیب کر رہے ہیں کہ اس غلط روش پہ چلو گے تو تباہ ہو جاؤ گے، یہ اس کے متعلق ہے۔ بَلْ هُمْ فِىْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِىْ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ (38:8) یہ ہمارے اس ضابطۂ قوانین کے متعلق شک وشبہ میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ اس لیے کہ جس آنے والی تباہی کے متعلق انہیں آگاہ کیا گیا ہے۔ وہ ابھی تک ان کے سامنے نہیں آئی۔ اس کا جو ثبوت ہے وہ کل ہی ان کو مل جائے گا جب اس کی خلاف ورزی کا تباہ کن نتیجہ ان کے سامنے آئے گا، آپ ﷺ کیوں اس طرح ملحوظ خاطر ہو رہے ہیں۔ سبحان اللہ!

سورۃ صٓ کی آیت 8 تک ہم آ گئے، عزیزانِ من! نویں آیت سے آئندہ لیں گے۔ آگے انبیائے کرامؑ کے واقعات آ رہے تھے آئندہ کی آیات میں حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ اور حضرت ایوبؑ کے واقعات آئیں گے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ ان میں ہماری افسانہ طرازیوں نے کیا کچھ بنا دیا ہے۔



رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ

❀...❀...❀

217صٓ

دوسرا باب: سورۃ صٓ (آیات 9 تا 26)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَمۡ عِنۡدَہُمۡ خَزَآئِنُ رَحۡمَۃِ رَبِّکَ الۡعَزِیۡزِ الۡوَہَّابِ ۚ﴿۹﴾ اَمۡ لَہُمۡ مُّلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا
بَیۡنَہُمَا ۟ فَلۡیَرۡتَقُوۡا فِی الۡاَسۡبَابِ ﴿۱۰﴾ جُنۡدٌ مَّا ہُنَالِکَ مَہۡزُوۡمٌ مِّنَ الۡاَحۡزَابِ ﴿۱۱﴾ کَذَّبَتۡ قَبۡلَہُمۡ
قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّ عَادٌ وَّ فِرۡعَوۡنُ ذُو الۡاَوۡتَادِ ﴿ۙ۱۲﴾ وَ ثَمُوۡدُ وَ قَوۡمُ لُوۡطٍ وَّ اَصۡحٰبُ لۡـَٔیۡکَۃِ ؕ اُولٰٓئِکَ
الۡاَحۡزَابُ ﴿۱۳﴾ اِنۡ کُلٌّ اِلَّا کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿ؑ۱۴﴾ وَ مَا یَنۡظُرُ ہٰۤؤُلَآءِ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً مَّا
لَہَا مِنۡ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾ وَ قَالُوۡا رَبَّنَا عَجِّلۡ لَّنَا قِطَّنَا قَبۡلَ یَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴿۱۶﴾ اِصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ
وَ اذۡکُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَیۡدِ ۚ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾ اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِیِّ
وَ الۡاِشۡرَاقِ ﴿ۙ۱۸﴾ وَ الطَّیۡرَ مَحۡشُوۡرَۃً ؕ کُلٌّ لَّہٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ وَ شَدَدۡنَا مُلۡکَہٗ وَ اٰتَیۡنٰہُ الۡحِکۡمَۃَ وَ فَصۡلَ
الۡخِطَابِ ﴿۲۰﴾ وَ ہَلۡ اَتٰىکَ نَبَؤُا الۡخَصۡمِ ۘ اِذۡ تَسَوَّرُوا الۡمِحۡرَابَ ﴿ۙ۲۱﴾ اِذۡ دَخَلُوۡا عَلٰی دَاوٗدَ فَفَزِعَ
مِنۡہُمۡ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ ۚ خَصۡمٰنِ بَغٰی بَعۡضُنَا عَلٰی بَعۡضٍ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَنَا بِالۡحَقِّ وَ لَا تُشۡطِطۡ وَ اہۡدِنَاۤ
اِلٰی سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾ اِنَّ ہٰذَاۤ اَخِیۡ ۟ لَہٗ تِسۡعٌ وَّ تِسۡعُوۡنَ نَعۡجَۃً وَّلِیَ نَعۡجَۃٌ وَّاحِدَۃٌ ۟ فَقَالَ اَکۡفِلۡنِیۡہَا
وَ عَزَّنِیۡ فِی الۡخِطَابِ ﴿۲۳﴾ قَالَ لَقَدۡ ظَلَمَکَ بِسُؤَالِ نَعۡجَتِکَ اِلٰی نِعَاجِہٖ ؕ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡخُلَطَآءِ
لَیَبۡغِیۡ بَعۡضُہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِیۡلٌ مَّا ہُمۡ ؕ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا
فَتَنّٰہُ فَاسۡتَغۡفَرَ رَبَّہٗ وَ خَرَّ رَاکِعًا وَّ اَنَابَ ﴿ٛ۲۴﴾ فَغَفَرۡنَا لَہٗ ذٰلِکَ ؕ وَ اِنَّ لَہٗ عِنۡدَنَا لَزُلۡفٰی وَ حُسۡنَ
مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾ یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰکَ خَلِیۡفَۃً فِی الۡاَرۡضِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ بِالۡحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الۡہَوٰی
فَیُضِلَّکَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَضِلُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌۢ بِمَا نَسُوۡا
یَوۡمَ الۡحِسَابِ ﴿ؒ۲۶﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1980ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ صٓ کی آیت 9 سے ہو رہا ہے:(38:9)۔

217ص

خدا تعالیٰ کی طرف سے انسانی نشوونما کے لیے مفت ملنے والا رزق رب کریم کی رحمت کہلاتا ہے

سابقہ آیات میں مخالفین کی مخاصمت اور تزاحم کا ذکر ہو رہا تھا۔ اسی سلسلے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ کس بنا پہ اتنی زیادہ مخالفت کر رہے ہیں' کس زعم باطل میں یہ مبتلا ہیں' اپنی قوت کے متعلق ان کے کس قدر غلط اندازے ہیں' پوچھیے کہ ان کے پاس ہے کیا؟ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ (38:9) کیا خدا کے رزق کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں؟ وہ رزق کہ جس پر پیدا ہونے کے بعد' مختلف افراد' گروہ یا قبیلے یا قومیں قبضہ کر لیتی ہیں۔ وہ رزق جو خدا کے خزانے میں ہے وہ تو زمین کے اندر ہے اور سارا رزق وہاں سے ہی ملتا ہے' اس پر تو کسی کا بھی قبضہ نہیں ہوتا۔ قرآن نے اس کو "رحمت رب" کہا ہے کہ وہاں سے یہ سامانِ نشوونما مفت ملتا ہے اور "ترحمنا" طریق پہ ملتا ہے۔

خدا کی صفت عزیز اور وہاب کا قرآنی مفہوم مکمل طور پر نظامِ ربوبیت کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے

اور پھر اس آیت کے آخر میں خدا نے دو صفات بیان کی ہیں: عزیز اور وہاب۔ کیا بات ہے! آدمی جھوم جاتا ہے جب یہ دیکھتا ہے۔ اتنا بڑا غلبہ اور اقتدار ہے کہ وہ اس کے لیے "عزیز" ہے لیکن اس کا غلبہ اس لیے ہے کہ وہ "وہاب" ہے۔ انسانوں کو سامان رزق مفت دیتا ہے۔ تو گویا جو اقتدار اور غلبہ ہے' وہ اس لیے نہیں ہے کہ رزق کو انسانوں سے روک لے' بلکہ اگر خدا کی صفت ہے اور جو معاشرہ اس کے نام پہ قائم ہوگا' وہ عزیز تو ضرور ہوگا کیونکہ اگر وہ قوت اور اقتدار نہ ہو تو وہ اپنے قبضے میں' تحویل میں' اپنے انتظام میں' ان چیزوں کو لے نہیں سکتا لیکن اس کی یہ غرض' اس کی یہ غایت ومنتہا کیا ہے؟ اس غلبے کا' اس اقتدار کا منتہا کیا ہے؟ یہ ہے کہ اس کے اندر وہابیت ہو' وہبی طور پر' بلا مزد ومعاوضہ یہ لوگوں کی' انسانوں کی' نشوونما کے لیے دیا جائے۔ کیا بات ہے عزیز و وہاب کہنے کی!۔ یہاں کہا ہے کہ کیا سامانِ زیست پر' ان سب پر تمہارا قبضہ واقتدار ہو چکا ہے؟ اور آگے کہا ہے کہ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَلْيَرْتَقُوْا فِى الْاَسْبَابِ (38:10) کیا پوری کائنات کا اقتدار' اس کا جو نظم ونسق ہے' وہ ان کے ہاتھ میں ہے؟ اگر ایسی صورت ہے تو ٹھیک ہے' ان سے کہیے کہ یہ ذرائع اور اسباب تلاش کرتے چلے جائیں' ڈھونڈتے چلے جائیں' حاصل کرتے چلے جائیں' چڑھتے چلے جائیں' بڑھتے چلے جائیں' یہ کہاں تک جائیں گے؟ یہ Infinite (لامنتہا) تو نہیں ہیں' انسان لامحدود تو نہیں ہے' یہ تو زمان ومکان میں گھرا ہوا ہے۔ اس کی تو ایک حد ہوتی ہے' خدا کے مقابلے میں یہ انسان کہاں تک جا سکتے ہیں کہ جو زمان اور مکان کی حدود کی نسبتوں تک سے ماورا ہے۔ تو گویا بتا یہ رہے ہیں کہ ایک طرف خدائی نظام ہے' دوسری طرف اس خدائی نظام کے علی الرغم انسانوں کا خود قائم کردہ' جو اس کے مقابل میں لاتے ہیں' وہ نظام ہے۔ قرآن تو ان دونوں نظاموں (Systems) کا تقابل کرتا چلا جاتا ہے۔ آگے اس کے بعد کہا کہ بالآخر یہ ہیں کیا جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ (38:11)۔ یہ اتنے بڑے بنے پھرتے ہیں' اس کا مآل وانجام کیا ہے؟ یہ کہ یہ ایک شکست خوردہ گروہ

ہے۔ یہ پہلے سے ہی کہا جا رہا ہے۔ یہ اس زمانے کے قریش کے، مخالفین کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا کہ وہ آخرالامر ان کے مقابلے میں ص217
ایک شکستہ خوردہ، ہزیمت خوردہ گروہ اور قبیلہ ہو سکے گا۔ تو کہا کہ یہ جو کچھ بھی اپنے زعم میں سمجھتے ہیں، سمجھتے رہیں، اس کا مآل اور انجام، آخر الامر، تو یہ ہوگا کہ یہ ایک مهزوم یعنی شکست خوردہ جماعت نہیں بلکہ جندلشکر ہوگا، یہ اتنا بڑا لشکر لا رہے ہیں جو آخرالامر مهزوم ہوگا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو ہم کہہ رہے ہیں کہ یہ انہی کے ساتھ ہوگا۔

تاریخ اس چیز کی گواہ ہے کہ کامرانی ہمیشہ حق کی ہی ہوتی ہے

کہا ہے کہ **كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّعَادٌ وَّفِرۡعَوۡنُ ذُو الۡاَوۡتَادِ o وَثَمُوۡدُ وَقَوۡمُ لُوۡطٍ وَّاَصۡحٰبُ الۡاَيۡكَةِ** ((38:12-13۔ یہاں انبیائے کرامؑ اور ان کے مخالفین کی پوری تاریخ بتا دی کہ یہ کچھ تو ہوتا آیا ہے اور دیکھو تو سہی، ہر نبی کی مخالفت میں یہ اٹھے اور ان کا انجام تم دیکھ لو۔ اور پچھلی آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ انجام دیکھنا ہے تو ان کی، یہ جو اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات ہیں، ان کے پتھروں پہ، ان کی اینٹوں پہ، ان کی لکھی ہوئی داستانیں یا نوحے ہیں، وہ جا کر تم پڑھو، ان علاقوں سے ان راستوں سے صبح شام گزرتے ہو۔ کہا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، انبیائے کرامؑ کے ساتھ یہ ہوتا رہا ہے اور اس کے بعد جنہوں نے مخالفت کی ان کا انجام دیکھ لیجیے۔ **اُولٰٓئِكَ الۡاَحۡزَابُ** ((38:13 وہ بھی اسی قسم کے مخالفت کرنے والے گروہ تھے، قومیں تھیں، ان کے مقابلے میں اٹھی تھیں۔ ان کا کیا انجام ہوا وہ تمہارے سامنے ہے۔

لفظ تکذیب کا اور عقاب کا مفہوم

کہا ہے کہ **اِنۡ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ** ((38:14 ان تمام نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی۔ یہ تکذیب وغیرہ کی اصطلاحیں چونکہ بار بار آ رہی ہیں، بار بار ان کے مفہوم کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تکذیب جو قرآن نے کہا تھا کہ وہ رسول کو جھوٹا نہیں کہتے تھے، رسول تو امین تھا، صدیق تھا، صادق القول تھا، مخالفین دشمن بھی اس کو مانتے تھے، اعتراف کرتے تھے کہ یہ سچا ہے۔ اور قرآنِ کریم نے یہ کہا کہ یہ اگر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو آپ اس سے افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہیں، وہ آپ کے متعلق نہیں کہتے کہ آپ جھوٹے ہیں (معاذ اللہ)، آپ کو تو یہ سچا سمجھتے ہیں، کہہ یہ رہے ہیں کہ خدا جو یہ کہتا ہے کہ اگر تم نے اپنا یہ طریق نہ چھوڑا تو تباہ ہو جاؤ گے، یہ غلط ہے، ہمیں تباہی نہیں آسکتی ہم نے پورا انتظام کر رکھا ہے۔ یہ ہے تکذیب جسے قرآن نے کہا ہے۔ تو یہ ان لوگوں نے تکذیب کی، اس سے پہلے ان رسولوں کی جو آتے رہے، اس کا انجام آپ کے سامنے ہے، اسی تاریخ کے اسی سلسلۂ دراز کی یہ بھی ایک کڑی ہے جو آج ہو رہا ہے اور یہی ہمیشہ ہوگا۔ انہوں نے تکذیب کی **فَحَقَّ عِقَابِ** ((38:14۔ کیا بات ہے اس عقاب کی! میں نے کہا ہے کہ انسان کا عمل پہلے

ص217 سرزد ہوتا ہے اس کا نتیجہ اس کے پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے اسی لیے کبھی اس کو ذنب کہا ہے جیسے حیوان کے پیچھے دم چمٹی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ جہاں جائے اس کے پیچھے لگی ہوئی ہوتی ہے یہ بڑی عجیب مثال ہے۔ عربی زبان عجیب وغریب زبان تھی جہاں جائے وہ چمٹی ہوئی پیچھے لگی ہوئی ہے۔ تو یہی چیز ہے جس کو عقاب بھی کہا جاتا ہے: پیچھے لگا ہوا ہے۔ ایک چیز جو ہے وہ اس عمل کا نتیجہ ہے جو ان کے پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے۔ پہلے وہ غیر محسوس ہوتا ہے پھر وہ مشہور ہو جاتا ہے۔

یہ فحق آپ دیکھیے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ یہ جو حق ہے یہ ہمارے ہاں ایک غیر محسوس نظریہ ہے ایک عقیدہ ہے۔ جب یہ محسوس شکل میں حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آتا ہے اس وقت اسے حق کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں حقیقت کے لیے تو کچھ ایسا تصور ہے کہ وہ کچھ غیر محسوس شکل میں ایسی صورت ہے جسے ہم Reality کہتے ہیں جسے ہم The Real کہتے ہیں۔ حق کے متعلق کبھی یہ ذہن میں نہیں آتا۔ ایسا ہوتا ہے کہ یہ محض ایک نظریہ یا عقیدہ ہی ہے۔ یہ اس طرح کا نہیں ہے۔ حق ایک محسوس شکل میں سامنے آتا ہے حقیقت بن کر سامنے آتا ہے یوں کہیے۔ تو انہوں نے کہا یہ ہے کہ وہ جو ان کا انجام تھا وہ ان کے پیچھے لگا ہوا تھا ان کے اعمال کے تباہ کن نتائج ان کے پیچھے لگے ہوئے چلے آرہے تھے پہلے غیر محسوس تھے جب پھر وہ اس طرح سے یہ لشکر مھزوم ہوتے ہیں تو وہ محسوس شکل اختیار کر لیتے ہیں تو اس وقت اسے کہا جائے گا کہ فَحَقَّ عِقَابِ ((38:14 ان کے اعمال کے نتائج حقیقت ثابتہ بن کر تباہی کی شکل میں ان کے سامنے آ گئے اور اب وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ((38:15 یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں کہ ایک آواز ایک چیخ بلند ہو اور اس کے بعد پھر وہ تباہی اس شکل میں آئے جسے فواق کہتے ہیں۔ یہ اصل میں تو جو وقفہ ہے اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ یہ جو ان کے ہاں افق لفظ تھا وہ یوں تھا کہ وہ جانور کا دودھ دوہتے ہیں صبح دوہتے ہیں پھر یا دوپہر کو یا پھر شام کو تو درمیان میں جو یہ وقفہ ہوتا ہے اس کے لیے یہ لفظ آتا تھا۔ لیکن وقفے کے معنوں میں یہ آئے گا کہ جب پھر وہ تباہی آئے گی تو وہ اتنی مسلسل تباہی آتی چلی جائے گی کہ اس میں وقفہ بھی نہیں ہوگا۔ اس وقت تو کیفیت یہ ہے کہ یہ مہلت کا زمانہ ہے اس میں تو وہ محسوس شکل میں بھی ان کے سامنے نہیں ہے لیکن جب وہ ایک حقیقت بن کر سامنے آجائے گی تو وہ تباہی ایسی مسلسل اور متواتر چلی آئے گی کہ اب اس کے اندر پھر وقفہ بھی نہیں ہوگا۔ ان کے ساتھ یہ کیفیت ہونے والی ہے۔

اندازہ لگائیے! اس شکل میں جب کہ یہ مکے سے ہجرت کر کے چھوٹی سی جماعت مدینے میں آئی بے ساز و یراق ہے جسے ہم اب پناہ گزیں کہتے ہیں پناہ گزینوں کی سی کیفیت تھی مختصر سی جماعت چند نفوس پر مشتمل تھی۔ یہ حالت تھی اُدھر مخالفت میں یہ سارا ملک اور پھر قریش جیسے لوگ تھے۔ اُس زمانے میں کہا جا رہا ہے کہ یہ ''تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی'' وہ اس لیے کہ ''جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا'' تو ان سے یہ کہا جا رہا تھا کہ تمہارا انجام ویسا ہی ہوگا جیسا کہ ان اقوام کا ہوا تباہیاں بربادیاں

تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہیں۔ ان کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ جماعت کیا کہہ رہی ہے' ان کے پاس تو سر چھپانے کے لیے مکان 217ص تک نہیں ہے اور کہے یہ جا رہے ہیں۔

ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر!

تو ان کے ذہن میں ایسا کچھ ہوگا۔ اسی لیے وہ کہہ رہے تھے کہ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ(38:16) اور وہ لوگ کہتے تھے کہ تم ظہور نتائج کی جس گھڑی سے ہمیں ڈراتے رہتے ہو ہم سے اس کا انتظار نہیں ہو سکتا اگر تم سچے ہو تو اپنے رب سے کہو کہ وہ ہمارا حساب جلد چکا دے اور ہمارے حصے کا عذاب ابھی سے آئے۔ اس لیے وہ پوچھتے ہیں کہ یہ تباہی کب آئے گی۔

یوم الحساب کا سلسلہ صرف قیامت کے دن کے لیے ہی موقوف نہیں بلکہ زندگی بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے

اب جسے یہ یوم الحساب کہا جاتا ہے' ٹھیک ہے ہمارے ذہنوں میں تو یہی چیز ہے کہ جو حساب ہے' وہ صرف قیامت کے دن جا کر ہوگا یہاں نہیں ہوگا' تو ہمارے ہاں اسے ہی یوم الحساب کہتے ہیں' اسے ہی محاسبہ کہتے ہیں لیکن وہ تو سریع الحساب ہے اتنا لمبا وقفہ' وہ اتنی لمبی مدت جو ہے اس پہ ہمارا ایمان ہے کہ مرنے کے بعد وہ آخرت کا مواخذہ' حساب ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے لیکن یہ وہیں نہیں ہے' جب یہ کہا ہے کہ ان قوموں کا انجام تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے' وہ انجام سامنے نکلا ہے' وہ تو اسی دنیا میں ان کا انجام سامنے آ گیا تھا' تو ان کا یوم الحساب تو وہی تھا جب وہ یہاں اس دنیا میں تباہ ہوئے ہیں' پھر آگے چل کر جو حساب ہوگا وہ اور بات ہے۔ یہاں تو اس Context (ضمن) میں' جس میں یہ بات کہی جا رہی ہے' نظر آ رہا ہے کہ ان سے کہا جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ پھر وہ تباہی آتی کیوں نہیں ہے۔ کہا یہ ہے کہ وہ Calculated (حساب کنندہ) ہے' ایک قانون ہے' اس قانون کی رو سے پانی چولہے پہ چڑھا دیا جاتا ہے' آگ جلا دی جاتی ہے' تو اگر کوئی کہے کہ صاحب! پانی چڑھایا ہے' اس نے ابلنا کیوں نہیں شروع کیا' کھولنا کیوں نہیں شروع کیا تو اب یہ اس ٹھنڈے پانی میں اور اس کے Boil (ابال) ہونے کے درمیان میں جو مہلت کا وقفہ ہے' اسے تو کسی طرح سے آپ کم ہی نہیں کر سکتے' وہ ایک اٹل قانون ہے۔ اور جب وہ وقفہ آ جاتا ہے' پانی اس حرارت پر پہنچتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کو روک نہیں سکتی کہ وہ Boil (اُبلے) نہ ہو۔ اس لیے کہا ہے کہ یہ جب اس صورت میں پانی چڑھایا تھا تو انہوں نے دہائی دینی شروع کی۔ انہوں نے کہا کہ نہیں' اس کے لیے ایک وقفہ ہے' اس کو ایک وقت لگے گا تو وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ کاہے کے لیے وقت لگے گا' ہم سمجھتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے' یہ بات ہے ہی غلط' ہمیں کچھ نہیں ہوگا' یہ خوامخواہ کہا جا رہا ہے۔ یہ جسے ہم اپنے وقت پر کہتے ہیں' یہ ہے یوم الحساب کا ترجمہ۔ یہ اپنے وقت پر ہوگا اور قانون کے مطابق وہ وقت متعین ہوتا ہے کہ یہ تباہی کب آئے گی۔

217ص

اپنے وقت پر نتائج کا شہود طور پر سامنے آ جانا یوم الحساب کہلاتا ہے

اب وہ کہتے تھے کہ عَجِّلْ لَّنَا (38:16) جلدی سے لاؤ' ہم دیکھ لیں۔ وہ جلدی والی جو بات ہے' یہ ٹھیک ہے' خدا تو قادرِ مطلق ہے' وہ تو یہ ٹھیک ہے' وہ اگر چاہے تو آگ پہ چڑھائے بغیر ہی پانی کھولنے لگ جائے لیکن اس نے یہ کہا ہے کہ یہ سنت اللہ ہے' اس میں ہم تبدیلی نہیں کرتے۔ یہ پانی کھولنے کے لیے وقت لے گا' ہم اس کو اس سے کم وقت میں آگ پہ چڑھائے بغیر ہی کھولا سکتے ہیں' جیسا میں نے عرض کیا ہے' لیکن ہم نے یہ قانون بنا رکھا ہے کہ اس کو آگ پہ چڑھانا ہوگا اور پھر وہ اتنی حرارت Accumulate (اکٹھی) کر لے گا تو پھر کھولنا شروع ہوگا۔ وہ جو کہہ رہے ہیں کہ جلدی کیوں نہیں کرتے' کہو کہ وہ اس لیے نہیں کرتے کہ جسے تم حساب کہتے ہو وہ Calculated (حساب شدہ) ہوتا ہے اور وہ اس اپنے وقت پر آتا ہے جو ہم نے مقرر کیا ہوا ہے۔ وہ بھی خدا کا مقرر کردہ ہے۔ اس لیے اُدھر ان سے یہ کہا ہے اور ان سے جو کہا تھا کہ ان اقوام کو دیکھیے جو تباہ و برباد ہوئیں۔ اب ان کا ہجومِ مخالفت بڑھتا چلا جا رہا ہے' یہ ایک مختصر سی کمزوروں ناتوانوں کی جماعت ہے' ان کے صبر آزما مراحل ہیں' ہمت شکن مراحل ہیں' ان کے لیے تسلی کا سامان بھی ہونا چاہیے۔ کہا تو جا رہا ہے جیسے صرف نبی اکرم ﷺ سے' لیکن یہ پوری جماعت کے لیے ہے کہ اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (38:17) جو باتیں یہ کرتے ہیں' ان سے ہمت نہ ہار دینا' یہ بڑی ہی حوصلہ طلب ہیں' یہ سارے معاملات ہمت شکن ہیں کہ یہ اس قسم کی یہ باتیں کرتے ہیں' تمہارے پاس اس کا کوئی ایسا انتظام نہیں کہ جونہی یہ کہتے ہیں کہ ابھی تباہی لے آؤ تم فوراً وہ تباہی لے آؤ۔ وہ تو حساب کے مطابق ہونی ہے۔ یعنی یہ دیکھیے کہ یہ اس داعی کے لیے کتنی مشکل ہے کہ وہ دعویٰ یہ کرتا ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی ہے' وہ کہتے ہیں تباہی لاؤ' یہ لا نہیں سکتا' انتظار کرنا پڑتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ (7:71) تم بھی انتظار کرو مجھے بھی انتظار کرنا پڑے گا۔ اور یہ جو وقفہ ہے یہ ہے جس کے اندر وہ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں اور اس کے لیے یہ کہا گیا کہ تمہیں ہمت نہیں ہارنی' استقامت سے کام لیجیے گا۔

قومِ بنی اسرائیل کے تین اولوالعزم انبیائے اکرام کے تذکرہ جلیلہ کے سلسلہ میں حضرت داؤدؑ کا ذکرِ خیر

اس سورۃ میں بنی اسرائیل کے تین اولوالعزم انبیائے کرامؑ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے علاوہ حضرت ایوبؑ کا بھی تذکرہ آئے گا۔ کہا ہے کہ اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (38:17)۔ یہ بنی اسرائیل کا عروج کا زمانہ ہے جس میں حضرت داؤدؑ اور ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ ہوئے ہیں اور یہ جو دنیا کی تاریخ ہے' اس میں بھی شوکتِ داؤدیؑ اور سطوتِ سلیمانیؑ بڑی بلندیوں پہ ہے' اس کا تاریخ عالم میں ذکر آتا ہے۔ بنی اسرائیل کے جو بلند تریں عروج کا زمانہ ہے اس میں حضرت داؤدؑ آ رہے ہیں اور ان کے متعلق پہلے ہی ذا الاید کہا ہے۔ اس کا ترجمہ تو ہاتھوں والا ہوگا' لیکن اس کے تو مجازی معنی لیے جاتے ہیں کہ ہاتھ میں ہے یعنی اس کے

ص217 قبضے میں ہے' جسے ہم اقتدار میں ہے کہتے ہیں' کہتے ہیں کہ وہ صاحب اقتدار تھے۔ یہ جو خدا کے ایک رسول کا اقتدار اور خدا کی جماعت کا اقتدار اور پھر یہ انسانوں کا اقتدار ہے' ایک لفظ میں اس کا فرق بتا دیا۔ کہا ہے کہ اِنَّہٗٓ اَوَّابٌ ((38:17 یہ ''اوب'' بھی نہیں ہے بلکہ ''اوّاب'' ہے۔ وہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں ہمارے قانون کی طرف لوٹتا تھا۔ جو بات آئی' اِس نے دیکھا کہ خدا کیا کہتا ہے وہ کر دیا۔ قوت ہے' اقتدار ہے' یہ ذاالاید ہے۔

عزیزانِ من! یہ چھوٹے چھوٹے سے الفاظ میں قرآن بڑی عظیم باتیں کہہ جاتا ہے۔ حقیقت میں سارا نظام اس کے اندر آ گیا۔ اگر ذاالاید نہیں ہے تو وہ نظامِ خداوندی کا علمبردار نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ میں یہ اقتدار قوت طاقت مملکت ہونی چاہیے لیکن اقتدار قوت تو چنگیز (1227-1162ء)' ہلاکو (1265-1217ء) اور جتنے بھی ڈکٹیٹر ہیں ان کے ہاتھ میں بھی ہوتی ہے تو ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ فرق یہ ہے کہ طاقت کے استعمال کے لیے جب وقت آتا ہے تو یہ اپنی مرضی اپنے فیصلے کے مطابق نہیں استعمال کرتے' وہ ہماری طرف رجوع کرتے ہیں اور پھر یہ جو لفظ ''اواب'' ہے کہ بڑی تیز خیالی سے' تیزی سے دوڑ کر ہماری طرف آتے ہیں' جیسے پوچھنے کے لیے کہیں بچہ جاتا ہے کہ ابا جی! میں کیا کروں باہر جاؤں یا باہر نہ جاؤں۔ یعنی یہ انداز ہے کہ وہ تیزی سے ہماری طرف پوچھنے کے لیے' معلوم کرنے کے لیے آتے تھے۔ اس ہماری طرف کا کیا مطلب ہے؟ یہ کہ قانون خداوندی کو Consult کرنے کے لیے۔ یہ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ((2:156 ہے۔ یہ ہے فرق' یہ ہے نظام خداوندی کہ قوت کے' طاقت کے استعمال کے لیے یہ دیکھنا کہ خدا کا قانون ہمیں کیا راہنمائی دیتا ہے' اواب اس طرف تیزی سے آنا ہے۔ کہا ہے کہ اس مملکت کے اندر اقتدار کی قوت کی یہ کیفیت تھی اور اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِشْرَاقِ ((38:18 یہ چیزیں پہلے آ چکی ہیں اس لیے میں اس میں زیادہ وقت نہ لونگا اس لیے کہ زیادہ وقت لینے کے لیے آگے بات آتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمارا وقت صرف ہو جائے گا۔

الجبال اور طیر کے متعلق ہمارے ہاں کی تفسیروں کے بیانات کی حقیقت

یہ جو ہمارے ہاں کے ترجمے اور تفسیریں ہیں' ان میں بھی عجب چیزیں دی گئی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ سَخَّرْنَا الْجِبَالَ ((38:18 پہاڑوں کو ان کے تابع فرمان بنا دیا تھا' کاہے کے لیے بنایا تھا؟ ان کی تسخیر کا کیا مقصد تھا؟ کہا کہ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِشْرَاقِ ((38:18۔ وہ شام کو اور دن چڑھے اشراق کے وقت ان کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے۔ یہ ہے ہمارے ہاں کا ترجمہ بھی۔ آپ کہیں ترجمہ دیکھ لیجیے یا تفسیریں دیکھ لیجیے' یہی کیا ہے کہ پہاڑ ان کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے۔ وَ الطَّیْرَ مَحْشُوْرَۃً ((38:19 اور پرندے جو بہت منتشر تھے وہ جمع کیے ہوئے تھے۔ یہ ہمارے ہاں کا ترجمہ ہے' یہی تفسیر ہے۔ وہ جو ذاالاید ہے کہ وہ نہایت بڑی قوتوں کا مالک ہے'

تو وہ قوتوں کا مالک ہے' پہاڑ اور پرندے اس کے آگے مسخر ہیں۔ وہ ان سے کیا کام لے رہا ہے؟ یہ کہ وہ بھی تسبیح پھیرتے تھے' یہ بھی تسبیح کرتے تھے۔ یہ ہے جو ہمارے ہاں تصور دیا جاتا ہے۔ اور پہلے **ذا الاید** کہہ کر' جبال اور طیر کے متعلق یہ دونوں الفاظ کہہ کر کہ وہ یوں مسخر تھے' آگے ہے کہ **وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ** (38:20) اس کی مملکت کو ہم نے بڑا ہی طاقتور بنایا ہوا تھا۔ تو یہاں تو پہلے **الاید** ہے' اقتدار ہے' قوت ہے' اختیارات ہیں' اس کے بعد جو مملکت ہے اس کو مضبوط محکم تر بنانے کی بات ہے' درمیان میں یہ دو چیزیں آئی ہیں تو ان کے ساتھ کچھ اس کا تعلق ہوگا۔

عربی زبان میں لغوی اور مجازی معنی کے استعمال کا معاملہ جو قرآن فہمی کے لیے بنیادی حیثیت کا حامل ہے

عزیزانِ من! میں تو کچھ زیادہ کہنا ہی نہیں چاہتا۔ ہمارے جتنے مفسر تھے' عربی زبان میں تو ہم ان کے مقابلے میں کچھ شے ہی نہیں ہیں' انہی سے پھر آگے ترجمے بھی آتے ہیں۔ ترجمے کرنے والے بھی بڑے بڑے آتے ہیں۔ یہی لوگ ہمیں بتاتے ہیں کہ لغوی معنی اور مجازی معنی عربی زبان کی خصوصیت تھی۔ مجازی معنی کے متعلق ہمارے ہاں کتابیں تصنیف ہوئی ہیں کہ وہ Literal (لفظی) معنی تو ٹھیک ہے مثلاً جبل کے معنی پہاڑ' جبال اس کی جمع ہے' یہ تو اس کے لغوی معنی ہیں' لفظی معنی ہیں۔ خود عربی زبان میں عربوں کے ہاں قوم کے جو بڑے بڑے محکم سردار ہوتے تھے یہ پہاڑوں کی طرح تھے جن کے کھونٹے گڑے ہوتے تھے جیسے فرعون کو **ذو الاوتاد** کہا ہے۔ یہ تھے جبال' اپنے اپنے مقام کے اوپر پہاڑوں کی طرح مضبوط۔ کہا ہے کہ وہ بھی ان کے تابع فرمان تھے۔

حضرت سلیمانؑ کی مستحکم حکومت کے خدوخال

اور یہ بنی اسرائیل کی تاریخ بتا رہی ہے' حضرت سلیمانؑ کی تاریخ بتا رہی ہے کہ ہدہد کا قبیلہ تھا' طیر کا قبیلہ تھا۔ ان کے ہاں یہ طیر جو انہوں نے اپنا نام رکھا تھا تو وہ گھوڑے پالتے تھے' بڑے تیز رفتار گھوڑے ان کے ہوتے تھے اور اس زمانے میں تو جو جنگ تھی' ابھی یہ مکینکل سامان تو نکلا نہیں تھا' پیدل ہوتے تھے یا رسالے ہوتے تھے۔ تیز رفتار رسالے جو جنگ کے لیے سدھائے جاتے تھے' یہ اس ملک کے اندر ایک خاص قبیلہ تھا' اور وہ تھے باہر سے جیسے خانہ بدوش ہوتے ہیں' شہروں میں تو یہ لوگ رہ نہیں سکتے۔ ہمارے ہاں بھی انگریز کے زمانے میں گھوڑے پال ملا کرتے تھے۔ یہ گھوڑے پالتے تھے' ان کو سدھاتے تھے اور ان قبائل کے گھوڑے مشہور تھے۔ ویسے یہ عربی گھوڑا تو اب بھی بہت مشہور ہے۔ ان کے ہاں بھی خاص طور پہ یہ علاقہ تھا' جہاں پرندوں کی طرح اڑنے والے گھوڑے انہوں نے خاص طور پہ پال رکھے تھے۔ اس کے لیے یہ چیز کہی تھی' اس قبیلے ہی کو قبیلہ طیر کہتے تھے۔ یہ پرندے نہیں ہیں۔ یہ قبیلۂ طیر ہے۔ بڑے بڑے محکم قبائل کے محکم سردار' وہ بھی مسخر ہیں اور اتنے بڑے بڑے قبائل خاص طور پہ وہ قبائل جو اس زمانے میں گھوڑوں کو پالتے تھے' سدھاتے تھے' تیز رفتار تیز خرام گھوڑوں والے' یہ بھی ان کے تابع فرمان تھے۔ یہ جو **يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ** (38:18) کہا ہے' یہ میں

نے آپ کو بتایا ہے کہ خود عربی زبان کے اندر بھی یہ ''س ب ح'' جو ہے'اس کے معنی ہیں ''کسی کام کے سرانجام دینے میں انتہائی سرگرمی سے کام لینا' پوری پوری قوت صرف کر دینا' جو گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہے اس کے لیے یہ کہتے ہیں' جو تیراک پورے ہاتھ اس طرح سے پھیلا کر تیرتا ہے اس کے لیے یہ کچھ کہتے ہیں''۔ یہ اس کے معنی ہوتے ہیں مجازی طور پر کہ کسی کام کے سرانجام دینے میں انتہائی قوت صرف کر دینا۔ تو یہ جو تھے وہ اس طرح سے **سخرنا** تھے' یہ کیفیت تھی کہ وہ اس طرح سے ان کے تابع فرمان تھے کہ ان کے تیار کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے وہ بھی انتہائی کوشش کرتے تھے' اور اس طرح سے جو قبیلۂ طیر والے تھے' وہ بھی ان کے تابع فرمان تھے۔ یہ ابھی اس نے کہا ہے' یہ **یسبحن** کا ترجمہ آگے ہو جاتا ہے۔ 217 صٓ

ملوکیت اور نظامِ خداوندی میں بیّن فرق کی نشاندہی

کہا ہے کہ **کُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ** (38:19)۔ وہ سب اُس کے زیرِ فرمان تھے۔ یہ جو حضرت داؤد علیہ السلام یا یہ انبیاء یا یہ مملکت کے سربراہ تھے یہ تو خدا کی طرف ہر معاملے کے اندر رجوع کرتے تھے' اور یہ جو ان کے تابع فرمان تھے یہ ہر ہدایت اور حکم لینے کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ دونوں کا رجوع کرنا کیا بات ہے! نظام چل ہی اس طرح سے سکتا ہے کہ **کُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ** (38:19) ہو۔ آگے کہا کہ **وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ** (38:20) انہیں مملکت ہی نہیں دی تھی' یہ اتنی بڑی قوتیں ہی نہیں دی تھیں' اس کے ساتھ حکمت بھی دی تھی' وہ سب کچھ Rationally (استدلالی طور پر) کرتے تھے' Reason (استدلال) کی بنا پہ کرتے تھے۔ یہ ڈکٹیٹر ملوکیت کے سربراہ نہیں تھے' ان کے ڈکٹیٹر و ملوکیت ہونے کا تو سوال ہی نہیں وہاں Reason (استدلال) ہے۔ ان کے برعکس جو ڈکٹیٹر یا مطلق العنان ہیں۔ کوئی سوال ہوٗ ان کے ہاں تو ان کا حکم قانون ہے اور اس حکم کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی Reason (عقل و استدلال) پر مبنی ہوٗ انہوں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ وہاں تو

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت' اینک ماہ و پروین [1]

یہ تعلیم تھی جو دی جاتی تھی کہ بادشاہ دن کے وقت کہے کہ رات ہو گئی ہے تو کہو جی دیکھیے! تارے ہیں' یہ چاند ہے وہ دیکھیے! کیسے چمک

---

[1] اگر بادشاہ دن کو رات کہے تو تم فوراً کہہ دو کہ بالکل ٹھیک ہے' وہ دیکھیے چاند چڑھ رہا ہے اور یہ دیکھیے ستارے چمک رہے ہیں!

You are not to question right, you are only to do and die[2]

217 صٓ رہے ہیں لیکن یہ جو خدا کی طرف سے مملکتوں کے سر براہ یہ انبیائے کرامؑ یا نظام خداوندی کے جو سر براہ یا نظم و نسق کے اربابِ اقتدار ہیں ان کے ساتھ قوت ہے ان کے ساتھ حکمت ہے۔اسی لیے فریضۂ نبوت بتایا گیا کہ **یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ** (2:129) وہ قانون کی تعلیم دیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ قانون کی غایت کیا ہے' The why of it کیا ہے' اس کا Rationale (وجۂ جواز) کیا ہے' وہ Reason (استدلال) کیا ہے جس پر ہم نے یہ قانون بنایا ہے' کیوں یہ قانون بنایا ہے' مقصد اس کا کیا ہے؟ قانون کا جب مقصد اور 'کیوں' بتایا جائے تو پھر وہ ڈکٹیٹر کا قانون نہیں ہوتا۔ڈکٹیٹر کا قانون یہ ہے کہ تمہارا یہ کام نہیں ہے کہ ہم سے پوچھو کہ کیوں ہم نے ایسا حکم دیا ہے' تمہارا کام یہ ہے کہ تم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو اور مر جاؤ' جان دیدو۔نظام خداوندی میں یہ بات نہیں ہے' وہاں کیوں کا جواب دیا جاتا ہے۔اور جب سننے والے کا ''کیوں'' کے جواب سے اطمینان ہوتا ہے تو یہ اطاعت ہے جو دل کے جھکاؤ سے ہوتی ہے۔اگر یہ کیوں کا جواب قابل اطمینان نہ دیا جائے تو آپ اس کے سامنے جھک تو جائیں گے لیکن صرف آپ کا سر جھکے گا' دل نہیں جھکے گا' دل ہر وقت اس تلاش میں رہے گا کہ کہیں موقع ملے تو میں ادھر سے کھسک جاؤں۔اسی لیے یہ نظام قائم ہی نہیں رہتے' قانون قائم ہی نہیں رہتا' قانون میں ہر شخص کے سر کے اوپر آپ ایک ایک سپاہی کیسے کھڑا کریں گے۔وہ تو اپنے دل کے جھکاؤ سے قانون کا احترام اور قانون کی تعمیل کرے گا تو نظام قائم رہے گا اور وہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ اس کے 'کیوں' پہ مطمئن ہوں اور اطمینان یہ ہو کہ آپ یہ کریں کہ یہ میرے فائدے کے لیے ہے۔پھر کوئی پاگل ہی اس سے سرکشی اختیار کرے گا جس کو معلوم ہو کہ اس کی تعمیل میں میرا فائدہ ہے۔**الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ** (38:20) جب معاملات سامنے آئیں' ان میں فیصلہ کرنے کی قوت ہو۔

یہ ہے عزیزانِ من! نظام کہ قوت ہو تو اتنی زیادہ قوت ہو کہ پہاڑوں جیسے سردار اور یہ سارے ان کے سامنے جھکے ہوں' **وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ** (38:20) ان کی مملکت کو ہم نے بڑا محکم بنایا' بڑی قوت کی مملکت تھی لیکن کیفیت سر براہ کی یہ کہ کوئی معاملہ سامنے آئے وہ دیکھے کہ اس معاملے کے اندر حکمِ خداوندی' قانون خداوندی کیا ہے۔پھر وہ دوسروں کو سمجھائے کہ اس میں یہ حکمت ہے' پھر معاملات اس کے سامنے آئیں تو اس کی روشنی میں وہ ان کا فیصلہ کرے۔اور جب یہ بات کہی تو کہا کہ **فَصْلَ الْخِطَابِ** (38:20) معاملے کا فیصلہ تو آگے ایک مقدمہ کا ذکر آ گیا اور یہ ہے وہ جہاں میں نے کہا تھا کہ آج ہمیں اس میں وقت لگے گا' یہ بڑی اہم چیز ہے۔میرا خیال ہے اس کے لیے میں یوں کرتا ہوں کہ پہلے یہ آیات لے کر اس کا جو عام ترجمہ ہے وہ پیش کرتا ہوں پھر اس کے لیے یہ جو تفسیر بیان کی جاتی ہے میں وہ آپ کے

---

❷ اسے یوں بھی ایک انگریز شاعر نے کہا ہے: The is not to reason why، There is but to do and die.

سامنے پیش کرونگا' دیکھیے گا کہ ہمارے ہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اور پھر میں یہ عرض کرونگا کہ یہ قرآن اس کے متعلق کہتا کیا ہے۔ اور میں سمجھتا ص 217
ہوں کہ یہ جو طریق ہے' سمجھنے کے لیے زیادہ بہتر ہوگا۔ کسی بات کے سمجھنے کے لیے یہ جو تناظر بیک گراؤنڈ ہوتی ہے یہ بڑی ضروری ہوتی ہے۔

حضرت داؤدؑ کے دور میں آپ کے ہاں ایک پیش ہونے والے مقدمے کی نوعیت

کہا ہے کہ وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ o اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ((38:21-22) اے رسول! کیا تمہیں اس مقدمے کے حالات کچھ معلوم ہیں؟ قرآن کا بات کرنے کا انداز ہوتا ہے' جیسے ہم بھی کسی کو کوئی بات کہنی ہوتی ہے تو پہلے کہا جاتا ہے کہ کیا تمہیں اس کے متعلق کچھ علم ہے' میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تو کہا ہم تمہیں بتاتے ہیں اس مقدمے کا حال جو وہاں ہوا: وہ اپنے ہاں بیٹھے تھے تو ایسا ہوا ...... کہ ان کی قوم ایسی تھی جیسے نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تھی حالانکہ حضرت داؤدؑ کے وقت سے لے کر حضور ﷺ کے وقت تک زمانہ بہت آگے بڑھ گیا تھا لیکن وہاں وہ اسی قسم کے بدو' اسی قسم کے جاہل اور وحشی تھے ان میں آدابِ معاشرت نہیں تھی۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق یہ ہے کہ جب وہ آتے تھے تو ان کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ گھر سے باہر کسی کو آواز دیا کرتے ہیں' Privacy (تنہائی) بھی کسی کی ہوا کرتی ہے' کھانے کے لیے بلاؤ تو وہ پہلے ہی آ بیٹھتے ہیں' ابھی ہانڈیاں چولہے کے اوپر چڑھی ہوئی ہوتی ہیں اور وہ آکر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر کھانے کے بعد باتوں میں لگ جاتے ہیں اور قرآن نے کہا ہے کہ رسول شرم کا مارا کہتا کچھ نہیں ہے۔

یہ حضرت داودؑ کے اس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ او بابا! کھانے کے وقت آیا کرو' کھانے کے بعد چلے جایا کرو' یعنی یہ باتیں بھی ان لوگوں کو سمجھانی پڑتی تھیں۔ اور یہ تو ان سے بھی صدیوں پہلے کی بات ہے' اس زمانے کے وحشی قبائل تھے ان کی کیفیت یہ تھی کہ انہوں نے یہ بھی انتظار نہیں کیا کہ دروازے کی طرف سے ہی جائیں اور اجازت لے کر جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہنشاہ ایسے نہیں تھے کہ وہ قلعوں کے اندر رہتے تھے' کوئی چھوٹی چھوٹی سی دیوار ہوگی وہ دیوار پھاند کر ہی آ گئے۔ آپ اندر بیٹھے تھے تو انہوں نے دیکھا' کہا کہ پتہ نہیں خطرے والی کوئی بات ہے کہ یہ جو لوگ ہیں اس طرح پھاند کر آ گئے ہیں۔ نظر آیا کہ پتہ نہیں کوئی ڈاکو آ گیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ نہیں' گھبرانے کی بات نہیں ہے ہم تو اپنا ایک مقدمہ لے کر آئے ہیں۔ تو اس کے لیے وہ رنجیدہ خاطر نہیں ہوئے' انہوں نے انہیں ڈانٹا نہیں ہے' وہ جانتے تھے کہ اس قسم کے یہ لوگ ہیں' ان کو سمجھانے کی بات ہے کہ نہیں' بابا! آنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے۔ کہا کہ مقدمہ کیا ہے؟ کہا کہ مقدمہ یہ ہے کہ اِنَّ هٰذَآ اَخِىْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِىَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ((38:23) مستغیث نے کہا' جس نے مقدمہ پیش کیا ہے کہ یہ میرا بھائی ہے' اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں' میرے پاس ایک ہی دنبی ہے اور یہ فَقَالَ کہتا ہے کہ یہ جو تمہارے پاس ایک دنبی ہے

اَكْفِلْنِيْهَا ((38:23 یہ بھی مجھے دیدو، یہ ایک بھی نہیں میرے پاس رہنے دینا چاہتا' وہ بھی مجھ سے چھینتا ہے وَعَزَّنِىْ فِى الْخِطَابِ 217صٓ ((38:23اور چونکہ صاحبِ اثر ہے' سردار ہے' اس لیے جب کبھی اس معاملے پہ گفتگو ہوتی ہے تو وہ ہمیشہ ہمارے اوپر غالب آ جاتا ہے' تو یہ مقدمے کا فیصلہ کر دیجیے کہ کیا یہ کہنے کے لیے یہ حق بجانب ہے۔قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ((38:24 حضرت داوٗدؑ نے ان سے کہا کہ یہ تو بڑا ظلم ہے کہ اس کے پاس ایک دنبی ہے تم وہ بھی نہیں رہنے دینا چاہتے' یہ تمہاری بڑی زیادتی ہے۔ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ((38:24 اور اس قسم کے معاملوں کے اندر ہوتا یہی ہے کہ جو صاحب اثر ہے جو صاحبِ اقتدار ہوتا ہے' وہ غریب کا گلا گھونٹ دیتا ہے' اس کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لینا چاہتا ہے' یہ بڑی زیادتی ہے' یہ بڑی بری بات ہے۔اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ((38:24 لیکن ایسا وہ لوگ نہیں کرتے جو قانون خداوندی کے تابع چلتے ہیں لیکن آگے اس زمانے میں بھی یہ کہہ دیا اور اس کے بعد بھی کہ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ((38:24 یہ بہت تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ یہ ہے جی جو مقدمہ آیا۔

تورات میں اس بیان کردہ واقعہ کی وہ روئداد جو ہمارے ہاں کی تفسیروں کی زینت بنی

اب اس کے متعلق پہلی تفسیریں تورات میں آتی ہیں۔تورات کو اس لیے مجھے بیان کرنا پڑتا ہے کہ وہی تورات والی چیزیں جو ہیں وہ پھر ہمارے ہاں آتی ہیں اور وہ یہی نہیں ہے کہ ہمارے ہاں کے مفسر اپنے طور پر ان کو لے لیتے ہیں' لیتے بھی ہیں تو یہ نہیں کہتے کہ تورات سے لیا ہے' لیتے ہیں تو کہتے یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا تھا۔یعنی ایک نبیؑ کے متعلق بات دوسرے نبی ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی ہے کہ انہوں نے یہ کہا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کے خلاف بیان کردہ روایت

داستان حضرت ابراہیمؑ میں' میں نے یہ بتایا تھا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین دفعہ جھوٹ بولے' تو ایک تو خدا کے اتنے اولوالعزم نبیؑ کے متعلق یہ اتہام کہ اس نے جھوٹ بولا اور اس کے متعلق کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔یعنی خدا کا ایک اولوالعزم نبیؑ وہ جھوٹ بولتا ہے (معاذ اللہ) اور دوسرا نبی ﷺ اس کی تصدیق کر رہا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا۔ یہ ہو رہا ہے ان تفاسیر میں۔

تورات میں حضرت داوٗد علیہ السلام کی بیویوں کی بیان کردہ تعداد 99 اور حضرت سلیمان کی 100 بتائی گئی ہے

ہمارے ہاں تو لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ((2:285 رسول ہونے کی جہت سے تو وہ حضرت داوٗدؑ اور نبی اکرم ﷺ میں' ہم تو فرق ہی نہیں کر سکتے' ہم تو پہلے اُن پہ ایمان لاتے ہیں' آخر میں حضور ﷺ پہ ایمان لاتے ہیں لیکن جن کے یہ نبیؑ تھے' جن کے متعلق کہنا

پڑتا ہے کہ وہ ان کے متعلق یہ کہا کرتے ہیں کہ یہ ہمارے نبیؑ تھے' یہ ﷺ تمہارا نبی ہے۔ چلیے صاحب! جن کے یہ نبی تھے پہلی چیز تو یہ ص217
ہے کہ وہ اپنے نبیوں کے ساتھ کرتے کیا تھے؟ تورات میں یہ قصہ بڑی تفصیل سے مذکور ہے۔ وہ یہاں سے بات چلاتے ہیں کہ حضرت داؤدؑ کی ننانوے ((99 بیویاں تھیں' حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہم آگے چلیں گے تو وہاں انہوں نے سو کہہ دیا۔

تورات میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ایک واقعہ کی روئداد (معاذ اللہ معاذ اللہ)

(بقول تورات) حضرت داؤدؑ کی ننانوے بیویاں تھیں' پھر اس کے بعد پڑوس میں کسی کا مکان تھا' کہا ہے کہ ''ایک دن شام کو ایسا ہوا (میں یہ تورات کا بیان پڑھ رہا ہوں) کہ داؤد علیہ السلام اپنے بچھونے پر سے اٹھا اور بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اور وہاں سے اس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی اور وہ نہایت خوبصورت تھی۔ تب داؤد نے اس عورت کا حال دریافت کرنے کو آدمی بھیجے۔ انہوں نے کہا کہ کیا وہ العام کی بیٹی بت سبع حِتّی اوریا (Orian the Hittite) کی جورو (بیوی) ہے اور داؤد علیہ السلام نے لوگ بھیج کر اس عورت کو بلایا۔ چنانچہ وہ اس کے پاس آئی اور وہ اس سے ہم بستر ہوا کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک ہوئی تھی اور وہ اپنے گھر کو چلی گئی اور وہ عورت حاملہ ہوگئی' سو اس نے داؤد علیہ السلام پاس خبر بھیجی کہ حاملہ ہوں[1]'' اور آگے ہے کہ پھر اس سے حضرت سلیمانؑ پیدا ہوئے۔ یہ بہرحال اگر ان کا دعویٰ ہے کہ یہ ہمارے نبی ہیں تو وہاں اپنے نبیوں کے متعلق یہ ہو رہا ہے۔ اب وہ ان کی ننانوے بیویاں پہلے موجود تھیں' وہ جو پڑوسی تھا یہ اس کی ایک بیوی تھی' اب اس بیوی کے متعلق یہاں تو اتنی سی بات ہی کہی ہے کہ ان آدمیوں کو بھیجا۔ آگے تفصیل ہے کہ کس طرح سے اس عورت کو پھر ادھر سے اپنے ہاں منگایا' یہ تو ایک ہی دفعہ منگایا ہے۔ اب وہ مستقل طور پر اس کو اپنی بیوی بنانا چاہتے تھے۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ انہوں نے یہ جو اپنا لشکر کہیں جا رہا تھا' فوج جنگ کے لیے جا رہی تھی تو نہوں نے وہ جنگ کا جو سپہ سالار تھا اس کو بلا کر کہا کہ یہ جو شخص ہے وہ فوج میں ہے اس کو ساتھ لے جاؤ' فوج میں سب سے آگے جو ہوتا تھا اُسے صاحب تابوت کہتے تھے۔ یوں کہہ لیجیے کہ شاید وہ جھنڈے والا ہوتا ہوگا لیکن بہرحال وہ سب سے آگے ہوتا تھا اور کیفیت یہ تھی کہ وہ کم ہی بچ کر آیا کرتا تھا۔ اسے کہا کہ اس کو لے جاؤ اور اس کو اس مقام کے اوپر ساتھ آگے لے جاؤ تاکہ یہ بچ کر نہ آئے۔ چنانچہ اس کو وہ لے گئے تو وہ وہاں میدان جنگ میں قتل ہو گیا اور اس کے بعد پھر اس کی جو بیوی تھی گویا وہ بیوہ ہوگئی تو پھر اس کے ساتھ انہوں نے نکاح کر لیا یا اس کو اپنی بیوی بنا لیا' اس طریق سے' اس کے خاوند کو مروایا اور اس کو اپنی بیوی بنایا۔ کہنے لگے یہ تھا مقدمہ (معاذ اللہ)۔

---

[1] حوالہ سموئیل ۲' باب ۱۱' آیات ۲۔۵' نیز پرویزؒ: برق طور' طلوع اسلام' لاہور' 1993' ص ص۔ ۲۴۵۔۲۴۶۔

بات تو ایک اولوالعزم نبی کے متعلق ہے۔ میں نے کہا ہے یوں تو ان کا ہی اگر یہ کچھ ہوتا تو ہم کیوں دخل دیتے۔ یہ ان کا نہیں ہے یہ ص 267
خدا کے انبیاء ہیں' وہ ہمارا نبیؑ بھی ہے' ان کا ہی نہیں ہے' خدا کے نبیؑ ہیں جن پر ایمان لانا ہمارا بھی فرض ہے۔ تو گویا ان کے متعلق تورات میں یہ ہے تو اس پہ ہمارا اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی تورات میں اس کے متعلق کیا لکھتے ہیں۔ جب اس طرح سے حضرت داؤدؑ نے یہ تدبیر کر کے' یہ حیلہ کر کے' یہ سازش کر کے' اس کے خاوند کو مروا دیا' اس عورت کو اپنے گھر لے آئے۔ ''خداوند خدا نے ناتن نبی کو داؤد کے پاس بھیجا۔ اُس نے اس کے پاس آ کے اس سے کہا' ایک شہر میں دو شخص تھے' ایک تو دولتمند اور دوسرا کنگال۔ اُس مالدار کے پاس بہت بے شمار بھیڑ' بکری اور گائے بیل کے گلے تھے' پر اس کنگال کے پاس ایک بھیڑ کی اس پٹھیا کے سوا کچھ نہ تھا جسے اس نے مول لیا تھا اور پالا تھا اور وہ اس کے اور اس کے بچوں کے پاس بڑھی تھی اور اس کے پیالے سے پیتی تھی' اس کی گود میں سوتی تھی اور اس کی بیٹی کی جگہ تھی ❶''۔ اسی کے اوپر ان کا دارومدار تھا۔

وہ جو ناتن آئے ہیں' ان کے ہاں انہیں نبی کہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ جنہیں قرآن نے انبیائے کرام کہا ہے یہ وہی ہوں۔ یہ لفظ اس کے لیے ہی ضروری نہیں تھا۔ نبی' یہودیوں کے ہاں ہیکل کا ایک منصب دار تھا اور بہت بڑا منصب دار تھا جو پیش گوئیاں کیا کرتا تھا' قسمت کے حال بتایا کرتا تھا' وہ ان کو نبی کہتے تھے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ناتن جو انہوں نے وہاں لکھا ہے وہ قرآن میں تو نہیں ہے۔ انہوں نے یہ ایک تمثیلی بات کہی کہ ''ایسا اتفاق ہوا کہ ایک مسافر دولت مند پاس آیا۔ سو اس نے اپنے گائے بیل اور بھیڑ بکری کو بچا رکھا اور اس مسافر کے لیے جو اس پاس آیا تھا نہیں پکایا۔ بلکہ اس کنگال کی بھیڑ لے لی اور اس شخص کے لیے جو اس پاس آیا تھا پکا ڈالی۔ تب داؤد علیہ السلام کا غصہ اس شخص پر بہ شدت بھڑکا اور اس نے ناتن کو کہا: زندہ خداوند کی قسم کہ وہ شخص جس نے یہ کام کیا واجب القتل ہے سو وہ شخص چوگنی پٹھیا اسے پھیر دے کیونکہ اس نے ایسا کام کیا اور کچھ رحم نہ کیا۔ تب ناتن نے داؤد کو کہا کہ یہ وہ شخص تُو ہی ہے ❶''۔ تُو نے یہ سارا کچھ کیا ہے اور اس کے بعد یہ ہے کہ وہ داؤدؑ کس طرح سے نادم ہوا اور کیسے توبہ کی۔ یعنی یہ تورات میں ایک قصہ ہے۔ ٹھیک ہے جی۔

بقول ان کے وہ اپنے نبی کے متعلق یہ کچھ کہتے ہیں' اگر تو وہ ان کا ہی ہے تو کہتے رہیں۔ ہمارے ہاں تو اگر یہ چیز آئے گی تو ہم تو اس تورات کی یہاں اس بات کو رد کر دیں گے اس لیے کہ یہ ہمارے نبی ہیں۔ اپنے ہاں وہ رکھیں اگر انہوں نے اسے رکھنا ہی ہے' اور اگر انسانیت کی میزان میں ہوگی تو پھر تو انسانیت اس چیز کو ختم کر دے گی۔ بہر حال ان کے ہاں یہ چیز تھی۔ تو میں نے کہا ہے ان کے ہاں تھی' ہمیں کیا اس سے غرض لیکن غرض تو اس سے ہے جو ہمارے ہاں کی تفاسیر میں ہے۔

---

❷ حوالہ سموئیل ۲' باب ۱۲' آیات ۱۔۱۰۔

217ص

تورات کے اس بیان کے بعد ہمارے ہاں کی بیان کردہ تفاسیر کی حالت زار

اب اپنی تفاسیر کی طرف آیئے۔کئی تفسیریں ہیں جن کے میں یہاں حوالے دے سکتا ہوں' ان میں سے ایک لیجیے ''معالم التنزیل'' تفسیر۔یہ بڑی مستند سی تفسیر ہے' مشہور کتاب ہے۔اُس میں اس سارے قصے کی پہلے بڑی دلچسپ تمہید لکھی ہے' وہ یہی ہے جو کچھ میں نے ابھی عرض کیا ہے۔اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ ''حضرت داوٗدؑ نے اس عورت کو باغ میں حوض کے کنارے نہاتے ہوئے دیکھا''۔یہ اور آگے بڑھے' تورات میں تو تھا کہ وہ گھر کے اندر تھی تو انہوں نے کوٹھے پہ سے یہ دیکھا تھا۔انہوں نے کہا کہ ''باغ میں حوض کے کنارے (ان کو) نہاتے ہوئے دیکھا۔داوٗد علیہ السلام کو اس کا حسن بہت پسند آیا اور وہ بہت دیر تک اس کو دیکھتے رہے۔اتنے میں اُس عورت نے ان کا سایہ دیکھ لیا اور اپنے بال بکھیر لیے اور اپنے بدن کو ڈھانپ لیا۔اس سے ان کا شوق اور بڑھا❶''۔اور اس کے بعد پھر انہوں نے وہ پوری تدبیر' وہی جو حضرت داوٗد علیہ السلام نے کی تھی' دی ہے کہ اُس عورت کے خاوند کو اپنے بھانجے کی مدد سے میدان جنگ میں قتل کرا دیا اور پھر اس عورت سے نکاح کر لیا اور اس عورت کے بطن سے حضرت سلیمانؑ پیدا ہوئے (استغفر اللہ)۔یہ ہمارے ہاں کی اس تفسیر کے اندر ہے۔

نبویوں کی سیرت کے متعلق خدا کی طرف سے دی گئی گواہی کے برعکس ہمارے ہاں بیان کردہ' منسوب کردہ' روایات کی نوعیت

وہ ''معالم التنزیل'' کے مفسر جو بھی ہیں' ٹھیک ہے' وہ اپنے وقت میں تھے' ہم اس کو اٹھا کر پھینک دیں گے کہ انہوں نے تورات کے تصور سے یہی لیا۔ظلم تو آگے ہوتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ یہ میں نے خود نہیں لکھا۔اس کے بعد انہوں (مفسر معالم التنزیل) نے یہ حدیث نقل کی ہے۔اس میں کہا یہ ہے کہ ''انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ سُنا میں نے رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ جب داوٗدؑ نبی نے اس عورت کی طرف دیکھا تو بنی اسرائیل پر اس نے ایک لشکر تیار کیا اور سپہ سالار کو حکم دیا کہ جب دشمن کا سامنا ہو تو فلاں آدمی کو تابوت کے آگے مقرر کر دینا اور اس زمانے میں تابوت کے ساتھ نصرت طلب کی جاتی تھی۔جو شخص تابوت کے آگے چلتا تھا' نہیں لوٹتا تھا۔حتیٰ کہ قتل کیا جاتا یا لشکر سے بھاگ جاتا۔پس اس عورت کا خاوند قتل ہو گیا❷''۔یہ نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب حدیث بیان کی جا رہی ہے۔خدا کا ایک نبیؑ یہ کر رہا ہے' خدا کا دوسرا نبی ﷺ اس کی تائید میں یہ بتا رہا ہے (معاذ اللہ' صد بار معاذ اللہ' استغفر اللہ' ہزار بار استغفر اللہ)۔عورت کا خاوند قتل ہو گیا اور انہوں نے اپنی ننانوے بیویوں میں اپنے ہاں ایک اور بیوی ملا لی۔دو فرشتے نازل کیے گئے۔اُدھر تو صرف

---

❶ حوالہ معالم التنزیل۔

❷ حوالہ معالم التنزیل نیز پرویزؒ: برق طور' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1993ء' ص ص۔۲۴۸-۲۴۹۔

ناتن نبی آئے تھے۔ اِدھر'' دوفرشتے نازل ہوئے جو اس کے سامنے اس کا قصہ بیان کرتے تھے۔ پس داؤدؑ سمجھ گیا ❶''۔ یعنی اس سے صٓ 217
پیشتر خدا کا ایک نبی جس کے متعلق کہا ہے کہ ہم نے اس کو حکمت بھی دی تھی، فصل الخطاب کی صلاحیت بھی دی تھی، اُجڈ قسم کا چنگیز خاں نہیں تھا کہ ڈنڈے کے زور پہ سلطنت پہ قابو ہو گیا تھا، نہ عقل نہ مت۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ ان صلاحیتوں کا وہ مالک ہے۔ اور وہ کہہ رہے ہیں کہ ان فرشتوں نے آ کے یہ کہا تو اس سے انہوں نے سمجھا کہ افوہ! یہ تو ہمارے متعلق کچھ کہہ رہے تھے۔ ''پس داؤدؑ سمجھ گیا ❶''۔ اس سے پہلے نہ یہ سمجھا کہ یہ کوئی جرم ہے، یہ کوئی گناہ ہے، یہ کوئی معیوب بات ہے جو میں نے کی ہے، نہ فرشتوں نے آ کے یہ بات کہی تو وہ سمجھا کہ او ہو! یہ تو یہ ہے'' اور وہ سجدے میں گر پڑا اور چالیس رات تک سجدے میں پڑا رہا۔ حتیٰ کہ آنسوؤں سے سبزی اگ کر اس کے سر سے گذر گئی ❶''۔

عزیزانِ من! اس پر کسی قسم کا تذکرہ یا تنقید کے لیے، جی نہیں چاہتا، خون کے آنسو روتا ہوں جب میں یہ چیزیں پڑھتا ہوں '' ماں نال لڑاں تے ہتھ کتے پاواں ❷''۔ ہزار احتیاط کے باوجود بھی جو کہا جائے گا وہ خدا کے ان نبیوں کے متعلق ہے لیکن نہیں، ان نبیوں کے متعلق نہیں ہے وہ ان سے بہت بلند ہیں۔ ان کی سیرت کی صداقت کی گواہیاں خدا اور اس کے فرشتے دے رہے ہیں۔ نہ داؤدؑ ایسے تھے، نہ حضور ﷺ نے ایسا فرمایا تھا۔ پوچھیے ان ظالموں سے، پوچھیے ان جامعینِ حدیث سے کہ جنہوں نے اس قسم کی روایتیں اپنے ہاں جمع کی ہیں، رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی ہیں، ان کو صحیح ترین قرار دیا ہے، پوچھیے ان مفسروں سے کہ پھر انہوں نے اپنی تفسیروں میں ان چیزوں کو آپ کے ہاں درج کیا۔ اور اس کے بعد ہم پہ حکم یہ لگا دیا کہ ان میں سے کسی ایک حدیث کا انکار بھی کفر ہے انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر آپ اس حدیث کو صحیح نہ مانیں، رسول اللہ ﷺ کی حدیث، تو یہ کفر ہو گا، آپ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ یہ ہیں آپ کے ہاں تفسیریں جو آپ کے ہاں دار العلوموں میں پڑھائی جاتی ہیں اور پھر جن کو اسلام کہہ کر پھیلایا جاتا ہے۔ کچھ امید بندھ چلی تھی ہمارے اس دور میں کہ اس قسم کی یہ جتنی وضعی روایات وغیرہ یکسر وضعی چیزیں تھیں ختم کر دی جائیں گی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بڑی سازش کے تحت یہ کیا کچھ کیا گیا ہے، ایک سازش تو سب سے بڑی یہ تھی کہ اس قسم کی تورات اور اس قسم کی جو چیزیں ان کے ہاں تھیں، مسلمان ان کے اوپر نہایت آسانی سے اعتراض کر سکتے تھے کہ تمہارے ہاں ان کے اندر یہ لکھا ہے مگر اُنہوں نے نہایت خاموشی سے، وہ سارا اپنے ہاں کا جتنا لٹریچر تھا، آپ کے ہاں کی حدیث کی کتابوں کے اندر داخل کیا اور اس کے بعد تفسیروں کے اندر داخل کیا، اب کیجیے اعتراض ان کے اوپر!!

---

❶ حوالہ معالم التنزیل۔ نیز پرویزؒ: برق طور، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1993، ص ص ۲۴۸-۲۴۹۔

❷ ماں سے جھگڑا کروں تو ہاتھ کہاں ڈالوں!!

اس قسم کی اخلاق سوز خودساختہ روایات پر لب کشائی کرنے والوں سے کیا جانے والا سلوک اور نوجوان نسل کی تشنگی 217ص

ابھی آپ کے سامنے یہ چیز آ گئی' تورات پہ یہ اعتراض کیجیے' وہ آپ کے سامنے معالم التنزیل یا حدیث پیش کر دیں گے کہ آپ کے رسول ﷺ نے یہ فرمایا ہے' ہمیں کیا کہتے ہیں آپ۔ یہ تورات کے متعلق تو آپ بڑی جرأت سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب لغو ہے اور یہ سب وضعی ہے اور یہ (ناتن) خدا کا پیغمبر نہیں ہوسکتا' اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے۔ اُنہوں نے یہ کیا ہے کہ آپ ان کی کسی بات کو جھٹلا ہی نہ سکیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ اس دور میں کچھ غنیمت تھا کہ کچھ علم اور دانشمندی اور فکر اور یہ چیزیں ذرا عام ہو رہی تھیں جن کی بنا پہ اس قسم کے جو یہ داستانیں اور یہ قصے اور یہ خرافات تھیں' ان سے کم از کم ہمارا اگلا نوجوان طبقہ' وہ ان سے خود ہی متنفر ہو رہا تھا' یہ کفر بالطاغوت کا یہ بھی ایک طریق ہوتا ہے کہ آپ اسے اس طرح سے پیش کریں اور وہ جو علم تدبر و بصیرت کی روشنی میں معاملات کو سوچنے اور جانچنے کے عادی ہوں' وہ خود اس نتیجے پہ پہنچیں کہ نہیں' یہ نہیں ہوسکتا' یہ غلط ہے۔ یہ ہو رہا تھا اور اس سے نظر آتا تھا کہ بہرحال یہ آثارِ سحر ہیں' ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد قرآن کا اور صداقتوں کا سورج طلوع ہو جائے لیکن یہاں پھر ایک سازش ہوئی۔ یہاں پہنچ کر مجھے واقعی بڑے جبر سے کچھ باتیں کہنی پڑتی ہیں۔ عین اس دور میں' یہاں پاکستان کے اندر' جو مملکت لی گئی تھی' اسلام کے نام پہ' خدا کا نظام قائم کرنے کے لیے' یہاں ان کو ہزار آپ کہیے' یہ نئی نسل کے نوجوانوں کو یہ کچھ کہیے اور پھر یہ تو وہاں سرسیدؒ (1898-1817ء) تک چلتے ہیں ان کے خلاف یہ سازش ہو رہی ہے۔ سوچنا سمجھنا تو سکھایا تھا ان لوگوں کو' اس کا نتیجہ کم از کم یہ تو تھا کہ ان چیزوں سے یہ جو نوجوان تھے' ان کے جو دل و دماغ تھے' وہ باغی ہوئے۔ جب یہ ان کے دماغ ان چیزوں سے خالی ہوئے ہیں تو اس وقت بڑا مساعد وقت تھا کہ قرآن خالص ان کے سامنے پیش کر دیا جاتا' وہ ادھر لپک کر آ جاتے۔ اور عزیزانِ من! یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کیونکہ نوجوان میرے پاس آتے ہیں۔ ان سے میں یہ کہتا ہوں کہ یہ کوئی اسلام نہیں ہے' یہ سب وضعی روایات ہیں' آؤ قرآن کی طرف' اور وہ اس قدر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کا ایک حلقہ ہے لیکن عین اس وقت یہاں ایک سازش ہوئی۔

جناب مودودیؒ کا دعویٰ اور ان کے نزدیک سورۃ صٓ کے سلسلہ میں دیئے گئے مذکورہ واقعہ کی تفسیر کے خدوخال

مجھے کسی شخص کے خلاف کوئی مخاصمت نہیں لیکن جب بات قرآن اور اسلام کی آ جائے گی تو مجھے کسی کی رعایت مقصود نہیں ہے۔ مجھے اپنے خدا کے ہاں جواب دینا ہے۔ (سید ابوالاعلیٰ) مودودی مرحوم ((1979-1908 نے دعویٰ کیا۔ یہ بہت بڑے مفسر ہیں۔ انہوں

نے کہا کہ میں نہ تو یہ قدامت پرست طبقے میں سے ہوں' نہ یہ جو ملحد اور بے دین طبقہ نئی نسلوں کا آ گیا ہے ماڈرن' ان میں سے ہوں' میں بیچ کی راہ کا آدمی ہوں' میں تو عقل و فکر کی بنا پہ قرآن پیش کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد بہر حال پروپیگنڈہ ہے کچھ بھی ہے ان کو مقام دیا گیا کہ وہ بہت بڑے مفکر ہیں جو علم و بصیرت اور عقل و شعور کی بنا پر قرآن پیش کرتے تھے۔ یہ ان نوجوانوں کے دلوں کے اندر بٹھا دیا گیا۔ اُدھر سے یہ باغی ہوئے' اب یہ ادھر آئے کہ جہاں کہا گیا تھا کہ یہ فکر و بصیرت کی بنا پہ قرآن پیش کیا جاتا ہے۔ اب اس فکر و بصیرت کی بنا پہ پیش کرنے والے کے متعلق دیکھیے' تفہیم القرآن ❶ ان کی تفسیر ہے' چوتھی جلد' سورۃ صٓ کی یہی آیت ہے۔ ان کا انداز یہ ہے کہ یہ جو چیزیں میں نے کہی ہیں کہا کہ یہ ساری وضعی ہیں' یہ لغو ہے' یہ سب کچھ ہے۔ پہلے تیار کر لیا کہ صاحب! ہاں یہ ان کو نہیں مانتے' بالکل ٹھیک ہے۔ اب اس کے بعد ذہنوں میں آیا کہ اب یہ جو کچھ کہیں گے' وہ واقعی قرآن کی بات ہوگی۔ بات شروع ہی یہ کرتے ہیں۔ پہلے ان ساری چیزوں کو مسترد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''اصل واقعہ جو قرآن مجید کے مذکورہ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے'' (اب اس سے بڑا دعویٰ اور کیا ہوگا کہ آپ یہاں اصل واقعہ بیان کر رہے ہیں) ''وہ یہ ہے''۔ غور سے سنیے عزیزانِ من! یہ آپ کی ماڈرن تفسیر ہے کہ ''حضرت داؤدؑ نے اوریاہ (یعنی جو خاوند ہے) یا جو کچھ بھی اس کا نام رہا ہو' سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے''۔ ''جی اصل واقعہ جو قرآن سے صاف سمجھ میں آتا ہے۔'' یاد رہے قرآن میں کہیں نہیں' سارے قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اس سے کہا تھا کہ اسے طلاق دیدو۔ اور وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ''قرآن سے صاف سمجھ میں آتا ❶ ہے''۔ یہ نوجوان بیچارے ہیں' ان کو کیا پتہ کہ قرآن میں کیا لکھا ہوا ہے۔ اتنا بڑا مفکر' اتنا بڑا مفسر' اتنا بڑا عالم' اسے اللہ کا شاہکار کہا جاتا تھا' وہ کہہ رہا ہے کہ ''قرآن سے صاف سمجھ میں یہ آ رہا ہے ❶ ''اصل واقعہ کہ وہ حضرت داؤدؑ نے یوں نہیں کیا تھا کہ اس عورت کو بلا کے یوں کر دیا تھا بلکہ اس سے کہا یہ تھا کہ اپنی بیوی کو طلاق دیدو۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ وہ عورت پسند آ گئی تھی' وہ اس کو اپنی بیوی بنانا چاہتے تھے' اس واقعے سے جو قرآن سے سمجھ میں آتا ہے' آپ نے اس کے شوہر سے کہا کہ اپنی بیوی کو طلاق دیدو۔ اور آگے ہے کہ ''چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرماں روا اور ایک زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی اس لیے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا ❶ ''۔ دیکھیے! یہ ظاہری جبر نہیں تھا اور وہ اپنے آپ کو مجبور پا رہا تھا۔ آپ ظالم نہیں ہیں' آپ' ہم تو مظلوم ہیں' یعنی کسی جبر کے بغیر اپنے آپ کو مجبور پا رہا تھا۔ کیوں پا رہا تھا؟ اس لیے کہ اتنا بڑا جلیل القدر فرماں روا' اتنا بڑا زبردست دینی عظمت رکھنے والا' وہ رعایا کے ایک عام فرد کو یہ بات کہہ رہا ہے۔ تو کہہ یہ رہے ہیں کہ بغیر کسی جبر کے وہ اپنے آپ کو مجبور پا رہا تھا۔ خدا کا نبی' نظام خداوندی' ایک مملکت کا سربراہ اس کی مملکت کے اندر اس نبی کی کیفیت اور سیرت و کردار یہ کہ

---

❶ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: تفہیم القرآن (جلد چہارم)' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' 1993' ص ص۔ 328 تا 329۔

اس کو دوسرے کی بیوی پسند آجاتی ہے اور اسے بلا کر کہتا ہے کہ ''اسے طلاق دیدو' وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے مجبور پاتا ہے۔ یہ ہے 217 صٓ اسلامی حکومت اور یہ ہے نظام خداوندی جو آپ دنیا کے اندر قائم کرنا چاہتے ہیں' جس کی بیوی پسند آئے اس کو بلا کر کہا جائے کہ اس کو طلاق دیدو اور وہ اپنے آپ کو مجبور پائے۔

نبی اکرم ﷺ کی طرف سے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو ان کی بیوی کے سلسلہ میں کی گئی درخواست کی نوعیت

او کہنے والے! ذرا تو سوچ' نبی کی شان کیا ہوتی ہے! اسی کے متعلق نبی کی شان دیکھنا چاہتے ہو تو گوش ہوش سے سنو۔ وہ زید کو کہتا ہے جو اپنا آزاد کردہ غلام تھا جس کے ساتھ اپنی پھوپھی زاد بہن ❶ کی شادی کی ہوئی تھی' اس سے یہ کہہ رہا ہے کہ زید بیوی کو طلاق نہ دو۔ یہ ﷺ حضرت داؤدؑ سے بڑے فرماں روا تھے' ان سے بڑی ان کی دینی شخصیت بھی تھی' اس شخص (زید رضی اللہ عنہ) کے اوپر اتنے بڑے احسان بھی تھے' معاملہ اپنی پھوپھی زاد بہن کا تھا' درخواست کی جا رہی ہے کہ بیوی کو طلاق نہ دو اور وہ سامنے سے کہتا ہے کہ معاف رکھیے میں اپنے معاملات کو آپ ﷺ سے بہتر سمجھتا ہوں' اور اس نے طلاق دیدی۔ وہ مجبور نہیں پا رہا' یہ ہے نبی کی شان۔ اور یہ ہے جو آپ کے ہاں کا نیا مفسر ہے' یہ سمجھا رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مجبور پا رہا تھا۔ یا میرے اللہ! اگر یہ حکومت خداوندی میں بھی افراد کی' رعایا کی' یہ کیفیت ہے کہ وہ جو کچھ کہے' یہ اپنے آپ کو مجبور پائیں تو اس سے زیادہ ظلم وستم اس کی حکومت میں اور کیا ہوتا تھا۔'' اس موقع پر قبل اس کے کہ وہ حضرت داؤدؑ کی فرمائش کی تعمیل کرتا'' پتہ نہیں کہاں سے یہ ساری چیزیں ان کو معلوم ہوگئیں' قرآن میں کچھ نہیں اس کے متعلق''' قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے'' یعنی (معاذ اللہ) یہ نیک نہیں تھے' دو نیک آدمی وہاں پہنچ گئے'' اور انہوں نے ایک فرضی مقدمے کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا'' کیفیت وہاں کی یہ تھی کہ ان کی جرأتیں سلب کی ہوئی تھیں کہ وہ معاملے کو سیدھی شکل میں پیش کرنے کی جرأت نہیں کر رہے تھے کہ جی! آپ کہہ رہے ہیں اس شخص کو مجبور کر رہے ہیں۔ اُس نے دو نیک آدمی ان کے پاس بھیجے اور انہوں نے فرضی مقدمہ' نیک اور فرضی مقدمہ ملاحظہ فرماؤ' جرأت یہ نہیں ہوئی ان کی بھی کہ آ کر ٹھیک ان سے کہیں کہ آپ کیا کر رہے ہیں' فرضی مقدمہ پیش کیا۔ یہ ہے حکومت خداوندی ایک نبی کے ہاتھوں جو قائم ہوئی ہے۔ وہ بات سیدھی دوٹوک نہیں کر سکتے' فرضی مقدمہ پیش کر دیا'' حضرت داؤدؑ ابتدا میں تو یہ سمجھے کہ یہ واقعی کوئی مقدمہ ہے چنانچہ انہوں نے اسے سن کر اپنا فیصلہ سنا دیا'' کہ یہ زیادتی ہے'' لیکن زبان سے فیصلہ کے الفاظ نکلتے ہی ان کے ضمیر نے تنبیہ کی''۔ اس وقت ضمیر نے تنبیہ کی' اس سے پہلے نبی کی جو ضمیر تھی سب سوئی ہوئی تھی۔ اس وقت تنبیہ کی'' کہ یہ تمثیل پوری طرح ان کے اور اس شخص کے معاملے پر چسپاں ہوتی ہے''۔ اس وقت بات سمجھ میں آئی اور اس وقت

---

❶ پرویزؒ: معراجِ انسانیت (معارف القرآن' جلد چہارم' ادارہ طلوع اسلام' کراچی' 1949' ص ص 686 اور 744۔

ضمیر نے تنبیہ کی کہ یہ تو معاملہ ہے جو میرا اور اس شخص کا ہے۔'' اور جس فعل کو وہ ظلم قرار دے رہے ہیں اس کا صدور خود ان سے اس شخص ص 24
کے معاملے میں ہو رہا ہے''۔ اب سمجھ میں بات آئی اور اب ضمیر نے ملامت کیا۔'' یہ احساس دل میں پیدا ہوتے ہی وہ سجدے میں گر گئے اور توبہ کی اور اپنے اس فعل سے رجوع فرمایا[1]''۔ عزیزانِ من! یہ ہے اس دور کی ماڈرن تفسیر۔

نظام سرمایہ داری کا خاصہ اور اس کی بنیاد پر بنی اسرائیل کا قائم کردہ یورپ کا پورا معاشی سسٹم

عزیزانِ من! یہ جو سارا قصہ ہے' قرآن نے تو ایک لفظ میں ساری بات سمجھا دی۔ یہودی' یہ بنی اسرائیل' سرمایہ داری میں انتہا تک پہنچی ہوئی قوم تھی۔ سرمایہ داری ہوتی کیا ہے؟ سرمایہ دار کرتا کیا ہے؟ وہ مل کر ایک Limited Concern سا بنا لیتے ہیں' کچھ لوگ مل جاتے ہیں کچھ معاملہ کرتے ہیں' کچھ کاروبار کرتے ہیں' ان کی انوسٹمنٹ (سرمایہ کاری) ہوتی ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ جو بڑے سرمائے والا ہوتا ہے' اس کی پوری خواہش یہ ہوتی ہے کہ چھوٹے سرمائے والے کی پونجی بھی اپنے ہاں لے آئے' ہوتا ہی یہ ہے۔

مایہ کو مایہ ملے کر کر لمبے ہاتھ
تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

وہ تو چھوٹے سرمایہ دار کو یہ بڑے سرمایہ دار پنپنے ہی نہیں دیتے' چھوٹی پونجی لے کر بیچارہ کوئی کھوکھے والا کھڑا ہو' اس کے مقابلے میں لاکھ روپیہ لگانے کے بعد وہ جو وہاں دکان کھول لیتا ہے' وہ اس کی دکان ایک دن بھی نہیں چلنے دیتا۔ اگر انوسٹ کرتا ہے' تو انوسٹمنٹ میں بھی یہ اس کا سارا کچھ کھا جاتا ہے۔ تو مایہ کو مایہ ملتی ہے۔

گاؤں کے دہقان کا ایک قصہ

وہ جو میں گاؤں کے دہقان کا ایک قصہ سنایا کرتا ہوں' وہ یہ ہے کہ اس نے سن رکھا تھا کہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے' کہیں سے کسی طرح بیچارے نے دو دو چار پیسے جمع کر کے ایک روپیہ اکٹھا کر لیا' شہر میں صراف کی دکان پہ دیکھا تو روپے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے تو اس نے دور سے کھڑے ہو کر روپیہ پھینکا اور اس ڈھیر میں چلا گیا' اب وہ کھڑا انتظار کر رہا ہے کہ میرا روپیہ اس روپے کو کھینچ لائے۔ تو پہلے صراف نے تھوڑا انتظار کیا پھر اس کے بعد پوچھا کہ میاں! تم یہاں اتنے وقت سے کھڑے ہو' کیا ہوا؟ کہنے لگا: جی! میں نے سن رکھا تھا کہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے' میں نے اپنا روپیہ یہاں پھینکا تھا' میں اب انتظار میں ہوں کہ وہ کھینچ لائے تو وہ میرے پاس دو ہو جائیں لیکن وہ تو بات غلط نظر آتی ہے۔ کہنے لگے: نہیں' وہ بات غلط نہیں ہے' روپیہ روپے کو کھینچتا ہے' اس روپے نے تمہارے

---

[1] واوین میں دی گئی عبارت یا جملے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: تفہیم القرآن جلد چہارم مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی 1993' ص۔ 328 سے لیے گئے ہیں۔

روپے کو کھینچ لیا ہے۔ یہ ہے سرمایہ داری۔

عزیزانِ من! اس کے اندر ایک لفظ ہے جس نے یہ جو ساری کہانی ہے واضح کر دی ہے۔ کہا ہے کہ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ((38:24 جب یہ مشترکہ کاروبار کرنے والے جو ہوتے ہیں تو ان میں تو ہوتا یہ ہے کہ یہ زیادہ سرمائے والا جو ہے ننانوے دنبیوں والا' وہ کوشش کرتا ہے کہ میں چڑھ دوڑوں اس چھوٹے سرمایے والے کے اوپر اور کھینچ لوں اس کی ایک دنبی بھی۔ تو بات تو یہ ساری ہو رہی تھی۔ یہ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ ((38:24 کیا بات ہے ایک لفظ ہے مشترکہ کاروبار کرنے والے لیکن ان کی نگاہ ادھر کیوں جائے ان کی نگاہ تو جاتی جنسیات کے اوپر ہو گی خواہ اس کے خاوند کو یوں مروائیں' خواہ اس کو کہیں کہ طلاق دیدو۔ خلطآء کے لفظ سے دیکھ رہے ہیں کس طرح بات واضح ہو گئی!

مذکورہ بالا بیان کردہ واقعہ کا اصل مقصد اور لم نظام سرمایہ داری کی ذہنیت کو واضح کرنا تھا

اور اب آجایئے کہ اس نے کہا کیا تھا' عزیزانِ من! کیا بات ہے جو اس نے کہی تھی اور قرآن کا انداز ہے۔ کہا یہ کہ حضور! ذرا دیکھیے کہ ان ھٰذا اخی ((38:23 یہ مجھ سے کہتا ہے میں تیرا بھائی ہوں' یہ میرا بھائی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور بھائی کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں' مجھ غریب کے پاس ایک دنبی ہے اور یہ مجھ سے کہتا ہے کہ یہ بھی مجھے دیدے' یہ میرا بھائی ہے۔ وہ اگر کہتا کہ میں تیرا دشمن ہوں' یہ اس کے کاروبار میں شریک ہی نہ ہوتا۔ کہا کہ میں تیرا بھائی ہوں۔ ایک لفظ میں کہاں سے کہاں بات پہنچا دی۔ کہتا ہے میں تیرا بھائی ہوں اور کرتا اس کے بعد یہ ہے کہ تمہاری جو ایک دنبی ہے یہ میرے ننانوے میں ہی داخل کر دو۔ تو ان سے کہا کہ آپ فرمایئے اس کا مطالبہ کہاں تک جائز ہے۔ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ((38:24 کہنے لگے کہ یہ انتہائی ظلم ہے کہ ننانوے والا کسی غریب کی ایک دنبی کو بھی لے جائے۔ اس ایک مقدمے کے فیصلے نے نظام سرمایہ داری کی جڑ کاٹ کر رکھ دی کہ ننانوے کو حق حاصل نہیں ہے کہ غریب کے پاس اگر تھوڑا سا سرمایہ ہے اس سرمایہ کو لخطآء یعنی مشترکہ کاروبار کا بہانہ بنائے اور اس کو کھینچ کر اپنی طرف لے آئے اور وہ کم سرمائے والا روتا پھرے' پیٹتا پھرے۔ روز ہمارے ہاں یہ کچھ ہوتا ہے' یہ غریب تھوڑے سرمائے والے روتے پھرتے ہیں ''لٹ کے لے گیا' کھا گیا مینوں' بڑے بڑے سبز باغ دکھانداسی کہ جی! اے مل جائے گا' اے مل جائے گا' میں غریب ساری عمر دا میرا سرمایہ سی [1]''۔ اور یہ جو ریٹائر گورنمنٹ سرونٹ دیتا ہے' وہ تو بیچارہ بڑی جلدی قابو آتا ہے۔ اسے کچھ کاروبار نہیں آتا' جونہی اس کو G.P فنڈ ملا' اور یہ ننانوے دنبیوں والے آ گئے اجی بھائی! تمہیں کاروبار کا تجربہ نہیں ہے' ہم تو تجربے والے ہیں' بس اس کے

---

[1] لوٹ کر لے گیا' مجھے کھا گیا' بڑے بڑے سبز باغ دکھاتا تھا کہ جی! یہ ملے گا اور وہ ملے گا۔ مجھ غریب کا وہ ساری زندگی کا سرمایہ تھا۔

ساتھ ہی یہ Invest (سرمایہ کاری) کر دیجیے اور اس کے بعد وہ ٹھیک ہے بس یہ اتنا تمہارا اتنا ہمارا کاروبار مل کر کریں گے۔ چھ ہی مہینے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ جی کاروبار ڈوب گیا' تمہارا بھی گیا' ہمارا بھی گیا اور پھر "آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں"۔ مل کے کیا کریں تمہارا جانے کے بعد بھی کتنا بچا ہے' اس کا پوچھو کیا رہا۔ کہتا ہے کہ اِنَّ ھٰذَا آخِی ((38:23 میں تیرا بھائی ہوں۔ مطالبہ یہ ہے کہ اپنی ایک دنبی بھی میرے ننانوے میں دیدو' میرے سپرد کردو۔ کہا: یہ تو بڑا ظلم ہے لَیَبْغِیْ بَعْضُھُمْ عَلٰی بَعْضٍ ((38:24 وہ زیادہ سرمائے والا چاہتا یہ ہے کہ اس چھوٹے سرمائے والے کے اوپر چڑھ دوڑے' اس کو پاؤں تلے روند کے رکھ دے۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ((38:24 یہ لوگ ایسا نہیں کرتے جو قوانینِ خداوندی پر ایمان رکھتے ہیں اور معاشرہ کو سنوارنے والے کام کرتے ہیں لیکن کیا کیا جائے وَقَلِیْلٌ مَّا ھُمْ ((38:24 ایسے لوگ بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی حسّاس خیالی کا علاج صرف نبی اکرمؐ کے اس فرمان میں ہے کہ "کام صلاحیت کے مطابق اور دام ضرورت کے مطابق"

کہا ہے کہ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ((38:24 یہاں داؤدؑ کو یہ احساس ہوا کہ یہ جو معاشرے کے اندر معاشی نظام جاری ہو چکا ہے' یہ بڑا ظلم ہے۔ خدا چاہتا یہ ہے کہ میں ایسا نظام قائم کروں کہ جس میں ننانوے والا' ایک والے کی دنبی کو سمیٹ کر نہ لے جائے۔ مسئلہ بڑا مشکل ہے۔ اپنی ہی قوم ہے' دوسری قوم کے اندر تو یہ سربراہِ مملکت تھا' زبردستی بھی کرتا' اپنی ہی قوم کے اندر یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ اس دور کے یہودیوں کی تاریخ پڑھ کر دیکھیے۔ اپنے دور میں مجھے یہ کرنا پڑے گا کہ ننانوے اور ایک والے میں پھر یہ ہوگا کہ ننانوے والے کو انچاس جو ہیں [1]' وہ وہاں سے چھین کر اس ایک والے کو دینی پڑیں گی' یہ بڑا صبر آزما مرحلہ ہے۔ اس لیے اُس نے اپنے رب سے سامانِ حفاظت طلب کیا کہ تُو ہی مدد کرنے والا ہے' اس قوم کے ہاتھوں تو ہی مجھے اس حالت میں محفوظ رکھنے والا ہے' میں نے جو نہی اس نظام کی ایک بات کہی ہے انہوں نے تو پوچھو نہیں کہ کیا کچھ کر دینا ہے۔ یہ ہے جو وہ خدا کی حفاظت طلب کر رہے ہیں کہ میں اس قوم میں اصلاح Reform تو یہ کرونگا' لیکن یہ قوم تو پوچھو نہیں کیا قوم ہے' الٹے حربوں کے اوپر اتر آئے گی۔ اس کے باوجود کہا کہ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ((38:24 ٹھیک ہے جو ہوتا ہے ہوتا رہے' جب ظلم مٹانا ہے تو پھر میں یہ کرونگا۔

---

[1] یہ نظامِ جمہوریت میں اکثریت کا اصول ہے کہ 51% `49% پر بھاری ہیں۔

حضرت داؤدؑ کا عزم تو قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کو ہی قائم کرنا تھا

عزیزانِ من! یہ نہیں ہوا تھا کہ سجدے میں گئے' چالیس دن روتے رہے اور گھاس اُگ کر اس کے سر کے اوپر آگئی۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے' میں یہ کرونگا' میں اس خدا کے قانون کے سامنے جھکتا ہوں' یہ جو معاشی نظام ہے' میں اس کی جگہ خدا کا نظام رائج کر کے رہونگا۔ تاریخ بتا رہی ہے کہ ان لوگوں نے کیا ریفارمز کی تھیں۔ فَغَفَرۡنَا لَهٗ ذٰلِكَ ((38:25 ہم نے اس کی حفاظت کی۔ وَاِنَّ لَهٗ عِنۡدَنَا لَزُلۡفٰى وَحُسۡنَ مَاٰبٍ ((38:25 بڑی ہمت سے کام لیا' ہمارے مقرب بندے یہی کیا کرتے ہیں۔ کہا کہ اے داؤد! اس سرمایہ دار طبقے کی بالکل پرواہ نہ کرو جو اس وقت اتنے اتنے کھونٹے گاڑ کر بیٹھا ہوا ہے۔ یداود جعلنک خلیفةً فی الارض ((28:26 ہم نے تمہیں سربراہِ مملکت بنایا ہے۔ ہماری طرف سے یہ اقتدار ملا ہے' تم نے بزورِ شمشیر قوت اور اقتدار کے زور پہ یہ حاصل نہیں کیا ہے' اس ''ہم نے'' یہ دیا ہے۔ ہم نے کے معنی کیا ہیں؟ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ ((24:55 ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجے میں جو مملکت یا استخلاف ملتا ہے اُسے خدا کہتا ہے کہ ہم نے دیا ہے۔ یہ ہے ہم نے دیا کے معنی۔ یہ بات نہیں ہے کہ تم نے جوز ور وزبردستی سے یا بزورِ شمشیر یہ حاصل کرلیا ہے' یہ تو ہمارے قانون کے مطابق ملا ہے۔

یہ کا ہے کے لیے ملا ہے؟ یہ ہے جو اگلی بات ہے۔ کہا کہ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَ النَّاسِ بِالۡحَـقِّ ((38:26 صحیح قانون خداوندی یعنی جو حق پر ہے' اس کے مطابق عمل کرتا چلا جا' ان معاملات کے فیصلے کرتا چلا۔ یہ بات ہے کہ وَلَا تَتَّبِعِ الۡهَوٰى یہ اتنے اتنے بڑے سرمایہ پرست جو ہیں' ان کے مفاد اور ان کی خواہشات اور ان کے جذبات کی بالکل پرواہ نہ کر۔ فَيُضِلَّكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ((38:26 یہ خدا کے راستے سے تمہیں بہکا دیں گے' یاد رکھو۔ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَضِلُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌۢ بِمَا نَسُوۡا يَوۡمَ الۡحِسَابِ ((38:26 اور جو لوگ ہمارا صحیح راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے پر پڑ جاتے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان کا انجام بڑا تباہ کن ہوتا ہے' شدید تباہی ان پر آتی ہے۔ یہ تباہی کیوں آتی ہے؟ یہ نہیں ہے کہ ہمیں غصہ آجاتا ہے' ہم تباہ کر دیتے ہیں۔ دو الفاظ میں اس کا سارا راز ہے کہ بِمَا نَسُوۡا يَوۡمَ الۡحِسَابِ ((38:26 وہ بھول گئے کہ ہم نے اس کا حساب بھی دینا ہے' اس کا نام Accountability (جواب دہی) ہوتا ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں جسے Sovereignty مملکت کا اقتدار کہتے ہیں' Sovereign' حاکم اعلیٰ وہ ہوتا ہے جو Accountable to none (کسی کے سامنے جواب دہ نہیں) ہوتا ہے۔ باقی اس کے نیچے والے جو ہیں' ان کا تو وہ محاسبہ کرتا ہے' آخر میں ایک ہوتا ہے کہ جو کسی کے سامنے بھی Accountable (جواب دہ) نہیں ہوتا' اس سے اونچا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہوتا۔ یہ جو نظامِ خداوندی ہے' اس میں یہ صورت نہیں ہے' اس میں کوئی ایسا بھی نہیں ہوتا خواہ وہ آخر میں انتظامی معاملات کے متعلق سربراہ ہی اس کو آپ کیوں نہ کہہ دیں' یہ نہیں

ہوتا کہ وہ Accountable to none (کسی کے سامنے جوابدہ نہ) ہو۔ وہ خدا کے سامنے حساب دینے والا ہوتا ہے' اسے Responsible to Allah (اللہ کے سامنے جوابدہ) کہہ لیجیے' وہاں اس نے حساب دینا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ((38:26 جو اس بات کو بھول جاتے ہیں' ان کے ہاتھوں پھر قوموں کی تباہی آتی ہے۔

اور اس کے بعد آگے وہ چیز ہے کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ((38:27۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کے لیے تائید میں آیا کہ جو نظام کائنات ہے وہ لوگوں کی مرضی کے مطابق نہیں' ہمارے قوانین کے مطابق چلتا ہے' دیکھو کس حسن و خوبی سے وہ نظام چلا جا رہا ہے' ان کے مفادات کا' ان کے جذبات کا' اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن میں یہ سمجھاؤں گا جو یہ کہتے ہیں کہ یہ نہ ماننے والے اس بات کو یہ کہتے ہیں کہ نہیں' یہ سب باطل چیز ہے۔

عزیزانِ من! اب وقت ختم ہو گیا ہے' ہم سورۃ صٓ کی آیت 26 تک آ گئے 27 ویں آیت سے ہم پھر لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



تیسرا باب: سورۃ صٓ (آیات 27 تا 44)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿٢٧﴾ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ
نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿٢٨﴾ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا
الْاَلْبَابِ ﴿٢٩﴾ وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿٣٠﴾ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ
الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿٣١﴾ فَقَالَ اِنِّىْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ
بِالْحِجَابِ ﴿٣٢﴾ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۭ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴿٣٣﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰي
كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿٣٤﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ
اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿٣٥﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاۗءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿٣٦﴾ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّاۗءٍ
وَّغَوَّاصٍ ﴿٣٧﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿٣٨﴾ هٰذَا عَطَاۗؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ
حِسَابٍ ﴿٣٩﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٤٠﴾ وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِيَ
الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ﴿٤١﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿٤٢﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ
وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿٤٣﴾ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا
تَحْنَثْ ۭ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿٤٤﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1980ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ صٓ کی 27 ویں آیت سے ہو رہا ہے:

(38:27)۔

نظامِ سرمایہ داری کی ماہیت کو واضح انداز میں پیش کرنے کے سلسلہ میں پیش کردہ تمثیل کی اہمیت ص237

سابقہ آیات میں سلسلۂ کلام یہ چلا آ رہا تھا کہ حضرت داوٗدؑ کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا۔ میں نے آخر میں یہ عرض کیا تھا کہ یہ ایک مقدمے کی بات نہیں تھی۔ بنی اسرائیل یا یہودیوں کی قوم کے اندر سرمایہ داری کی انتہا تھی۔ اس مثال کی رو سے سرمایہ داری کا تو بنیادی اصول یہ ہے کہ جس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں' اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس کے پاس ایک ہے' وہ بھی اسی کے پاس آ جائے۔ یہ ہے اس کی بنیاد: ''مایہ کو مایہ ملے کر کر لمبے ہاتھ'' لیکن ''یہ مایہ کو مایہ'' یوں ملتی ہے کہ جو بڑی مایہ ہے' وہ چھوٹی مایہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ یہ تھی وہ چیز جس کے لیے یہ کہا گیا کہ معاشرے میں اقتصادی یا معاشی اصلاح نہایت ضروری ہے۔ یہ تو اصلاح نہیں تھی' یہ تو انقلاب تھا اور بہت بڑا انقلاب تھا۔ یہ آپ جو اقتدار سنبھالے ہوئے ہیں' ان سے تو پھر بھی لڑ کر' جھگڑ کر' فساد کر کے' کچھ نہ کچھ چھین سکتے ہیں' یہ سرمایہ داری کا جو نظام ہے' اس کو بدلنے کے لیے بڑے ہی عزم کی ضرورت ہے' بڑی استقامت کی ضرورت ہے۔ اور یہ جو ان کی مخالفت ہوتی ہے' اس کا مقابلہ کرنے کے لیے آج دنیا کی بڑی بڑی سپر پاورز' ان چند یہودیوں کی مرضی کے خلاف' کوئی فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ آج اس قدر بے بس ہو گئی ہوئی ہیں جتنی بھی سپر پاورز ہیں۔ کہنے کو وہ سپر پاورز ہیں لیکن وہ ہینڈل سارا ان کے ہاتھ میں ہے جو یہ سرمایہ دار یہودی ہیں۔ یہ تو ان کے اندر بہت پرانی ریت چلی آ رہی تھی۔ اس کے متعلق کہا گیا تھا کہ بڑی ہمت سے ان کے اس سرمایہ دارانہ نظام کو تمہیں بدلنا ہے۔

نظامِ خداوندی اور سیکولر نظام کی شکل وصورت میں فرق

عزیزانِ من! یہ چیز کہنے کے بعد بات ہوئی کہ یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ ((38:26 اے داوٗد علیہ السلام! ہم نے تمہیں ملک میں اقتدار دیا ہے۔ تو پہلی چیز تو یہی ہے کہ یہ انبیائے کرامؑ وعظ کہنے کے لیے نہیں آتے تھے' یہ ایک نظام قائم کرتے تھے اور اس نظام کے متعلق یہ کہا کہ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ((38:26 تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے حق کے ساتھ کرو۔ اب یہاں وہ اصل چیز ہے جہاں نظامِ خداوندی اور دنیا کے سیکولر نظام میں حدِ امتیاز پیدا ہو جاتا ہے' تفریق پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا کے عام نظام میں جسے نظامِ عدل کہا جاتا ہے اگر بغیر رو رعایت کے کوئی فیصلہ مروّجہ قانون کے مطابق ہو جائے تو اسے کہا جائے گا کہ انصاف مل گیا' عدل ہو گیا یعنی یہ صرف اتنی سی بات ہے کہ کسی کی رعایت نہ کی جائے' کوئی رشوت نہ لی جائے' کسی کی مخالفت نہ کی جائے' قانون کے' قاعدے کے' مطابق فیصلہ کر دیا جائے تو وہ عدل ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ٹھیک ہے یہ ان کی عدل کی جو Definition (تعریف) ہے یا معیار ہے وہ تو یہی ہے لیکن اگر وہ قانون جس کے مطابق یہ فیصلہ ہوا ہے' وہی بے عدلی کے اوپر' ناانصافی کے اوپر' مبنی ہو تو یہ انصاف کیسے ہو جائے گا۔ وہ پہلے

اس قانون کو لیتا ہے جس کے مطابق فیصلے ہونے ہوتے ہیں کہ وہ کیسا ہے۔ یہ ہے بنیادی فرق۔ سیکولر نظام جسے عام نظام کہتے ہیں اس میں 247ص یہ قوانین بھی انہی انسانوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں اور جب بھی انسانوں کی بنائی ہوئی' انسانوں کی وضع کردہ کوئی چیز قائم (Establish) ہوگی تو اس میں انسانی قلب کی رنگینی کی آمیزش تو ضرور ہو جائے گی۔ پہلے تو قانون ایسے بنے اور پھر اس قانون کے اوپر عمل پیرا ہونے کے لیے جو مشینری ہے' اس میں بھی وہ انسان ہوتے ہیں لیکن بنیادی چیز یہ ہے کہ وہ قانون کیسا ہے۔

قرآنی آئیڈیالوجی یہ ہے کہ وہ قانون جس پر عمل کیا جائے وہ بذات خود الحق پہ مبنی ہو

قرآن کریم نے اسی لیے جہاں جہاں عدل کے متعلق الحق کہا ہے تو اس کے متعلق هو بِهٖ يَعْدِلُوْنَ ((7:181 کہا ہے کہ عدل یہ ہے کہ الحق کے مطابق جو قوانین بنیں ان قوانین کی رو سے فیصلہ کیا جائے۔ وہ ہے جسے عدل کہا جائے گا۔ اس لیے یہاں کہا ہے کہ تمہیں جو اقتدار دیا ہے تو معاملات کے فیصلے جو تم نے کرنے ہیں' بالحق کرنے ہیں۔ جب الحق آئے گا تو پھر یہ چیز وحی خداوندی ہے' اس کی رو سے جو قوانین' احکام' حدود' اقدار' اصول دیئے جائیں ان کے مطابق فیصلے کرنے ہیں۔ اور اگلی چیز آ گئی کہ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى ((38:26 نہ اپنی خواہشات' آرزوؤں کا اس میں اثر ہو' نہ کسی اور کی خواہشات کا اثر اس کے اوپر آکر پڑے' اور اس طرح کسی چیز سے متاثر ہوئے بغیر حق کے مطابق فیصلے کیے جاؤ' یعنی اپنی خواہشات' اپنے جذبات کو بھی اس میں دخل انداز نہ ہونے دو اور لوگوں کی خواہشات اور مفاد کے متعلق کبھی نہ سوچو' کبھی نہ اس کا اتباع نہ کرو' الحق جو فیصلہ دیتا ہے وہ فیصلہ کرو۔ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ((38:26 اگر تم نے اپنے یا دوسرے لوگوں کی خواہشات کا اتباع شروع کر دیا تو یہ چیز تمہیں صحیح راستے سے بہکا دے گی' پھر تم صحیح راستے پہ نہیں چل سکتے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ((38:26 جو لوگ بھی صحیح راستے سے بہک جاتے ہیں' ان کے لیے تباہی ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ بہک جاتے ہیں۔

انسانی ذات کی تمام تر نشوونما کا دارومدار مواخذ کے سلسلہ میں قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان لانا ہے

عزیزانِ من! بنیادی طور پر تمام امراض کی جڑ یہ ہے کہ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ((38:26 وہ بھول جاتے ہیں کہ ہم نے اس کا کہیں حساب بھی دینا ہے۔ وہ حساب یہاں تک تو ہوتا ہے' اپنے سے اوپر کوئی بھی ہو بہرحال وہاں تک ہی حساب ہوتا ہے۔ یہ' مواخذہ اگر ہو بھی' کسی معاشرے کے اندر صحیح نظام بھی اگر ہو' تو وہاں یہ مواخذہ' یہ حساب' یہ Accountability (جواب دہی)' یہ ذمہ داری' اپنے سے اوپر کے انسان کی ہوتی ہے۔ آپ سے اوپر جو آفیسر اور انچارج ہے اس تک' اس کے اوپر آخر میں چلے جاؤ گے تو وہ مملکت کے جو سربراہان ہیں وہاں تک' تو انسانوں کے سامنے ہی ہوگی۔ اگر انتظام ایسا کر دیا جائے کہ وہاں مواخذہ نہ ہو تو پھر کوئی چیز نہیں جو آپ کو

اس چیز سے روک دے کہ آپ غلط فیصلے نہ کریں۔ دین کی اصل چیز یہ ہے کہ یہ ہو کہ یہاں مواخذہ ہو یا نہ ہو' ایک قانونِ مکافاتِ عمل ہے 237صٓ
جس کو خدا کے ہاں حساب ہونا' خدا کے ہاں مواخذہ ہونا کہا جاتا ہے' نظام عدل ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے مکافاتِ عمل کا جو قانون ہے'
اس کی رو سے وہ ہوتا ہے۔ یہ خدا کا قانون ہے اور وہ قانون جاری وساری ہے' کائنات کی ہر شے اس قانون کے مطابق روبہ عمل ہے۔

فکروتدبر اور تحقیق وجستجو کے سلسلہ میں ہماری کوتاہ نظری کی کیفیت اور اس کا نتیجہ

اب یہاں انسانوں کی دنیا میں یہ ایک چیز قرآنِ کریم کہتا ہے۔ ہم لوگوں نے تو خیر تحقیق ہی کیا کرنی ہے' ہم پر تو صدیوں سے سوچ کے دروازے بند ہو چکے ہوئے ہیں۔ تحقیق کر رہے ہیں اور یہ تحقیق کرنے والے یورپ کے' امریکہ کے' محققین' دانشور (Intellect-uals) اور Scientists (سائنسدان) ہیں۔ قرآن نے کئی مقامات میں یہ کہا ہے کہ یہ خدا کا قانون مکافات عمل ہے جو آپ کے دل میں گزرنے والے خیالات کا بھی مواخذہ کرتا ہے' آپ جو یہاں انسانوں کی گرفت سے بچ جاتے ہیں اس کا بھی مواخذہ کیا ہوتا ہے۔ یہ مواخذہ کیا ہوتا ہے؟ یہ اس قانون کے مطابق فطری فعل ہے' اس قانون کا عمل ہے کہ وہ نتیجہ پیدا کرے۔ بظاہر یہ چیز ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ایک شخص Escape (فرار) کر گیا ہے' نہیں پکڑا گیا' کچھ اس نے انتظام کر لیا ہے یا کہا کہ دل میں گزرنے والے جو خیالات ہیں' ان کا محاسبہ کس طرح سے ہو سکے گا۔ یہ کس طرح والی بات ہے وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

خارجی کائنات اپنے اندر ایک عظیم مقصد لیے ہوئے ہے

میں نے کہا ہے کہ قرآن جو یہ بات کہتا ہے اس تحقیق تک تو ابھی عقل انسانی نہیں پہنچی۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ وَمَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَہُمَا بَاطِلًا (38:27) یاد رکھو! یہ جو خارجی کائنات ہے' یہ یونہی ہم نے باطل نہیں پیدا کی' بیکار نہیں پیدا کی' یہ ایک مقصد کے لیے پیدا کی ہے۔ پوری کی پوری خارجی کائنات ایک مقصد کے لیے پیدا کی ہے۔ ہمیں تو یہی نظر آتا ہے کہ بہر حال موسم بدلتے ہیں' ہوائیں چلتی ہیں' بارش ہوتی ہے' روئیدگی ہوتی ہے' نباتات ہوتی ہے' یہی اس کا مقصد نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہی مقصد نہیں ہے' یہ تو حقیقت میں تمہارے لیے' تمہاری طبعی زندگی کے لیے' سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کے ذرائع ہیں۔ جو اصل مقصد ہے وہ یہ ہے کہ وَخَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ (45:22)۔ یہاں یہ تخلیقِ ارض وسما پھر وہی بالحق ہے' یہ باطل نہیں ہے' الحق ہے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ وَلِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ وَہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ (45:22) ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ مل کر رہے اور کسی پر کوئی زیادتی نہ ہو۔ اب یہ چیز کہ خارجی کائنات کی یہ اتنی عظیم الشان مشینری' قرآن کی رو سے سرگرمِ عمل ہے' یہ صرف ان طبعی نتائج پیدا کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ اس لیے ہے کہ تمہارے جو اعمال' تمہارے جو کام ہیں' وہ بلا نتیجہ نہ رہیں' ہر ایک کو اس کے عمل کا نتیجہ مل کر رہے اور کسی پر کوئی زیادتی

بھی نہ ہو۔

عقل مند سے عقل مند فرد ہو یا کوئی قوم ہو' قرآنِ حکیم کی راہنمائی کے بغیر وہ اندھی ہے

کہا ہے کہ اس کی حالت پہ غور کیجیے کہ اَفَرَئَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ((45:23 جو اس الحق کی بجائے اپنی ہی خواہشات' اپنے ہی مفادات کے پیچھے لگ پڑا ہے' اپنے ہی جذبات کے تابع چل پڑا ہے' اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ وہ کتنا ہی Intellectual (دانش مند) کیوں نہ ہو' علم و ہنر اور تہذیب وتمدن میں کتنے ہی بلند مقام پر وہ قوم کیوں نہ پہنچی ہوئی ہو' جب بھی وہ جذبات کے تابع چلے گی تو علم کے باوجود وہ گمراہ ہوجائے گی' اس کے کانوں کے اوپر' اس کی آنکھوں کے اوپر' مہریں لگ جائیں گی' پردے پڑ جائیں گے' وہ جو فیصلہ کرنے والی انسان کے اندر قوت ہے جسے Mind (قلب) کہا جاتا ہے' وہ بھی صحیح کام نہیں کرے گی۔ تو کہا کہ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ ((45:23 تو جب اس کی حالت یہ ہوجائے' اس کے بعد اس کو صحیح راستے کی طرف کون لاسکتا ہے۔ بات تو یہاں یہ کہی گئی ہے کہ یہ خارجی کائنات جو اس طرح سے سرگرمِ عمل ہے' کہا یہ ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا کوئی عمل بلانتیجہ نہ رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟ طبعی دنیا کے اندر تو بہرحال اس کی تحقیق ہو ہی رہی ہے' وہ ٹھیک ہے لیکن یہ کہ انسانی اعمال کے نتائج بھی جسے مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے ان کے مرتب کرنے میں بھی یہ جو کارگہ' کائنات کی مشینری ہے' اس کا عمل دخل ہے' ابھی تک اس پہ تحقیق نہیں ہوئی۔ میں نے عرض کیا ہے تحقیق ہو رہی ہے وہ اس طرف بھی آ رہے ہیں۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس کارگہ' کائنات کی یہ مشینری ہم نے یونہی باطل نہیں پیدا کی۔ باطل کے معنی ہوتا ہے تخریبی یا بے نتیجہ' اور نتیجہ یہ بتادیا جو میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے۔ کئی اور مقامات میں بھی اس قسم کی آیتیں ہیں کہ انسانی اعمال کے نتائج مرتب کرنے کے لیے یہ مشینری سرگرم عمل ہے۔ بہرحال اسی ایمان سے تو ہماری بات آگے چلتی ہے کہ انسان کا کوئی عمل بلانتیجہ نہیں رہ سکتا' اس کا محاسبہ' اس کا مواخذہ ضرور ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ نہیں صاحب! بس ہم نے اپنی ہنرمندی سے انتظامات کرلیے ہیں کہ ہم کسی گرفت میں نہیں آئے تو سنو! ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ((38:27 یہ کفر ہے اور یہ ان کا اپنا ظن ہے' زعم باطل ہے' جو سمجھتے ہیں کہ ہمیں کوئی نہیں پکڑ سکتا' ہم نے یہاں انتظام کرلیا ہے' پکڑنے والی مشینریوں کو ساتھ ملالیا ہے' کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ((38:27 ان لوگوں کے لیے تباہی کا جہنم ہے۔

نوعِ انسانی دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہے

اب یہاں دو قسم کے گروہ ہمارے سامنے آگئے۔ ایک تو وہ کہ جن کا یہ ایمان ہے کہ یہ بات اگر سردست ہماری تحقیق میں نہیں آئی کہ

یہ سلسلۂ کائنات عمل کس طرح سے کررہا ہے' ایمان ہمارا یہ ہے کہ انسان کے دل میں گزرنے والے جو خیالات ہیں' وہ بھی نتیجہ پیدا کرتے ص 237 ہیں' جسے محاسبہ یا مواخذہ کہتے ہیں' اس کے معنی نتیجہ پیدا کرنا ہیں۔ وہ نتیجہ پیدا کر کے رہتے ہیں' یہاں پیدا نہیں ہوتا تو زندگی یہاں ختم نہیں ہو جاتی' زندگی آگے چلتی ہے نتیجہ پیدا ہوگا' یہاں نہیں پیدا ہوگا تو وہاں ہوگا' زندگی میں تو تسلسل ہے۔ ایک تو یہ گروہ ہے۔ اور دوسرے یہ لوگ ہیں کہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ قانون کا' عدل کا' یہ دنیاوی نظام ہے' اس میں سے ہم کسی طرح سے انتظام کرلیں کہ اپنے جرائم سے بچ جائیں تو پھر کوئی مواخذہ نہیں ہے' ہمارا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ یہ دوسرا گروہ ہے۔ دو قسم کے یہ گروہ ہو گئے۔ کہا ہے کہ اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ کَالۡفُجَّارِ ((38:28۔ یہ دو گروہ ہیں: ایک یہ گروہ ہے جو یہ ایمان رکھتا ہے دوسرا وہ ہے جو اس سے انکار کرتا ہے۔

مکافاتِ عمل پر ایمان نہ رکھنے والے اس دنیا میں بھی ذلت کے عذاب سے نہیں بچ سکتے

اب یہاں ((38:28 میں تو یہ ایسی عظیم بات کہی ہے۔ کہا ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ دونوں گروہ برابر ہیں؟ ان میں سے ایک گروہ کی جو زندگی ہے اسے فی الارض کہا ہے' قیامت کے دن کی زندگی کو تو چھوڑ دیجیے کہ وہاں تو بہرحال ہم کہتے ہی ہیں کہ ہاں صاحب! یہ مجرم جہنم میں جائیں گے اور یہ متقی پرہیزگار جنت میں جائیں گے۔ یہاں وہ فی الارض کہہ رہا ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ جو دو گروہ ہیں' یہاں اسی دنیا کے اندر دونوں کی زندگی ایک جیسی ہوگی؟ کیا جو ان قوانین کی نگہداشت کرنے والے افراد یا قوم ہے وہ ان جیسے ہو جائیں گے جو اس قانون کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتے ہیں' جو اس کو مانتے ہی نہیں ہیں؟ کہو کہ کیا دونوں کی زندگی یکساں ہو سکے گی؟ سوچیے عزیزانِ من! کتنی بڑی امتیازی چیز ہے کہ جسے ہم دعویٰ کر کے کہتے ہیں ایمان والے' اعمالِ صالحہ والے' یہ مومنوں کی جماعت' جسے اب ہم مسلمان کہہ کر دھوکا دے لیتے ہیں' وہ کہتا ہے کہ اِن کی زندگی اور اُن کی زندگی ایک جیسی نہیں ہوگی۔ ٹھیک ہے' آپ یہ کہیں گے کہ ایک جیسی نہ ہونے کا تصور ہمارا ابھی ہے کہ ہم ذلیل وخوار رہیں گے' ان کی جوتیاں کھاتے رہیں گے' وہ ڈنڈے برساتے رہیں گے' دیکھ لیجیے ایک جیسی تو نہیں ہے۔

مومن ہونے کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ مومن پر کوئی دوسرا غالب آ ہی نہیں سکتا

ایک جیسی نہ ہونے کے متعلق یہ بھی تو بات ہے' وہ تو بھاگنے نہیں دیتا' وہ کہتا ہے کہ جب ہم نے کہا ہے کہ ایک جیسی نہیں ہے تو ہم تمہیں بتا دیتے ہیں کہ اس سے مراد کیا ہے' اپنے آپ کو فریب میں نہ رکھو۔ کہا کہ وَ لَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا ((4:141۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے نہ ماننے والے کبھی مومنوں پہ غالب نہیں آسکیں گے۔ یہ ہے جو کہا ہے کہ ایک جیسی زندگی نہیں ہوگی۔ قرآن ہے' عزیزانِ من! اگر اس چیز کا ایمان ہے تو پھر سوچیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ (معاذ اللہ) یا تو یہ کہیے کہ یہ محض شاعری تھی جو اللہ تعالیٰ

نے کر دی، اور اگر یہ حق ہے جو کہا گیا ہے تو پھر سوچ لیجیے کہ ہمارا شمار کس میں ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَ لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ (4:141) یہ ہو 237ص نہیں سکتا کہ اللہ ایسا کر دے کہ کفار کبھی مومنین پہ غالب آسکیں، یہ ہو نہیں سکتا۔ اس نظام کے متعلق تو اس نے کہا ہے کہ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) دنیا کے ہر نظام کے اوپر اس کو غالب آنا ہے۔ اور یہ چیز جواب کہا گیا کہ کیا ان دونوں کی زندگی ایک جیسی ہوگی، تو اب بات سمجھ میں آگئی کہ وہ جو کہا ہے کہ ایک جیسی نہیں ہوگی تو اس کے معنی کیا ہیں۔

قرآنِ حکیم کی عظمت اور لفظ برکت کا قرآنی مفہوم

یہ ایمان والے جو ہیں ان کو قرآن نے غالب ہونے والے کہا ہے، انہیں اعلون کہا ہے، سب سے بلند اور سب سے بڑے غلبے والے: وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3:139)۔ یہ کیسے ہوگا، یہ کس چیز کی وجہ سے ہوگا؟ کہا کہ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ (38:29) یہ وہ کتاب ہے جس کے اندر دنیا بھر کی برکات موجود ہیں۔ برکت کیا ہوتی ہے؟ یہ جو برسات کے بعد گھنی قسم کی یہ روئیدگی ہوتی ہے جس کی سبزی سیاہی مائل ہو جاتی ہے، جو بڑی گھنی قسم کی ہوتی ہے، اس قسم کی جو پیداوار ہوتی ہے، وہ برکت کہلاتی ہے۔ یہ کتاب کہ جو اس قسم کے نتائج پیدا کرنے والی ہے جب وہ لوگ اس کا اتباع کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا لیکن کتاب کا ہے کے لیے دی گئی ہے۔ جتنا ہم پڑھتے ہیں شاید ہی کوئی اور پڑھتا ہوگا اس کتاب کو۔ وہ کہتا ہے کہ یہ صرف پڑھنے والی بات نہیں ہے۔ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُوْلُوا الْاَلْبَابِ (38:29) یہ کتاب ہے جس پہ غور و تدبر کیا جائے گا، عقل و فکر سے کام لیا جائے گا اور یہ ان لوگوں کو صحیح راہنمائی دے گی جو اُوْلُوا الْاَلْبَابِ (38:29) صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں۔

لفظ ''الباب'' کا لغوی مفہوم اور عقل و فکر سے کام نہ لینے کا نتیجہ

میں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ یہ جو الباب کا لفظ آتا ہے اسے ہمارے ہاں لب لباب کہتے ہیں کہ جی! اس کا لب لباب یہ ہے'' پنجابی اچ اینوں کیندے نیں تت کڈیا ہویا[1] ''، عقل کا لب لباب تو گویا اس مقام کے اوپر وہ عقل و فکر سے کام لینے والے ہیں، تدبر اور غور سے کام لینے والے ہیں، یہ اربابِ فکر و دانش وہ ہیں جو غور و تدبر سے اس قرآن کو پڑھیں گے، اس قرآن پہ عمل کریں گے، تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کو یہ قرآن راہنمائی دے گا جس سے برکات ہونگی، اور جو ان قوانین کو نہیں ماننے والے ہونگے وہ کبھی ان پر غالب نہیں آسکیں گے۔ تدبر شرط تھا۔ یہ جو اس قوم کے ساتھ سازش ہوئی ہے اس کے لیے تفصیل تو لمبی چوڑی ہے، اس کا نقطہ ماسکہ ایک ہی ہے عزیزانِ من! کہ ان پر سوچ کے دروازے بند کر دیئے، جب بھی سوچ کے دروازے بند کیے جائیں گے تو وہ قوم انسان سے حیوانات کے درجے

---

[1] پنجابی میں اسے 'ملخص نکالا ہوا' کہتے ہیں۔

پر آجائے گی' اور جب حیوان کے درجے پہ آئے گی تو کوئی بھی جوقوت والا ہوگا' جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہوگا' وہ ان کو آگے لگا لے گا۔ ہماری ص237
ساری تاریخ یہی ہے: سوچ کے دروازے بند ہیں۔قرآن کو بامعنی پڑھنے کی مخالفت ہو رہی ہے۔

قرآن کو غور وخوض کے ساتھ بامعنی پڑھنے کی مخالفت

یہ سارے حافظ ہیں' ان کے ہاں یہ ناظرہ قرآن' جتنا پڑھا جا رہا ہے' یعنی معنی تک قرآن کے معلوم نہیں' پڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ صرف معنی ہی معلوم نہیں۔ وہ تو یہ کہتا ہے اس پر تدبر ہے' جو اولوالباب ہیں' ان کی سمجھ میں یہ بات آسکے گی' انتہائی عقل وفکر کی رو سے' اس قرآن سے راہنمائی کے یہ طریقے' صراط مستقیم کے یہ نشانات' حاصل کرنے ہونگے۔ یہ ہے اس قرآن کے لیے جو دیا گیا ہے۔

خاندانی طور پر نبوت کے نہ ملنے کے متعلق ایک اہم نکتہ کی وضاحت

اب وہ پھر حضرت داؤدؑ کا جو قصہ تھا اس سے آگے ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف چلا ہے۔ کہا ہے کہ وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمٰنَ ((38:30 ہم نے داؤد علیہ السلام کو ان کا بیٹا سلیمانؑ عطا کیا تھا- یہ ایک بات یاد رکھیے گا۔ یہ انبیائے بنی اسرائیل میں ہم دیکھتے ہیں' کم از کم دو تین پشتوں تک وہ نبوت بھی ان کی اولاد کے اندر آتی ہے' حضرت ابراہیمؑ حضرت اسحٰقؑ ان کے بھائی حضرت اسماعیلؑ' اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ' حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسف' یہاں تک تو ایک لڑی نظر آ رہی ہے کہ باپ کے بعد بیٹا ہے۔ ان کے پاس بادشاہتیں بھی تھیں لیکن اصل بات تو نبوت کی ہے۔ نبوت تو ایسی چیز ہے نہیں' وہ اکتسابی طور پہ اپنے کسب و ہنر سے کوئی حاصل نہیں کرسکتا' چہ جائیکہ وہ وراثتاً کسی کے پاس آجائے۔ وراثتاً تو یہ آ ہی نہیں سکتی۔ حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے بعد جو دعا کی تھی کہ یا اللہ! یہ چیز ہمیں دینا' یہ دینا' اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ٹھیک ہے ہم نے تمہاری دعا قبول کر لی' ہم یہ دیں گے۔ اور اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ ((2:124 میری اولاد کے متعلق کیا حکم ہے' ان کو یہ ملتی رہے گی؟ فٹ سے کہہ دیا کہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ((2:124 محض کسی کا اولاد میں ہونا ہمارے ہاں کوئی چیز نہیں ہے یہ کوئی شے ہی نہیں ہے' یہ طبعی چیز ہے' فزیکل ایکشن ہے Procreation (تولید) کو اس سے کیا تعلق۔ بالکل نہیں۔ ان میں سے اگر کوئی شخص ظلم کی راہ اختیار کرے گا تو ہم کبھی اس سے یہ عہد نہیں کرتے کہ محض تمہاری ذریت میں ہونے کی وجہ سے اس کو ہم یہ کچھ کر دیں۔ قطعاً نہیں ہے۔

قرآن کے نزدیک نسلی امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا لہٰذا نبوت خدا کی رحمت کی بنیاد پر مختص ہوتی تھی

قرآن اس چیز کو کاٹنے کے لیے آیا ہے کہ دنیا کے اندر نسلی امتیاز کوئی شے نہیں ہے۔ تو یہ جو چیز تھی کہ یہ انبیاء اس طرح سے آئے تھے' یہ نہیں تھے کہ یہ ان کے بیٹے تھے اس لیے یہ نبی ہو گئے' انہوں نے نبوت بھی وراثت میں پا لی۔ یہ بات نہیں تھی۔ وہ تو خدا کا جو معیار ہے'

جو نبوت کا معیار تھا' اس معیار کے مطابق یہ چیز تھی کہ یہ جو لوگ تھے وہ اس معیار کے اوپر پورے اترے اور ان کو نبوت ملتی گئی۔ حضرت یوسفؑ کے بعد ہم دیکھتے ہیں' کہیں سے ذکر ہی نہیں آتا۔ ادھر حضرت اسماعیلؑ کے بعد عرب کے اندر ہم دیکھتے ہیں کسی نبی کا ذکر ہی نہیں۔ صٓ 237
تو ذریت کی تو بات ہی کچھ نہیں' نسل پرستی کی کوئی چیز نہیں کہ ''دریں رافلاں ابن فلاں چیزے نیست''۔ ہر فرد اپنے میرٹ کے اوپر کسی چیز کا مستحق ہوسکتا ہے۔ تو یہ جو آتے ہیں کہ وہ حضرت داؤدؑ کا بیٹا حضرت سلیمانؑ تو یہ بیٹے ہونے کی جہت سے شاید مملکت تو مل سکتی تھی' اور قرآن کی رو سے تو وہ بھی نہیں مل سکتی' وراثت میں نہیں آسکتی۔ نبوت کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ جب نبوت جاری بھی تھی تو اس میں معیار یہ نہیں تھا۔ میں اس لیے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ عام طور پہ ہوتا ہے کہ صاحب! ان انبیائے بنی اسرائیل میں تو باپ کے بعد بیٹے میں نبوت آیا کرتی تھی۔ وہ اس لیے نہیں آتی تھی کہ بیٹے ہوتے تھے بلکہ معیار خداوندی کی رو سے نبوت کے وہ مستحق ہوتے تھے۔ اور یہ معیار کیا ہے' وہ خدا جانتا ہے۔ کہا ہے کہ وَ اللّٰہُ یَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ (2:105) ہم مختص کرتے ہیں اپنی اس نبوت کی رحمت کے لیے' اپنے پروگرام کے مطابق' جسے ہم اس کا اہل سمجھتے ہیں۔

نبی کی سب سے بڑی خصوصیت نہایت عمدہ عبد بننا تھا

خصوصیت کیا ہے کہ جس کی بنیاد پر نبی نبی بنا ہے؟ وہ تھی نِعۡمَ الۡعَبۡدُ (38:30) وہ میں نے کہا ہے کہ سب سے بڑی خصوصیت جو قرآن بتاتا ہے کسی انسان کی وہ خدا کی عبودیت ہے' خدا کا عبد ہونا ہے۔ اور یہ جو مقامِ عبودیت ہے' اطاعت کی انتہا ہے' نبی پر جا کر اس کی منتہا ہوتی ہے۔ نبی کا سب سے بڑا امتیاز یہ خصوصیت بتائی ہے کہ وہ خدا کا عبد ہوتا ہے اور پھر باقی مومنین بھی اس کے عباد ہوتے ہیں لیکن نبی کو خاص طور پہ کہا جاتا ہے: اشھد ان محمدًا رسول اللہ عبدہ و رسولہ۔ تو بڑی چیز جو ہے وہ نعم العبد ہے' نہایت عمدہ عبد! کیسے وہ عبد بنا تھا؟ کہا کہ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ (38:30) ہر معاملے میں وہ تیزی سے ہماری طرف آتا تھا' ہمارے قوانین کی طرف آتا تھا' ہر فیصلے سے پہلے وہ یہ دیکھتا تھا کہ اس باب میں خدا کا ارشاد کیا ہے۔ جب یہ چیز ہر فیصلے کے متعلق دیکھے تو اس سے زیادہ بہتر اچھا عبد اور کونسا ہوسکتا ہے!

شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی کی کیفیت اور ان کی جدوجہد کی داستان

اب حضرت سلیمانؑ کا ذکر آیا۔ میں نے بتایا ہے' تاریخ بتا رہی ہے کہ شوکتِ سلیمانیؑ' سطوتِ داؤدی بنی اسرائیل میں ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم میں بھی اس کی مثال کم ملے گی' ان لوگوں کی اتنی بڑی عظیم شوکت تھی۔ حضرت سلیمانؑ کے متعلق قرآن بتاتا ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ یہ علاقہ تو یہی فلسطین کا علاقہ' یہ شام کا علاقہ تھا' ان کے ہاں کے جو پہاڑی قبائل تھے' وہ بڑے جفاکش تھے اور یہ ہوتے ہیں۔ یہ تو

جو زرعی معیشت ہے' یہ ہل چلا کر اس میں پیدا ہو جانے والی یا ہل بھی نہیں چلانا پڑتا' اس میں ذرا آدمی سست ہو جاتا ہے۔ یہ پہاڑی علاقے کے لوگوں کو روٹی کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے' پہاڑی علاقے کے لوگ بڑے ہی جفاکش تھے اور یہ عام طور پر کسی کے قابو نہیں آتے۔ یہ ہمارے ساتھ پہاڑی علاقے کے جو لوگ تھے آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے متعلق بھی انگریز کے زمانے سے کیا ہوتا چلا آیا؟ کہ یہ جلدی سے قابو نہیں آتے ❶۔ حضرت سلیمانؑ نے ان پہاڑی علاقوں کے جو لوگ تھے ان کو بھی اپنے قابو کیا ہوا تھا' یہ بڑی چیز تھی۔ پھر اسی علاقے کے اندر یہ ایسے خانہ بدوش قبائل بستے تھے جو گھوڑے پالتے تھے۔ میں نے حضرت داؤدؑ کے قصے میں بھی بتایا تھا۔ گھوڑوں کا لشکر اس زمانے میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ پھر حضرت سلیمانؑ نے تو اپنا بحری بیڑہ بھی تیار کیا تھا' کشتیاں تھیں' وہ بادبانوں سے ہی چلتی تھیں لیکن وہ بڑی بڑی عظیم کشتیاں تھیں۔ ان کی بھی مثال دوسری مملکتوں میں نہیں ملتی تھی۔ یہ کچھ ان کے ہاں تھا۔ ان کے متعلق ذکر آ رہا ہے۔

کہا ہے کہ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ (38:31) ان کے ہاں بھی عمدہ عمدہ سبک رفتار گھوڑے تھے۔ وہ پچھلے پہر ان کا معائنہ کیا کرتا تھا۔ اس طرح وہ گھوڑوں میں اتنی دلچسپی لیتا تھا' یہ خدا کا عبد تھا' دوسروں پہ ہی ساری ذمہ داری نہیں تھوپ رکھی تھی' ذاتی طور پہ ایک ایک چیز کو دیکھتے تھے۔ پچھلے پہر وہ گھوڑوں کا معائنہ کرتے تھے۔ ان کی دو صفتیں بتائی ہیں: صّٰفِنٰتُ اور جیاد۔ صّٰفِنٰتُ تو ہیں: صف بستہ تیزی سے جانے والے اور یہ جو جیاد ہے' یہ تو بڑی چیز ہے۔ جس کو جود و صفا ❷ کہتے ہیں یہ انسانوں کی بڑی صفت ہے' یہ ''جید'' جہاں سے لفظ ہے' وہیں سے یہ لفظ ''جواد'' ہے' اس کا مادہ ''ج و د'' ہے۔ اسی سے ''جواد'' ہے اس کی جمع جِیادٌ ہے۔ جواد اعلیٰ درجے کا گھوڑا جو نہایت تیز رفتار ہو اور دوڑنے میں اپنی ساری طاقت صرف کر دے' ان کو اصیل گھوڑے کہیے۔ ان کے ہاں گھوڑوں کے اندر بھی وہ جو اصل بریڈنگ (Breeding) کے ہوتے ہیں' وہ ان کو اصیل کہتے ہیں۔ قرآن میں' اس کے لیے' یہ لفظ بڑے شرف کا ہے' بڑے ممتاز قسم کے جو گھوڑے تھے' وہ ان کے ہاں تھے' سہ پہر کے وقت وہ ان کو خود دیکھتے تھے' دوڑاتے تھے۔ اور اگلی بات آ گئی جو فرق کی ہے کہ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ (38:32) کہا تم دیکھتے ہو میں ان کے اندر بڑا انٹرسٹ (Interest) لے رہا ہوں' تو یہ بات نہیں ہے کہ ایسا کوئی واقعہ ہوا ہو اس لیے میں اس میں انٹرسٹ (دلچسپی) لے رہا ہوں۔ یہ اس لیے کہ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ (38:32) یہ خدائی پروگرام میں بہت کام دینے والے ہیں۔ مومن کی تو زندگی کا جو ہر رخ ہے وہ اسی سمت کی طرف جاتا ہے کہ وہ جو خدا نے منزل مقرر

---

❶ آج پاکستان میں پہاڑی علاقوں کی نسبت سے پیدا ہونے والی دہشت گردی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

❷ دو چیزوں کو اس طرح اکٹھا کر دینا کہ ان کے بعض حصے دوسرے حصوں کے ساتھ مل جائیں (محیط المحیط)۔ صَفَنَ الفرس يَصْفِنُ۔ صَفونًا گھوڑے کا اس طرح کھڑا ہونا کہ اس کے تین پاؤں زمین پر ہوں اور چوتھے پاؤں کا اس طرح اٹھا ہونا کہ اس کا اگلا حصہ (کنارہ) زمین کو مس کرتا ہے (تاج العروس)۔ (پرویزؒ: لغات القرآن' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961' ص ص۔ 1029-1028)

کی ہوئی ہے' اس کا ہر قدم اس کی طرف اٹھتا ہے۔ گھوڑوں میں بھی دلچسپی لے رہا ہوں اس لیے کہ یہ اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے سرانجام دینے کے لیے' بڑا عمدہ ذریعہ ہیں۔ یہ وجہ ہے۔ ذاتی طور پہ یہ بات نہیں ہے کہ محض گھوڑے ہونے کی حیثیت سے میں یہ کچھ کرتا ہوں۔ وہ اپنے ساتھیوں سے اسی قسم کے حقائق بیان کرتا جاتا تھا اور ساتھ ہی گھوڑوں کا معائنہ بھی کرتا جاتا تھا۔ **حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ** (38:32)۔ اب یہاں وہ بات آئی۔ حضرت داؤدؑ کے قصے میں تو آپ نے وہ افسانہ' وہ کہانی سنی تھی' ہمارے ہاں ان لوگوں نے کوئی نبی بھی ایسا نہیں چھوڑا کہ تورات میں کچھ افسانہ ہو اور ہماری اس کے اوپر تضمین نہ ہوئی ہو۔ یہ وہی ہے جسے شاعری کے اندر تضمین کہتے ہیں اور افسانہ در افسانہ پھر چلتے گئے' کسی نے سوچا نہیں کہ کن شخصیتوں کے متعلق ہم یہ کہہ رہے ہیں۔ قرآن **نِعْمَ الْعَبْدُ** (38:30) کہتا ہے' ان لوگوں کو اواب کہہ رہا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے عصر کی نماز قضا ہونے پر بیس ہزار گھوڑوں کو ذبح کرنے کے افسانے کا ماجرا

پچھلی دفعہ میں نے پہلے وہ افسانے بیان کیے تھے پھر مطلب بیان کیا تھا۔ یہ بات صاف سی ہے کہ وہ جب تیز دور نکل گئے' نگاہوں سے بھی پوشیدہ ہو گئے' تو انہوں نے آدمیوں سے کہا کہ ان سب کو ذرا واپس لاؤ یا ان میں سے جو آگے تیز دوڑ گئے ہوں گے وہ واپس لاؤ۔ قرآن اتنی جزئیات نہیں دیتا۔ بات تو یہ کرتا ہے کہ وہ کتنا زیادہ انٹرسٹ (دلچسپی) لیتے تھے۔ وہ دیکھ لیجیے کہ **عَنْ ذِكْرِ رَبِّیْ** (38:32) کہا ہے کہ یہ نظامِ خداوندی کی مدافعت کے لیے کام دیتے ہیں۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ جو گھوڑے پالے بھی ہیں' یہ اس مقصد کے لیے ہیں یہ ان میں دلچسپی بھی لے رہے ہیں۔ کہا کہ **رُدُّوْهَا عَلَیَّ** (38:33) ذرا ان کو واپس لے آیئے' واپس لائے **فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ** (38:33) وہ آئے تو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ان کی پنڈلیوں اور گردن سے گرد وغبار جھاڑنا شروع کر دیا۔ یہ تو عام طور پہ آپ دیکھیں گے گھوڑا جیت کے آئے' کسی طرح سے آئے' ریس کا بھی گھوڑا ہو یا دوڑ میں بھی آنے والا ہو' مالک آتا ہے' اس کو پکڑتا ہے' وہ تھوڑی سی گاجر کھلاتا ہے' تھپکی دیتا ہے' جسے کہتے ہیں کہ گھوڑے پہ ہاتھ پھیرتا ہے۔ مالک کا ایک پیار سے پھیرا ہوا ہاتھ جو ہوتا ہے' وہ گھوڑے کی تکان اتار دیتا ہے۔ تو وہ گھوڑے آئے اور یہ گئے' انہوں نے ان کو تھپکی دی' پنڈلیوں پر تھپکی دی' اس کو تھپتھپایا۔

بات بالکل صاف تھی لیکن اس صاف ہونے پر پھر اس میں لطف پیدا تو نہیں ہوتا' وہ زیب داستاں ہونی چاہیے۔ اس زیب داستاں کے لیے پھر یہ سوچتے نہیں ہیں کہ اس میں جو ہمارے ہاں جن کو ہم کردار یا Actor (معاذ اللہ) ہیرو بناتے ہیں' ان کے متعلق ہم کرتے کیا ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ ان گھوڑوں کے اس تماشے میں اتنے جذب ہوئے کہ ان کی عصر کی نماز قضا ہو گئی' اب انہیں اس کا اس قدر صدمہ ہوا' کہ انہوں نے کہا کہ ان کو واپس بلاؤ' ان کو بلایا۔ بعض روایتوں میں تو یہ ہے کہ یہ ایک ہزار گھوڑے تھے' بعض میں ہے

کہ یہ بیس ہزار گھوڑے تھے‘ ان کو بلایا اور اس غصے میں کہ ان کی وجہ سے میری نماز قضا ہوئی ہے‘ تلوار ہاتھ میں لی اور ان کو کاٹنا شروع ص237 کر دیا۔ یہ بیس ہزار یا کم از کم وہ جتنے بھی اصیل گھوڑے تھے‘ جن کو قرآن جیاد کہتا ہے کاٹنا شروع کر دیا۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے اکٹھے کیے ہوئے تھے‘ کس مقصد کے لیے کیے تھے؟ کہ جی! ذکر ربی کے لیے اکٹھا کیا ہوا رسالہ ہے۔ قصور ان کا کیا ہے؟ کہ ان کی وجہ سے میری نماز کیوں قضا ہوگئی۔ ’’اے تہانوں دو چار واری ٹیلیفون دا کنکشن نئیں ناملدا اتے فیر جدوں غصہ اوندا اے تے او ہینڈل ٹھا ماردے او وہدے اتے ❶‘‘ مغضوب الغضب آدمی کے لیے عام طور پہ آپ دیکھیں گے یہ کچھ کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک Bad Workman (بُرا کاریگر) جو ہے پھر وہ اپنے ٹول سے لڑتا ❷ ہے۔ یعنی نماز قضا ہوگئی‘ گھوڑوں کی وجہ سے ہوئی یا آپ کی وجہ سے ہوئی‘ نہیں جی! گھوڑوں کی وجہ سے ہوئی‘ سزا کیا دی جائے گی؟ سب کو کاٹ دیا۔ ہزار گھوڑا یا بیس ہزار گھوڑا کاٹ کر رکھ دیا۔ یعنی وہ ایک نماز عصر کی تو قضا ہوئی ہوگی محض اس لیے کہ دیکھتے رہے‘ یہ جو دس ہزار یا بیس ہزار کے کاٹنے کا ہے‘ وہ تو سال بھر کی نمازیں قضا ہوگئی ہونگی۔ یعنی آپ سوچیے کتنے وقت میں انہوں نے تلوار سے ان کو کاٹا ہوگا۔ افسانے والے خوش ہوگئے کہ صاحب! نماز کی یہ اہمیت ہے‘ کسی طرح سے ایک نماز اگر قضا ہو جاتی ہے تو وہ پرواہ نہیں کرتے‘ بیس ہزار گھوڑا اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتے ہیں۔ افسانہ بنا دیا۔ اس سے کچھ غرض نہیں کہ کس شخصیت کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ اجی! عام آدمی کے متعلق بھی کہا جائے تو آپ سوچیے کہ کیا اس کے متعلق اس کا کیا ردعمل ہوگا‘ میں تو کہنا نہیں چاہتا کہ وہ تو برگزیدہ شخصیت تھیں۔ ان روایات سے‘ ان احادیث سے‘ آپ انکار کیجیے تو منکرِ حدیث ہوئے‘ کفر کا فتویٰ لگا۔ بات تو اتنی سی تھی جو انہوں نے کہی ہے‘ اتنی سی بات تھی جسے انہوں نے افسانہ کر دیا‘ نہیں بلکہ افسانہ در افسانہ بنا دیا۔

حضرت سلیمانؑ کے بعد آپ کے بیٹے کی نالائقی کی بنیادی وجہ اصل میں حضرت سلیمان کا انشاء اللہ نہ کہنے کا نتیجہ تھی: ایک افسانہ

حضرت سلیمانؑ کے بعد ان کا جو بیٹا تھا‘ وہ نالائق سا تھا‘ وہ سلطنت کو سنبھالنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ انؑ کے بعد جو تخت نشین ہوا تو بڑی بغاوتیں پھیلیں۔ قرآن نے یہاں اس جگہ صرف اتنا ہی کہا ہے کہ وَ لَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَ اَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّهٖ جَسَدًا (38:34) وہ اس کے تخت پہ‘ اس کی کرسی پہ‘ اس کے اقتدار پر‘ جو بیٹھا ’’جینوں اسی کیندے آں ناکہ مٹی دا مادھوسی ❸‘‘ بس یوں سمجھیے کہ وہ پیکر سا

---

❶ یہ جو دو چار بار ٹیلیفون نہیں (ہاتھ نہ جانے آنگن ٹیڑھا) تو پھر غصے میں آکر اس کا ہینڈل دے مارتے ہو۔

❷ A bad work man quarrels with his tools.

❸ جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ مٹی کا مادھو تھا۔

ص237 تھا' آب وگل کا ایک مجموعہ تھا' اس میں انسانیت کی بات ہی کوئی نہیں تھی۔ قرآن نے اس کو جسد کہا ہے۔ کیا بات ہے! ایک لفظ میں ساری بات کہہ گیا ہے۔ وہ شکل وصورت ساری انسان جیسی تھی' بس جسم ہی جسم تھا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ اس کے بعد اس کے تخت پر بیٹھا' اس کا وہ وارث بنا۔ یہ بہت بڑی چیز تھی۔ حضرت سلیمانؑ کے لیے یہ بات بڑی وجہ کوفت تھی کہ اس کے بعد یہ چیز ہوگی۔ آگے تو یہ چیز ہے کہ ثُمَّ اَنَابَ (38:34)۔ وہ قوانین خداوندی کی طرف اور شدت سے رجوع کرتا۔ اس کے لیے اس نے دعائیں کیں' آرزوئیں کیں' کوشش بھی کی ہوگی۔ اب دو چیزیں آپ دیکھ لیجیے۔ ایک تو یہ ہے کہ یہ اس قسم کا بیٹا ان کے ہاں کیسے پیدا ہوا۔ بخاری شریف کی حدیث ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ میری بیٹیو! حجاب ہے' مجھے معاف رکھنا' حدیث ہے جو بیان کر رہا ہوں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک بار سلیمانؑ نے کہا کہ آج رات میں اپنی ستر عورتوں کا دورہ کرونگا''۔ دو تین جگہ مختلف روایتیں ہیں ان میں تعداد الگ الگ ہے حتیٰ کہ سو تک بھی تعداد ہے' سو عورتوں کا دورہ کرونگا۔'' اور ہر عورت حاملہ ہو کر ایک ایسا شاہسوار پیدا کرے گی جو راہ خدا میں جہاد کرے گا۔ حضرت سلیمانؑ کے ساتھی (یعنی فرشتہ) نے کہا کہ انشاء اللہ کہو لیکن حضرت سلیمانؑ نے نہ کہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی عورت حاملہ نہ ہوئی۔ صرف ایک عورت کے آدھا بچہ پیدا ہوا۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر سلیمانؑ انشاء اللہ کہہ دیتے تو سب (سوار پیدا ہوتے اور) راہ خدا میں جہاد کرتے''۔ گھوڑوں کے بارے میں وہ ایک نماز قضاء ہونے کا تھا اور شاہسوار پیدا ہونے کے سلسلے میں یہ انشاء اللہ نہ کہنے سے ہوا۔ یہ تھا وہ آدھا بچہ جس کے متعلق کہا کہ وہ پھر تخت پہ بیٹھا تو وہ جسد تھا' بے روح تھا۔

عزیزان من! یہ اتنا ہی نہیں کہ یہیں تک ہی ہو جائے کہ وہ نالائق بیٹا بیٹھا تھا۔ دوسرے مقام پہ بھی یہ ذکر آتا ہے۔ کہا ہے کہ **فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِى الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ** ((34:14 اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا' اس کا جانشین ہوا لیکن وہ اپنے دادا کی طرح نہ تھا۔ وہ محض ایک انسان نما حیوان تھا۔ بس آب وگل کا ایک متحرک پیکر۔ چنانچہ اس کے ہاتھوں شوکت داؤدی اور سطوت سلیمانی سب ختم ہوگئ' بنی اسرائیل کے دس قبائل اس سے سرکش ہو گئے۔ چنانچہ جب ان وحشی قبائل نے جو سلیمان کے عہد میں اس طرح اطاعت شعار اور فرماں پذیر تھے اس صورت حال کو دیکھا تو وہ بھی سرکش ہو گئے اور انہیں افسوس ہوا کہ وہ اپنے پرانے خیال کے مطابق اتنا عرصہ یوں یونہی اس جسدِ جان کی غلامی کرتے رہے۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ اس حکومت کا صرف نام ہی باقی ہے اور اس کے پیچھے قوت کچھ نہیں رہی تو وہ اتنا عرصہ اس ذلت آمیز عذاب میں کیوں مبتلا رہتے؟ اس سے بات صاف ہے کہ ان کے بعد جوان کا بیٹا تھا' وہاں اسے جسد کہا ہے' یہاں دآبہ کہا ہے۔

حضرت سلیمانؑ کی بیٹے کی تخت نشینی کے باعث مملکت پر پڑنے والے اثرات ص237

دابہ کے معنی ہوتا ہے ''یونہی سانس لینے والا۔کوئی حیوان بھی ہو اس کو عربی زبان میں دابہ کہتے ہیں'' اور قرآن کریم میں دآبہ کہا جاتا ہے ''جو زمین پہ پاؤں رکھ کر زمین کو دبا کر یوں چلنے والا ہو''۔ کہا ہے کہ وہ حقیقت میں دآبہ تھا' وہ جسد تھا' بے روح پیکر تھا تو وہ تخت پر بیٹھا' آہستہ آہستہ گھن کھائی لکڑی کی طرح اس نے اس تخت کو کر دیا۔ وہ جو وہاں جن کہا گیا ہے' جن وہ پہاڑی صحرائی علاقے کے لوگ تھے' جن کو حضرت سلیمانؑ کے اقتدار نے محکوم رکھا ہوا تھا' تو ان کو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو بڑا ہی کمزور اور بڑا نالائق ہے' انہوں نے افسوس کیا کہ اگر ہمیں پہلے معلوم ہوتا تو ہم کبھی اس کی محکومیت اختیار ہی نہ کرتے' ہم اس کی اطاعت ہی نہ کرتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا ہوگا کہ مجھے دفن نہ کرنا' ایسا کرنا کہ یہی جو میرے شاہانہ کپڑے وغیرہ ہیں' اسی طرح سے مجھے پہنا کر اور غالباً یہی ہوگا کہ کوئی شیشے کا ایک کیس ہوگا' جس میں سے نظر آتے رہیں' اس قسم کے کیس کے اندر مجھے کھڑا کر دینا' یہ میرا عصا ہے' یہ میرے ساتھ یوں یہاں دیدینا اور میں وہاں کھڑا رہونگا' اور تم لوگ یہ مشہور کرنا کہ اسی طرح سے یہ زندہ ہیں' سب کچھ دیکھ رہے ہیں' یہیں سے اپنے فرمان جاری کریں گے۔ یہ تخت پہ بیٹھنے کی یہ ایک چیز جو جگہ ہے اس طرح سے وہ کھڑے ہیں۔ وہ وہاں اس طرح سے یہ کھڑے رہے اور یہ سارے جتنے تھے' وہ اطاعت کرتے رہے یہ سمجھ کر کہ یہ زندہ کھڑے ہیں۔ کہنے لگے کہ رہا تو یہ بڑا کامیاب' یہ ان کے ہاں کی جو اسکیم تھی لیکن اس سوٹی کو دیمک لگ گئی وہ جو یوں رکھی ہوئی تھی۔ بس یہ رہ گئی بات' دیمک نے اس کو کھا لیا' اس کو گھن لگ گیا' یا دیمک لگ گئی' وہ لکڑی جو تھی وہ کھوکھلی ہو کر کمزور ہو گئی اور ایک دن وہ لکڑی جو گری تو لکڑی کے ساتھ ہی وہ بھی گرے' وہ گرے تو یہ سارے جتنے تھے' انہوں نے کہا ارے دیکھو تو سہی ہم اس کی اطاعت کر رہے تھے' ہمیں پہلے پتہ ہوتا تو ہم کبھی بھی اطاعت نہ کرتے' تو سارے سرکش ہو گئے۔ یہ بھی قصہ ہو گیا کہ وہ بیٹا ایسے پیدا ہوا۔ یہ انبیائے کرامؑ کی سیرت آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہے جو شرف وتکریم انسانیت کے معراج کبریٰ پر فائز ہوتے ہیں۔ بہرحال مجھے آگے بڑھنا چاہیے۔

ذکر کچھ حضرت سلیمانؑ کی شوکت وحشمت کا نیز لفظ شیطان کی ماہیت اور وضاحت

قرآن بتاتا ہے کہ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ((38:35 کہا کہ میں اپنی طرف سے تو پوری کوشش کرتا ہوں' تیری رحمت وبرکت بھی شامل حال ہو تو اس قسم کی مملکت ہو جو میرے بعد بھی کسی کو نہ ملے' اس کا انتظام ایسا کر دے۔ کہا کہ ہم نے اس کی زندگی میں تو یہ کچھ کیا۔ اب آگے آتا ہے کہ سلیمانؑ کی کیا کچھ شوکت وحشمت تھی' وہ کتنی بڑی تھی! یہ کہ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ((38:36۔ میں نے کہا تھا کہ انہوں نے اپنا کشتیوں کا بیڑہ بنایا تھا' جو

بادبانوں سے چلتی تھیں' یہ اس زمانے کے اندر بڑی چیز تھی کہ ان کا کشتیوں کا بیڑہ بھی تھا۔ کہا کہ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ 237ص (38:37)) شیطان بھی اکٹھے کیے ہوئے ہیں۔ شیطان تو ہمارے ہاں ایک ہی کہتے ہیں جبکہ یہاں جمع کے صیغے شیاطین آجاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب جی اس کے جولاؤلشکر ہیں' ان کو بھی ساتھ یہ کہا جاتا ہے ورنہ شیطان تو وہ ایک ہی ہے ان کے ذہن میں۔ بات میں سے بات نکل آئی انہوں نے کبھی سوچا نہیں کہ شیطان کا مقام کیا مقرر کرتے ہیں۔ شیطان کے متعلق یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی بھی انسان ہے' اس کے ساتھ وہ شیطان ہوتا ہے اور اس کو بہکاتا ہے۔ گویا دنیا میں جہاں انسان ہے ہر جگہ وہ شیطان موجود ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں صرف اللہ تعالیٰ کی یہ صفت بتائی ہے کہ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ((57:4 جہاں کہیں انسان ہوتا ہے خدا اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اندازہ لگائیے' عزیزانِ من! کبھی سوچا انہوں نے کہ ہم کیا کررہے ہیں' یعنی شیطان کی وہ خصوصیت بیان کررہے ہیں جو خصوصیت کبریٰ صرف خدا کی انفرادیت ہے' کسی اور کی ہو ہی نہیں سکتی کہ ہر مقام پہ' ہر وقت موجود ہو۔ بڑے فخر سے بولتے چلے جائیں گے' پوچھنے والا کون ہے؟ کوئی نہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم' سرکش گروہوں کے یہ جو سرغنے ہوتے ہیں انہیں شیطٰن کہتا ہے۔ شیطٰن کے معنی ہی ہوتا ہے ''یہ شعلہ اٹھنے والی چیز''۔ شیطان ہوتا ہی وہ ہے کہ جو سرکش ہو جاتا ہے قوانین خداوندی سے۔ یہ اقدار خداوندی سے سرکشی کا نام ہے۔ ہر انسان اپنا شیطان آپ ہوتا ہے' جونہی اس کے جذبات احکام خداوندی' اقدار خداوندی سے سرکشی برتیں وہ شیطان ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک شیطان ہے وہ ہر انسان کے ساتھ ہر جگہ ہوتا ہے بلکہ ہر انسان کے اندر اس کا شیطان ہوتا ہے۔ قوانین خداوندی کے تابع رکھے تو یوں کہیے کہ وہ ملکوت ہوتا ہے' اس سے سرکشی برتے تو وہ شیطان ہوتا ہے۔

سرکش قبائلی اقوام کے کارنامے اور اُن پر حضرت سلیمان علیہ السلام کے کنٹرول کا ذکر اور ہمارے ہاں نقشِ سلیمانی کے تصورات

عزیزانِ من! یہ جتنے سرکش قوموں کے' قبائل کے بڑے بڑے سرغنے ہوتے تھے ان کو شیاطین کہتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان اقوام کے بڑے بڑے سرکش سرغنے تھے' حضرت سلیمانؑ نے ان کو بھی مطیع فرمان بنا رکھا تھا۔ وہ شیطان کیا کرتے تھے؟ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ((38:37 وہ ان کے معمار تھے۔ ہیکل سلیمانی کے کھنڈرات آج تک آپ دیکھیے' اب تو خیر مٹ چکے ہوئے ہیں' جو بڑی بڑی عمارتیں بنائی ہوئی تھیں' اتنے اتنے بڑے پتھروں کی عمارتیں تھیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے کہ اس زمانے میں کرین تو ہوتے نہیں تھے' کیسے یہ لوگ بناتے تھے؟ یہ تھے پہاڑی قبائل' یہ بنآء تھے' ان کے معمار تھے' غواص تھے' سمندروں میں غوطے لگاتے تھے۔ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ((38:38 اور جو ان میں اس سے بھی سرکشی اختیار کرتے تھے تو وہ ان کو جکڑ دیتا تھا۔ اب یہ سارا کچھ

بتائیں گے اور آپ کو پتہ ہے کہ نقش سلیمانی کسے کہتے ہیں؟ وہ وردو ظیفے' حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کے ہیں' وہ جادو کے ٹوٹکے ہیں اسم اعظم ہے کہ وہ ایسے کرتے تھے' لکیر ایک کھینچ دیتے تھے' اس کو حصار کہتے ہیں۔ وہ جو کہا ہے کہ ان کو سلیمانؑ زنجیریں پہنا دیتا تھا' بیڑیاں پہنا دیتا تھا تو وہ کہتے ہیں کہ وہ ان کے گرد ایک حصار کرتا تھا۔ جو سرکشی اختیار کرتا تھا اس کو اس طرح سے وہ جکڑ تا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ هٰذَا عَطَآؤُنَا ((38:39 یہ ساری قوت' یہ سب کچھ ہماری عطا کردہ تھی۔ اُس سے کہا ہوا تھا کہ فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ((38:39 ان میں سے جو بھی تم سمجھو کہ اب مطیع وفرمانبردار ہو گئے' ان کی تربیت ہو گئی' وہ انسانیت کے زمرے میں آگئے ہیں' ٹھیک ہے ان کو پھر اس سے آزاد کردو' کہ کام کاج کریں۔ جو ابھی اس قابل نہیں ہوئے' ان کو اس طرح سے ذرا ابھی پابند رکھو' ان کی تربیت کرتے چلے جاؤ۔ جو عطآئے خداوندی ہے' اس میں تو استبداد کا پہلو نہیں ہو گا' یہ تو ان سرکشوں کی تربیت ہے۔ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ((38:40 سلیمانؑ نے اپنے آپ کو ہمارے قوانین کے بہت قریب رکھا تھا اور ہر معاملہ میں انہی کی طرف رجوع کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے ہر کام کا مآل نہایت حسین اور خوشگوار ہوتا تھا۔ یہ ہیں وہ پیغمبر جن کے یہ افسانے بتائے جارہے ہیں۔ شروع میں نِعْمَ الْعَبْدُ ((38:30 کہا' اواب کہا' آخر میں یہ کہا کہ یہ تھے وہ جن کا مرتبہ ہمارے ہاں بڑا بلند تھا' وَحُسْنَ مَاٰبٍ ((38:40 ان لوگوں کا نہایت اچھا لوٹ کر آنے کا ٹھکانہ تھا۔ انبیائے کرامؑ کی باتیں ہو رہی تھیں۔

حضرت ایوبؑ کا ذکرِ خیر آپ علیہ السلام کو سانپ کے ڈسنے کا واقعہ

عزیزانِ من! یہی جو سلسلۂ انبیائے کرامؑ ہے' اس میں آگے حضرت ایوبؑ کا ذکر آرہا ہے۔ کہا ہے کہ وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ((38:41۔ یہاں وہی عبد ہے نبی کے ساتھ' جو کسی انسان کا بلند ترین امتیاز ہو سکتا ہے۔ کہا ہے کہ ایوبؑ بھی ہمارے عبد تھے' اس کی سرگزشت بھی سامنے رکھو۔ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ((38:41 وہ ایک سفر میں بڑی جانکاہ مصیبتوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے ساتھی اس سے بچھڑ گئے۔ پانی ختم ہو گیا' وہ سفر کی تکان اور پیاس سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس پر اسے سانپ نے ڈس لیا۔ اس طرح اسے مصائب وتکالیف کے ہجوم نے گھیر لیا۔

عزیزانِ من! آگے چل کر جو اور الفاظ آتے ہیں' اس سے نظر آتا ہے کہ وہ کہیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر گئے تھے۔ قرآن ان جزئیات تک تو نہیں جاتا' بات تو اتنی ہی کرتا ہے جس میں کچھ ہمارے لیے نصیحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ تو وہاں ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئے' اکیلے رہ گئے' اس اکیلے رہنے سے' وہاں انہیں کہیں سانپ نے ڈس لیا۔ ویسے ہی سانپ کا ڈسنا ہی بڑی چیز تھی' پھر اس کے ساتھ تنہائی بھی تھی۔ سانپ ڈسنے کے بعد بڑی شدت کی پیاس لگتی ہے' کہتے ہیں کہ شاید یہ اس کے زہر کی وجہ سے ہے یا خون نکلتا

ہے، وہ اس وجہ سے ہے۔ اب قرآن نے یہاں کہا ہے کہ انہوں نے خدا کو پکارا کہ مجھے شیطان نے ڈس لیا ہے، پیاس کی شدت ہے، بڑی 237 صٓ تکلیف ہے۔ یہ تو شیطان کے معنی شیطان ہی لیتے ہیں اور حیرت ہے کہ یہ سارے تفسیر لکھنے والے بھی عرب تو تھے، کم از کم، انہی کی تفاسیر موجود ہیں۔ یہ جو کوبرا سانپ (Cobra Snake) ہے، جو پھن والا سانپ ہے، یہ عرب اس کو شیطان کہتے تھے۔ وہ جو ان کے ہاں تو ہم پرستیاں تھیں یہ دیوتے بنے ہوئے، وہ تو آجکل بھی وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کے پھن کے پیچھے انسانوں کے نقش ہوتے ہیں، وہ اخباروں میں نکل رہا ہے۔ تو آپ سوچیے کہ اس زمانے میں ان کے سامنے اگر ایسے آئیں۔ ایک تو یہ جو تھوہر ہوتی ہے، وہ تھوہر ہی وہ سانپ پھنی تھوہر کہلاتی ہے اور ناگ پھنی بھی، تو وہ جو ناگ پھنی تھوہر کہلاتی ہے، اس قسم کا جو ناگ تھا جس کا وہ اوپر پھن ہوتا تھا، جسے ہم کوبرا کہتے ہیں، وہ اس کو شیطان کہتے تھے۔ سرمایہ دار کے متعلق قرآن نے یہ تشبیہ دی ہے کہ ہوس زر میں اس کی ایسی کیفیت ہوتی ہے جیسے سانپ نے کسی کو ڈس لیا ہو اور وہ تڑپ رہا ہو، اتنی زیادہ پیاس لگی ہوئی ہو کہ پانی پیے جائے اور پیاس بجھے نہیں۔ بڑی عمدہ تشبیہ ہے لیکن یہاں تو انہوں نے وہ وہی بات کہی۔

سانپ ڈسنے کے سلسلہ میں علاج کی خاطر حضرت ایوب علیہ السلام کو وحی سے راہنمائی دی جارہی ہے

یہاں میں نے کہا ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ مجھے تکلیف ہے، شدت سے درد ہے۔ دوسری جگہ قرآن نے بیان کیا ہے، وہاں بات صاف ہوگئی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن سمجھنے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ دوسرے مقام پہ دیکھو وہ بات کیا کہتا ہے۔ وہاں دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ وَ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ (21:83)۔ یہاں لفظ صاف کہہ دیا ہے کہ سخت مضرت کی چیز ہے، بڑی تکلیف دہ چیز ہے۔ اور یہاں (38:41) میں وہ کہا کہ سانپ نے ان کو ڈس لیا، بڑی تکلیف ہوئی، شدت کی پیاس بھی لگی ہوئی تھی، اکیلے تھے، کچھ سوجھتا نہیں تھا کہ کیا کیا جائے۔ اُس زمانے کے حضرات انبیائے کرامؑ کی جو قرآنِ کریم داستانیں بیان کرتا ہے وہ دور ابھی ایسا تھا جہاں ان چیزوں کی تحقیق نہیں ہوئی تھی، اس قسم کی چیزیں بھی وحی کے ذریعے سے ان کو آتی تھیں۔ حضرت نوحؑ کو قرآن کہتا ہے کہ ہم نے کہا: کشتی بناؤ۔ اُنہوں نے کہا کہ میں تو جانتا ہی نہیں کہ کشتی ہوتی کیا ہے چہ جائیکہ مجھے معلوم ہو کہ کشتی بناتے کس طرح سے ہیں۔ قرآن میں خدا کہتا ہے کہ ہم نے اسے وحی کے ذریعے سے کشتی بنانا سکھایا۔ اسی طرح یہ انبیائے کرامؑ کے قصوں میں جو بات بھی آتی ہے وہ فوق الفطرت، سُپر نیچرل نہیں ہوتی، عام قانون فطرت کے تابع ہوتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اگر ان کو علم نہیں ہوتا تو خدا کی طرف سے اس کا علم دیدیا جاتا ہے، وحی یہ کرتی ہے لیکن ان کو جو طریقے سکھاتی ہے، وہ سارے وہی ہوتے ہیں جو فطری ہوتے ہیں۔ اب اس حالت میں ان سے علاج کا کچھ کہا گیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ چشمے ایسے ہوتے ہیں مثلاً گندھک کے چشمے' گرم پانی کے چشمے۔ ان میں نہانے سے انفیکشن (Infection) دور ہو جاتی ہے' یہ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ دلی (انڈیا) کے قریب تو یہ چشمے تھے اور پوچھو نہیں کتنی دور دور سے لوگ آتے تھے۔ کراچی میں بھی منگو پیر کے پاس وہ کہتے ہیں کہ یہ چشمے موجود ہیں۔ بہرحال گندھک کے چشمے ہوتے ہیں اور یہ یورپ میں تو بڑے اہم ہیں' وہاں تو ان لوگوں نے انتظامات کر رکھے ہیں' Skin Diseases (جلدی بیماریوں) کے لیے دنیا بھر سے لوگ جاتے ہیں۔ اُس میں کوئی چیز فوق الفطرت' سپر نیچرل نہیں ہوتی۔ خدا یہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے اس کو پتہ بتایا کہ ذرا ادھر جاؤ' وہاں تمہیں ایک چشمہ ملے گا۔ کہا کہ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ((38:42 وہاں تم دیکھو گے کہ ٹھنڈے پانی کے بھی چشمے ملیں گے جہاں پیا بھی جائے گا' اس قسم کے بھی ملیں گے' وہاں جا کر اپنے پاؤں کو اس چشمے کے اندر ڈبوؤ اور تھوڑا اہلاؤ' فائدہ ہو جائے گا۔ یہ ایک علاج بتایا جا رہا ہے' نیچرل چیز ہے' یہ کرو۔ قرآن ساری کڑیاں بیان نہیں کرتا' یہ کوئی Story Teller (داستاں گو) نہیں ہے' درمیان میں Gap (خال) چھوڑ دیتا ہے کہ Fill in the gap (خال پُر کرو) تو آپ خود کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہے کہ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ((38:43 اس کے بعد جو تھوڑا بہت باقی رہ گیا تھا' بعد میں جو After Effects (بعد کے اثرات) ہوتے ہیں' اس کے لیے اگلی آیت میں ہے کہ کیا کیا لیکن اتنے میں وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ کہنے لگے کہ اتفاق ہے کہ ''وہ جو اپنے لوگ ان سے چھوٹ گئے تھے' وہ بھی اس کے ساتھ اس کو مل گئے اور پھر وہ اس قابل بھی ہو گیا کہ چل پھر بھی سکے''۔ اب یہاں پھر یہ کہا ہے کہ وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ((38:43 ہم نے بات بتائی ہے جو عقل و فکر سے کام لیں گے انہیں اس کے اندر ایک بڑا سبق ملے گا کہ اگر اس قسم کی کوئی چیز ہو جائے' کسی طرح کوئی سانپ ڈس لے' اتنی تکلیف ہو' تو وہاں جاؤ' جو چیز Dis-infect (عفونت ربا) کرنے والی ہو' اس سے آرام ہو جائے گا۔ اگر یہ کوئی سپر نیچرل چیز تھی جو خدا نے ان کو بتائی تھی تو یہ اولی الالباب اس سے کیا سبق حاصل کریں گے۔ وہ تو عقل و فکر کو یہاں اپیل کر رہا ہے۔

سانپ کے ڈسنے کا علاج جھاڑ پھونک کی بجائے جڑی بوٹیوں سے تجویز کیا گیا

اگلی چیز پھر یہ کہی کہ یہ جو باقی رہ گیا ہے اس کے لیے یاد رکھو وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ((38:44 یہ ہے وہ بات۔ کہا کہ وہ جھاڑ پھونک کی طرف نہ چلے جانا' کوئی ورد وظیفے کی بات نہ کر لینا' حضرت صاحب سے نہ کہنا کہ لب لگا دیں' کہا کہ یہ ساری تو ہم پرستیاں ہیں۔ یاد رکھو! قاعدے سے علاج کرنا ہے' یہ جڑی بوٹیاں بتا دی گئیں کہ یہ یہ بوٹیاں ہیں' ان کو لو' مٹھی بھر بوٹیاں لو' اس کے بعد وہ جو زخم رہ گیا ہوگا' اس پہ ان بوٹیوں کو ملو۔ ''مٹھی بھر بوٹیاں لو اور اس پہ ملو'' وَلَا تَحْنَثْ ((38:44 نے بات صاف کر دی

کہ توہم پرستی کی طرف نہ جانا' یہ جولوگوں کے غلط خیالات ہیں' ایسے موقعوں پر یہ غلط سمت کی طرف کر دیتے ہیں' یہ کچھ نہ کرنا' قاعدے ص237 کے مطابق کرنا۔ اسی لیے تو اولی الالباب کو کہا کہ تمہارے لیے بڑی سبق آموز بات ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ آج کے دور میں اس چیز کی طرف جانے کی ضرورت نہیں ہے' ہر جگہ جو Dis-infection (عفونت) ہوتی ہے اس کا علاج کراؤ' یہ چیزیں باقی رہ جاتی ہیں' ٹھیک ہے جڑی بوٹیوں سے ان کا علاج کرلو۔ ہم نے اس سے کہا کہ یہ جڑی بوٹیاں ہاتھ میں لے لو' ان سے مالش کرو۔ کہا کہ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ((38:44) اس کو بڑی تکلیف تھی' لیکن جو کچھ ہم نے اس کو بتایا' یہ نہیں ہوا کہ اس نے کہا کہ ''یار کتھوں دم کرا ای لو تھوڑا اجیا' ٹھیک ہے' اے دے نال علاج وی چنگا ہیگا' اے جیہڑا کرونے ہیگے آں' کتھے دم درود وی چنگا ای ہوندا اے نا [1]''۔ یہ کون کرتا ہے؟ وہ جس میں استقامت نہیں ہوتی' جس میں تلون ہوتا ہے وہ یہ علاج وہ علاج' وہ ایلو پیتھک بھی' وہ یونانی بھی اور وہ ہومیو پیتھک بھی' پھر وہ درود بھی کراتے ہیں' اس کے بعد وہ تعویذ بھی اور گنڈے بھی۔ قرآن نے کیا بات کہی ہے کہ وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ((38:44) وہ تکلیف برداشت کر گیا لیکن اس قسم کی توہم پرستیوں کی طرف نہیں گیا۔ نِعْمَ الْعَبْدُ ((38:44) وہ کیسا اچھا فرمانبردار تھا! اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ((38:44) وہ ہر بات میں ہماری طرف آتا تھا' ان چیزوں کی طرف نہیں جاتا تھا۔ کیا بات ہے! اولی الالباب کے لیے کتنا بڑا سبق ہے کہ ایسے معاملات کے اندر' ہم نے جب فطرت کے قوانین بنا دیئے ہیں' مرض ہے' مرض کی تشخیص کراؤ اس کے علاج کے لیے دوائیاں ہم نے بنا دی ہیں' خدا کی بنائی ہوئی دوائیاں ہیں' انہی میں یہ تاثیر ہے ''اواب'' ان کی طرف آؤ' اس سے یہ علاج کراؤ' توہم پرستیوں کی طرف کیوں جاتے ہو۔

حضرت ایوبؑ کا اپنی قسم کو پورا کرنے کا طریق: ایک افسانہ

عزیزانِ من! سوچیے کہ کس زمانے میں یہ بات ہو رہی ہے لیکن اس سے تو آپ کو کچھ لطف نہیں آیا' بار بار میں یہ لفظ بولتا ہوں کہ یہ لطف کی بات کہاں سے چلتی تھی۔ کہا کہ یہ بوٹیاں ہاتھ میں لے لو۔ اب آتی ہے روایت کہ جب ان کو یہ تکلیف تھی' تو ان کی جو بیوی تھی' بڑی بیچاری اطاعت گزار تھی لیکن یہ بڑے غصے والے تھے' تو کوئی بات ایک دن ہوگئی کہ وقت کے اوپر بیچاری انگوٹھیاں نہیں پہن سکی یا کوئی چیز نہیں لا سکی۔ کہنے لگے: کوئی بات نہیں' مجھے اچھا ہونے دو' تمہیں سو چھڑیاں مارونگا' یہ سو درّے تمہیں مارونگا' اور قسم کھالی کہ خدا کی قسم ایسا کرونگا۔ اب اس کے بعد ''او تے کیندی ہوئے گی اچھا نہ ای ہوویں توں [2]'' وہ اچھے ہو گئے' اب وہ قسم کھا بیٹھے تھے۔ اب سوچیے تو سو کوڑے وہ کھا سکتی تھی؟ قسم کھا بیٹھے تھے کہ کیا کروں اب قسم کھا بیٹھا ہوں۔ کہا کہ خدا نے یہ کہا کہ کوئی بات نہیں' یہ بہاری (جھاڑو) کے سو تیلے لے لو' اپنی مٹھی میں لے لو اور اس کو ایسے ایک دفعہ کردو' شرط پوری ہوگئی۔ یہ خدا کا نبی ہے' اپنی قسم پوری کر رہا ہے' خدا حیلہ بتا رہا ہے۔ یہ کن کی

---

1. یار! کہیں سے دم درود بھی تھوڑا سا کرالو۔ ٹھیک ہے یہ جو کراتے ہیں اس کے ساتھ بھی علاج اچھا ہو جاتا ہے۔ کہیں دم درود بھی اچھا ہی ہوتا ہے۔
2. وہ تو کہتی ہوگی کہ تو اچھا نہ ہی ہو۔

باتیں ہورہی ہیں: خدائے تعالیٰ کی باتیں ہورہی ہیں' اس کے انبیاء کی باتیں ہورہی ہیں۔ وہ بتا رہا ہے کہ کوئی بات نہیں ہے' قسم کھا بیٹھے ہو وہ یوں پورا کرو اور انہوں نے اسی طرح سے وہ ایک مٹھا لیا اور یوں اس نے کیا اور وہ پھر اللہ اکبر خوش ہو گئے صاحب! کہ موج ہوگئی' قسم پوری ہوگئی۔ اب آپ کہیں گے تو ہاتھ میں تنکوں کا یہ کہ بات ہوگئی' افسانہ ہوگیا' تو وہ تو کہتا ہے کہ جو عقلمند ہیں ان کے لیے اس میں بات ہے' کہنے لگے کہ اس میں عقلمند کے لیے بڑی بات ہے۔

زنا کی سزا سو کوڑوں سے بچنے کے لیے جناب مودودیؒ کا تفسیری بیان

یہ زنا کی سزا سو کوڑے ہیں' یہ ان سزاؤں کے اوپر تبصرہ کرتے ہوئے مجھے مصیبت ہے' بار بار کہنا پڑتا ہے لیکن میں اس لیے مودودی مرحوم (1903-1979ء) کا نام کہتا ہوں کہ Latest (جدید ترین) تفسیر ان کی ہے اور ان کو بڑا ماڈرن سمجھا جاتا ہے۔ اُنہوں نے اس پہ تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے ''تفہیم القرآن کی تیسری جلد کا 341 صفحہ'' ہے۔ انہیں فکر پیدا ہوگئی کہ یہ سو کوڑے مارنے ہیں' کہا کہ اگر وہ مجرم کمزور ہو' بیمار ہو' بوڑھا ہو تو سو کوڑے تو کھا نہیں سکے گا' انہوں نے لکھا یہ ہے کہ ہمارے لیے ہدایت ہے اس کے اندر جو خدا نے دی ہوئی ہے' چاہیے یہ کہ ایک بہارو (جھاڑو) لے لو' اس میں سو تنکے رکھ کر اس کو یوں ایک دفعہ مار دیجیے تو یہ جو جرم ہے اس کی سزا کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ یہ تفہیم القرآن ❶ کے اندر لکھا ہے' وہ قانون بتا رہے ہیں کہ سو کوڑے کا وہ تقاضا پورا ہو جائے گا تو آپ نے سوچ لیا کہ ان سے پھر کیا کیا استنباط کیے جاتے ہیں۔ آپ حیران ہوتے ہونگے کہ یہ افسانے' یہ اس قسم کی کہانیاں رکھی ہوئی کیوں ہیں' کس کام کے لیے رکھی ہوئی ہیں؟ یہ یونہی کوئی واعظ نہیں ہے جو یہ کہہ رہے ہیں' میں نے عرض کیا ہے کہ اتنا بڑا مفکر جس کو کہا جاتا تھا' ان کو تو اللہ کا شاہکار کہا جاتا ہے' ان کی تفسیر میں یہ جو جرم زنا کی سزا سو کوڑے ہیں' اس پہ تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ عدالت یہ دیکھ لے کہ اگر وہ سو نہیں برداشت کرسکتا تو پھر وہ اپنی Judgment (فیصلے) کے اندر لکھ دیں گے کہ سو تنکے لے لیے جائیں اور اس کو وہ سو تنکے مار دیئے جائیں۔ اُس نے کہا تھا کہ قسم کا تقاضا پورا ہو جائے گا' یہ کہتے ہیں قانون کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔

عزیزانِ من! اب ہم سورۃ صٓ کی آیت 44 تک آ گئے' 45ویں آیت سے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ



❶ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: تفہیم القرآن جلد سوم' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' 1993' ص۔ 341۔

چوتھا باب: سورۃ صٓ (آیات 45 تا 78)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ
ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۷﴾ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا
الْكِفْلِ ؕ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۸﴾ هٰذَا ذِكْرٌ ؕ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۹﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً
لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴿۵۰﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿۵۱﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ
الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿۵۲﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾ هٰذَا ؕ
وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾ هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ
وَّغَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴿۵۸﴾ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ
صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۫ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾
قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿۶۱﴾ وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا
نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿۶۲﴾ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿۶۳﴾ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ
اَهْلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۶۵﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۶۶﴾ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿۶۷﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿۶۸﴾ مَا كَانَ
لِيَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰۤى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۶۹﴾ اِنْ يُّوْحٰۤى اِلَيَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۰﴾ اِذْ قَالَ رَبُّكَ
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿۷۱﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾
فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ
يٰۤاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ
اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷۶﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۷۷﴾ وَّاِنَّ
عَلَيْكَ لَعْنَتِيْۤ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۷۸﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1980ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ صٓ کی آیت 45 سے ہو رہا ہے صٓ (38:45)۔

قرآن حکیم میں انبیائے کرام کے تذکرے کا انداز

سابقہ آیات میں تذکار جلیلہ اولوالعزم انبیائے کرامؑ حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ حضرت ایوبؑ کا تھا۔ ان کے متعلق تفصیل سے گفتگو کی گئی تھی۔ اور اس کے بعد کچھ انبیائے کرامؑ کے صرف اسمائے گرامی دیئے گئے ہیں' ان کے تفصیلی تذکرے دوسرے مقامات پر ہیں۔ ان کے متعلق کچھ خصوصیات مختصر الفاظ میں بیان کر دی گئی ہیں اور تفصیل ان کے متعلق چاہیے تو دوسرے مقامات پر مل جائے گی۔ قرآن کا انداز یہی ہے' ایک جگہ وہ تفصیل بیان کرتا ہے' دوسرے مقامات پر صرف اس کا حوالہ دیتے ہوئے آگے گزر جاتا ہے۔

اب یہاں یہ کہا کہ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ (38:45)۔ یہ تو ایک ہی سلسلۂ زرّیں کی کڑیاں ہیں: حضرت ابراہیم علیہ السلام جنہیں امتِ مسلمہ کا مورثِ اعلیٰ کہتے ہیں اور آگے ان کی شاخ ہے جہاں سے انبیائے کرامؑ چلتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ ان کے بیٹے ہونے کی وجہ سے یہ نبی ہو گئے تھے بلکہ یہ بات ہے کہ کچھ آگے نبوت چلتی ہے' حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے فلسطین (کنعان) میں حضرت اسحٰقؑ ہیں اور اُدھر حجاز میں حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد تو اُدھر سلسلۂ نبوت آگے نہ چلا تا آنکہ اس شجر طیّب کا گل سرسبد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخر الانبیاء پیدا ہوئے لیکن دوسری طرف حضرت اسحٰقؑ کی ذریت سے' اولاد سے' سلسلۂ انبیائے بنی اسرائیل شروع ہوا۔ حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے۔ ان کا لقب اسرائیل تھا اور اس بنا پہ آگے وہ قوم بھی بنی اسرائیل ہی کہلائی۔ ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام تھے۔ قرآن کریم نے اس سلسلے میں وہاں تک بیان کیا ہے' حضرت یوسفؑ سے آگے بیان نہیں کیا۔ بنی اسرائیل کے انبیائے کرامؑ میں پھر حضرت موسیٰؑ سے سلسلہ آگے شروع کیا ہے' درمیان کی کڑیاں بیان نہیں کیں' شاید درمیان میں یہ انبیاء کچھ ہوئے نہیں تھے۔ اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا نام لیا' اس کے بعد دو الفاظ کہے ہیں۔

خدائے علیم نے قرآن حکیم کی عظمت اور اس کی بالیدگی کو دو لفظوں میں سمو کر رکھ دیا ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم کی عظمت ویسے تو سارا قرآن ہی پورے کا پورا ایک عظیم کتاب ہے لیکن بعض مقامات میں ایسے الفاظ' اصطلاحات آتی ہیں کہ میں سمجھتا ہوں اگر آج کی دنیا کے سامنے بھی قرآن کو یا اسلام کو یا اس کے نظام کو پیش کرنا ہو تو یہ مقامات ہیں جنہیں پیش کرنا چاہیے۔ انہیں وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ کن بلندیوں پہ قرآن یہ بات کہہ گیا ہے۔ انبیائے کرامؑ کا ذکر ہو رہا ہے اور خصوصیت دو لفظوں میں بتائی ہے' ان دو لفظوں کا جو امتزاج ہے جو مجموعہ ہے' اسے سامنے رکھ لیا جائے تو ساری سیاست کا مسئلہ دو لفظوں میں حل ہو جاتا

ہے، دوخصوصیات ایک کے اندر جمع ہونی چاہئیں۔اس مقام پہ ذکر تو انبیاء کا کیا ہے لیکن جو بھی انبیائے کرامؑ کے راستے پہ چل کر نظام قائم ص263 کریں، یہ خصوصیات ان کے اندر ہونی چاہئیں۔اور اگر یہ خصوصیات کہیں جمع ہو جائیں تو آپ دیکھیے کہ پھر اس کا نقشہ کیسا ہوتا ہے۔مجھے احساس ہے کہ آپ کو انتظار ہے کہ میں وہ دو الفاظ جلدی سے بیان کیوں نہیں کرتا۔ان کی اہمیت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ذرا آپ کی توجہات کو مرکوز کرلوں کہ آپ سوچیں کہ اس نے وہ کیا کہا ہے۔کہا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو اُولِي الْاَيْدِيْ وَ الْاَبْصَارِ (38:45) تھے یعنی وہ قوت اور بصیرت کا مجموعہ تھے۔یہ دو الفاظ ہیں۔

دنیا بھر میں تمام تر کامیابی کا راز قوت اور بصیرت کو یک جا کرنے میں مضمر ہے

عزیزانِ من! دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ ملوکیت آتی ہے۔ملوکیت اب ایک پرانی اصطلاح ہوگئی، ہر دور میں جہاں قوت ہو اور ساتھ بصیرت نہ ہو تو اسے ملوکیت کہہ لیجیے۔سب سے بڑا استبداد، انسانیت کے لیے سب سے بڑی لعنت، وہ اقتدار ہے کہ جو صاحب اقتدار ہوں، ان میں بصیرت نہ ہو۔اور دوسری طرف کیفیت یہ ہو کہ ارباب بصیرت ہوں، دانشمند ہوں، انہیں کوئی اقتدار حاصل نہ ہو۔یہ جو ملوکیت کا نظام ہے، جس میں وہ قوت اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں لیکن ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس میں ارباب دانش کو کوئی حصہ نہ مل جائے، اس میں ان کا کوئی عمل دخل نہ ہو جائے۔چنانچہ اس سے ثنویت یا Dualism پیدا ہوتی ہے۔یہ ارباب دانش وبینش جسے قرآن نے ارباب ابصار کہا ہے یہ جو دانش و بینش والے لوگ ہیں ان کو اتنا دور الگ رکھا جاتا ہے کہ اقتدار میں ان کا حصہ ہی نہیں ہوتا، ان کا کوئی اپنا اختیار نہیں ہوتا، اقتدار میں حصہ ہونا تو ایک طرف، ان کو تو بات کرنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔انہیں ایسے مقام پہ رکھا جاتا ہے۔قوت بلا بصیرت رہ جاتی ہے۔ان دونوں صورتوں میں اپنی اپنی جگہ ان کی عقل وفکر، علم وتدبر اور بصیرت وفکر وفہم کسی کام نہیں آتا، وہ دانش وبینش والے لوگ گوشوں میں سمٹے بیٹھے رہتے ہیں یا پھر وہ اپنے ہی خیالات کے اندر مست ہوتے ہیں۔جسے اقبالؒ (1877-1938) نے یہ کہا ہے حالانکہ خود ہمارے دور میں اس شخص کا ارباب بصیرت میں بلند ترین مقام تھا لیکن وہ بات ٹھیک کہہ گیا ہے:

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی

(ضرب کلیم-- 1996 ص-33)

زمین پہ بیٹھے ہوئے آسمان کی باتیں کرتے رہیے، وہ اس لیے کہ ملوکیت میں اجازت ہی اس کی دی جاتی ہے کہ تم آسمان کی باتیں کرتے رہو۔اس میں تو تقسیم ہی اس قسم کی ہوتی ہے۔وہ جو سعدیؒ (1184-1291ء) کی ایک پرانی کہاوت ہے کہ دو بھائیوں کا آپس میں

وراثت کا جھگڑا تھا۔ ایک ہی مکان تھا' اب اس کے متعلق وراثت میں جھگڑا پیدا ہو گیا کہ تقسیم کس طرح سے کی جائے۔ وہ جو صاحبِ قوت صٓ 263
تھا' اس نے اس سے کہا کہ بات بڑی آسان سی ہے' تمہیں بہت زیادہ ضرورت ہے' میری ضرورت بڑی کم ہے' یہ ایک چھوٹا سا کوٹھا ہے' اس کی یوں تقسیم کر لیتے ہیں کہ کم از کم میرے پاس رہے۔ یہ ''از صحن خانہ تا بہ لب بام از ان من'' یہ نیچے صحن سے لے کے یہ چھت تک جو ہے' یہ اتنا سا کوٹھا' یہ تو مجھے دیدو' اور ''از بام خانہ تا بہ ثریا آذان تو'' اور چھت سے لے کر آسمان تک تمہاری ملکیت ہوا۔ یہ ٹھیک ہے' میں اتنے پہ ہی راضی ہوتا ہوں' تمہیں بڑی ضرورت ہے بھئی! اور تم چھوٹے بھی ہو' میرا یہ بھی حق ہے کہ تمہاری پرورش بھی کروں۔ یہ تقسیم ہوتی ہے: ''از صحن خانہ تا بہ لب بام از ان من'' وہ تو اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے اور انہیں اجازت ہوتی ہے کہ ''از بام خانہ تا بہ ثریا آذان تو''۔ وہ کہتا ہے:

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

اور یہی ہے وہ تقسیم' یہی ہے وہ Dualism (ثنویت) کہ جو ملوکیت کے اقتدار کا خاصہ ہے۔ اسی لیے اس شخص نے دو مصرعوں میں بڑی اہم بات کہی ہے کہ

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوت بے رائے جہل است و جنوں

انبیائے کرامؑ کی ذات کا خاصہ قوت اور بصیرت کا مجموعہ ہوتا تھا

اور قرآن نے کہا کہ یہ جو ہمارے نام پہ نظام قائم کرنے والے انبیاء آتے تھے ان کی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ وہ اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ ((38:45 تھے یعنی انہیں ہم نے قوت واقتدار بھی عطا کیا تھا اور علم وبصیرت بھی۔ آپ نے غور فرمایا جو میں نے کہا تھا کہ یہ ہیں وہ مقامات جن سے اسلام کی' قرآن کی' عظمت ہویدا ہوتی ہے۔ ان مقامات کو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیے کہ دیکھیے! قرآن کیا کیا کہہ گیا ہے! یہ بات چودہ سو سال پیشتر تو ایک طرف رہی' آج بھی کسی انسانی فکر کی یہ بات ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ یہ نظام بتائے کہ جس میں اقتدار اور بصیرت ایک ہاتھ کے اندر ہو۔

پلیٹو کے قول کے برعکس فکر قرآنی کی راہنمائی

پلیٹو ((428-347BC نے یہ کہا تھا کہ جو حکومت ہے' وہ فلاسفرز کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ یہ غلط کہا تھا۔ یہ حکومت اور فلسفہ کی بات نہیں ہے کہ ان کو الگ الگ ہونا چاہیے بلکہ وہ ایک فرد ہونا چاہیے جس کے اندر حکومت اور اقتدار کی خصوصیات بھی ہوں اور بصیرت

اور تدبر کی بھی خصوصیات ہوں' ایک میں یہ چیز ہونی چاہیے۔ اور اس بلندترین مقام پر جو اس نے بتایا ہے' انبیاء کا ذکر کیا ہے اور یہاں سے صٓ 263
یہ بھی بات ثابت ہوگئی کہ انبیائے کرامؑ پوجا پاٹ کے طریقے سکھانے نہیں آیا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذرّیت کے متعلق کہا ہے کہ ہم نے نبوت بھی انہیں دی اور انہیں ہم نے ملک عظیم بھی دیا' عظیم مملکت بھی دی ورنہ اگر صرف نبوت ہو اور مملکت ساتھ نہ ہو تو وہ تو پھر رائے بےقوت ہو جاتی ہے' پھر وہ جو اور اقتدار ہے ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے' جہاں یہ رائے نہیں ہوتی۔ نبوت کی جو خصوصیات ہیں' ان میں یہ ہے کہ رائے اور قوت دونوں ایک مقام میں جمع ہوتی ہیں اور یہی وہ چیز ہوتی ہے جس سے پھر انسانیت بڑھتی پھولتی پھلتی ہے۔ یہ ہے اُولِی الْاَیْدِیْ وَ الْاَبْصَارِ ((38:45 اور کہا کہ یہ تھے چنے ہوئے' اور یہ خلاصہ تھا انسانیت کا جو ان حضرات انبیائے کرامؑ کے اندر آیا۔ آگے کہا کہ اِنَّآ اَخْلَصْنٰھُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ((38:46 ان کی خصوصیت کبریٰ یہ تھی کہ وہ ہر معاملہ میں مستقبل کی زندگی کو پیشِ نظر رکھتے تھے' قوانینِ خداوندی سے ہٹ کر کبھی کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر ہم نے انہیں باقی لوگوں سے الگ کر کے ایک خاص جماعت بنا دیا تھا۔ وہ تو خصوصیات بتائیں تھیں کہ وہ قوت بھی ہو اور بصیرت بھی ہو' اور جو متمع نگاہ ہے وہ ذکری الدار ہے۔ یہ الدار ہے ''ال'' کے ساتھ ہے' یعنی جو نصب العین ہے اس کے اوپر ہمیشہ ان کی نگاہ رہتی تھی' ان کی نگاہ ادھر اُدھر نہیں ہوتی تھی۔ وہ انسانیت کا خلاصہ تھے اور نصب العین پر ان کی ہمیشہ نگاہ رہتی تھی۔ اور نصب العین یہی نہیں' دار تو ہر مقام کو کہتے ہیں' الدار ''ال'' کے ساتھ آ گیا' وہ جو خدا کا متعین کردہ نصب العین ہے اس کی طرف یہاں ان کی نگاہ رہتی تھی اور بصیرت اور قوت دونوں کے بل بوتے پر وہ کاروانِ انسانیت کو ادھر لے جاتے تھے۔ یہ تھی انبیائے کرامؑ کی وہ خصوصیت۔

تا قیامت پوری کی پوری نوع انسانی ان ہر دو صفات کی محتاج رہے گی

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ قرآن نے انبیا کے صرف نام لیے ہیں' لیکن ان کی جو خصوصیت بتائی ہے' وہ دو لفظوں کے اندر پوری داستان آ جاتی ہے۔ اور وہ وہ نہیں ہے کہ اسی زمانے کی کوئی کہانی کہی گئی ہے' آج بھی اس کی ضرورت ہے' قیامت تک انسانوں کو اس کی ضرورت رہے گی کہ یہ اقتدار اور بصیرت ایک مقام پر جمع ہو۔ وَاِنَّھُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ((38:47 وہ منتخب افرادِ انسانیہ تھے: مصطفین' یہیں سے مصطفیٰ ﷺ کا جو لفظ ہے' نبی اکرم ﷺ کے متعلق جو بولتے ہیں' تمام انبیائے کرامؑ کے متعلق یہی لفظ آیا ہے' جو خدا کے برگزیدہ منتخب افراد ہیں' ان میں سے چن کر الگ کیے گئے' یہ حضرات تھے۔

قرآن حکیم کے مروجہ تراجم کی بنا پر ہونے والے نقصان کے سلسلہ میں خیرات یا خیر کا حقیقی مفہوم

اور اس کے بعد الْاَخْيَارِ ((38:47 ہے۔ میں نے عرض کیا ہے اور بار بار یہ عرض کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں یہ جتنی تفسیریں ہیں' پھر

ان کی بنا پر جو ترجمے ہوئے ہیں' یہ سارے ہمارے دورِ ملوکیت کے ہیں جب ان الفاظ کو معنی کچھ اور پہنا دیئے گئے تھے۔ اب یہ لفظِ خیر 283ص جو ہے' اس کے معنی زیادہ سے زیادہ نیکی کیا جاتا ہے اور نیکی کا کوئی متعین مفہوم ہی نہیں ہوتا' وہ نیکی کا ہر ایک کے اپنے ذہن میں الگ الگ مفہوم ہوتا ہے اور اس کے لیے پھر یہ خیر کا لفظ آجاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں سے آگے جو پھر خیر خیرات کا لفظ ہمارے ہاں ہے' خیرات کا لفظ ہے' وہ اس سے انسانیت پست تریں درجے پہ چلی جاتی ہے۔ یعنی میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ الفاظ اپنے معنی کھو نہیں دیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بہت بڑی سازش تھی کہ اس دور کے اندر ان الفاظ کو یہ معانی پہنائے گئے اور وہی معانی اب آپ کے ہاں آگے چلے ہیں۔ اب قرآن کا ترجمہ ان معانی سے ہو جاتا ہے۔ وہ خیرات یا خیر ہے' اس کے معنی نیکیاں ہو جاتا ہے اور جب پھر آپ کے ہاں خیر' خیرات ہوتی ہے' خیرات کو پھر بہت بڑی نیکی بتایا گیا۔ بات تو ایک لفظ کی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ چمکتی ہوئی حدیث ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ خیرات سے دینے والے کا دل پتھر ہو جاتا ہے' اس میں Superiority Complex (احساس برتری) آجاتا ہے' جو لینے والا ہے وہ Inferiority Complex (احساسِ کمتری) میں مارا جاتا ہے صاحب! وہ انسانیت کے مقام سے نیچے گر جاتا ہے' وہ اپنے آپ کو محکوم و محتاج تصور کرتا ہے' گداگر تصور کرتا ہے۔ یہ انتہا درجے کی ذلت ہے۔

جسے آپ خیرات کہتے ہیں' وہ بڑی عجیب چیز ہے' نفسیاتی طور پہ دینے والا اپنے آپ کو اس سے اونچا اور افضل محسوس کرتا ہے اور جو لینے والا ہے وہ شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور خیرات ہمارے ہاں پھر ایسی ہے کہ اسے افضل تریں نیکی کہا گیا ہے۔ ملوکیت کے زمانے کے مفہوم نے انسانیت کو اس مقام پر پہنچا دیا' اب مفہوم ہی خیرات سے یہ رہ گیا ہے۔ ان کو قرآن نے کہا ہے کہ وہ اخیار تھے' یہ ''ج و خ ی ر'' مادہ ہے' وہ اختیار اسی سے تو لفظ بنا ہے' وہ ارباب اختیار تھے' ان کو اتھارٹی حاصل تھی اور خیر تو وہ ہے جہاں کسی کو اتھارٹی حاصل ہوتی تھی۔ خدا کی طرف سے دیا گیا خیر ہوگا تو وہ خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کی اتھارٹی ہوگی۔

کلامِ الٰہی کے سلسلہ میں تحریف کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں

اب آپ دیکھیے کہ جو الفاظ ہیں' ان کے معانی کس طرح سے بدلتے ہیں یا بدلے جاتے ہیں۔ یہ تحریف بدترین قسم کی تحریف ہے۔ ایک تو وہ تحریف تھی کہ جس میں وہ کتاب کے الفاظ ہی بدل دیتے تھے' کتاب کی آیتیں بدل دیتے تھے' Content (متن و مواد) بدل دیتے تھے۔ وہ بھی ایک تحریف تھی جو خدا نے کہا ہے کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79) خود ہی ایک فتویٰ لکھتے ہیں' کہتے ہیں خدا کا حکم ہے۔ دوسری تحریف یہ ہے کہ الفاظ تو وہی رہیں اور قرآن میں الفاظ تو بدل نہیں سکتے تھے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لیا تھا' تحریف آسان ہے کہ الفاظ وہی رہنے دیجیے' مفہوم بدل دیجیے۔ یہ آج اسلام کی جتنی اصطلاحیں آپ کے ہاں

استعمال ہو رہی ہیں' ان سب کا مفہوم بدلا ہوا ہے۔ نظام صلوٰۃ' نظام زکوٰۃ' یہ حج' نیکی کا مفہوم' بدی کا مفہوم' حکومت کا مفہوم' خیرات کا مفہوم' یہ سارے مفہوم آپ دیکھیں گے ان کی تہ میں اگر تحقیق سے دیکھیں گے تو نظر آئے گا کہ ملوکیت کے زمانے کی یہ چیزیں ہیں جو یہاں کہی گئی ہیں۔ ''مست رکھو ذکر وفکر صبحگاہی میں اسے''۔ خیرات کرنے دو ان کو' گداگروں کا ایک ٹولہ قیامت تک کے لیے رہنا چاہیے تاکہ ان کی خیرات لینے والا تو کوئی ہو' خیرات دینا بہت بڑی نیکی ہے' یہ اسی صورت میں دی جائے گی کہ آپ کے ہاں محتاج ہوں' محکوم ہوں' گداگر ہوں۔ یعنی ان کو نیکی کمانے کا ذریعہ مہیا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے اندر محتاجوں اور گداگروں کا ایک ٹولہ قیامت تک باقی رہے' یہ باقی نہیں رہیں گے تو وہ بخشے کیسے جائیں گے۔ '' لے اونہاں نوں جنت اچ لے جان لئی اے سارے دے سارے عمل نیں ❶ '' لہٰذا ان کو قائم رکھو۔

خیر اور خیرات اِدھر کچھ اور اُدھر کچھ!

عزیزانِ من! آپ غور فرما رہے ہیں ان الفاظ کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ یعنی وہ ''خ ی ر'' ہے' یہ کہتے ہیں صاحب! یہ کوئی نیا ہی آ گیا ہے' او بابا! نیا نہیں آ گیا' تمہارے ہاں کے لغت کے الفاظ ہیں جو میں یہ کہہ رہا ہوں۔ تمہارے ہاں عربی زبان میں ہیں' قرآن کیوں بار بار کہتا ہے کہ ہم نے عربی زبان کے اندر اسے نازل کیا' کہا یہ کہ عربی لغت کی رو سے دیکھو کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ یہی خیر جسے آپ شر کے مقابلے میں کہتے ہیں ''خ ی ر'' سے ہے' وہیں سے ''اختیار'' ہے' وہی اخیار کا مادہ ہے صاحب! آپ اختیار کیوں نہیں کہتے۔ وہ صاحب اختیار تو پھر وہ بادشاہ سلطان ہو جائیں گے یہ تو پھر نہیں رہیں گے' ان کو صاحبِ خیرات رکھو' وہ صاحبِ اختیار رہیں۔ ایک ہی مادہ ہے اس کے دو الفاظ ہیں' ادھر کچھ اور معنی ہیں اور ان کے ہاں کچھ اور معنی۔

جو شخص صاحبِ اختیار نہیں' وہ برگزیدہ نہیں بلکہ محکوم ہے

یہ وہ لوگ تھے جنہیں قرآنِ کریم نے اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ((38:45 کہا ہے یعنی جہاں قوت اور بصیرت ایک جگہ جمع ہوئی تھی' یہ **مصطفین** تھے' ان کی برگزیدگی اس بنا پہ تھی کہ وہ صاحبِ اختیار تھے' جو صاحبِ اختیار نہیں' وہ برگزیدہ نہیں ہو سکتا ہے' وہ تو محکوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد دو تین انبیائے کرامؑ کا اور ذکر ہے۔ کہا ہے کہ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ((38:48 حضرت اسماعیل علیہ السلام یسع اور ذی الکفل وغیرہ۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا شرف ومجد بتا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سوا یہ انبیائے بنی اسرائیل کے نام ہیں' قرآن میں ان کے متعلق کچھ تفصیلی باتیں نہیں آئیں۔ عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ وہ جو الیسع ہے وہ تورات کا یوشا یا علیشا (Elisha)

---

❶ لے بھئی! انہیں جنت میں لے جانے کے لیے یہ سارے عمل ہیں۔

ص263 ہے۔ قرآنِ کریم نے ان کا تفصیلی تعارف نہیں کرایا اور ذی الکفل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت حزقی ایل نبی ہیں جو ان کے ہاں کے تھے، یہ ان کا نام ہے لیکن قرآن نے تفصیل نہیں دی اور ہمارے لیے زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، ہم تو وہیں تک اپنے آپ کو محدود رکھیں گے جہاں تک قرآن نے ان کے متعلق کچھ کہا ہے۔ یہ بھی انبیائے کرامؑ تھے اور ان کے متعلق وہی ایک خصوصیت ہے کہ وَ كُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ((38:48۔ ان سب کی یہی کیفیت تھی کہ وہ صاحبِ اختیار تھے، خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کی اتھارٹی ان کے پاس تھی، یہ اخیار تھے۔ کہا ہے کہ هٰذَا ذِكْرٌ ((38:49 یہ پرانے انبیاء کی داستانیں نہیں ہیں، تمہارے لیے اصول زندگی ہے، تمہارے لیے وجہ شرف ہے۔

عربی زبان میں ذکر اور حسن کا مفہوم اور مآلِ آسائشوں کی جنت میں لگے تکیے

عزیزانِ من! ذکر کے دو ہی معنی قرآن میں آتے ہیں۔ عربی زبان میں ذکر کے معنی ''شرف'' بھی ہوتا ہے اور ذکر ''قانونِ حیات'' ہے، قانون زندگی ہے جس کو ہر وقت سامنے رکھنا چاہیے اس لیے اس کو ذکر کہا گیا ہے کہ ہر وقت یہ تمہاری نگاہوں کے سامنے رہے۔ اور اسی لیے آگے کہا کہ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ((38:49۔ متقین وہ ہیں جو ان قوانین کی پاسداری اور نگہداشت کرتے ہیں اور وہ جو ان کی Destiny (منزلِ مقصود) ہے، جو ان کا Destination (نصب العین) ہے، جہاں انہوں نے پہنچنا ہے، جو نصب العین سامنے رکھا تھا، بڑا ہی حسین ہے۔ ایک لفظ حسن کے اندر ساری چیزیں قرآن لے آتا ہے، خواہ وہ زندگی کی طبعی خوشگواریاں ہوں یا Aesthetic Sense (حسِ جمالیات) کی خوشگواریاں ہوں۔ اس آیت ((38:49 میں کہا ہے کہ جو لوگ قوانین خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرتے ہیں، انہیں شروع میں کتنی ہی مصیبتیں کیوں نہ اٹھانی پڑیں، آخر الامر انہیں نہایت خوشگوار ٹھکانے مل جاتے ہیں، ان کا انجام بڑا حسین ہوتا ہے یعنی جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ((38:50 ایسے باغات جن پہ خزاں نہ آسکے اور وہاں جا کر یہ بھی نہیں کہ دروازہ کھٹکھٹانا پڑے، ایسا مہمان جس کے لیے پہلے سے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ کتنا حسین ہے یہ انداز گفتگو کا کہ آنے والے کے لیے پہلے سے دروازے کھول دیئے ہیں! مُتَّكِئِيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ((38:51 یہ لوگ آسائشوں کی جنت میں تکیے لگائے بیٹھے ہونگے اور ان کی طلب پر ہر جگہ سے بہترین پھل اور مشروبات ان کے لیے چلے آئیں گے۔

آخرت کی جنت ہو یا جہنم، قرآن نے اسے تمثیلی انداز میں ہی بیان کیا ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے قرآن نے خود کہا ہے کہ آخرت کی جنت کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا، وہ سارا تمثیلی انداز ہوگا، Symbolical ہوگا، یہاں کی جو جنت ہے اس میں وہ چیز ایسے ہی ہوگی جیسی یہاں دنیا میں ہوتی ہے۔ اب وہ جتنی چیزیں کہے گا، وہ جو

ص263 وہاں کی جنت کے متعلق کہیں گے تو وہ تمثیلی چیز ہو جائے گی اور یہاں کی جنت کے متعلق وہ واقعی Actually ایسی ہی ہونگی جیسی وہ کہتا ہے یہ نہایت آسائش سے رہنے والے ہونگے ۔جس چیز کی بھی مانگ ہوگی' طلب ہوگی' خواہش ہوگی' وہ ان کو بلا کوفت' بغیر جگر پاش مشقت کے قرآن کہتا ہے' محنت تو کرنی ہوتی ہے' وہ سب کچھ جگر پاش مشقت کے بغیر ملے گی' کثیرۃً ملے گی' باافراط ملے گی اور جو پچھلی دفعہ شروب آیا تھا کہ اس میں ملاوٹ نہیں ہوگی ۔ باافراط ملے گی' حسب منشا ملے گی' ملاوٹ تک نہیں ہوگی ۔ یہ جو لفظ شراب ہے' ہمارے ہاں تو اب شراب کو وائن ہی کہتے ہیں' عربی زبان میں ہر پینے والی چیز کو کہتے ہیں' شرب کے معنی ہی پینے والی چیز ہے' شربت تو ہمارے ہاں' اسی مادے سے' اسی معنی میں' استعمال ہوتا ہے لیکن اسی مادے سے جو لفظ شراب ہے' وہ ہمارے ہاں اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا ہے ۔عربی زبان کے اندر ہر پینے والی چیز کے متعلق یہ لفظ آتا ہے' مشروب یہیں سے لفظ ہے جہاں سے یہ کچھ شراب ہے ۔

لفظ حور کا لغوی مفہوم

اور آگے پھر وہی بات کہی ہے کہ وَعِنۡدَهُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ اَتۡرَابٌ ((38:52 یہ جنّتی آسائشیں صرف مردوں کے لیے ہی نہیں ہونگی ۔ ان کے ساتھ ان کی ہم عمل یعنی انہی جیسی خصوصیات کی پیکر' عورتیں بھی ہونگی' جن کے مجسمے' جن کی نگاہیں کبھی بیباک نہ ہوں ۔ پچھلی دفعہ میں نے عرض کیا تھا جب جنت کی تفصیلات کا ذکر آیا تھا کہ یہ ''حور اور یہ عین'' جو الفاظ ہیں یہ مؤنث ہی نہیں' عورتوں کے لیے ہی نہیں آتے ۔ عربی زبان میں یہ خصوصیات ہیں جو عورتوں اور مردوں دونوں میں ہوتی ہیں ۔ ایک یہ جو خصوصیت ہے کہ نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیا جائے' ان کو کنٹرول میں رکھا جائے' یہ مردوں کے لیے بھی ہے' یہ عورتوں کے لیے بھی قرآن میں ہے ۔ بے داغ کردار کے متعلق عربی زبان میں ''حور'' کا لفظ آتا ہے' مردوں کے لیے بھی ہے اور عورتوں کے لیے بھی ہے ۔ ہمارے ہاں تو پھر یہ تصور ہی اور ہو گئے ''حور'' جب کہیے گا تو ذہن میں ہی نہیں آتا کہ مردوں کے لیے بھی ہو سکتا ہے ۔ یہ ''عین'' اس آنکھ کو کہتے ہیں جس کے اندر ذرا سی بھی کجی نہ ہو: صاف پاکیزہ کردار کی آنکھ' شرمگیں آنکھیں جو بیباک نہ ہوں ۔ یہ عربی زبان کے الفاظ ہیں ۔ میں نے عرض کیا ہے' عزیزانِ من! بعد میں آپ لوگوں کو خود سوچنا پڑے گا' ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہو کر سوچیے گا پھر قرآن سمجھ میں آئے گا ۔ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ ((38:52 کہا ہے یہ محض جھکی ہوئی نگاہ ہی نہیں ہوتی ۔قرآن نے قٰصِرٰتُ کیوں کہا ہے' یہ ٹھیک ہے کہ ایک تو بیباک نظر آتی ہے یعنی دیدے پھاڑ پھاڑ کے دیکھنا جسے ہم کہتے ہیں' یہ بے حیائی کی علامت ہوتی ہے' اور وہ جو جھکی ہوئی نگاہ یا جسے آپ کم نگہی کہتے ہیں' وہ ہے ہمارے ہاں ایک لفظ کم نگہی کہ پوری طرح سے آنکھ کھول کر بھی نہ کسی کی طرف دیکھنا ۔ وہ جو کم نگہی ہے اس کو تو اپنے انداز میں غالب ((1797-1869 نے کہا ہے-

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہہ کہ بہ ظاہر نگاہ سے کم ہے

یہ تو شاعری ہے لیکن یہ چیز جو عربوں کے ہاں، جس طرح اس کو استعمال کرتے تھے، وہ ہے اصل بات۔ وہ کہتے تھے: **قَصَرَ سَهْمُهٗ عن الْهَدَفِ** یعنی اس کا تیر نشانے تک نہ پہنچ سکا۔ ''قَصَرَ'' کا لفظ یہاں آیا ہے۔ نشانے کو تاک کے تیر نہ مارنا، قصر وہ نگاہ ہے کہ پہلے نشانہ دیکھ کے اس کی طرف تیر نہ مارا جائے، اس سے صرف دیکھنے کا کام لیا جائے۔

قصرِ نگاہ یعنی بدنگاہی کی غرض سے کسی کو نہ دیکھنا

عزیزانِ من! ساری حیا اور شرم سب کچھ ایک لفظ میں آ گیا۔ جتنی بے حیائی کی چیزیں ہیں، ابتدا میں آپ دیکھیں گے کہ نشانہ دیکھ کر نگاہ کا تیر مارا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ شاعری کا لفظ ہے۔ اور وہ باحیا نگاہ کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے تھے کہ وہ نشانہ تاک کے تیر نہیں مارتا، نگاہ سے دیکھنے کا کام لیتا ہے صرف۔ غور فرمایا کیا باتیں وہ اس کے اندر کہہ جاتا ہے۔ اور پھر عربوں کے ہاں یہ لفظ جن معنی میں استعمال ہوتے تھے، وہاں سے معنی متعین ہوتے ہیں'' قصر سہو'' وہ کہتے ہی اس چیز کو تھے۔ اور نشانہ جو پہلے تاکا جاتا ہے، اس میں تو ارادہ شامل ہوتا ہے اور جو دیکھنا ہوتا ہے وہ تو سوال نہیں ہوتا وہ تو ایک طبعی عمل ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ**(38:52)۔ اتراب: ایک تو اس میں دو چیزیں ہیں، مساوات جو ہے مرد اور عورت کی، یہ بھی اس کے اندر آتی ہے اور پھر میں نے کہا تھا قرآن کریم میں جو زوج کا لفظ آیا ہے، وہ بیوی کے لیے ہی نہیں ہے، عربی زبان میں یہ لفظ Companion (رفیق، ساتھی) کے لیے ہوتا ہے، رفیق کے لیے یہ لفظ ہوتا ہے، مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے یہ بھی لفظ ہوتا ہے۔

میاں بیوی کی رفاقت کا معیار اور اس کے لوازمات

جیسا میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں تو زوجہ ہوتی ہی بیوی ہے، وہ تو اس کا زوج ہوتا ہی نہیں، وہ تو داروغہ ہوتا ہے، وہ حاکم ہوتا ہے، ہنٹر ہاتھ میں لیے ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! زبان کے اعتبار سے بھی یہ لفظ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، قرآن میں دونوں یعنی میاں اور بیوی کے لیے یہ لفظ آیا ہے۔ رفیق کے معنی میں آتا ہے، یہ رفیق ہے، رفاقت میں ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے، رفاقت ہوتی ہی وہاں ہے جہاں ہم آہنگی ہو۔ اور پھر جو میاں بیوی کی رفاقت ہے اس کے اندر تو فکر اور خیال اور مزاج اور عادت اور ذوق، ان سب کی ہم آہنگی ہوگی تو پھر وہ ایک دوسرے کے زوج بن سکیں گے۔ اب قرآن نے یہ بات بتانی تھی کہ انتہا درجے کی ایک مثال، ایک لفظ پہ قرآن لے آیا ہے۔ عزیزانِ من! سوچیے گا وجد میں آ جائیے گا۔ کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے، کہا یہی جاتا ہے کہ آدمی مٹی کا بنا ہوا ہے لیکن تمہیں بتائیں یہ مرد اور

عورت' یہ کس طرح مٹی کے بنتے ہیں' وہ کہا کہ کمہار مٹی گوندکر چاک کے قریب تو وہ یوں رکھ لیتا ہے' پھر اس میں سے لیتا جاتا ہے اور کچھ صٓ 253 بناتا جاتا ہے۔ کہا کہ یہ جو مرد اور عورت تھے' وہ ہم نے بنائے ہی اس لیے کہ گوندھ کے مٹی اکٹھی کر لی' آدھی سے مرد بنا دیئے' آدھی سے عورتیں بنا دیں۔ میں کہتا ہوں مساوات کی انتہائی مثال ہے عزیزانِ من! اور ہم آہنگی کی بھی۔ یہ جو ہم ِگل ہونا ہے ایک مٹی کے اُسی مٹی کے دو بنے ہوئے' لفظ ایک ہے عزیزانِ من! انہوں نے اتراب لیا ہے کہ وہی جو ہمارے مشہور تھا کہ وہ آدم اور حوا مٹی سے بنی تھیں' انسان کو مٹی سے بنایا۔ وہ اس تحقیق میں سائنٹسٹ کی طرح نہیں گئے ہیں' ان کے ہاں زبان میں یہ چیز موجود تھی اور اسی زبان کے اعتبار سے وہ انتہائی ہم آہنگی کے لیے یہ بولتے تھے کہ یہ تو دونوں ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ قرآن نے ان کا یہ جو لفظ اتراب ہے اس کو رفقاء کے لیے استعمال کیا ہے' خواہ وہ مرد اور عورت ہوں خواہ وہ مرد آپس میں ہوں یا عورتیں ہوں یا مخلوط ہوں' رفقاء جتنے بھی ہوں ان کی انتہائی کیفیت یہ ہونی ہے رفیق ہونے کی کہ وہ ایک مٹی کے بنے ہوئے ہوں۔ یہ ہیں قرآن کے انداز۔

انسان کو جو کچھ ملتا ہے' وہ اعمال کے ترازو میں تول کر ملتا ہے

کہا یہ ہے کہ ھٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِیَوْمِ الْحِسَابِ (38:53) جو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں اور یہ یونہی نہیں ہے کہ چھت پھاڑ کر دیدیا جاتا ہے۔ یہ تمہارے اعمال کے نتائج کا حساب کر کے دیا جاتا ہے' یونہی مل جاتا یہ جو کچھ ہے۔ اور یہ یوم الحساب کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مرنے کے بعد وہ جو قیامت ہے' وہ تو ہے ہی' اور وہاں جا کے تو وہ ہے ہی' حساب تو ہر سانس میں انسان کا ہوتا ہے' زندگی کا ہر سانس ایک میزان ہے' جس کے اندر انسان کے یہ نیک اور بد کے اعمال تلتے ہیں کیونکہ ہر عمل کا اثر اس کی خودی اور اس کے انا پر پڑتا ہے اس کے Self (نفس) پہ پڑتا ہے' اسی لیے قرآن نے کریم نے خدا کو سریع الحساب کہا ہے' وہ فوراً حساب کر دینے والا ہے۔ اب وہ حساب کر دیا جاتا ہے' اس کے ہاں بیلنس میں وہ بنک میں جمع رہتا ہے' جب بھی ڈرا (Draw) کرنا ہو' یہاں ضرورت ہے' یہاں ڈرا کر لیجیے' یہاں ضرورت نہیں تھی' وہی آپ کا بیلنس آگے چلا جائے گا۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ قرآن کی ساری تعلیم کی بنیاد' زندگی کے تسلسل پہ ہے کہ اس طبعی موت سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا' یہ آگے بھی چلتی ہے۔ یہ جو آگے چلنے والی بات میں نے ابھی عرض کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ یہیں کے اعمال کے نتائج ہوتے ہیں کہ جو یہاں بھی مرتب ہو کر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کے بعد چونکہ زندگی نے اسی طرح سے آگے چلنا ہے' وہ نتائج انسان کے ساتھ جاتے ہیں۔ یہیں کے اعمال کے نتائج ہوتے ہیں جو ابھر کر وہاں سامنے آجاتے ہیں۔ کہیں بھی سامنے آئیں' ان کی بنیاد اس چیز پر ہے کہ انسان کا ہر کام بلکہ وہ کہتا ہے' نگاہ کی خیانت اور دل میں گزرنے والے خیالات بھی' نتائج پیدا کرتے ہیں۔ محسوس طور پہ یہ یہاں تمہارے سامنے نہ آئیں تو یہاں اور وہاں کا وہ کہتا ہے کہ ہمارے نزدیک کچھ فرق نہیں ہے' تم اسی طرح سے

آگے چلتے ہو، وہ وہاں سامنے آجائیں گے۔ ص263

انسانی ذات کی قدر و منزلت کا تفصیلی تعارف

یہ جو ''میں'' نے تم پہ زور دیا ہے' یہ قرآن کا عجیب انداز ہے۔قرآن کہتا ہے کہ جسے تم ''میری'' کہتے ہو یا ''میرا'' کہتے ہو' تو سنو! وہ جو تمہاری اضافی چیزیں ہیں وہ تو یہاں رہ جاتی ہیں' حتیٰ کہ جسے تم میری جان اور میری زندگی کہتے ہو' میرا جسم کہتے ہو' وہ بھی یہاں رہ جاتا ہے اور جو ''میں'' ❶ ہے' وہ ان تمام اعمال کے نتائج کو ساتھ لیے ہوئے آگے جاتی ہے جو اس زندگی میں تم سے سرزد ہوتے ہیں اور وہ بھی جن میں نگاہ کی خیانتیں اور دل میں گزرنے والے خیالات بھی ہیں۔اور پھر معاملہ سارا ''میں'' سے ہے اور یہاں تو معاملہ ''میں'' سے ہی ہوتا ہے' جسم سے تو کوئی واسطہ نہیں ہے' یہ شے ہی کچھ نہیں ہے۔اس کا کیا ہے' اچھا بھلا جسم ہے' ایک ہاتھ مفلوج ہو جاتا ہے' نظر آجاتا ہے تو عمل ہی اس کا کچھ نہیں ہوتا' یہ کچھ شے نہیں ہے۔ یہ تو جتنا جسم انسانی ہے' وہ انسان کی ''میں'' کے ارادوں کو بروئے کار لانے کے لیے Instruments (آلات) ہیں۔ بڑھئی کے پاس جیسے ایک آری ہوتی ہے' ایک تیشہ ہوتا ہے یہ Instruments (آلات) ہوتے ہیں' یہ ''میں'' کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کے Instruments (آلات) ہیں' میرا جی چاہتا ہے کہ میں یہ پکڑ لوں تو میرا یہ ہاتھ میرے اس فیصلے کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتا ہے۔''میں'' آگے چلتی ہے' بات یہ ہے جو قرآن نے کہی ہے۔

بقا صرف اس عمل کو ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کیا جائے

''حساب'' کے معنی یہ ہیں کہ یہاں سے یہ مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے اور مسلسل آگے چلتا ہے۔کہا ہے کہ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ (38:54) یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے کہ حسن عمل کے نتیجے میں جو نظام قائم ہوگا' وہ یہاں قائم ہو یا اس کے بعد اگلی دنیا تک مسلسل چلے' یہ وہ رزق ہے جس میں کمی واقع نہیں ہوتی' یہی باقی رہتا ہے۔ یہ رزق کس طرح سے ملتا ہے؟ سارا قرآن اس کو بتاتا ہے۔یعنی اس کے لیے اس نے باقی رہنے والا' ایک اصول بتایا ہے' جو کم نہیں ہوتا۔کہا ہے کہ و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (23:17) یاد رکھو! باقی وہ عمل رہے گا جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کیا جائے گا۔نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے جو کام کیا جائے گا' بقا اس کام کے لیے ہے' اس کی بنا پر جو رزق ملتا ہے اور مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ (38:54) اس میں کمی واقع نہیں ہوتی۔کہا کہ هٰذا (38:55) یہ تو ہوا ان کا کہ جو صاحبِ اختیار تھے' ایدی والابصار تھے' قوت اور بصیرت تھی' خدا کی اقدار کے مطابق انہوں نے نظام قائم کیے تھے' اپنی زندگیاں اس قالب میں ڈھالی تھیں۔ اور دوسری طرف ان کے مقابل میں وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ۔ جَهَنَّمَ (38:55-56) ہے۔

---

❶ I-am-ness

یہاں طٰغین کا لفظ آیا ہے' یعنی اقدارِ خداوندی سے سرکشی برتنے والے۔ ایک تو صرف انکار کرنے والے ہوتے ہیں' ان کا Attitude ص263 (رویہ) کچھ Negative (منفی) سا ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کو نہیں مانتا۔ ایک اس کے علی الرغم سرکشی برتتا ہے کہ نہیں' ہم اس کے خلاف کریں گے۔ یہ جرم کی بڑی شدید ترین شکل ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ جو سرکشی برتنے والے ہیں' ان کا انجام' ان کا ٹھانہ شر ہے۔

اعمال کے لحاظ سے خیر اور شر کی وضاحت اور ان کی قدر و قیمت

وہاں ''خیر'' کہا تھا' یہاں ''شر'' کہا ہے' خیر اور شر جس کا عام طور پہ ترجمہ Good & Evil کیا جاتا ہے' یہ ترجمہ حقیقت میں صحیح نہیں ہے۔ انسانی ذات پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں' یہ ان کا نام ہے۔ جن اعمال سے انسانی ذات کے اختیارات میں وسعتیں ہوتی ہیں' وہ عمل خیر ہوتا ہے' وسعتوں کے معنی یہ ہیں کہ قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے اختیارات اور قوتیں ہیں' یہ کچھ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ قوانینِ خداوندی کی رُو سے ہے اور جس میں یہ چیز نہیں ہوتی ہے یا وہ ان کو تخریب کے لیے استعمال کرتا ہے تو وہ جو اعمال ہیں وہ شر ہو جاتے ہیں۔ اثر دونوں کا انسان کی اپنی ذات یا Self پہ پڑتا ہے۔ اس کا نام جہنم کہا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ میں ان لفظوں کا Analysis (تجزیہ) کرتا چلا آ رہا ہوں۔ جہاں جہاں یہ الفاظ آتے ہیں' انہیں بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ جہنم اس وادی کا نام تھا جہاں ان کا ایک بت ہوتا تھا' اس میں انسانوں کو زندہ جلایا جاتا تھا۔ تو جہنم وہ مقام ہے جہاں انسانیت جلائی جاتی ہے' اور وہ ہے جحیم جہاں انسان کی ترقی رک جاتی ہے' وہ ٹھہر جاتا ہے' آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس کے لیے کہا ہے کہ **یَصۡلَوۡنَهَا فَبِئۡسَ الۡمِهَادُ** ((38:56 اس میں وہ داخل ہونگے اور یہ نہایت برا ٹھکانہ ہے۔ کہا ہے کہ **هٰذَا** ((38:57 یہ یوں ہوں ہوگا۔

انسانی زندگی کے لیے غیرِ خدا محکومیت کا نتیجہ شرفِ انسانیت سے محرومی ہے

آگے کہا کہ **فَلۡيَذُوۡقُوۡهُ حَمِيۡمٌ وَّغَسَّاقٌ** ((38:57۔ یہ عجیب الفاظ ہیں اور غور طلب ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کی آیات میں دو دو الفاظ آتے ہیں' پتہ نہیں معنی کی ایک دنیا ان کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ ترجموں میں اس جہنم کے متعلق بتایا یہ جائے گا کہ کھولتا ہوا پانی اور یخ بستہ پانی ہوگا' یہی ہے جو یہاں جہنم کے متعلق بتایا جائے گا۔ آخر یہ ہے کیا؟ میں نے ایک پورا درس اس پہ دیا تھا جس میں یہ بتایا تھا کہ خدا کے علاوہ محکومیت کی جو بدترین شکل ہے' اس کا نام جہنم ہے' جہنم کے داروغے کا نام مالک ہے۔ اور قرآن کہتا ہے کہ جب کوئی انسان کسی انسان کا مالک ہو جاتا ہے تو یہ شر الدوآب ہوتا ہے اور وہ جہنم میں ہوتے ہیں' یہ دونوں جہنم میں ہوتے ہیں۔ قرآن نے تو یہ کہا ہے' وہ اپنی قوتوں کا غلط استعمال کرتا ہے اور یہ شرفِ انسانیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ اب اس میں جس کے اندر یہ کیفیت ہوتی ہے کہ انسان انسانوں کے محکوم اور محتاج ہو جاتے ہیں' دو لفظوں میں اس نے اس کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے کہ اس نظام میں ہوتا کیا ہے۔

جہنمی معاشرے کی وہ خصوصیات جو ہر عام وخاص کو متاثر کیے ہوتی ہیں: لفظ حمیم اور غساق کا مفہوم ص263

یہ ''حمیم'' اور ''غساق'' دو الفاظ بتایا ہے۔ حمیم کے معنی ہوتا ہے ''حرارت کی بہت زیادہ تیزی' حدت' حرارت' سرکشی' شر' بے باک' قوتِ اقتدار'' اس کا نام اس نے حمیم رکھا ہے۔ یہ شر اور حرارت ہے' اس سے جہنم کی آگ بھڑکتی ہے۔ ایک طرف تو یہ انتہا پر ہوتا ہے' دوسری طرف یہ غساق ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ دوسری طرف وہ عوام ہوتے ہیں کہ جن کی رگوں کے اندر خون منجمد ہو گیا ہوتا ہے' ان کے اندر آزادی کی تڑپ' غیرت' حمیت کی حرارت باقی نہیں رہتی' ان کے رگوں میں خون نہیں ہوتا' وہ جسے عروق مردہ کہا ہے' ان میں وہ ہوتا ہے یعنی یخ بستہ خون۔ زندگی تو نام ہی خون کی حرارت کا ہے' عزیزانِ من! جتنی اس میں حرارت کم ہوتی جاتی ہے' زندگی اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہے اور جب وہ حرارت ختم ہونے کے بعد حتیٰ کہ وہ خون یخ بستہ ہو جائے تو پھر تو سوچیے کہ اس میں زندگی کی رمق تک باقی نہیں رہتی۔ تو جو غلط معاشرہ ہے' اس میں دو چیزیں اپنی Extreme (انتہا) پہ پہنچی ہوئی ہوتی ہیں: استبداد کی جو حرارت ہے' وہ ایک طرف انتہا پہ ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ جو محکومیت ہوتی ہے' اس خون میں حرارت ہی باقی نہیں رہتی ہے' اس میں غیرت اور حریت کا نشان تک نہیں ہوتا۔ یہ دو چیزیں ہوتی ہیں ایک ہی معاشرے کے اندر اور کہا کہ یہ ہے وہ معاشرہ جو جہنم کا ہوتا ہے کہ اقتدار ہے تو بیباک' اس کی حرارتیں ہیں تو شعلہ فگن' مقابلے میں جو انسان ہیں' وہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں مگر ان کی رگوں میں خون یخ بستہ ہو چکا ہوتا ہے۔ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ قرآن ان دو لفظوں میں کیا کہہ گیا ہے؟

اسلامی نظام اور جہنمی نظام میں: فرق اپنے اندر ایک محاکاتی انداز لیے ہوئے ہے

عزیزانِ من! غور فرمایا ہے کہ اس نے جہنم کس کو کہا ہے' کیوں اس کے داروغے کو مالک کہا ہے؟ انسانیت تو عزیزانِ من! وہ ہے جس میں شرف اور تکریم انسانیت باقی رہے' جہاں کسی انسان کو کسی طرح سے بھی آپ نے ذلیل کیا وہاں انسانیت ختم ہو گئی۔ کہا ہے کہ **ولقد کرمنا بنی أدم** ((17:70 ہم نے ہر انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے' تم کون ہوتے ہو اس کو ذلیل کرنے والے! یہ ہے معیار عزیزانِ من! جسے آپ اسلامی نظام' قرآنی مملکت' انسانیت کی مملکت کہتے ہیں کہ اس میں ہر انسان شرفِ انسانیت سے سرفراز ہوتا ہے۔ جہاں کوئی انسان ذلیل ہو جائے' وہ معاشرہ قرآنی اور اسلامی نہیں کہلا سکتا' وہاں حمیم وغساق کی کیفیت ہوتی ہے جس میں سامانِ زیست تو ہو گا لیکن ایسا جس سے تسکین ہونے کے بجائے اور اضطراب بڑھ جائے جس سے نشوونما نہ ہو سکے مثلاً پانی ہو گا لیکن کھولتا ہوا اور یخ بستہ ان دونوں سے کھیتی جل جاتی ہے۔ کہا کہ وَاٰخَرُ مِنۡ شَكۡلِهٖۤ اَزۡوَاجٌ ((38:58 پھر یہ ایک ہی چیز نہیں' پھر اس میں ملتی جلتی اور چیزیں' قسم قسم کے عذاب اس کے اندر ہوتے ہیں' پھر پوچھو ہی نہیں یہ چیز اس میں کتنی شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرے مقامات پہ اس کی تفصیل دی ہے'

یہاں ان آیات میں اگرچہ اس کی تفصیل نہیں دی، تفصیل دوسری آیات میں تھی، میں نے ان کے حوالے بھی آپ کو دیئے تھے، بڑے ہی عبرت آموز تھے۔ اور وہ یہ بات نہیں ہے کہ وہاں قیامت میں، کوئی آنے والا جہنم ہے، اس کے اندر وہ ٹھنسے ہوئے ہونگے، آگ کے اندر جل رہے ہونگے۔ قیامت موجود ہے، غلط نظام جو ہے، وہ جہنم ہے جس کے اندر انسانیت جلتی ہے، جھلستی ہے اور اس کے اندر پھر یہ دونوں فریق ہوتے ہیں۔

نظری اور محاکاتی انداز میں بات کو سمجھنے اور سمجھانے میں واضح فرق ہے

ان کی جو ماجریات ہوتی ہیں جو ان پر گزر رہی ہوتی ہیں قرآن انہیں اس طرح Dramatically (ڈرامائی انداز میں) بیان کرتا ہے، محاکاتی انداز سے بیان کرتا ہے کیونکہ بات سمجھ میں زیادہ اچھی طرح آتی ہے۔ Abstract Talk (نظری بات) جو کی جائے وہ زیادہ مؤثر نہیں ہوتی، جب اس کو محسوس شکل میں بیان کیا جائے تو وہ زیادہ مؤثر ہوجاتی ہے۔ وہ مکالمے کی شکل میں بیان کرتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ (38:59) لیڈروں سے کہا جائے گا کہ یہ جو پیچھے تمہارے ہاں یہ بھیڑ چلی آرہی ہے، پہچانتے ہو جانتے ہو کہ یہ کون ہیں۔ کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی عقل و فکر سے کوئی کام نہیں لیا اور دھڑا دھڑ تمہارے پیچھے چلتے گئے، اگلی بھیڑ کے پیچھے جیسے پچھلی بھیڑیں چلتی ہیں، آنکھیں بند کیے تمہارے پیچھے پیچھے چلتے گئے۔ ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ انہیں ذراسی کشاد اور آسائش نہیں ملنی چاہیے اور اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ (38:59) تم جہنم میں پہنچ گئے، یہ بھی تمہارے پیچھے جہنم میں پہنچ گئے۔

عزیزانِ من! وہ یاد ہے سورۃ ابراہیم میں جو قرآن نے کہا ہے، عجیب الفاظ ہیں کہ تباہ کرتے ہیں کاروانِ انسانیت کو وہ لیڈر، جو انہیں اس منڈی میں جا کر اتارتے ہیں جہاں اس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہیں ہوتا۔ یہاں کہا ہے کہ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ (38:59) تم آگے آگے تھے، تم آئے، یہ آنکھیں بند کیے ہوئے پیچھے پیچھے تھے۔ یہ پیچھے جانے والے ان سے کہیں گے قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًام بِكُمْ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا فَبِئْسَ الْقَرَارُ (38:60) وہ متبعین ان سے مڑ کے کہیں گے کہ آج تم ہمیں موردِ الزام ٹھہراتے ہو حالانکہ تم نے خود ہی سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ کم بختو! یہ جہنم تم نے ہمارے لیے تیار کیا تھا سو اب دیکھو کہ یہ کیسی بُری جگہ ہے۔

قرآن حکیم نے جہنم میں جانے والوں کے لیے ''لا مرحبا'' کا لفظ استعمال کیا ہے

''مرحبا'' کا لفظ ویسا ہی ہے جیسے ہم کسی کو Welcome (خوش آمدید) کہتے ہیں، کسی کو دیکھ کر خوش ہونا، اس کو خوش آمدید کہنا۔ اور اس کے برعکس وہ جو آنے والا ہو وہ آئے اور اسے دیکھ کر ماتھے پہ سات سات شکنیں چہرے پر افسردگی نمودار ہوجائیں کہ ''کتھوں آگئی بلا ❶'' اس وقت وہ ''لا مرحبا'' کہتے تھے، یعنی خوش آمدید کسی کو نہ کہنا۔ کہا کہ یہ جو وہاں ان کے تعلقات ایسے دیکھتے تھے کہ یہ آتے تھے اور

---

❶ یہ مصیبت کہاں سے آٹپکی!

پھولوں کے ہار اور زندہ باد یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ جب وہ جہنم ابھر کر سامنے آتا ہے تو اسے کہتے ہیں کہ تمہیں کس نے یہاں بھیج دیا، ہم تمہیں Receive (خوش آمدید) کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، لَا مَرْحَبًام بِكُمْ ((38:60 کوئی Welcome (خوش آمدید) نہیں ہے یہاں تمہارے لیے۔ وہ سارے گیٹ، وہ جھنڈیاں، وہ پھول، وہ مرحبا والے تھے، جتنے بھی تھے، وہ کہتا ہے وہ سب ختم ہو جاتے ہیں۔ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا فَبِئْسَ الْقَرَارُ ((38:60 تم ہمیں اس قسم کی جہنم کے اندر لے آئے ہو اور ہم سے توقع یہ رکھتے ہو کہ پھر تمہیں یہاں آ کر مرحبا بھی کہیں، یہ ہے تمہاری کیفیت۔

خدا کی مسندوں پر براجمان ہونے والے اور ان کو وہاں تک پہنچانے والوں کے لیے قرآن حکیم کا جواب

اب دیکھتے ہیں کہ یہ وہی نقشہ ہے جو پہلے قرآن نے بیان کیا تھا کہ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِى النَّارِ ((38:61 وہ خدا سے کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! یہ جنہوں نے ہمارے لیے جہنم تیار کیا تھا انہیں دہری سزا دو، ایک تو ان کے اپنے جرائم کی جس کی وجہ سے یہ خود جہنم میں گئے اور دوسرے یہ جو ہمیں جہنم میں دھکیل کر لے آئے ہیں اس کے لیے سزا۔ اور آپ کو شاید یاد ہو جواب میں خدا کی طرف سے جو کہا گیا تھا کہ دہری سزا کہتے ہو تو تم دونوں کو دہری سزا ہے۔ آج تم ان کے سر الزام دھرتے ہو، ان کی قوت کون تھے، ان کا اقتدار کن کے بھروسے پہ قائم تھا؟ یہ تم ہی تو تھے جن کی قوت کے بل بوتے پر یہ اتنی سرکشی برتتے تھے۔ تم اگر ان کے سامنے سجدہ ریز نہ ہوتے تو یہ خدائی مسندوں پر براجمان ہو نہیں سکتے تھے۔ اگر یہ بلاواسطہ اس جرم کے مجرم ہیں تو تم بالواسطہ اس جرم کے مجرم ہو اس لیے دونوں کو دگنی سزا ملے گی۔ وہ تو ملی ہوئی ہوتی ہے عزیزانِ من! وہ تو کہنے کی بات ہے کہ سزا ملے گی۔ جس جہنمی معاشرے کے اندر یہ جی رہے ہوتے ہیں، وہ تو ان کو سزا ملی ہوئی ہوتی ہے۔

اب وہ آپس میں کچھ بات کرتے ہیں کہ وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ((38:62۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔ یہ ان سے کہیں گے کہ وہاں ہم جن لوگوں کے متعلق کچھ توقع کرتے تھے کہ یہ ہمارے ہمدرد ہو سکتے ہیں، یہ کوئی صاحب الرائے ہو سکتے ہیں، یہ کوئی اچھے انسان ہیں، عمدہ کردار کے لوگ ہیں۔ تمہاری کیفیت یہ تھی کہ تم کہتے تھے کہ یہ بدترین خلائق ہیں، یاد رکھو، معاشرہ میں سب سے زیادہ شریر ہیں، سب سے زیادہ تمہارے دشمن یہ ہیں، کہیں ان کے قریب نہ جانا۔ کہا کہ یہ جو لوگ تم کہا کرتے تھے کہ یہ تو سب سے زیادہ مجرم اور شریر اور بدترین خلائق ہیں تو انہیں تو سب سے پہلے جہنم میں ہونا چاہیے، وہ تو یہاں جہنم میں ہیں نہیں۔ وہ اگر ایسے ہی تھے جیسے تم ان کے متعلق کہا کرتے تھے کہ ان کے قریب نہ جانا انہیں تو سب سے پہلے یہاں ہونا چاہیے، یہ کیا ہوا کہ تم بھی جہنم میں، ہم بھی جہنم میں، وہ یہاں نظر نہیں آتے۔ او! کتنا دھوکے میں رکھا تم نے ہمیں کہ ان کی طرف نہ جانے کے لیے پتہ نہیں کس کس قسم کی تم نے ان کے چہروں کے اوپر کالک مل دی! کتنا عجیب انداز ہے بات بیان کرنے کا کہ وہ یہاں کہیں نظر نہیں

آ رہے' بتاؤ کچھ تو بتاؤ۔ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا ((38:63 تمہارے کہنے کے مطابق ہم ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور یہ ذہن میں تھا کہ یہ لوگ جو ہیں سب سے بڑے جہنم کے کندے ہیں۔ کہا کہ اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ((38:63 وہ واقعی یہاں جہنم میں نہیں ہیں یا کچھ ہماری آنکھوں کو' نگاہوں کو' کچھ ہو گیا ہے جو وہ نظر نہیں آتے۔ کچھ تو کہو' کچھ تو بتاؤ' ہمیں کہ یہ کیا ہے کہ یہ ہماری نگاہ کا پھیر ہے جو وہ نظر نہیں آتے یا وہ واقعی نہیں ہیں جنہیں تم نے اس قدر سیاہ رو کر کے ہمارے سامنے پیش کیا تھا' وہ نہیں ہیں یا ہماری نگاہوں کا پھیر ہے؟ یہ جو لفظ ہے کہ کچھ تو کہو' عزیزانِ من! ' کچھ تو کہو' طنز کا نشتر نظر آتا ہے لیکن اس میں یہ صرف طنز نہیں ہوتی' اس میں مایوسی کی انتہا ہوتی ہے' جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے' سوا ان سے پوچھا جائے کہ او کم بختو! کچھ تو کہو اور ان کے پاس بھی کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ یہ' کچھ تو کہو' بڑی چیز ہے۔

مکمل طور پر مایوس ہو جانے کی کیفیت انسان کو دردناک عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے

میں نے کہا ہے کہ یہ مایوسی کی انتہا اس لیے ہے کہ قرآن نے جہنم والوں کے لیے کہا ہے کہ مُبْلِسُونَ ((23:77 مایوسی کی انتہا پہ پہنچے ہوئے' جن کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ مرنا چاہیں گے مر نہیں سکیں گے: وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ((14:17 موت آتی ہے پر نہیں آتی' جہنم سے نکلنے کی بار بار کوشش کریں گے' دوبارہ اس کو لوٹا کر وہیں پھینک دیا جائے گا' نکل نہیں سکیں گے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر میرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

(مرزا اسداللہ خاں غالب)

یہ مایوسی کی انتہا ہے' اس لیے قرآن نے ان کو مُبْلِسُونَ ((23:77 کہا ہے۔ اور کہا ہے کہ یاد رکھو! قرب اور درد اور عذاب کی انتہا ہوتی ہے جب انسان اس درجے تک مایوس ہو جائے کہ کوئی راستہ اس کو نظر نہ آئے' جہنم سے ٹکریں مار کر نکلنے کی کوشش کرے اور اس سے وہ نکل بھی نہ سکے۔ یہ کیفیت ہے۔ ' کچھ تو کہو' ایسے مقام پہ ان کے لیے آتا ہے کہ وہاں تو اتنا کچھ کہا کرتے تھے او کچھ تو کہو کہ کیا ہوا۔ عزیزانِ من! بعض وقت آپ کو معلوم ہے کہ بعض ریفرنس سے بعض چیزیں' جسے کہتے ہیں نازل ہوتی ہیں' کچھ تو کہو' کی جو انتہائی مایوسی ہے' ہمت ہے تو ذرا دل پہ ہاتھ رکھ کر ایک مایوس کے دو تین شعر سن لیجیے۔ اُفوہ!

گم ہوئی ہے کہاں کلید سحر
گردشِ روزگار! کچھ تو کہو
گمشدہ راستوں کے ویرانو!
داستانِ غبار کچھ تو کہو

263ص

اوراس کے بعد تو شعر شاید پڑھا بھی نہ جائے:

کیا کہیں غم کی انتہا بھی ہے
غم کے پروردگار! کچھ تو کہو

مُبۡلِسُونَ ((23:77 قرآن نے کہا ہے' وہ وہاں ان سے پوچھیں گے او! کچھ تو کہو۔ آپ نے دیکھا' عزیزانِ من! یہ جو وہاں بات تھی کہ کچھ تو کہو کہ ہماری نگاہوں کا پھیر ہے' وہ نظر نہیں آتے یا وہ یہاں ہیں ہی نہیں جن کے متعلق یہ کچھ تم کہا کرتے تھے۔ کیا نقشہ قرآن کھینچتا ہے:' کچھ تو کہو' کہا کہ اِنَّ ذٰلِکَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَھۡلِ النَّارِ ((38:64 یہ جو ہم بات کہہ رہے ہیں کہ وہ آپس میں یہ کچھ کہیں گے' اسے افسانہ نہ سمجھو' یہ ایک حقیقت کبریٰ ہے جسے ہم بیان کررہے ہیں' یہ حق ہے' ایسے مقام پہ یہ ہوتا ہے۔ یہ حق ہے۔

بطیبِ خاطر منزل کو حاصل کرنے کا جذبہ ہی کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میرا کام تو اتنا ہی تھا قُلۡ اِنَّمَآ اَنَا مُنۡذِرٌ وَّ مَا مِنۡ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَھَّارُ ((38:65 میں تو تمہیں زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرنے والا ہوں' میرا کام تو اتنا ہی ہے' میں زبردستی تمہیں صحیح راستے پہ نہیں لگا سکتا۔ زبردستی راستے پہ لگایا ہوا چلتا ہی نہیں ہے۔ میرا کام تھا صحیح راستہ دکھا دینا' وہ میں نے دکھایا اور صحیح راستہ یہ ہے کہ یاد رکھو! اقتدار اور حقِ حکومت خدا کے سوا کسی انسان کو حاصل نہیں ہے' بس یہ ہے جو بات میں کہنے کے لیے آیا ہوں۔ یہاں آجاؤ گے تو شرفِ انسانیت محفوظ ہو جائے گا' مایوسیوں سے بچ جاؤ گے' جہنم سے بچ جاؤ گے۔ میں تو یہ کہنے آیا ہوں۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَھُمَا ((38:66 یہ سماوات والارض ہے' اس کے اندر Entire Universe (تمام کائنات) آجاتا ہے لیکن کیا بات ہے یہ کہ اس دور میں یہ بھی تو تھا کہ ایک کرّے اور دوسرے کرّے کے درمیان ایک Atmospheric Space (فضائی جگہ) بھی ہوتی ہے' تو مَا بَیۡنَھُمَا قرآن نے یہ کہہ دیا ہے کہ تمہیں تو یہ خلا نظر آتا ہے' تمہیں کیا پتہ ہے کہ اس کے اندر' اس خلا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ یہاں رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ میں رب کہا ہے۔

میں نے کہا ہے' عزیزانِ من! کہ ان آیات' ان سورتوں میں اور قرآن میں' اکثر مقام پہ دو دو لفظوں کے اندر وہ اتنی بڑی حقیقت کہہ جاتا ہے۔ جیسا ابھی میں نے یہ اولی الایدی والابصار عرض کیا تھا' اس میں قوت اور بصیرت دونوں حاصل ہوں' یہ نبی کا مقام ہے۔ یہاں دیکھیے قرآن دو الفاظ کہہ گیا ہے' الٰہ اقتدار کا مالک صرف خدا ہے' حق حکومت صرف اس کو حاصل ہے کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ وہ اس کی حکومت اور اس کا اقتدار اور اس کا غلبہ اور اس کا تسلط کاہے کے لیے ہے؟ دو الفاظ ہیں' عزیزانِ من! پھر میں آ گیا یہیں کہ وہ دو

الفاظ اگر اکٹھے کیے جائیں: اقتدار یعنی قوت اور بصیرت کو تو اس سے ایسا امتزاج ہوتا ہے جس سے انسانیت کی پٹڑی پہ گاڑی چلتی ہے۔ 283ص

آج قوت وبصیرت کے بعد العزیز اور الغفار کی دو صفات کے باہمی ربط کے مفہوم اور مقصد کا فقدان ہے

یہاں بتایا ہے کہ مقصدِ حکومت کیا ہے۔ کہا کہ غلبہ اور اقتدار تو صرف اس خدا کو حاصل ہے۔ کاہے کے لیے ہے یہ؟ کہا کہ **الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ** ((38:66 اس کو انتہائی غلبہ اس لیے حاصل ہے کہ ہر ایک کو حفاظت مل جائے۔ ان دونوں چیزوں کو اکٹھا کیجیے عزیز انِ من! پھر دیکھیے کہ کیا نقشہ سامنے آتا ہے' یہ دنیا جنت بن جاتی ہے یا نہیں۔ یہ عزیز کا لفظ ہے۔ اس کے معنی غلبہ اقتدار ہوتا ہے' العزیز ہے وہ انتہائی غلبہ اور اقتدار اس کو حاصل ہے' کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے لیکن اس کا وہ غلبہ کاہے کے لیے ہے؟ کیا خوف پیدا کرنے کے لیے ہے؟ Terror (دہشت) پیدا کرنے کے لیے ہے؟ کمزوروں کو اور ضعیفوں کو اور ناتوانوں کو جو کچلے ہوئے ہیں اور کچلنے کے لیے دبانے کے لیے ہے؟ ہڈیاں توڑنے کے لیے ہے؟ یہاں تو دنیا کے اندر غلبے کا یہی ایک مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں آج انسانوں کی حکومت انسانوں پہ ہے۔ یہ کاہے کے لیے ہوتا ہے' کیوں اتنی قوت حاصل کرتے ہیں؟ ایک قوم دوسری قوم کو کچلنے کے لیے' ایک فرد دوسرے فرد کو کچلنے کے لیے۔ یہاں غلبے کا مطلب ہی ایک لیا جاتا ہے کہ اتنی پاور ہو کہ وہ سپر پاور ہوں۔ اس سے آج العزیز اور الغفار کے باہمی ربط کا فقدان نظر آتا ہے۔

خدا کے نام پر حکومت قائم کرنے والوں کی ذمہ داری اور اس نظام کی بنیادی صفات

وہ کہتا ہے کہ یہ اتنی پاور کا مالک وہ خدا ہے۔ کاہے کے لیے اس کی پاور ہے؟ غفار: تاکہ کسی کو خوف اور حزن نہ ہو' ہر ایک اپنے آپ کو محفوظ Feel (محسوس) کرے۔ غلبہ اور طاقت اس لیے ہونی چاہیے۔ خدا کے نام پہ جو آپ نظام قائم کریں گے' خدا کی یہ صفات اس میں محسوس شکل میں کارفرما ہونگی۔ یہ پہچاننے کے لیے' جاننے کے لیے کہ نظام خداوندی کیا ہے اور وہ ہے یا نہیں' دیکھنا یہ ہے کہ اس میں خدا کی صفات بہ حد بشریت کارفرما ہیں یا نہیں۔ اس کا نام ہے نظام خداوندی یا حکومت خداوندی۔ اللہ تعالیٰ یہاں آ کر کرسی پہ نہیں بیٹھ جاتا' اس کی صفات کا اس معاشرے کے اندر انعکاس ہوتا ہے' پرتو ہوتا ہے جو اس کے نام پہ اس کی اقدار کے مطابق قائم کیا جاتا ہے۔ اب یہ جو اس کی دو صفتیں العزیز الغفار ہیں: پہلی چیز تو یہ حفاظت ہے' دوسروں کی حفاظت تو ایک طرف جس کے پاس قوت نہ ہو وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتا اس لیے حفاظت کرنے والے کے لیے عزیز ہونا تو نہایت ضروری ہو گیا لیکن اگر وہ عزیز ہی ہے' قوت اور تسلط اس کو حاصل ہے اور مقصد اس کے اپنے ہیں تو وہ تسلط تو پھر چنگیزی اور ہلاکو خانی ہو جائے گا۔ وہ اس کا اقتدار غفاریت کے لیے ہو' بے خوفی اور امن کے لیے ہو' حفاظت کے لیے ہو۔

خدا کی صفت المومن کا مفہوم

آپ کا معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت المومن بھی ہے۔ہم تو مومن سمجھتے ہیں' اس کا ترجمہ ہی ہمارے ہاں ایمان لانے والا ہوگیا۔خدا نے اپنے آپ کو مومن کہا ہے تو ہم تو خدا پر ایمان لاتے ہیں وہ خدا کس چیز پہ ایمان لاتا ہے۔المومن کا تو مادہ ''ا م ن'' ہے جو امن ہے' مومن کے معنی ہیں نظام کائنات کے امن کا ذمہ دار' امن کا ضامن۔اور یہ جو اس کے نام پہ یہاں مومن بنتا ہے یہ انسانیت کی دنیا میں امن کا ضامن ہوتا ہے۔امن کی ضمانت تو وہی دلا سکتا ہے جو پھر عزیز بھی ہو' اس کا غلبہ بھی ہو۔جو اپنی حفاظت کے لیے دوسروں کا محتاج ہو' وہ غفار کیسے ہوسکتا ہے' وہ عزیز کیسے ہوسکتا ہے۔قوت کا یہ مقصد ہے' قرآن نے بتا دیا کہ قوت کا ہونا نہایت ضروری ہے' العزیز ہوگا تو غفار ہوگا لیکن قوت کا مقصد غفاریت ہے۔وہ جو اس [1] نے قوت کے لیے یہ کہا ہے کہ

لا دیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بدتر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

اوز ہر کا تریاق تو ہے ہی۔

قرآن حکیم کی روشنی میں اقبالؒ کے الفاظ میں زہر کے تریاق کا حل شمشیر خارہ شگاف میں ہے

غفاریت جس کا مقصد ہو جائے' یعنی نوع انسانی کو ہر قسم کے خوف اور حزن سے محفوظ رکھنا' تو ہر زہر کا تریاق تو ہوگیا۔اور یہ کس طرح ہوتا ہے؟ وہ بھی اقبالؒ نے عجیب چیز بتا دی۔قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ ہم نے انبیاء کو کتاب بھی دی وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ ((57:25 اور اس کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف بھی نازل کی' کتاب اور اس کے ساتھ تلوار عطا کی:

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند

خالی قرآن ہو اور اس کے ساتھ قوت نافذہ نہ ہو' تو وعظ بن کر رہ جاتا ہے' وہ محفوظ ہی نہیں رہتا۔اور خالی تلوار ہو اور قرآن کی اس کے ساتھ پابندی نہ ہو تو وہ زہر ہلاہل بن جاتی ہے' بے باک ہو جاتی ہے۔'ایں دو قوت' تلوار قرآن کی حفاظت کرنے والی' قرآن تلوار کی حفاظت کرنے والا کہ بیباک نہ ہو۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محو اند

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877ء) کی طرف ہے۔

مومن علیٰ حدِ بشریّت خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرتا ہے

انسانی زندگی کی کائنات اس تلوار اور قرآن کے امتزاج کے گرد گھومتی ہے' یہ ہے العزیز الغفار۔ یہی ہے عبد مومن جو خدا کے نام پہ اسے قائم رکھنے کی ذمہ داری لیتا ہے' یہ جو خدا کی صفتیں ہیں' جو صفات ہیں' وہ ان انسانوں کے اندر علیٰ حد بشریت منعکس ہونی چاہئیں۔ اور اس نظام کے اندر ان کا پرتو ہونا چاہیے جو ان کے ہاتھوں سے قائم ہو۔ مومن کے متعلق یہی دو چیزیں ہیں جو اقبالؒ نے کہی ہیں' چار الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن اصل میں وہ دو ہی چیزیں ہیں کہ

قہّاری و غفّاری و قدوّسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اصل میں تو قہّاری اور غفّاری جو ہے' یہ قدّوسی اور جبروت یہی دونوں چیزیں ہیں۔ تو یہ جو قہّاری اور غفّاری ہے' یہاں العزیز الغفار سے تو اس نے یہ لیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں قرآن دو دولفظوں کے اندر یہ کتنے کتنے سیاسی اخلاقی فلسفیانہ معاشرتی مسائل حل کر جاتا ہے' نظام حکومت دولفظوں کے اندر دیا۔ اقتدار کے نافذ کرنے والوں کے لیے وہاں اُولِی الۡاَیۡدِیۡ وَ الۡاَبۡصَارِ (38:45) کہا' قوت بھی اور بصیرت بھی۔ نظام کے متعلق کہا کہ قوت حفاظت دینے کے لیے حاصل ہو۔

قرآن حکیم تو وہ سمندر ہے کہ جوں جوں آپ آگے بڑھیں گے تو اس کے کنارے اور وسیع ہوتے جائینگے

اب اس کی تفصیل پھیلاتے چلے جایئے' نقطہ ماسکہ تو اس نے دیدیا: العزیز الغفار لیکن یہ تو قرآن کے مفہوم سے پتہ چلتا ہے کہ کیا کہہ گیا ہے۔ ترجموں اور تفسیر سے آپ دیں گے تو ''عزیز عزت والا اور غفار بخشنے والا ہے'' سے آپ کیا سمجھے۔

نبی اکرم ﷺ کی طرف سے پیش کردہ انقلاب کے ثمرات کی یقین دہانی کے باوجود کفار کی مخالفت اور قصہ آدم کی تفصیل

عزیزانِ من! اب سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ شروع سے یہ چیز کہی جا رہی تھی' حضور ﷺ نے کہا تھا کہ وہ انقلاب آنے والا ہے' ہمارے ہاتھوں سے وہ برپا ہوگا جس کا نقشہ یہ ہوگا کہ یہ جتنے اس قدر سرکش اور بیباک اور طاغوت ہیں' جہنم کے اندر ہونگے۔ یہی جماعت مومنین جو آج تم کو اس قدر کمزور اور نحیف سی نظر آتی ہے' تم دیکھو گے کہ یہ خدا کی صفات کو اپنے اندر لیے ہوئے' جب نظام قائم کریں گے تو اس نظام کا نقشہ کیا ہوگا۔ قُلۡ ہُوَ نَبَؤٌا عَظِیۡمٌ ۔ اَنۡتُمۡ عَنۡہُ مُعۡرِضُوۡنَ (38:67-68) کہا کہ بڑا عظیم سا ایک واقعہ ہے جو ہونے والا ہے اور تم اس سے اعراض برت رہے ہو' گریز کی راہیں نکال رہے ہو' پہلوتہی کر رہے ہو کہ وہ کہیں آنے نہ پائے۔ کہا کہ جتنے

بھی انبیائے کرامؑ آئے' انہوں نے یہی پیغام دیا تھا اور ہر ایک کے ساتھ جھگڑا کرنے والوں نے اسی طرح جھگڑا کیا جیسا تم میرے ساتھ جھگڑا کرتے ہو۔ ان کے جھگڑے کی تفصیل تو مجھے معلوم نہیں۔ کہا کہ مَا كَانَ لِيَ مِنۡ عِلۡمٍۢ بِالۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰٓى اِذۡ يَخۡتَصِمُوۡنَ (38:69) وہ بلند مقامات کے اوپر انبیائے کرامؑ تھے' ان کے ساتھ جو لوگ جھگڑے کرتے تھے اس کے متعلق کچھ تفصیلی علم تو میں نہیں کہہ سکتا۔ اِنۡ يُّوۡحٰٓى اِلَىَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ (38:70) وحی کے ذریعے مجھے ان کے متعلق جو بتایا جاتا ہے' میں تمہیں بتا دیتا ہوں اور اسی کے ذریعے مجھے یہ کہا جاتا ہے کہ ان کو وارن (Warn) کردو کہ جس روش پہ یہ چل رہے ہیں' اس کا انجام تباہی ہے۔ اور اس تباہی کے لیے اس نے کہا ہے۔ اب اگلی آیت میں قصہ آدم ہے۔

ہمارے ہاں علما کے نزدیک خدا تعالیٰ کی تصنیف قرآن حکیم ایک بے ربط کتاب ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ عام طور پر ہمارے ہاں سطح بیں واعظ داستاں گو کو قرآن میں ربط نہیں نظر آتا کہ جی! ربط ہے نہیں' وہ یونہی جی حضرت ابراہیمؑ کا قصہ آیا' ایوبؑ کا آ گیا' اس کے بعد جہنم کا قصہ آ گیا' پھر یہ ان کا آ گیا' پھر آدم کا قصہ آ گیا' پھر حضرت نوحؑ کی کشتی آ گئی۔ کسی انسان کی تصنیف بھی ایسی لاترکیب ہے' بے ربط ہو' عزیزانِ من! تو آدمی اٹھا کر پھینک دیتا ہے' چہ جائیکہ جس کتاب کا مصنف ہی کہا جائے گا کہ خدائے عظیم ہو' قیامت تک کے لیے وہ کتاب ہو' اور اس میں قدم قدم پہ کہا جائے کہ یہ اہل علم کے لیے ہے' اہل بصیرت کے لیے ہے' اہل فکر کے لیے ہے' اس لیے تدبر کرو' غور کرو' فکر کرو تو کیا اس قسم کی کتاب بے ربط ہوگی؟ بے ربط کتاب تو جیسا میں نے عرض کیا ہے کسی انسان کی تصنیف بھی قابل قبول نہیں ہوتی۔ میری کسی کتاب کے متعلق وہ کہدے کہ اس کے اندر تو ربط ہی نہیں ہے تو میں اس کو اٹھا کر پھینک دوں' اگر واقعی اس میں ربط نہیں ہے۔

کائنات کی تو کوئی ایک شے بھی بے ربط نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک اکائی ہے

ربط ہی تو وہ ہے جسے انسانیت کا بیان کہا جاتا ہے' اس کی خصوصیت ربط ہے جو کلام کے اندر ہوتا ہے' بے ربط کلام تو پاگل کا ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ دو گروہ الگ الگ ہم بتاتے چلے جا رہے ہیں۔ انسانوں کے یہ دو گروہ کیوں ہو گئے؟ کائنات کی کسی شے میں دو گروہ نہیں ہیں' پانی جہاں بھی ہے' نشیب کی طرف بہتا ہے' آگ جہاں بھی ہے' حرارت پہنچاتی ہے' جہاں بھی آپ گیہوں کا بیج ڈالتے ہیں' اس سے گیہوں پیدا ہو جاتا ہے' بارش برستی ہے تو زمین مردہ میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ دو طرح کے نتائج نہیں نکلتے ہیں۔ انسانوں کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے ہاں یہ تخریبی قوت والے بھی واقع ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں یہ دوسری قسم کے مومن بھی واقع ہوئے ہیں' یہ الگ الگ کیوں ہیں؟ کہا کہ یہ اس لیے کہ کائنات میں صرف یہ ایک ہستی ہے جسے ہم نے صاحب اختیار پیدا کیا ہے۔ اسے ہم نے صرف

راستہ دکھایا ہے اور وھدینٰھم نجدین ((90:10 دونوں راستے اس کے سامنے کھول دیئے اور اس کے بعد یہ کہہ دیا کہ یہ جہنم کی ص263 طرف جاتا ہے' یہ جنت کی طرف جاتا ہے' چوراہے پہ تم کھڑے ہو' جدھر کا جی چاہے اختیار کرلو' ہم اس کے بعد دخل ہی نہیں دیں گے' نہ زبردستی تمہیں کسی راستے پہ چلائیں گے۔ اس لیے کہ انسان کو جو اس کی Self یا خودی ملی ہے' وہ تو جو کام یہ اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے اس کا اثر اس پر ہوتا ہے۔

قصّہ آدم ایک بیان کا تمثیلی انداز ہے جس میں بابا آدم والی بات نہیں ہے

یہ امتیازی خصوصیت کائنات میں اوپر خدا کو حاصل ہے یا اس کی عطا کردہ انسان کو حاصل ہے۔ اور یہی چیز اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ آدم کسی فرد کا نام نہیں ہے' یہ بابا آدم والی بات نہیں ہے' نہ اماں حوا والی بات ہے' یہ آدمی کی بات ہے' وہ آدمی ہی کو آدم کہا جاتا ہے۔ اور وہ جو قصہ آدم ہے' اس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ وہ صاحبِ اختیار و ارادہ ہے' ذمہ داری کا قبول کرنا' اپنے ارادے سے' اختیار سے' ایک کام کرنا' غلط ہوگیا ہے تو اس کے بعد ذمہ داری کو قبول کرنا۔ اگر ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا تو یہ سرکشی ہے' یہ ہے سارا قصہ آدم۔ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ((38:71 اور انسان کی تخلیق کی ساری بات تو بار بار آ چکی ہے' میں ان کی تفصیل میں نہیں جاؤنگا' اسی نقطے پر رہونگا۔ ہر جاندار کی ابتدا In-animate (غیر جاندار) مادہ سے ہوئی۔

قصّہ آدم کی ماہیت کے سلسلہ میں شیطان ابلیس ملائکہ اور انسان کے لیے اختیار و ارادہ کی قوت وغیرہ کی وضاحت

قرآن بتاتا ہے اور آج کی سائنس بتا رہی ہے کہ اُسے ہمیشہ اس نے طین کہہ کر' تراب کہہ کر پکارا ہے۔ اور پھر آگے سلسلہ ارتقا چلتا ہے۔ میں یہ اس درس میں اس طرف نہیں آؤنگا۔ کہا ہے کہ فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ ((38:72 جب تک تو یہ بھی محض طبعی' فزیکل باڈی' کا کچھ ہوگا اس میں ''میں'' نہیں ہے' جب اس کو اختیار و ارادے کا شرف میں عطا کرونگا' یہ قوت عطا کرونگا' ملائکہ سے کہا کہ پھر یہ تم سے افضل ہو جائے گا۔ ملائکہ وہ قوتیں ہیں جو خدا کے امر یا اس کے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے مخلوق کی گئی ہیں۔ ان کا کام ان کے مطابق کرتے چلے جانا ہے' ان کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں ہے۔ کہا کہ جب یہ صاحب اختیار و ارادہ ہو جائے تو فطرت کی قوتوں سے کہا کہ تم نے اس کے سامنے جھکنا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ ((45:13 کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جتنی یہ قوتیں ہم نے پھیلا رکھی ہیں' تم ان سب کو مسخر کر کے اپنے کام میں لا سکتے ہو۔ یہ ہے سجدۂ ملائکہ۔ کہا کہ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ ۔ اِلَّآ اِبْلِیْسَ اسْتَکْبَرَ وَ کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ((38:73-74۔

یہ تمثیلی بیان ہے، یہ باہر کی جو خارجی قوتیں تھیں وہ تو انسان کے سامنے جھک گئیں، اس کے اپنے اندر کے جو سرکش جذبات تھے، وہ اس کے سامنے نہیں جھکے۔ ان کو جھکانا پڑتا ہے، وہ از خود نہیں جھکتے، ان کو بیباک چھوڑ دیں گے تو وہ آپ کے اوپر غالب آ جائیں گے، ان کو اگر آپ حدود خداوندی، اقدار خداوندی، کے تابع رکھیں گے تو وہ آپ کی مرضی کے مطابق کام کریں گے۔ ابلیس کی سرکشی یہ ہے۔ قَالَ یٰٓاِبۡلِیۡسُ مَا مَنَعَکَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِیَدَیَّ اَسۡتَکۡبَرۡتَ اَمۡ کُنۡتَ مِنَ الۡعَالِیۡنَ ((38:75 کہا: ابلیس کیا بات ہے! کہ تم اس کے سامنے نہیں جھکے۔

انسان کے لیے مقامِ افضلیت: خدا کا انسان کو اپنے ہاتھوں سے تیار کرنے کا مفہوم

یہاں لفظ کہا ہے کہ جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے، یعنی جو انسان کی افضیلت ہے۔ ویسے تو اور کائنات کی چیزوں کے متعلق بھی یہ کہا ہے، یہاں خاص طور پہ کہا ہے کہ جسے ہم نے خود اپنے ہاتھ سے تیار کیا ہے ''یعنی ٹھیکے تے نہیں بنوایا ہیگا[1] ''۔ کیا بات ہے کہ تم تکبر میں آ گئے، تم ان ملائکہ سے اونچا ہونا چاہتے ہو؟ قَالَ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡهُ ((38:76۔ یہ، عزیزانِ من! جو آگے بات کہی ہے، سائنٹسٹ ہی نہیں آج کے جو نفسیات دان یعنی سائیکولوجسٹ (ماہرین نفسیات) ہیں وہ ان چیزوں پر غور کر کے وجد میں آتے ہیں۔ کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔

آب و گل کے اس پتلے میں حرکت، حرارت اور جذبات یعنی اختیار و ارادہ کے ایک شمہ کی وضاحت

کیا بات ہے اس بہتری کی! کہ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِیۡنٍ((38:76۔ یہاں تو بحثیں ہی یہ چل پڑی ہیں کہ جی! شیطان کو آگ سے پیدا کیا ہے، انسان کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ اس نے یہ کیا دلیل دی؟ یہ بڑی دلیل ہے۔ یہ حرکت اور حرارت جذبات کی خصوصیت ہے، انسان کا طبعی جسم، جسے اختیار و ارادہ حاصل نہیں ہے، مٹی کا پتلا ہے، کہا کہ یہ میں ہوں، جو اختیار و ارادہ ہے اس کی حرارت ہے، میں حکم دیتا ہوں، یہ اس کی تعمیل کرتا ہے۔ اور آج کی سائیکولوجی اسی پہ چلتی ہے۔ میں اندر سے یہ فیصلہ دیتا ہوں، اپنے ہاتھ کو حکم دیتا ہوں کہ گلاس کو پکڑ لو، یہ تو میرے احکام کی فرماں برداری کرتا ہے۔ یہ جو طین سے پیدا ہوا ہے، یعنی جو طبعی جسم ہے، وہ تو میرے احکام کی تعمیل کے لیے بنایا گیا ہے تو بتاؤ کہ میں افضل ہوں یا یہ طبعی جسم افضل ہے۔

عزیزانِ من! آج کل خاص طور پر یورپ اور امریکہ کے یہ فلاسفرز اور سائیکولوجسٹ اس چیز پہ لگے ہوئے ہیں۔ ابھی ابھی حال

---

[1] ٹھیکے پہ نہیں بنوایا۔

میں میرے پاس جو Latest (جدید ترین) کتاب [1] آئی ہے' وہ The Mind and the Brain یعنی انسان کی ہے اور Self 263 صٓ (نفس) کی ہے۔ عجیب تحقیقات ہو رہی ہیں۔ وہ اسی نقطے کے گرد گھوم رہی ہیں کہ جسے کہا گیا ہے' مٹی سے پیدا ہوا ہے' یہ انسان کی Physical Body ہے' یہ اس کا طبعی جسم ہے۔ اور وہ جو اس نے کہا تھا کہ میں اس سے اوپر ہوں' میں اس پہ حکومت کرتا ہوں' یہ میرے حکم کے تابع چلتا ہے' وہ ہے جس میں حرکت وحرارت ہے' جس میں اختیار کی چیز ہے' وہ انسان کے جذبات ہیں۔ تو وہ جو جذبات تھے' وہ سرکش ہوئے' جھکے نہیں اور انہوں نے کہا کہ اس کا کیا ہے' میں حکم دیتا ہوں' یہ اس کی تعمیل کرتا ہے اس لیے بتاؤ کہ یہ افضل ہے یا میں افضل ہوں۔ کتنی بڑی چیز ہے! بات آگے آتی ہے کہ تم نے صرف اس کے طبعی جسم کو دیکھا ہے' اس کے اندر ایک اور چیز بھی ہے جو تمہیں بھی اپنے سامنے جھکا سکتی ہے' وہاں اس پر نگاہ رکھو' اس مغالطے سے نکل جاؤ گے۔ کیا بات قرآن بیان کرتا چلا جاتا ہے!

اب یہاں سے ایک بات آ گئی۔ آپ دیکھتے ہیں ابلیس نے دلیل دی ہے' اس نے کہا کہ تم نے کیوں سجدہ نہیں کیا' اس نے کہا کہ اس لیے نہیں کیا کہ میں اس سے افضل ہوں' مجھے تم نے آگ سے پیدا کیا ہے' اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ دلیل یہ ہے۔ ہمارے ہاں شریعت میں عقل سے کام لینا حرام ہے' مسلمہ ہے کہ اس میں عقل کو دخل نہیں ہے۔ اس کے لیے آپ پوچھیں کہ سند کیا ہے' کہتے ہیں کہ سیدھی بات ہے **اول من خاص ابلیس** سب سے پہلے جس نے دلیل سے کام لیا تھا وہ ابلیس تھا' اس لیے جب بھی تم نے Reason (عقل) سے اور Argument (دلائل وبراہین) سے کام لیا تو ابلیس کی طرح ہوئے اور اس کی سند یہ ہے کہ دیکھیے اس نے دلیل پیش کی تھی۔ یعنی اب سارا ہی قرآن منسوخ ہوا۔ خدا کہتا ہے ان لوگوں سے رسول ﷺ کی زبانی کہ ان سے کہو کہ **ھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین** ((2:111 میں بھی دلیل پیش کرتا ہوں' تم بھی دلیل پیش کرو' فیصلہ دلیل کی رو سے ہوگا۔ اُدھر سے تو وہ کہتے ہیں وہ دلیل پیش کریں گے' اِدھر والے جو شریعت والے ہیں ان کے اوپر تو دلیل پیش کرنا حرام ہے۔

Reason (عقل) سے سمجھنا سوچنا اور دلائل وبراہین (Arguments) (ان کے ہاں کا) **اول من خاص ابلیس** مسلمہ ہے۔ اس کے بعد پتہ ہے کہ بات کیا ہوئی تھی۔ اس کے آگے ہے کہ **قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّکَ رَجِیۡمٌ** ((38:77 دور چلا گیا تُو سعادت مندیوں سے خوشگواریوں سے۔ کیا چیز تھی جس سے یہ دور چلا گیا تھا' قرآن میں دوسری جگہ بتایا ہے اور وہ ہے نقطہ ماسکہ کہ اختیار' اس کا غلط استعمال' پھر باز آفرینی۔

---

[1] اس کتاب کا حوالہ یہ ہے:

Schwartz, Jeffrey M. & Begley, Sharon: The Mind and the Brain: Neuroplastility and the Power of Mental Force, Regan Books, Haper Collins Publishers Inc. NY (Reprint 2002).

آدم نے معصیت کی، معانی کا طلب گار رہا، جو قبول ہوئی، ابلیس نے نافرمانی کی اور اپنی ذمہ داری خدا پر ڈال دی، ملعون قرار پایا

کہا کہ آدم سے ہم نے یہ کہا کہ اس شجر کے پاس نہ جانا، یہ تمثیلی بات ہے، آدم نے معصیت کی، نافرمانی کی، اس کے پاس چلا گیا۔ ابلیس سے ہم نے کہا کہ اس کو سجدہ کرو، اس نے نہیں کیا، اس نے بھی معصیت کی۔ اندازہ لگایئے، عزیزانِ من! قرآن کیا کیا کچھ کہہ جاتا ہے۔ اس نے بھی معصیت کی، اِس نے بھی معصیت کی، اس اعتبار سے دونوں ایک سطح پر آ گئے۔ آدم سے ہم نے کہا کہ تم نے یہ کیوں کیا ہے؟ اُس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا (7:23) میں اپنی غلطی کا ذمہ دار ہوں، مجھ سے غلطی ہو گئی، میں معافی کا طالب ہوں، آئندہ ایسا نہیں کرونگا، اس چیز کی احتیاط کرنا۔ اپنے اختیار و ارادے کو استعمال میں لانے کے بعد اگر قدم غلط اٹھتا ہے تو ذمہ داری قبول کی جائے۔ وہ تو تائب ہوتا ہے، انسان ذمہ داری قبول کرنے والا ہے، خدا تو اب اپنے آپ کو کہتا ہے کہ ایک قدم ہماری طرف بڑھا تو ہم دو قدم اور آگے بڑھتے ہیں۔

''جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں''

ابلیس سے کہا کہ تم نے ہمارے حکم سے نافرمانی کی۔ کہنے لگا: کیا کہتے ہیں آپ!! میں کون ہوں نافرمانی کرنے والا!! تیرے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا، میں نے تو تمہارے ہی حکم کے مطابق کیا، میں تو صاحب اختیار ہوں ہی نہیں، تمہاری اس مرضی کے مطابق میں نے سجدہ نہیں کیا، میں ذمہ دار ہی نہیں ہوں، تُو ذمہ دار ہے۔ کہا کہ اپنے اختیار کو جبر میں بدلتا ہے، یہی ملعونیت ہے، انسان کا صاحب اختیار ہونا ہی شرف تھا، اپنے اختیار کے بعد یہ کہتا ہے کہ میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں، خدا نے مجھ سے کرایا ہے، ذمہ داری دوسرے کی طرف لوٹاتے ہو۔ جو دوسرے کے اوپر ذمہ داری دھرتا ہے اس میں کبھی اصلاح کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ہاں ایک تو وہ مسلمہ ہے کہ سب سے پہلے جو کسی نے Argument (برہان) دیا، وہ ابلیس تھا، دوسرا مسلمہ یہ ہے کہ سب کچھ خدا کراتا ہے اس کے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہلتا۔ ابلیس نے یہی کہا تھا اور اس سے کہا تھا کہ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ - وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (38:77-78) تُو محروم رہے گا تیرے ہاں تو بازآفرینی کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ تُو اپنی ذمہ داری کو قبول نہیں کر رہا، اس لیے ہمیشہ کے لیے تُو محروم رہے گا۔

عزیزانِ من! آگے دو فقرے اور بھی ہیں لیکن وقت ہو گیا ہے، اس سورۃ کی بھی چند ہی آیتیں ہم نے لیں۔ یہ اگلی بات ہم آئندہ پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ ہم سورۃ صٓ کی آیت 78 تک آ گئے، 79 ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

288ص

پانچواں باب: سورۃ ص (آیات 79 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿٧٩﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ
الْمَعْلُوْمِ ﴿٨١﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٢﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٨٣﴾ قَالَ
فَالْحَقُّ ۡ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ﴿٨٤﴾ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٥﴾ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ
عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿٨٦﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ
حِيْنٍ ﴿٨٨﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1980ء کی 31 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ص کی آیت 79 سے ہو رہا ہے: (38:79)۔

خدا کے صحیح تصور کی اہمیت

آغاز تو اسی 79 ویں آیت سے ہوگا لیکن یہ سابقہ آیات کے تسلسل میں بات آگے چلتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ذرا دشواری یہ ہوئی کہ سابقہ جمعہ کا درس خصوصی تھا اور یہ اس سے پہلے کی آیات تھیں۔ یہ 17 اکتوبر 1980ء کے درس میں آئی تھیں اور ممکن ہے کہ وہ چیزیں ذہنوں میں مستحضر نہ ہوں۔ میں چند الفاظ میں پہلے انہیں دہرا دینا چاہتا ہوں تاکہ پھر یہ پوری داستان اس تسلسل میں سامنے آجائے۔ ویسے بھی ان آیات میں بعض نکات بڑے بنیادی اور اہم ہیں۔ پہلی چیز یہ سمجھ لیجیے کہ بنیادی چیز خدا اور انسان کا صحیح تصور (Concept) ہے، جسے یہ Concepts (تصورات) کہتے ہیں وہ درست ہونے چاہئیں تو پھر بات آگے چلتی ہے۔ قرآن بھی اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے اور اسلام بھی اسی صورت میں۔ یہ جو Concepts (تصورات) ہیں، مثلاً ایمان، یہ ایمان یونہی ایک لفظ نہیں ہے بلکہ ایمان کے معنی ہیں کہ جو صحیح تصورات ہیں، وہ آپ کے ذہن میں بالکل واضح اور Clear (شفاف) ہونے چاہئیں۔ اور پھر انہیں آپ علیٰ وجہ البصیرت

ایک صداقت کی حیثیت سے صحیح تسلیم کریں۔ خدا پر ایمان ایک تصور ہے۔ ہمارے ہاں تو یہی ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ مانتا ہوں کالفظ جو 288صٓ ہے، کبھی شرمندۂ تعبیر ہی نہیں ہوا۔ تم کیا مانتے ہو؟ بس مانتا ہوں۔ آپ بچوں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس سے کیا بات آپ کے ذہن میں آئی؟ اس سے انسان کی اپنی دنیا میں ہی نہیں خارجی دنیا میں بھی انقلاب آجاتا ہے، اگر یہ پتہ چلے کہ خدا کا صحیح تصور کیا ہے۔ وہ جو میں کبھی کبھی دہرایا کرتا ہوں غالباً لاک (Locke: 1632-1704 A.D) کی بات ہے جس نے یہ کہا تھا کہ آپ مجھے یہ بتادیجیے کہ فلاں قوم نے اپنی پرستش کے لیے اس قسم کا معبود تجویز کیا تھا اور میں اس قوم کی پوری تہذیب وتمدن کی زندگی آپ کو بتادونگا کہ کیسی ہوگی۔ یہ اتنی بنیادی چیز ہے جن کو آپ Concepts (تصورات) کہتے ہیں۔ یہ بڑی اہم چیز ہیں۔

قصۂ ابلیس وآدم کا صحیح تصور ہی دین کی بنیاد ہے

خدا کے متعلق بنیادی تصور، قرآنی تصور ذہن کے اندر آجائے تو دین سمجھ میں آجاتا ہے۔ اور پھر وہ خدا ہی کے متعلق صحیح تصور نہیں دیتا، انسان کے متعلق بھی صحیح تصور دیتا ہے۔ یہ دونوں تصورات اگر سامنے آجائیں تو یہ دین کی بنیاد بن جاتے ہیں، جن کے متعلق ہمارے ہاں کبھی کچھ اہمیت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ میں خدا کو مانتا ہوں اور بس انسان تو ہم ہیں ہی۔ یہاں سے بات شروع ہوتی ہے اور یہیں سے بات شروع ہونی چاہیے۔ اور اس سلسلے میں یہ جو انسان کے متعلق Concept (تصور) ہے اور اسی ضمن میں یہ کہونگا کہ خدا کے متعلق بھی جو تصور ہے، یہ جو ابلیس وآدم کا قصہ ہے، اس میں یہ بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ میں پھر عرض کروں کہ ہمارے ہاں تو اس ابلیس وآدم کے قصے کو بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے، اور پھر اس سے جو تصورات قائم ہوتے ہیں، وہ عجیب وغریب قسم کے تصورات قائم ہوتے ہیں۔ وہ بڑی بنیادی چیز ہے۔ پہلی چیز جو اس کے اندر آئی تھی، جو اس نے یہ کہا تھا کہ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (38:76)۔ یہ بڑا بنیادی نکتہ تھا۔

اگر انسان کے اندر جذبات نہ ہوں تو پھر اس کی حیثیت مٹی کے مادھو سے زیادہ کچھ نہیں رہتی

آپ کو یاد ہوگا اب تو ہم 23 ویں پارے پہ پہنچے ہوئے ہیں، شروع سے یہ چیزیں متعدد بار آچکی ہیں، قرآن نے یہ قصہ ابلیس وآدم دہرا ہی اسی لیے ہے کہ اس کے اندر بڑی بنیادی حقیقتیں ہیں۔ ابلیس انسان کے جذبات ہیں، یہ جس کو اب کہا ہے کہ اس کو تم نے طین سے، یعنی مٹی کا بنایا ہوا ہے، یہ انسان کے اعضا ہیں، یہ جسے ہم مٹی کا مادھو کہتے ہیں۔ یہ اس کے سارے اعضاء جذبات کے تابع کام کرتے ہیں، (مثلاً) میں نے فیصلہ کیا کہ بولنا ہے، زبان بولنے لگ گئی، میں نے فیصلہ کیا، گھڑی اٹھانی ہے، میرا ہاتھ آگے بڑھ گیا، اس نے گھڑی اٹھالی ہے، میں نے فیصلہ کیا کہ یہ چیز چرانی ہے، میرا ہاتھ بڑھ گیا، اس نے یہ چیز میری جیب میں ڈال لی۔ یہ میرے ہاتھ، یہ میرے پاؤں، یہ میری

زبان ہے یہ تو بجائے خویش کچھ شے ہی نہیں ہیں' یہ ایک ایسی چیز کے تابع چلتے ہیں' اس کو آپ جذبات کہہ لیجیے۔ یہ بڑی گہری نفسیاتی پیچیدگی 298ص ہے اور اب سائیکولوجی اس کے اوپر چلی ہے' اسی کو انہوں نے Self (نفس) کہا' Ego (ایغو) کہا' ہم نے بھی اسے خودی کہا' انسانی ذات کہا اور اُدھر جو Ego کہا تو ادھر ہمارے ہاں انانیت ایک لفظ ہے' جس کو انا کہا جاتا ہے۔ اور یہ جو جسم انسانی ہے' اس کی اپنی کچھ حیثیت نہیں' یہ خود صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں ہے' یہ اس کے تابع چلتا ہے جسے ابھی ابھی ہم نے کچھ کہا ہے۔

آدم کی غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے جذبات کو خدا کے حکم کے تابع نہ رکھا

اب یہ جو جذبات ہیں' یہاں تک اس نے یہ صحیح کہا تھا کہ یہ جو محض طبعی اعضاء ہیں' یہ جو انسان کے جسم کے Physical Organs ہیں' اس نے یہ کہا کہ یہ تو میرے تابع چلتے ہیں' میرے حکم کی تعمیل کرتے ہیں تو اس لیے میں اس سے افضل ہوں۔ وہ کہاں غلطی کر گیا؟ غلطی اس نے یہ کی کہ اس نے یہ کہا کہ میں ان اعضاء کو اپنے حکم کے تابع چلاؤ نگا اور میں صاحبِ اختیار ہوں' جس طرح سے جی چاہے گا کرونگا۔ اور اس سے خدا نے کہا کہ میں نے تمہیں ایک حکم دیا تھا' تم نے اس سے سرکشی برتی۔ تو اب صحیح نظام کیا ہوا کہ انسانی جذبات خدا کے احکام کے تابع رہیں اور پھر یہ جسم انسانی سے کام لیں۔ آپ نے دیکھا کس طرح سے یہ بات واضح ہوئی ہے۔ پہلے یہ کیوں کہا ہے کہ ہم نے اس سے کہا کہ سجدہ کرو اور اس نے استکبار کیا' سرکشی برتی' یہ جو ہے کہ اَمۡ کُنۡتَ مِنَ الۡعَالِیۡنَ (38:75) اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری بہت بڑی انا تھی' انانیت تھی۔

انسانی ذات' انسانی جسم اور خدا کے احکام کے مابین باہمی رابطے کی نوعیت اور اہمیت

یہ جو انسانی خودی یا Self (نفس) ہے جب آدمی خدا کے احکام یا قوانین سے سرکشی برتتا ہے تو آج کی سائیکولوجی کی اصطلاح میں' اسے وہ Ego کہتے ہیں' ہمارے ہاں اسے ''انا'' کہا جاتا تھا۔ فرعون نے اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی (79:24) کہا تھا۔ یہ جو انانیت ہے' یہ انانیت کوئی بُری چیز نہیں ہے' یہی تو اصل انسان ہے' یہ جسم انسانی تو شے ہی کچھ نہیں ہے' یہ تو جو اعضا ہیں' یہ اس کے Instruments (ذرائع) ہیں' اس کے ذرائع ہیں' اس کے اوزار ہیں' اس کے احکام کو Carry-out (عمل) کرنے کے لیے وسائل ہیں۔ اصل شے تو وہ ہے اور وہ ہے صاحبِ اختیار ہونا۔ اب اس پر صرف ایک پابندی لگائی گئی ہے کہ وہ اگر احکام و قوانین خداوندی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے تو اس کا نتیجہ خیر ہوگا' تعمیری ہوگا' اس کی ذات کی Development (نشوونما) بھی ہوگی' خارجی کائنات کے حسن میں بھی نکھار پیدا ہوگا۔ اور اگر یہ اس سے سرکشی برتے گا تو یہ ٹھیک ہے' یہ اس جسم سے جو جی چاہے کام لیتا جائے گا' یہ تو اس کے تابع چلنے والی چیز ہے' یہ انکار نہیں کرتی' کوئی ہاتھ اس سے انکار نہیں کرے گا اگر اس سے یہ کہا جائے گا کہ اس کو طمانچہ مار دو' یہ ہاتھ کا کام نہیں کہ وہ یہ کہے کہ یہ مظلوم ہے'

میں کیوں طمانچہ ماروں، وہ ظالم کا ہاتھ پکڑنے کو کہے گا کہ پکڑلو مظلوم کے سینے میں چھری نہ گھونپ دے، تو ہاتھ اس کو پکڑ لے گا، وہ کہے گا 288 ص کہ اسی چھری سے اس کو ذبح کر دو، ہاتھ اس کو ذبح کر دے گا۔ تو یہ جو اندر فیصلہ کرنے والی چیز ہے، یہ ان سے کام لینے والی چیز ہے۔

انسانی زندگی کے دو مختلف تصورات

لٰہذا ایک تو یہ تصور ہوا کہ یہ کسی کے تابع نہیں ہے، یہ جو جی میں آئے فیصلے کرے۔ یہ جو تصور ہے میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس کو ''انانیت'' کہتے ہیں، اس کو ''Ego'' کہتے ہیں اور خارجی دنیا میں جب آپ آئیں گے تو یہ ساری مغرب کی سیکولرازم، ان کی ساری ڈیما کریسی، اس کے تابع چلتی ہے کہ انسان کے اندر جو فیصلے کرنے والی قوت ہے، وہ بے محابہ فیصلے کرتی ہے، بے مہار ہے، اس پر کوئی اور طاقت نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اگر بنیادی تصور کو قرآن کے مطابق صحیح کر لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ انسان کی ذات ہی حسین ہو جاتی ہے، خارجی کائنات میں بھی ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ انسانی انا اگر فرعون ہو جاتی ہے اور کہے ہے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ((79:24 تو یہ ''شر'' ہے۔

انسانی نفس یا جذبات خدا تعالیٰ کی عطا ہیں، ان کی تربیت تو ہو سکتی ہے انہیں قتل نہیں کیا جا سکتا

اب اس کے خلاف ہمارے ہاں ہمارا ہی تصور نہیں، سب کا ہے۔ اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ صاحب! یہ جو ''انا'' ہے، یہ جس کو نفس کہتے ہیں، خودی کہتے ہیں، اس کو مار دینا چاہیے، فنا کر دینا چاہیے۔ یہ اس قدر باطل تصور ہے۔ یہ فنا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور پھر اگر یہ چیز ہے تو پھر خدا سے لڑائی مول لینے والی بات ہے کہ اس نے یہ بنایا ہے اور پھر یہ ہر انسانی بچے میں وہ پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور یہ اس کو فنا کرنے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے نفس کشی کہتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ جسے انہوں نے اپنے فریب نفس میں آ کر یہ کہا کہ ہم جذبات کو مار دیتے ہیں۔ وہ مرتے نہیں ہیں، وہ شعور سے تحت الشعور میں چلے جاتے ہیں اور وہاں زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں کہ شعور کے تابع تو پھر بھی باہر نکلنے کا ان کا جو چینل ہوتا ہے وہ فطرت کے مطابق ہوتا ہے اور اگر آپ اسے دبا دیتے ہیں یہ تحت الشعور میں چلے جاتے ہیں تو پھر یہ اپنے جو غیر فطری راستے ہیں، ان کو خود تراشتے ہیں اور اس طرح سے اپنے آپ کو باہر لاتے ہیں۔

مٹی کے اس مادھو میں اصل چیز تو یہ جذبات ہی ہیں

اصل چیز تو یہ ہے، اصل آدم تو یہی ہے جسے آپ یہ خودی، انا، Self کہہ رہے ہیں۔ اس کی تربیت کی ضرورت ہے کہ یہ احکامِ خداوندی یا قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلے کرے۔ قوانین کہنا زیادہ بہتر ہے۔ احکام کا جو لفظ ہے وہ حکم عام طور پہ بدل بھی سکتا ہے، جب وہ حکم ایسا مستقل ہو جائے کہ وہ غیر متبدل ہو جائے تو وہ قانون کہلاتا ہے۔ اگر یہ قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے فیصلے دیتا ہے تو یہ ہے جسے دین کہا جائے گا، اگر اس کو بیباک چھوڑ دیا جاتا ہے تو یہ ہے جسے میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اسے سیکولرازم کہیے، الحاد کہیے، بے دینی

کہیے۔ مغرب کا جو سارا نظام ہے' آج اسی کے تابع ہے' اسی کے ماتحت ان کی سیاست چلتی ہے' معیشت چلتی ہے' معاشرت چلتی ہے' اقوام کے ساتھ تعلقات چلتے ہیں۔ یہ بیباک Ego ہے' اس وقت قوموں کے اندر یہ سارے Ego ٹکرا رہے ہیں اور یہ وجہ ہے کہ جس کا Ego اس میں ملوث نہیں ہوتا' اس کی سمجھ میں بات نہیں آتی کہ یہ کر کیا رہے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں بات نہیں آ رہی کہ یہ ایران و عراق ❶ کر کیا رہے ہیں۔ اور اگر ہمیں بھی مجبوراً ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ہونا پڑے یا یہاں بھی وہ صورت پیدا ہو جائے تو ہم بھی وہی کچھ کرنے لگ جائیں' سمجھ میں اس وقت بھی نہیں آئے گا' سمجھ کی تو وہ بات ہی نہیں ہوتی' وہ تو جذبات کی بات ہوتی ہے۔

قصۂ ابلیس و آدم کا مرکزی نقطہ اسی فلسفۂ حیات کے گرد ہی گھومتا ہے

آپ دیکھیے کہ یہ ابلیس و آدم کے اندر جو پہلا نکتہ ہے' بات اس نے یہاں تک صحیح کہی تھی کہ میں اس سے بہتر ہوں' میں اس کے سامنے کیوں جھکوں۔ کہا گیا کہ یہ اس کے سامنے جھکنا نہیں' ہمارے قانون کے سامنے جھکنا ہے' یہ تھی چیز۔ اب یہی چیز جو ہے پھر اس نے یہ ایک دلیل دی کہ میں نے کیوں نہیں سجدہ کیا؟ اس لیے کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ ہمارے ہاں' اہل شریعت کے ہاں' اس سے پھر ایک مسئلہ پیدا ہوا' وہ تصوف تو اہل طریقت تھا جس نے کہا کہ سرے سے یہ نفس ہی خراب ہے ''خودی خدا داویر' جنوں کیندے نیں پنجابی اچ ❷''۔

قرآن حکیم کی تعلیم کے برعکس شریعت کے اندر دلیل و برہان کا تصور ہی غلط ہے

اہل شریعت کے ہاں مسئلہ پیدا ہوا کہ شریعت کے اندر دلیل دینا' Reason (وجہ و علت) بیان کرنا' ابلیسی کام ہے کیونکہ ابلیس سے جب خدا نے پوچھا تھا کہ تُو نے کیوں نہیں میرا حکم مانا' تو اس نے دلیل دی تھی کہ میں اس سے بہتر ہوں اور اس لیے وہ ملعون ہو گیا۔ ہمارے ہاں یہ اول من خاص ابلیس مسلمہ ہے کہ سب سے پہلے جس نے Reasoning (دلائل و براہین) سے کام لیا تھا' دلیل سے کام لیا تھا' وہ ابلیس تھا۔ اس لیے اب ان کے ہاں یہ ہوا کہ شریعت کے اندر دلیل اور برہان اور علم اور بصیرت اور Reasoning (دلائل و براہین) کو کوئی دخل نہیں ہے' اتنا زیادہ اس کی مخالفت ہوئی کہ یہ کہا کہ یہ ابلیسی کام ہے۔ اور سارا قرآن اس Reasoning' دلیل و برہان سے بھرا ہوا ہے' وہ مخالفین سے یہ کہہ رہا ہے کہ **ھاتوا برھانکم ان کنتم صدقین** (2:111) اگر سچے ہو تو اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل پیش کرو۔ وہ خود قرآن کو برہان کہتا ہے۔ تو گویا ذہن انسان کا یہ برہان (Reasoning) بھی بڑا ضروری ہوا' یہ جسے آپ اس کی Ego کہتے ہیں یا جسے یہ Self یا انا یا جذبات کہتے ہیں' یہ بھی ضروری ہیں اور جسم انسانی کو ان کے فیصلوں کو بروئے کار لانے

---

❶ یہ 1980ء میں ایران و عراق میں چھڑنے والی جنگ کی طرف اشارہ ہے جو بے نتیجہ تھی اور 1988ء میں بند ہوئی۔

❷ جسے پنجابی میں کہتے ہیں کہ ''خودی' خدا کے ساتھ دشمنی ہے''۔

کے یہ ذرائع ہیں' یہ بھی نہایت ضروری ہے۔ تو اصل چیز تو یہ ہے کہ قوانین خداوندی کے مطابق یہ سب کچھ کر رہے ہیں تو سارا کچھ تعمیری کام ہوگا۔ وہاں سے اگر اُسے چھوڑ دیا ہے اور یہ خود یہ کچھ کرنے لگ گئے ہیں تو یہ پھر سارا فساد ہے۔ ص288

انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ملائکہ کا اعتراض یک طرفہ اعتراض تھا

وہ جو ملائکہ کی نگاہ نے دیکھا تھا کہ دنیا کے اندر کسے بھیج رہا ہے؟ اسے جو یُفْسِدُ فِیْھَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ (2:30) فسادانگیزیاں کرے گا' خوں ریزیاں کرے گا' وہ ٹھیک کہہ رہے تھے' انہوں نے اس Ego (انا) کو دیکھا تھا۔ اور وہ جو کہا تھا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ((2:30 ایک بات تم نہیں جانتے' وہ ہم جانتے ہیں کہ جب ان کی اسی Ego (انا) کو وفَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ((2:38 ہماری طرف سے جو راہنمائی کی جائے گی اس کے مطابق جب یہ Ego (انا) چلے گی تو تم دیکھو گے کہ دنیا میں امن' دنیا کے اندر بے خوفی پیدا ہو جائے گی۔ میں نے کہا تھا کہ جو بنیادی تصورات ہیں' وہ بڑے ضروری ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ یہ قصہ ابلیس و آدم ہم کو کہاں لیے جا رہا ہے۔ پہلی چیز تو اس کی یہ آئی۔ دوسری چیز جو اس سے آگے آتی ہے جس سے کہا گیا کہ تُو قیامت تک کے لیے ملعون رہے گا' ملعون کے معنی خدا کی راہنمائی سے' زندگی کی خوشگواریوں سے' تعمیری امور سے' محروم ہوتا ہے۔ تو کہا کہ تُو قیامت تک کے لیے' ابدی طور پر محروم رہے گا۔ یہ ابدی طور پر اس کے لیے کیوں کہا؟

قصہ ابلیس و آدم ایک تمثیلی قصہ ہے جس میں پہلے غلطی کا اقرار ہے اور پھر اصلاح کا امکان

عزیزانِ من! یہ دوسری چیز آتی ہے۔ اور یہاں آتا ہے انسان کا مقام اور پھر خدا کا تصور۔ آپ کو یاد ہوگا یہ چیزیں کئی دفعہ آچکی ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ قصہ ابلیس و آدم ایک تمثیلی قصہ ہے' یہ اس قسم کا واقعہ نہیں ہے کہ ایک اسٹیج تھی' اس میں ایک آدم نامی پتلا تھا' پھر فرشتے تھے' پھر ملائکہ تھے' پھر خدا تھا' پھر وہاں یہ سارا کچھ ہو رہا تھا۔ یہ قرآن کی تمثیلی چیزیں ہیں جو بیان کی جاتی ہیں' یہ انسان کا اپنا قصہ ہے' جسے ہم آدمی کہتے ہیں' اُسے عربی زبان میں آدم کہتے ہیں' یہ آدمی کا قصہ ہے' یہ سارا کچھ اسی کے متعلق ہے۔ آدم سے بھی کہا گیا کہ وَ لَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ ((7:19 یہ نہ کرنا' اور اس نے وہ کیا' معصیت ہوئی۔ کہا کہ اے آدم! یہ کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ((7:23 مجھ سے بھول ہوگئی' مجھ سے غلطی ہوگئی۔ کہا کہ جب تجھے احساس ہو گیا کہ تجھ سے بھول ہوئی اور تُو نے اپنی ذمہ داری کو قبول کر لیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی' تو اب تم میں اصلاح کا امکان ہے' تم اپنی اصلاح کر لو گے۔ غلطی کا تسلیم کر لینا' ذمہ داری کا قبول کر لینا' یہ کہہ لینا کہ مجھ سے بھول ہوگئی' اس کے معنی ہیں کہ من تاب... و اصلح ((5:39 قرآن جو کہتا ہے کہ اس سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہے من تاب ((5:39 جو پہلے اس کا اقرار کرے کہ مجھ سے یہ غلطی ہوگئی تھی' میں اس

غلطی کا ذمہ دار ہوں' مجھ سے بھول ہوگئی تھی' آئندہ میں ایسا نہیں کرونگا' اس کی اصلاح ہوسکتی ہے (صلح)۔ قرآن میں ہر جگہ تابَ واصلح آیا ہے' اصلح ہو ہی نہیں سکتا اگر پہلے تاب نہ ہو' یعنی اگر آپ اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتے' ذمہ داری قبول نہیں کرتے کہ میں ذمہ دار ہوں جو غلط قدم میں نے اٹھایا ہے' تو آپ کی اصلاح ہی نہیں ہوسکتی۔ اصلاح اسی کی ہوتی ہے جس کا پہلا یہ قدم ہو کہ میں نے غلطی کی ہے۔

EGO (انا) کے لیے اپنی غلطی کا اعتراف' ہمیشہ تعمیری نتیجہ مرتب کرتا ہے

اب یہاں دیکھیے کہ وہ Ego (پندارِنفس) جھک رہا ہے۔ وہ جسے ہم نے انانیت کہا تھا اس میں تو استکبار تھا۔ قرآن نے کہا ہے کہ وہ نہیں جھکتا ہے۔ یہ جو چیز اپنی غلطی یا اپنی ذمہ داری کو تسلیم کر لینا ہے یہ کسی کے سامنے جھکنا نہیں ہے۔ اُس قسم کے تسلیم کرنے والی بات جو ہوتی ہے' وہ تسلیم نہیں ہوتی وہ جو مجرم جا کے عدالت میں کہتے ہیں کہ صاحب! میں نے تو پولیس کے تشدد سے بچنے کے لیے یہ بیان دیدیا تھا' تو وہ تسلیم کرتا ہے میں نے یہ جرم کیا تھا لیکن وہاں بھی وہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! میں نے نہیں کیا تھا' میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ ایک تو یہ مجبوری کا جھکنا ہے' اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اور دوسرا جھکنا یہ ہے کہ وہ تسلیم کرے کہ میں ذمہ دار ہوں' مجھ سے غلطی ہوئی تھی' اصل میں یہ جھکنا نہیں ہے' یہ اعتراف ہے' یہ اپنی ذمہ داری کو قبول کرنا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے' عزیزانِ من! یہ دونوں چیزیں ہیں کہ انسان کے متعلق صحیح تصور ہو اور خدا کے متعلق صحیح تصور ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک قصہ آدم کے اندر کس طرح سے یہ چیزیں آتی چلی جا رہی ہیں۔ قرآن تو اتنے اتنے اہم حقائق کو یوں بیان کرتا ہے۔ آدم سے کہا تو اس نے کہا کہ ہاں' میں اپنی غلطی کا ذمہ دار ہوں' مجھ سے بھول ہوگئی' خطا کوش ہوں' خطا کار ہوں۔ کہا کہ ٹھیک ہے' تم میں اصلاح کا امکان ہے' آئندہ نہ کرنا۔ اس ابلیس سے کہا کہ جب میں نے تمہیں حکم دیا تھا تو تم نے اس کی نافرمانی کیوں کی؟

اپنی مشیّت اور اپنی بدعملی کو قبول کرنے کی بجائے خدا کی مرضی قرار دینے کا نتیجہ

اب یہاں اگلا مقام آتا ہے' عزیزانِ من! اور وہ بڑا اہم ہے۔ اُس نے کہا کہ **قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ** (7:16) میں نے کب انکار کیا ہے' میں کون ہوں سرکشی کرنے والا' تیرے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا' یہ تو تیری مشیّت تھی کہ میں انکار کرتا' میں تو خود کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ یہاں ہر چیز خدا کے حکم اور مرضی کے اور اس کی مشیّت کے مطابق ہوتی ہے تو میں تو اس انکار کا ذمہ دار نہیں' تُو نے انکار کرایا' میں نے انکار کیا' مجھے کیوں ملعون قرار دیتا ہے۔ کہا کہ قیامت تک کے لیے تیری اصلاح نہیں ہوسکتی۔ تُو اپنی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتا' کسی اور کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اور 'اور' تو ایک طرف رہا تُو خدا کو ذمہ دار قرار دے رہا ہے۔ آپ

نے غور کیا کہ بات کیا ہوئی؟ مسلسل متواتر صدیوں سے اور ہمارے ہاں ہر ایک کے ذہن میں یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مرضی سے 288صٓ ہوتا ہے' اور یہ ایسا کہنے والے بلکہ اس پر اور شدت سے عمل کرنے والوں کو وہ مقربین بارگاہ خداوندی کہتے ہیں۔ ''مشیت خداوندی میں یہ نہیں تھا' اللہ کی مرضی یہ نہیں تھی' خدا کی مرضی ایسی نہیں تھی'' قدم قدم کے اوپر ہم یہ کچھ کہتے ہیں۔

خدا کی مرضی اور دعا کے متعلق حسرت موہانی کا ارشاد اور پھر ہماری سوچ: بے عاری فکر

اور راضی برضا ہونا تو پوچھیے نہیں' یہ جتنے بڑے بڑے مقربین کہلاتے ہیں' ان کے راضی برضا ہونے کا تو پوچھیے ہی نہیں وہ تو یہی کہتے ہیں کہ جو اس کی مشیّت کے مطابق ہو۔ حسرت موہانی ((1875-1951 ہے' وہ تو وہاں تک چلا جاتا ہے کہ

مرضئ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

چل بھئی! وہ تو دعا بھی نہیں کراتا۔ یہ جو چیز ہے' عزیزانِ من! آپ سوچیے کہ یہ ہمارے ہاں عام عقیدے کا جزو ہی نہیں بن گیا ہوا ہے بلکہ یہ بڑا ہی مقدس عقیدہ ہمارے ہاں سمجھا جاتا ہے: ''وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے'' اور انسان کو یہ چاہیے کہ راضی برضا رہے' جو اس کی رضا میں ہے' وہی کچھ ہوتا ہے' کچھ نہ کرے صاحب! اب یہ دیکھیے کہ یہ جو تقلید کا عقیدہ ہے کہ قسمت میں یہی لکھا تھا' خدا کو یہی منظور تھا' یہ تھا جو ابلیس نے جواب دیا تھا۔ اور اسے کہا گیا تھا کہ یہ اپنی ذمہ داری سے شق ہونے کے بہانے ہیں جو تُو لگا رہا ہے۔ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوتا ہے' خدا اس میں دخل نہیں دیتا۔

کائنات کا ایک ایک شعبہ خدا تعالیٰ کے غیر مبتدل اصولوں پر غور و فکر کی دعوت دینے میں ہر آن مصروف کار ہے

اللہ تعالیٰ ویسے تو کسی کا پابند ہی نہیں ہے' قادر مطلق ہے' وہ سب کچھ اپنی مشیّت کے مطابق کرتا ہے لیکن یہ جو دنیا' کائنات اس نے بنائی ہے' اس کائنات کو بنانے کے بعد اس نے یہ کہہ دیا کہ اب ہم نے اس کے لیے قوانین مقرر کر دیئے ہیں' وہ اس کے مطابق چلے گی اور وہ قوانین غیر متبدل ہیں' ہم بھی نہیں بدلیں گے۔ یہ نہیں کہا کہ بدل نہیں سکتے۔ ان دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ ہم بھی ان کو نہیں بدلیں گے۔ اور یہی انسان سے کہا ہے کہ ہم نے تمہیں صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے' ہم تمہارے اختیار کو سلب نہیں کریں گے' ہم تمہارے معاملات میں دخل نہیں دیں گے۔ وہاں کہا کہ جیسی ہماری مشیّت ہے' وہاں ہم کرتے ہیں۔ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ((41:40 اپنی دنیا میں تم اپنی مشیّت کے مطابق کرو' وہ لفظ شِئۡتُمۡ ہے۔ اور یہی ذمہ داری تو ہے جس سے آگے قانونِ مکافاتِ عمل اور جزا اور سزا اور قیامت میزان' یہاں دنیا کے اندر تباہیاں' بربادیاں' تعمیریں ہوتی ہیں۔ یہ ساری ذمہ داری کی تو بات ہے۔

ص288

ہمارے ہاں قومی سطح پر عقیدہ تقدیر کے تحت ہونے والا نقصان

اب آپ نے غور فرمایا کہ یہ جو ہمارے ہاں احکامِ خداوندی' قوانینِ خداوندی بھی نہیں بلکہ ہماری قوم عام قوانین کی خلاف ورزی بھی کرتی ہے' اس کی وجہ اس کے تحت الشعور میں ایک چیز ہے اور وہ یہ عقیدہ تقدیر ہے۔ جس شخص سے بھی کوئی جرم سرزد ہوتا ہے' کوئی برائی سرزد ہوتی ہے' اس کا کبھی پہلا ردِعمل یہ نہیں ہوتا کہ میں نے یہ کچھ کیا ہے' وہ یہ تلاش کرنے کی کوشش کرے گا کہ یہ کس کے سرمنڈوں۔ اور پھر جب آگے بتاتا ہے' وہ اللہ والا ہوتا ہے' تو وہ تو بیٹھا ہی ہوا ہے جس نے آگے سے کچھ نہیں کہنا کہ صاحب! اللہ کی مرضی ایسی تھی۔ اگر وہ کسی انسان کے متعلق کہتا ہے کہ جی! اس نے مجھ سے کرایا تو عدالت میں پھر اس کو ثابت کرنا پڑتا ہے ورنہ اس کی بھی سزا ہے۔ اس کی طرف ہم اس کو لوٹا دیتے ہیں کہ جو عدالت میں کھڑا ہی نہیں ہوتا' جو مرضی کہے جایئے اس کے متعلق اور بچتے چلے جایئے۔

عقیدہ تقدیر کی پیدا کردہ ایک اور نفسیاتی بیماری: ہر کام خدا کی مرضی سے ہے

اور اس سے آگے ایک اور Psychological (نفسیاتی) چیز ہماری قوم میں ہوئی۔ یہ بھی تحت الشعور میں عقیدہ ہے کہ خدا کی مرضی سے سب کچھ ہوتا ہے' لیکن بیمار ہوتا ہے تو اس کے لیے پھر علاج بھی ہوتا ہے' بھاگ دوڑ بھی ہوتی ہے' دوائیاں بھی لائی جاتی ہیں' ڈاکٹر بھی آتے ہیں' حکیم بھی آتے ہیں' یہ سارا کچھ بھی کیا جاتا ہے۔ ارے! اگر یہ بیماری خدا کے حکم سے آئی ہے' اگر اسی کا یہ حکم ہے اور یہ تقدیر میں لکھا ہوا ہے کہ اتنے دن کے لیے یہ بخار رہے گا' اس کے بعد ٹوٹ جائے گا' تو یہ دوائیاں کاہے کے لیے ہیں' اس سے پہلے تو یہ ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔ اور اگر یہ ہے کہ اس بخار کے بعد اس کی موت واقع ہو جانی ہے تو وہ تو موت واقع ہو جانی ہے' پھر یہ کچھ کرتے کیوں ہو؟ بیک وقت یہ بھی چیز ہوتی ہے کہ صاحب! خدا کی مرضی سے یہ سارا کچھ ہو رہا ہے' دوسری طرف ہر کام کے متعلق یہ ساری بھاگ دوڑ بھی ہو رہی ہے۔ پوچھو کہ یہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ جی! وہ ہوتا تو وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے لیکن تدبیر کرنا بھی تو فریضہ ہے۔ پوچھو کہ بات کیا کہہ رہے ہو' فریضہ کے معنی ہیں خدا نے مقرر کیا ہوا ہے' یعنی ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ہم کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ جو ہم کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خلاف تم تدبیریں بھی کیا کرو۔ یہ دودلی ہے' ہم نہیں سمجھتے۔

علم النفس کے جو ماہرین ہیں ان سائیکولوجسٹ سے پوچھیے' وہ کہتے ہیں کہ اس سے انسان کے اندر عزم نہیں پیدا ہوتا کہ ایک طرف تحت الشعور میں یہ بھی چیز ہے کہ خدا کی مرضی سے یہ ہو رہا ہے' دوسری طرف اس کی تدبیر بھی ہو رہی ہے' یہ تو Dualism (ثنویت) ہے۔ Dualism (ثنویت) کے معنی ہوتا ہے کہ وہ انسان کو نہ Self Confidence (خود اعتمادی) ہوتا ہے' نہ Determination (عزم) ہوتا ہے۔ ''ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر''۔ تدبیر بھی کی جا رہی ہے' تحت الشعور میں یہ چیز بھی ہے کہ ''ہوگا وہی جو خدا

کومنظور ہوگا''۔ جب وہ مریض مرجاتا ہےتو کہا ہی یہ جاتا ہے کہ جی ٹھیک ہے' اپنی طرف سے تو ہم نے بہت دوڑ دھوپ کی لیکن لکھی ہوئی اتنی تھی' اللہ کومنظور ہی یہ تھا۔تعزیت کے لیے جو آتے ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ بھئی! اللہ کومنظور ہی یہ تھا۔کبھی کھڑے ہوکر کوئی سوچتا نہیں کہ ہم یہ دومتضاد باتیں کیسے کررہے ہیں۔ یہ ساری اتنی دوڑ دھوپ کیوں کی' علاج کس کا کرایا تھا' غلط کیا تم نے' اس مرض کے لیے یہ نہیں' وہ فلاں ڈاکٹرز یادہ اچھا تھا۔تو یہ بھی کہتے ہیں اوراس کے بعد ہے کہ اچھا جی! بہرحال جواللہ کومنظور ہے وہ ہوتا ہے۔ارے یہ اللہ کومنظور تھا یاان دوائیوں کومنظور تھا جوتم نے کرائیں' وہ اس کے منظور پر ہی چھوڑ ناتھا تو یہ بھاگ دوڑ کاہے کے لیے ہوئی۔اوراگر وہ اچھا ہوجاتا ہےتو اس کے بعد یہ ہے کہ جی! کیابات ہےفلاں ڈاکٹر ہے' فلاں ڈاکٹر ہے' فلاں کی طرف گئے انہوں نے آن کر کیا' صاحب! کمال کردیا' کیابات ہے! بڑی توجہ دی اور بڑا علاج ہوا۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! ہم نے بھی دیکھا' تم نے بھی اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی' دیکھیے! یہ سب کچھ ہوا۔اور پھر رسماً کہہ دیا جاتا ہے کہ ٹھیک ہے جی! پھر اللہ تعالیٰ نے اس کوشفا دیدی۔یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے شفا دیدی' یہ کہنا بھی ضروری تھا۔

یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر ❶

غوروفکر کرنے والی قومیں اپنی ذمہ داری کوقبول کرتی ہیں' ہماری طرح نہیں کہتیں کہ''خدا کو یہی منظور تھا''

کفر کی طرف آتے ہوتو دیانتداری سے آؤ۔ وہ قومیں دیانتداری سے آئی ہوئی ہیں' غلط فیصلے ہی سہی' فیصلوں کی ذمہ داری تو قبول کرتے ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ یہ ہوتا ہے ہم کرتے ہیں' یہ چیز جو ہوگئی' پل ٹوٹ گیا' ہماری غلطی تھی' ہمارے انجینئر کی غلطی تھی۔ یہاں سیلاب آتے ہیں تو کوئی نہیں پوچھتا کہ جوانجینئر مقرر تھے ان پر ان کی تحقیق کریں کہ انہوں نے سیمنٹ کی جگہ زیادہ ریت تونہیں ڈال دی تھی۔''نہیں صاحب! یہ قوم کے انسانوں کے گناہوں کی وجہ سے ٹوٹا ہے' تباہی آئی ہوئی ہے' جی! خدا کے حکم سے آتی ہے' ان کی وجہ سے نہیں آتی جنہوں نے سیمنٹ کی جگہ ریت ڈال دی تھی''۔ وہ قومیں اس پہ نہیں جاتیں' وہ یکسوتو ہوگئیں' کفر میں پختگی تو آ گئی۔ ذمہ داری اپنی جوقبول کی ہے' وہ قومیں اس لیے ہم لوگوں سے آگے بڑھ رہی ہیں' وہ ہر کام میں انسان کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں' تحقیق یہ کرتی ہیں کہ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے' آؤ دیکھیں کہاں غلطی ہوئی ہے' آئندہ نہیں ہوگی' وہ توبہ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ خدا کومنظور ہی یہ تھا۔

---

❶ اس چمن میں پیروِبلبل ہو یاتلمیذِ گل یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر (اقبالؒ: بانگِ درا' شمع وشاعر)

ص288

قرآن حکیم کے دیئے گئے تصورات انسان کی سوچ کا رخ تبدیل کر دیتے ہیں

عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں کہ وہ تصورات (Concepts) جو میں نے کہا تھا کہ قرآن قائم کرتا ہے' اس نے انسان کے متعلق تصور یہ دیا ہے کہ یہ اپنے فیصلے کا آپ ذمہ دار ہے' ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ جو ہم نے ان کو بتایا ہے' چوراہے پہ Sign Post (نشانات راہ) لگا دیا ہے کہ یہ راستہ شہر کی طرف جاتا ہے' اور یہ گلبرگ کو۔ اب یہ اس کو دیکھے اور پھر یہ جائے' فیصلہ تو اس نے آپ خود کرنا ہے کہ میں نے شہر کا راستہ اختیار کرنا ہے یا گلبرگ کا کرنا ہے۔ ہم نے اتنا ہی کیا ہے کہ وہاں سائن پوسٹ لگا دیئے ہیں' دیکھ لو' تم جدھر جانا چاہتے ہو' جاؤ لیکن جب غلط راستے پہ جاتے ہو تو آخر میں منزل غلط پہ پہنچتے ہو۔ تسلیم کرو کہ تم نے اس راستے پہ چلنے میں غلطی کی' تم خود اس کے ذمہ دار ہو۔

انسانی سوچ کے لیے اقبالؒ کا پیغام بڑا غور و فکر کا متقاضی ہے

یہ جو چیز ہے اس کے متعلق اقبالؒ کے بڑے عمدہ الفاظ ہیں اور بات چونکہ ہمارے ساتھ یہی ہوئی ہے اس لیے میں نے یہ کہا ہے۔ یہ ''ضربِ کلیم'' کی ایک نظم ہے' اسی موضوع (تقدیر: ابلیس و یزداں ❶) کے اوپر ہے۔ ابلیس سے یہ کہا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ وہ کہتا ہے کہ

حرف 'استکبار' تیرے سامنے ممکن نہ تھا

میں سرکشی نہیں کرسکتا تھا

ہاں' مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

یہ ہے جو قرآن میں اس نے کہا ہے کہ تیری مشیّت میں میرا سجود نہ تھا۔ اس نے بڑے دلچسپ انداز میں یہ بات کی ہے۔ خدا (یزداں) کہتا ہے کہ

کب کھلا تجھ پہ یہ راز' انکار سے پہلے کہ بعد؟

اور ابلیس جواب دیتا ہے:

بعد' اے تیری تجلّی سے کمالاتِ وجود!

اس پر یزداں نے فرشتوں کی طرف دیکھ کر کہا کہ

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حُجت اسے

کہتا ہے 'تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود'

---

❶ اقبالؒ: ضربِ کلیم (تقدیر: ابلیس و یزداں)' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص ص 69 تا 70۔

تُو نے انکار تو اپنی مرضی سے کیا اور جب اس کا نتیجہ سامنے آیا ہے تو اس وقت کہا کہ نہیں صاحب! میں نے تو یہ نہیں کہا تھا' میرا یہ سجود غیر کی مشیّت میں نہیں تھا۔ اور اب: ص288

دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دُود!

اپنی غلطی کا مردانہ وار اعتراف انسان کو کئی کٹھن منازل سے محفوظ رکھنے کے علاوہ اسے مقامِ بلند عطا کرتا ہے

یہ پستیِ فطرت ہے۔ جرم کیا ہے' غلطی کی ہے تو پھر بلندیٔ فطرت کا تقاضا ہے کہ کھڑے ہو کر مردانہ وار اس کو قبول کیجیے کہ مجھ سے غلطی ہوئی' میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ میں نے کہا ہے کہ وہ ایک Ego (پندارِ نفس) ہے' انسان کے اندر چیز تو وہی ہے' قوت فیصلہ اس کو کہہ لیجیے۔ ابھی تک اس کے لیے صحیح اصطلاح بھی نہیں آئی کہ انسان کے اندر یہ فیصلہ کرنے والی قوت اندر ہے کیا۔ جو بھی ہے' کبھی اس کو Intellectual Brain (ذہنی دماغ) کہا تھا' کبھی کسی نے Mind (قلب) کہا' انہوں نے کہا' یہ بھی بات نہیں بنتی' اب اس کے لیے سائیکی (Psyche) کہتے ہیں۔ اسے کچھ بھی کہہ لیجیے' انسان کے اندر ایک قوت فیصلہ ہے۔ وہ جو ہے' اس سے انسان انسانیت کی سطح پر ہے' یہ قوتِ فیصلہ حیوان میں نہیں ہے۔ اب اس کے بعد یہ صورت ہے کہ اگر یہ اس سے انکار کرتا ہے کہ میں نے اپنے اختیار سے فیصلہ نہیں کیا تو انسانیت کی سطح سے نیچے چلا جاتا ہے۔ بکری اپنے اختیار سے گوشت کو چھوڑ کر گھاس نہیں کھاتی' اس سے اگر پوچھا جائے کہ تو نے گھاس کیوں کھائی' گوشت کیوں نہیں کھایا' یا شیر سے کہا جائے کہ تُو نے ہرن کو چیر پھاڑ کر کے گوشت کیوں کھایا ہے' یہ انگور کے خوشے لٹکے ہوئے تھے وہ کیوں نہیں کھائے' تو وہ تو یہ کہے گا کہ میری مشیّت میں ہی نہیں تھا کہ میں انگور کھاؤں' میں تو اس میں مجبور ہوں' وہ تو ٹھیک کہتا ہے۔ انسان سے اگر کہا جائے کہ تم نے حلال کی روزی چھوڑ کر حرام کی کیوں کھائی اور وہ یہ کہے کہ میرا اس میں قصور کیا ہے' تیری مشیّت میں ہی ایسا تھا' تو یہ اس کی پستیٔ فطرت ہے۔ اپنے شعلہ سوزاں کو خود دُور کہتا ہے' شعلے کو دھواں کہہ رہا ہے:

''پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجّت اسے''

اپنی آزادی کو مجبوری کا نام دے رہا ہے۔ یہ جتنا تقدیر کا ہمارے ہاں تصور ہے عزیزانِ من! کہ یہ سب کچھ پہلے سے لکھا ہوا ہوتا ہے' خدا کی مرضی' مشیّت یہی ہے' یہ انسان کی پستیٔ فطرت ہے۔ خدا نے اس کو کہا ہے کہ تیرے اختیار و ارادے کی بات ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری سے بچنا چاہتا ہے اور جو بھی اپنی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا اس سے بچتا ہے۔ یہ انسان کی پستیٔ فطرت ہے۔ اور اسی سے وہ بات آ گئی جو فرعون نے ڈوبتے وقت کہا تھا' پہلے تو یہ تھا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی (79:24) اور جب وہ ڈوبنے لگا' موت سامنے آئی تو اس نے کہا کہ میں بنی اسرائیل کے خدا پہ ایمان لاتا ہوں۔ خدا کی طرف سے یہ جواب ہے کہ اوفٹے منہ تیرا[1]۔ یہ پستیٔ فطرت ہے۔

---

[1] تُف ہے تجھ پر۔

اگر کوئی نہ کفر میں پختہ ہو اور نہ ایمان میں تو وہ تو پھر خودی کے شعلہ عشق سے ہی محروم ہو جاتا ہے

کیا بات ہے! پستیٔ فطرت کا تو ایمان بھی قبول نہیں ہوتا عزیزانِ من! وہاں کہا گیا' بڑا اچھا مصرعہ ہے:

'' در کفر ہم پختہ آ زنّار را رسوا مکن''

کم بخت! ایمان نصیب نہیں تھا تو کفر میں تو پختہ ہوتا۔ یہ چیز بڑی اہم ہے' عزیزانِ من! سائیکولوجیکلی (نفسیاتی لحاظ سے) انسان کی یہ چیز بھی آپ کہیے' میں نے کہا ہے کہ اس کے لیے ابھی تک لفظ نہیں ملا ہے' قرآن نے تو نفس ہی کہا ہے' اقبالؒ ((1877-1938) اس کو خودی کہتا ہے' جو کچھ بھی یہ چیز ہے' اس میں اتنی پختگی ہونی چاہیے کہ یہ اپنے اختیار کو مجبوری کا نام دے کر ذمہ داری سے جی نہ چرائے' مجرم کی طرح کھڑا ہو جائے کہ میں نے کیا ہے اور میں اس کے Consequences (نتائج) بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ پختگی ہے۔ یہی Ego (انا) جب صحیح راستے پہ چلے گا تو پھر اس سے توقعات ہونگی کہ یہ کیا کچھ نہیں کر دکھائے گا۔ اور جس Ego (انا) کی کیفیت یہ ہو گی کہ جہاں کہیں کوئی چیز غلط نظر آئی' کہا کہ نہیں صاحب! میں نے تو نہیں کی' یہ تو فلاں نے کرا دی ہے' اس قوم کی ذہنیت پھر یہ ہو جاتی ہے کہ وہ انسان' جرم کرتا ہے' سب سے پہلا ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ کس کے سر تھوپوں۔ ہم نے کبھی سوچا نہیں کہ یہ جو اس قسم کے تقدیر کے ہمارے ہاں غلط تصورات ہیں' یہ انسانوں کی معاشرتی زندگی اور اخلاقی زندگی کے اندر کس قدر اثر انداز ہوتے ہیں! کبھی ہمارے ذہن میں یہ بات نہیں آئی۔ خدا کی معصیت ہی ایسی تھی' وہاں سے تحت الشعور میں بات آتی ہے' تو خدا کی طرف تو چونکہ وہ عدالت مانتی نہیں ہے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ جی! اس نے مجھ سے یہ کرایا ہے' وہ تو کہتی ہے تو پھر ایسا آدمی بتاؤ جس کو ہم پکڑ سکیں' تو پھر وہ ایسا آدمی بتاتا ہے کہ میں نے تو نہیں کیا تھا' فلاں نے یہ کرایا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قصۂ ابلیس و آدم کے اندر باتیں کیا آ رہی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جو بھی اپنی خطا کا' اپنی غلطی کا' اپنے جرم کا' اعتراف کر کے ذمہ داری قبول نہیں کرتا' اس میں اصلاح کا امکان ہی نہیں ہوتا۔

تقدیر کا غلط تصور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی نفسیات کے لیے زہر قاتل ہے

یہ تھا جو اس سے کہا گیا تھا کہ جاؤ تم ہمیشہ کے لیے ملعون ہوئے۔ ملعون کے معنی ہیں کہ صحیح راہنمائی سے محروم رہو گے' زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہو گے کہ تم اپنی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتے تھے' دوسروں کے سر تھوپ رہے ہو۔ اور اس نے یہ جتنے قوانین دیئے ہیں یہ کہہ دیا کہ یہ غیر متبدل ہیں۔ اس نے انسانوں کی زندگی میں انسانوں کو کہا ہے کہ یہ نہ کہو کہ یہ خدا کی مشیّت میں تھا' بلکہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ((41:40) اپنی دنیا میں اپنی مشیّت سے کام کرو۔ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے' وہ انسان سے اس کا اختیار نہیں چھینتا۔ یہ خود ہی اپنی پستیٔ فطرت سے' اپنی آزادی کو مجبوری کا نام دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا عزیزانِ من! کہ یہ جسے ہم تقدیر کا مسئلہ کہتے ہیں' یہ کوئی

Academic (علمی ونظری) چیز نہیں ہے، محض علمی یا نظری مسئلہ نہیں ہے۔ پہلے تو یہ افراد کے اخلاق پر اتنا اثر انداز ہوتا ہے، پھر قوموں صٓ 288 کی قوموں کے اوپر یہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس قوم کا یا ان لوگوں کا پہلا ری ایکشن (ردِعمل) یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز اپنے ذمہ نہ لیں، کسی اور کے ذمے تھونپ دیں۔ اور اس کے بعد پھر انسان آگے چلتا ہے، تو جوں جوں پھر گھمنڈ اور غرور اور نفرت میں یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ وہ وہاں کا چوہدری بن جاتا ہے۔ یوں فریب نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر جوں جوں وہ مذہب پرست بنتا چلا جاتا ہے تو پھر تو ہر چیز کا ذمہ دار خدا ہوتا ہے ''مرضی مولا بر ہمہ اوست'' ہوتا ہے۔ اس کے خلاف کوئی کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

انسان کا اپنی ذمہ داری کو قبول نہ کرنا، تمام معاشرتی اور تمدنی بیماریوں کی جڑ ہے

ہم اپنے ہاں کمیشن بٹھاتے ہیں کہ دیکھیں کہ ہمارے اسباب زوال کیا ہیں اور اس کے لیے بھی ہم یہ جو باہر کے مسائل ہیں، ان پہ چلے جاتے ہیں کہ جی! یہاں ہمارے ہاں کرپشن ہو گئی، ہمارے ہاں چیزوں میں یہ ملاوٹ ہو گئی، مہنگائی ہو گئی۔ یہ ٹھیک ہے۔ اس کا بنیادی سبب (Root Cause) کیا ہے؟ یہ کہ کوئی شخص اپنی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جو کوشش کرتا ہے کہ اس کو ثابت کیا جائے کہ اس کا یہ ذمہ دار ہے، اس کی کوششیں ناکام کی جاتی ہیں، اس کی زبانیں کھینچ لی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ مرض عام ہو گیا ہے اور پھر جب یہ کہیں کہ صاحب! اس سے انسان کو تقربِ بارگاہِ الٰہی حاصل ہو جاتا ہے، کہتا ہے کہ صاحب! اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے تو صاحب بڑا ولی اللہ ہے۔ یہ جو چیز اس نے کہی تھی، تو یہ بات کسی کے نہیں سمجھ میں آتی

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

یہ عشق کیا چیز ہے جو اس نے کہا ہے؟ یہ کہ اپنی خودی کا استحکام ہو، جس سے وہ ہر Consequence (نتیجے) کو بھگتنے کے لیے تیار ہو لیکن شرط یہ ہے کہ ذمہ داری قبول کرو:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

اپنی ذمہ داری کو دوسروں پر ڈال دینا ہی تو زندیقیت ہے

اگر وہ ذمہ داری دوسرے کی طرف سونپتا ہے تو یہ کفر ہے، زندیقیت ہے۔ جو قبول کرتا ہے تو یہ دنیا کے اندر وہ لوگ ہیں کہ جب آپ ان کو صحیح راستہ دکھا دیں گے تو معلوم نہیں کہ کیا کچھ کر کے دکھا دیں گے۔ جو ان چیزوں کو قبول کرنے کی اپنے اندر جرأت نہیں رکھتا انہوں

نے اچھے کام کیا کر کے دکھانے ہیں۔ تو یہ جو قصہءِ ابلیس و آدم ہے، عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ یہ قصے نہیں ہیں۔ اور یہ جو قرآن 288 صٓ بار باران چیزوں کو دہراتا ہے، تو یہ وہ چیزیں ہیں جو سامنے لاتا ہے، وہ انسان کو Concepts (تصورات) دیتا ہے۔ آپ دیکھیے اس میں خدا کا کیا تصور ہمارے سامنے آتا ہے، کتنا عظیم تصور آتا ہے! قادرِ مطلق جو کائنات کو عدم سے وجود میں لائے اور اس کے بعد ہمارے الفاظ میں ایسا مجبور ہو کہ وہ ان کو بدلے نہیں، انسان کو خود صاحب اختیار وارادہ بنائے اور اس کے بعد یہ ہو کہ پوری قوتیں رکھتا ہوا، اس کا اختیار وارادہ سلب ہی نہیں کرے، تو خدا بننا اسے ہی سجتا ہے، عزیزانِ من! جس کی کیفیت یہ ہو کہ لا انتہا قوتوں کا مالک ہونے کے بعد جب ایک بات کہہ دی ہے، پھر وہ اس سے نہیں ٹلتا۔ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ((4:122 ہم نے جو کہہ دیا ہے، وہ اٹل ہے، ہم خود اس کے خلاف نہیں چلیں گے۔ یعنی یہ قرآن کی عجیب چیز ہے، ایک لفظ ہے کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ((2:183۔ اس کے معنی ہوتے ہیں "فرض قرار دیدیا ہم نے تمہارے اوپر، واجب قرار دیدیا ہے"۔ تو یہ لفظ ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر یہ لازم قرار دیدیا ہے، ہم نے واجب قرار دیدیا ہے، تمہیں کرنا ہوگا، یہ فرض قرار دیا ہے۔

خالقِ کائنات جو لامحدود اختیارات کا مالک ہے، اس نے بھی اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں

اور دوسری طرف کہا ہے کہ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ((6:12 ہم نے اپنے آپ کے اوپر بھی یہ فرض قرار دیدیا ہے۔ میرے اللہ! یہ ہے قرآن کی رو سے خدا کا تصور۔ وہی لفظ كَتَبَ ہے۔ تمہارے اوپر تو ہم نے فرض قرار دیا ہے، ہمارے اوپر اور کوئی فرض قرار نہیں دے سکتا تھا، ہمارے اوپر کوئی اور ہستی ایسی صاحب اقتدار نہیں ہے، تو کیا ہم بے مہار رہتے (معاذ اللہ)؟ کہا کہ ہم نے خود اپنے اوپر یہ پابندیاں عائد کر لی ہیں کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ((6:135 ہم ظلم کو پنپنے نہیں دیں گے، ہم نے اپنے اوپر یہ فرض عائد کر لیا ہے، لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ((11:115 حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والے کی جو محنت ہے وہ رائیگاں نہیں جائے گی، ہم نے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لی ہے کہ یہ ہوگا۔ جبکہ ہم کسی قسم کی جو پابندی ہے، وہ اپنے اوپر عائد کرنے کو تیار نہیں ہیں، جو جتنا زیادہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اس کی شہادت آگے بڑھنے کی یہ ہوتی ہے کہ وہ پابندیاں توڑتا چلا جاتا ہے۔ اور اس قادرِ مطلق کی کیفیت یہ ہے کہ كَتَبَ تمہارے لیے کہتا ہے اور كَتَبَ علیکم کہتا ہے اور اس کے بعد كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ ((6:12 ہے، ہم نے خود بھی، اپنے اوپر بھی، پابندی عائد کی ہے۔ اور یہ جو خود پابندی عائد کرتا ہے، عزیزانِ من! وہ مجبور نہیں ہو جاتا۔ اگر تھانے سے مجھے یہ حکم ہو کہ تم نے صبح پانچ بجے اٹھنا ہے اور تین میل کا فاصلہ طے کر کے تھانے میں حاضری لکھوانی ہے پھر واپس آنا ہے، تو یہ مجبوری ہے، یہ دوسرے کی عائد کردہ مجبوری ہے۔ اور اگر میں نے خود فیصلہ کیا ہے کہ میں صبح پانچ بجے اٹھونگا، تین میل سیر کر کے آؤنگا اور آکر پھر چائے پیونگا، تو کرتا میں بھی وہی ہوں

جو دوسری صورت میں ہے' یہ مجبوری نہیں ہے' یہ میں نے اپنے اوپر خود ایک چیز عائد کی ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے وہ جو اپنے اوپر ص288
پابندی عائد کرتا ہے ان پابندیوں سے تو وہ مجبور نہیں ہو جاتا لیکن خدا کا یہ Concept (تصور)' عزیزانِ من! آپ کو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملے گا کہ وہ یہ کہے کہ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ (6:12) ہم نے اپنے اوپر پابندی عائد کی ہوئی ہے' وہ تو کہتا ہے کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) ہم اس میں کبھی تبدیلی نہیں کریں گے۔ ہم نے تمہیں اختیار وارادہ دیا ہے وہ ہم کبھی سلب نہیں کرتے۔

اپنی کمزوری کو دوسروں پر ڈال دینا پستیٔ فطرت کا ثبوت ہے

عزیزانِ من! جب خود انسان اپنے شعلہ سوز اں کو' خود اپنی آزادی کو' مجبوری کا نام دیتا ہے تو وہ ابلیس سے کہتا ہے کہ فٹے منہ تیرا' ہم نے صاحب اختیار بنایا اور تو یہ بات کہتا ہے۔ اور وہ بات [1] جو اقبالؒ نے کہی ہے کہ ''انکار سے پہلے کہ بعد؟'' یہ بڑی چیز ہے' جب انسان خود کرتا ہے تو اس وقت یہ ذہن میں نہیں ہوتا کہ خدا مجھ سے کرا رہا ہے' وہ تو خود کرتا ہے' جب اس کے بعد پھنستا ہے تو پھر یہ بات آتی ہے کہ اب اس کو کس کے ذمے لگاؤں' اور کوئی نہیں ملتا تو خدا کے ہی ذمے لگا دوں۔ اس شخص کی' اقبالؒ کی' کیا بات ہے' کیا چیزیں کہہ جاتا ہے!

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجّت اسے
اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

وہ قومیں خواہ ان کا دائرہ یہی دنیا کی زندگیاں کیوں نہ ہو یہ وہ کرتی ہیں' وہ اپنی آزادی کو مجبوری کا نام نہیں دیتی ہیں۔ اس کے برعکس وہ قومیں جن کے تصوراتِ حیات یہ ہوتے ہیں جو میں نے عرض کیا ہے' جو صدیوں سے چلے آتے ہیں۔ یہ جو ہم جسے بظاہر آزادی کہتے ہیں جو مل جاتی ہے یہ بھی آزادی نہیں ہوتی' وہ ذہن تو اسی طرح غلام ہوتے ہیں۔ جتنا مذہب زیادہ ہوتا چلا جائے گا' اتنا ہی مرضیٔ مولا زیادہ ہوتی چلے جائے گی' جتنی وہ زیادہ ہوتی چلی جائے گی اتنا ہی تم اپنے اختیار کو مجبوری سے بدلتے چلے جاؤ گے۔ یہ چیز کہ خدا نے کہا ہے کہ ہم نے اپنے اوپر عائد کی اور ہم اس میں کبھی تبدیلی نہیں کریں گے یہ ایک بڑا اہم مقام ہے۔

تقدیر پرستی اور ملوکیت کے قید خانے میں تارنفسِ میں اسیر ہزار سالہ زندگی کی کیفیت

آپ کو معلوم ہے کہ ہم مسلمان یا ہماری قوم' ہزار برس سے بھی زیادہ شہنشاہیت وملوکیت کے تابع چلے آئے ہیں۔ ملوکیت میں قانون نہیں ہوتا' ملوکیت میں حکم ہوتا ہے' حکم وہ ہوتا ہے کہ اب یہ حکم دیدیا' دوسرے وقت میں یہ حکم دیدیا' جو جی میں آئے حکم دیدیا' وہ تو حکم ہوتا ہے۔ ہزار برس سے ہم احکام کے تابع زندگی بسر کرنے کے اتنے خوگر ہو چکے ہیں کہ اب قانون کے تابع زندگی بسر کرنے کی بات

---

[1] کب کھلا تجھ پہ یہ راز' انکار سے پہلے کہ بعد؟

ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ اگر کبھی کہیں قانون کی جھلک آتی بھی ہے تو ہم اس سے وہ پنجرے میں پھنسے ہوئے خوگر پرندے کی طرح ہیں 288 ص کہ باہر سے نکل کر پھر قفس میں چلے جاتے ہیں کہ احکام کے تابع ہیں' قانون نہیں ہے۔ قانون غیر متبدل ہوتا ہے۔ کتنا اطمینان ہوتا ہے' عزیزانِ من! اس قوم کو جسے یہ معلوم ہو کہ یہ قانون ہے اور یہ کبھی بدلا نہیں جائے گا۔ ٹھیک ہے اب تم خود سوچ لو کہ جہاں قانون کی جگہ حکم ہو تو وہ تو ہر وقت دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ اب یہ حکم دیا ہے' کل کو پتہ نہیں کیا' حکم مل جائے گا۔

علامہ پرویزؒ پر احکامِ خداوندی کی جگہ قانونِ خداوندی کہنے پر کفر کا فتویٰ

عجیب بات ہے آپ حیران ہونگے جو میں عرض کر رہا ہوں' میں نے جب یہ قوانین خداوندی کہا تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ چالیس سال سے میں قوانین خداوندی کہتا چلا آ رہا ہوں تو میرے خلاف جو کفر کا فتویٰ لگا تھا' اس میں یہ بات بھی تھی کہ یہ احکام خداوندی کی بجائے قوانینِ خداوندی کہتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ غیر متبدل ہیں' خدا کو بھی مجبور بنا دیا۔ میں نے کہا کہ تمہارا قصور نہیں ہے' ملوکیت کے تابع زندگی بسر کرنے والی قوم ہزار برس سے وہ احکام کو تو سمجھتی ہے کہ کیا ہوتے ہیں' لیکن وہ قانون کو سمجھ ہی نہیں سکتی کہ وہ کیا ہوتا ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ قانون کے تابع زندگی بسر کرنے میں انسان کو کتنی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہے قانون اور جو نہیں بدلے گا' کھڑے ہو کر فیصلہ کر لو کہ اس کے مطابق چلنا ہے یا اس کے خلاف چلنا ہے' خلاف چلنا ہے تو یہ ہونا ہے' یہ سب چیزیں طے ہیں۔ یہ قانون میں نہیں ہوتا کہ:

''اب چھری صیاد نے لی اب قفس کا در کھلا''

یہ زندگی تو حیوان کی زندگی بھی نہیں ہے' ان کو بھی پتہ ہے کہ ہماری جبلت کیا ہے' اس کے مطابق ہم نے چلنا ہے۔ بکری کو یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اب تو اس نے کہا ہے کہ گھاس کھاؤ' کل اس نے کہہ دینا ہے گوشت کھاؤ۔

انسان کو تو Rule of the Law کا سنہرا فارمولا صدیوں پہلے متعارف کرا دیا گیا تھا

یہ ہے عزیزانِ من! جس کو Rule of the Law (قانون کی حکمرانی) کہتے ہیں' اُس دور میں یہ بات ہوئی ہے۔ یہ اِس دور کی بات نہیں ہے یہ تو آپ کے ہاں دین کے بنیادی اصول ہیں' یہ تو چودہ سو سال پہلے آپ کو دیا گیا ہے' ''مذہب'' کی اسٹیج سے کھڑا ہو کر وہ پکارتا ہے کہ خدا نے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لی ہے اور وہ اس کے خلاف کبھی نہیں کرے گا۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! دیکھا قصۂ ابلیس و آدم کیا تھا۔ اور اب معلوم ہو گیا کہ اسے وہ کیوں کہا گیا تھا کہ اگر تیری ذہنیت یہ ہے کہ تُو اپنی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا' دوسرے کے ذمے تھوپتا ہے تو تجھ میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے۔

تمدنی اور معاشرتی نظام کی بنیاد ذمہ داری کے احساس پر استوار ہوتی ہے: اس کے خلاف ایک فتویٰ 288ص

آپ کو مشاورت کا جو نظام بتایا گیا ہے، اور خود رسول اللہ ﷺ سے بھی کہا گیا ہے کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (3:159) خود ہی نہ فیصلے کر کے احکام جاری کیا کرو، مشورے کیا کرو۔ مشاورت ہوتی یہ ہے کہ اس میں جو سقم ہوتے ہیں، کمزوریاں ہوتی ہیں، غلطیاں ہوتی ہیں خطائیں ہوتی ہیں، وہ Discussion (بحث و تمحیص) میں آجاتی ہیں، وہ وہاں متعین ہو جاتی ہیں کہ اس کے لیے کون ذمہ دار تھا، آئندہ یہ کچھ نہ ہو، اس میں اصلاح ہوتی ہے۔ ہزار برس تک آپ کے ہاں یہ سلاطین کے، بادشاہوں کے، ملوکیت کے، غلط نظام کیوں چلتے رہے، انہوں نے کسی کو ٹوکنے کی اجازت ہی نہیں دی کہ تم نے یہاں سے غلطی کی ہے، تم اس کے ذمہ دار ہو۔ 'اجازت نہیں دی' آپ کہیں گے کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!! تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کم از کم چالیس شیوخ تھے اور ایک جگہ تو لکھا ہے کہ شاید یہ سو شیوخ تھے، وہ وفد بنا کر یہ کہنے کے لیے خلیفہ عباسیہ کے ہاں گئے تھے، کہ خلیفۃ المسلمین جو کچھ بھی کرے اس کے لیے صرف یہی نہیں ہے کہ صرف اسی دنیا میں اس سے مواخذہ نہیں ہوگا، اس سے قیامت میں بھی مواخذہ نہیں ہوگا، وہ اس کو یہ فتویٰ دینے گئے تھے۔ تو کیا پھر یہ اپنی کسی غلطی کو تسلیم کرے گا؟ یہ اس لیے کہ "الانسان ظل اللہ علی الارض" یہ انسان نہیں ہیں، آپ تو زمین پر خدا کا سایہ ہیں۔ اور جب خدا کا اختیارات قادر مطلق ہے اور اس کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے تو آپ سے کون پوچھنے والا ہے، یہ دلیل تھی۔ پھر آپ سوچنے کے لیے کمیشن بٹھاتے ہیں کہ اس قوم کے ساتھ یہ کچھ ہو کیوں رہا ہے۔ تو اوپر جب یہ فتویٰ دیا تو جوں جوں نیچے آئے، قوت کچھ کم ہوتی چلی گئی، لیکن تصور تو یہی ہوا کہ جتنی وہ طاقت کسی کے پاس ہے، اس کی حد تک اس سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اور پھر جب اور زیادہ آگے بڑھے تو مشیّت آ گئی صاحب! وہ جابر مستبد کسی قسم کے بھی وہ حاکم اوپر آئیں، وہ سب خدا کے مقرر کردہ ہیں، ان کو کیا جرأت ہے کہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکیں، یہ سب اس کی مشیّت میں ہے، وہ کراتا ہے یہ کرتے ہیں، یہ تو بیچارے اس قسم کے ہیں۔ یہ تقدیر کا مسئلہ ہے۔ عزیزانِ من! یہ اس قدر گہری سازشیں ہیں جو آپ کے دین کے خلاف ہوئی ہے اور قوم کے خلاف ہوئی ہیں۔ عام طور پہ ذہنوں میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہوا۔ یعنی تقدیر کا یہ مسئلہ ہے۔ یہ اس لیے وضع کیا گیا کہ یہ جتنے استبداد اور ظلم اور جرائم ہوتے تھے، ان کی باز پرس نہ ہو سکے کہ خدا نے یہ کچھ کرایا ہوا ہے، اللہ کی طرف سے یہ ہوتا ہے۔ یہ اس لیے عقیدہ وضع کیا گیا۔

ہمارے ہاں تقدیر کے عقیدے کی اہمیت اور اس کا نتیجہ

شاید ایک دفعہ پہلے بھی میں نے عرض کیا تھا کہ اس عقیدے کی اہمیت یہ ہے کہ ایمان لانے کے لیے قرآن نے پانچ اجزا بتائے: **ایمان باللہ و ملٰئکتہ و کتبہ و رسلہ و الیوم الاخر** (4:136) یہ پانچ ہی ہیں: اللہ پہ ایمان، انبیاء پہ ایمان، کتابوں پہ ایمان، ملائکہ پہ

ایمان اور آخرت پہ ایمان۔ اب تو کبھی اتفاق بھی نہیں ہوتا کہ ایمان کی یہ جو صفت ہے' اس کو کہیں دہرایا جائے' کسی زمانے میں وہ بھی پڑھا صٓ 288
دور تھا' جب نکاح کے وقت میں وہ یہ کچھ پڑھا لیا کرتے تھے' اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی لیکن اگر آپ کو یاد ہے یا کہیں کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں یا جو پڑھائی جاتی ہیں' تو یہ اجزائے ایمان ہیں۔ اس میں پانچ وہ ہیں جو اللہ کے مقرر کیے ہوئے ہیں اور درمیان میں ایک ٹکڑا اور آتا ہے اور وہ یوں ہے کہ **اٰمنتو اباللہ و ملٰئکتہ و کتبہ و رسلہ و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ و البعث بعد الموت** یہ درمیان میں جو عقیدہ تقدیر ہے' وہ آپ کے ایمان کا چھٹا جزو ہے کہ خیر اور شر' نیکی بدی' سب خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ آپ کے ایمان کا جزو ہے۔ بارہ سو سال سے آپ کے ایمان کا جزو ہے' ملوکیت کے دور میں ایجاد ہوا اور انہوں نے کہا کہ اسے ایمان کے اجزا میں لگاؤ' دیکھیں کہ جاؤ! کہاں جاتے ہو۔ تمہارا ایمان یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوتا ہے' یہ سب خدا کی طرف سے ہے' تو ہمیں کیا تم کہہ رہے ہو کہ ہم جو تمہیں اس طرح سے تہ تیغ کر رہے ہیں اور مار رہے ہیں اور ظلم ہو رہا ہے' تو اس کا نام ظلم رکھنا' توبہ توبہ توبہ' خدا کا حکم ہے' اس کو ہم Carry-out (روبہ عمل) کر رہے ہیں۔ تم خود اپنے ایمان کی رو سے یہ کہتے ہو: **و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ**' جی! کہتا ہوں' تو پھر ہمیں کیسے تم کہہ سکتے ہو کہ ہم ظلم کر رہے ہیں۔ جی غور فرمایا کہ عقائد کیسے بنتے تھے لیکن پھر مذہب' وہ تو تقدیر کا تھا' یہ تقلید جو آگے آگئی' آج کہہ کر دیکھیے گا کہ یہ جزو ایمان نہیں ہے۔ کفر کا فتویٰ لگے گا' پھر آپ کہیں گے کہ یہ پرویزی ہو گیا ہے۔ یہ چیزیں یونہی نہیں آگئی ہوئیں۔

تقدیر کے عقیدے کا ماحصل اور سید سلیمان ندویؒ کی طرف سے لکھی گئی تفسیر کا ذکر

عزیزانِ من! یہ بہت بڑی سازش ہے' وہ بہت بڑے شاطر تھے جنہوں نے بیٹھ کر یہ سوچا کہ کیا کریں کہ یہ سب کچھ کریں اور مواخذہ کچھ نہ ہو' ذہنوں میں بھی یہ بات نہ آئے کہ یہ اس کا ذمہ دار ہے۔ جو کچھ یہ استبداد کر رہا ہے' جو یہ گلے کاٹ رہا ہے یہ اس کا ذمہ دار ہے۔ کسی کے ذہن میں نہ آئے' تو اس کے خلاف آواز کون بلند کرتا' وہ تو خدا کے خلاف آواز بلند کرنی تھی۔ آہستہ آہستہ قوم اس سطح پہ آگئی۔ اب جو کچھ جی میں آئے' کوئی اس کے ساتھ کر دے' اس کا وہ ذمہ دار ہی نہیں' اس کے تحت الشعور میں ہے کہ یہ سب مرضی مولا کے مطابق ہو رہا ہے' خدا کرا رہا ہے یہ چھٹا جزو ہے آپ کے ہاں۔ اور یہ کوئی عام گاؤں کی مسجد کے جسے ملا کہتے ہیں' یہ ان کا نہیں ہے' بہر حال وہ تو سب جگہ لکھا ہوا ہے' وہ یہ سارا کچھ پڑھاتے ہیں۔ ہمارے بچوں کو ابھی جو اسلامیات کے نام سے میں نے دیکھا ہے' وہ چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں' اس کے اندر بھی یہ چیز موجود ہے' ہر جگہ ہے لیکن یہ چھوٹے چھوٹے لوگ نہیں ہیں' سید سلیمان ندویؒ مرحوم ((1884-1953 کا نام آپ نے سنا ہوگا وہ بہر حال کچھ ایسے روشن خیال علما میں سے تھے۔ ذہن میں نہیں آتا کہ وہ ایسے تھے۔ سیرت کی دو جلدیں تو شبلی

نعمانی نے لکھی تھیں۔اس کے بعد انہوں نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ان کی ایک جلد عقائد کے اوپر ہے‘اس میں عقائد کے اندر آپ بحث کر رہے ہیں۔وہاں انہوں نے ایک پورا باب لکھا ہے‘ یہ چھٹا جزو جو عقیدے کا‘ تقدیر کا ہے اس پہ بحث کرتے چلے آرہے ہیں کہ ایمان کے چھ جزو ہیں اور چھٹا جزو یہ قدر خیرہٖ و شرہٖ کا ہے۔انہوں نے یہ لکھا تو ہم نے اپنے ہاں لکھا کہ صاحب! وہ پانچ جو ہیں‘ان کا تو آپ نے قرآن کریم سے بتایا کہ اس میں یہ ہیں‘ قرآن میں پانچوں ہی ہیں کہ ان سے انکار کرو تو ان پہ کفر لازم ہے‘ان پہ ایمان لاؤ تو ایمان ہے‘ تو ہم نے کہا کہ یہ جو چھٹا ہے‘ یہ کہاں سے آیا۔اب اس کے لیے وہ ثبوت تو پیش نہیں کر سکتے تھے‘ کہنے لگے یہ ٹھیک ہے کہ قرآن میں اس طرح سے تو نہیں ہے‘ لیکن امت میں یہ مسلمہ اس طرح سے متواتر چلا آتا ہے کہ اب اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔میں نے کہا کہ کیا ’’بات ہے صاحب!!!‘‘ پھر تو قبروں پر بھی جا کر سجدہ کیا کرو‘ امت میں مسلمہ چلا آرہا ہے۔پھر قوم یہاں پہنچ جاتی ہے۔بہر حال اسی لیے قرآن نے کہا تھا کہ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ (38:77) نکل جا اس جنّتی زندگی سے جو ہمارا دین قائم کرتا ہے‘ قیامت تک کے لیے تیرے نصیب میں یہ چیز نہیں ہوگی۔وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (38:78) جب تک اعمال کے نتائج سامنے نہیں آتے‘ اس وقت تک یہ محرومی تیری قسمت میں رہے گی‘ وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ تُو کیا کر گیا ہے اور قوم کو کہاں پہنچا گیا ہے۔

ابلیس کا آدم کو زندگی بھر بے عمل بنا دینے کے لیے قیامت تک کا پروگرام

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (38:79) کہا کہ ٹھیک ہے‘ تیرا یہ حکم ہے‘ میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا‘ ایک بات یہ ہے کہ اس آدم کو تو مقابل میں لے آیا ہے‘ ٹکراؤ میرے ساتھ یہ ہوا ہے‘ میں نے سرکشی برتی ہے۔اب اس کو بھیج اور ساتھ مجھے بھی تو دنیا میں بھیج رہا ہے اور قرآن میں ہے کہ پھر دیکھ کہ میں کس طرح اسے ناکوں چنے چبواتا ہوں‘ یہ جس کی خاطر مجھے ذلیل کیا جارہا ہے‘ دیکھ میں پھر اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔لیکن ایک بات ہے کہ جب میں اس کا ٹینٹوا دباؤں‘ اس کی گردن پکڑوں‘ تو یہ نہ ہو کہ تُو اس وقت مجھے مار دے‘ یہ تو فیئر پلے (Fair Play) نہیں ہوگا‘ ہم دونوں کو موقعہ برابر دے دے‘ جب تک دنیا میں آدم کا یہ آخری بیٹا ہو‘ اس وقت تک مجھے بھی اجازت ہو کہ میں زندہ رہوں‘ مجھ کو مارنا نہیں پھر دیکھ کہ ’’برابر دی کشتی ہوئے گی فیر۔تو تک فیر‘ میں کرنا کی آں تیرے اس چہیتے لاڈلے دے نال❶‘‘۔

انسانی زندگی کے گیسوؤں کو قیامت تک سنوارنا یا الجھائے رکھنا‘ انسان کے اختیار و ارادے پہ موقوف ہے

قرآن کے یہ الفاظ ہیں۔میں اس کی تفصیل میں جاؤں وہ تو بڑی دلچسپ چیز ہے۔کہا ہے کہ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ - اِلٰى يَوْمِ

---

❶ پھر یہ برابر کی کشتی ہوگی۔پھر تُو دیکھ کہ میں تیرے اس چہیتے لعل کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔

الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ((38:80-81اس نے کہا یہ ٹھیک ہے ہمیں شرط منظور ہے اور ٹھیک ہے ''اسی کوئی رعی نہیں کر دے ہیگے کسے دی، ٹھیک ہے چل برابر دی کشتی ❶''، ہم تمہارا ٹینٹوا نہیں دبائیں گے۔ یہ بڑا اہم معاملہ ہے۔ اگر انسانی جذبات ختم کر دیئے جائیں تو باقی تو یہ مٹی کا مادھورہ جاتا ہے۔ جب تک آدمی موجود ہے اس کے جذبات اس کے ساتھ ہیں۔ یہ تو تصوف ہے جو اس کے خلاف خدا کو علی الاعلان کہتا ہے کہ تُو نے تو ان کو قیامت تک زندہ رکھنے کی اجازت دی تھی ''اسیں مار کے دسنے آں تینوں ❷''۔ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ من! یہ ہمارے ہاں کے تصورات کے یہ عقائد ہیں کیا، او کبھی کوئی کھڑا ہو کر سوچتا نہیں ہے! وہ کہتا ہے کہ ہاں اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ((38:81 تجھے ایک ''وقتِ معلوم'' تک کے لیے مہلت دی جاتی ہے۔ اور اگر انسان کے اندر یہ جذبات ہی نہ رہیں، تو آپ سوچیے تو سہی کہ زندگی ہی کیا رہے! یہ اتنی بے لطف زندگی، اتنی Still (ساکت وصامت) زندگی ہوگی کہ انسان دو منٹ کے بعد۔ بور ہو جائے۔ کیا بات ہے یہ جو کہتا ہے! بات تو بڑی چبھتی ہوئی ہوتی ہے

مزی اندر جہانے کور ذوقے ❸

وہ بور کر دینے والی دنیا ہے اس میں زندگی نہ بسر کر۔

کہ یزداں دارد و شیطان نہ دارد ❹

''کہ او تھے اللہ ہی اللہ ہووے، شیطان نہ ہووے تو بور ہو جائیں گا پنجاں منٹاں وچ ❺''۔

یہ ہے وہ چیز جو قرآن میں خدا نے کہی ہے۔ ٹھیک ہے اسی سے تو زندگی کا لطف ہے، اسی سے تو یہ روانیاں اور حرارتیں ہیں جن کو جذبات کہتے ہیں۔ ہماری طرف سے یہ وعدہ ہے۔ اور پھر یہ ہے شیطان کا Ego (پندارِ نفس) جہاں سے وہ بول رہا ہے کہ قَالَ فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ ((38:82 کہتا ہے کہ قسم ہے تیری عزت و جبروت کی ''دیکھ فیر میں کی کرناں، واں''۔ کیا قسم کھائی ہے اس نے! یہ ابلیس، یہ شیطان ہی یہ قسم کھا سکتا تھا۔ قسم بھی کھائی ہے تو خدا کی عزت و جبروت کی قسم کھائی ہے۔ بڑا عجیب کیریکٹر ہے اس کا۔

---

❶ ہم کسی کی کوئی رعایت نہیں کرتے۔ ٹھیک ہے چلو! برابر کی ہی کشتی ہوگی۔

❷ ہم اسے مار کر دکھاتے ہیں۔

❸ اس جہان میں جس کا ذوق اندھا ہے، مت زندگی بسر کر۔

❹ ایسا جہان جو خدا تو رکھتا ہے، شیطان نہیں رکھتا۔

❺ کہ اگر وہاں اللہ ہی اللہ ہو، شیطان نہ ہو تو پانچ ہی منٹ میں بور ہو جاؤ گے۔

❻ دیکھ! پھر میں کیا کچھ کرتا ہوں۔

کیا انسانی ذات کی تعمیر کے لیے بچے کی زندگی کے پہلے تین سال بنیادی کردار ادا کرتے ہیں؟ 288ص

کہا ہے کہ اِلَّا عِبَادَکَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ((38:83 لیکن پھر بھی تیرے کچھ بندے ایسے نکل آئیں گے کہ جن پہ میرا قابو نہیں چلے گا، مگر یہ تھوڑے سے ہونگے۔ یہ بڑا اہم سوال ہے عزیزانِ من! یہ Psycho-Analysis (نفسیاتی تحلیل) والے یا Psychiatrists (اطبائے نفسی) یہ کہتے ہیں کہ انسانی بچہ زندگی کے پہلے تین سال میں جو کچھ اس نے مستقبل میں بننا ہوتا ہے بن چکتا ہے۔ یعنی عادات، مزاج، اخلاقیات، تصورات اس کے تحت الشعور میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ آپ کے ہاں کی تعلیم و تربیت Environment (ماحول) جو کچھ بھی ہے، تین سال تک یہ چیزیں اس میں آجاتی ہیں۔ اور اس کے بعد وہ نہیں نکل سکتیں۔ ان کو نکالنے کے لیے پھر وہ کہتے ہیں کہ یہ مختلف امراض ہوتی ہیں، Complexes (نفسی الجھاؤ) ہوتے ہیں۔ نفسیات دماغی امراض کی رو سے وہ اس کو نکالتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ بن چکتا ہے، یعنی انہوں نے یہ اتنی بڑی تحقیق کرنے کے بعد اس انسان کو مجبور محض بنا دیا ہے۔ یعنی تین سال کی عمر تک تو بچے کو اپنے اوپر کچھ اختیار ہی نہیں ہوتا، تو وہ خارج سے جو چیزیں اس کے اندر آجاتی ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ نکل ہی نہیں سکتیں، تو وہ تو وہیں آ گیا۔ یہ ابلیس نے خود کہا ہے کہ نہیں، ایسے بھی ہونگے جو میرے قابو نہیں آئیں گے۔ قرآن نے اس تھیوری (نظریہ) کی تردید کر کے رکھ دی کہ یہ غلط ہے کہ اس سے کوئی بچ ہی نہیں سکتا۔ یہ ابلیس نے کہا تھا کہ میں جانتا ہوں ایسے ہونگے جو میرے قابو نہیں آئیں گے۔ خدا کہتا ہے کہ قَالَ فَالۡحَقُّ ((38:84 تو نے سچی بات کہی۔ وَالۡحَقَّ اَقُوۡلُ ((38:84 اب میں جو کہنے لگا ہوں وہ بھی سچی بات ہے اور وہ یہ ہے کہ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡکَ وَ مِمَّنۡ تَبِعَکَ مِنۡهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ((38:85 جو تیرے پیچھے جائیں گے وہ جہنم کی زندگی بسر کریں گے "اے میں کیا، اے وی سچی، جیہڑی توں کہی سی او وی سچی[1]"۔

انسانیت کی تعمیر کے لیے کوئی نبی کسی سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا تھا

یہ قرآنِ کریم بڑی دلچسپ کتاب ہے، عزیزانِ من! پوچھو نہیں کہ انداز کیا عمدہ ہے! اب ہم آخری آیات پہ آ گئے۔ کہا ہے کہ اے رسول! تم نے ان سے یہ سب باتیں کہہ دیں، ان سے ایک بات کہو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ تمہارے بھلے کے لیے ہے، تمہارے فائدے کے لیے ہے، اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔ اور یہ بڑی اہم چیز ہے۔ قرآن ہر نبی کی زبان سے بار بار دہراتا ہے کہ اس میں میرا اپنا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔ یہ بڑی چیز ہوتی ہے اگر کسی کو آپ یقین دلا دیں کہ جو کچھ مجھ سے یہ کہہ رہا ہے، یہ میرے فائدے کے لیے ہے، اس میں اس کا اپنا فائدہ نہیں ہے تو بڑی حد تک وہ اسے قبول کرتا ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد یہ کہا کہ قُلۡ مَاۤ اَسۡئَلُکُمۡ عَلَیۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ وَّ مَاۤ اَنَا

---

[1] یہ میں کہتا ہوں یہ بھی سچ ہے، جو تم کہتے ہو وہ بھی سچ ہے۔

مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ (38:86) ان سے کہو کہ میں جو کچھ تمہاری خاطر کر رہا ہوں' جان مار رہا ہوں' جان گھلا رہا ہوں' میں اس کے لیے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ یہ بڑی چیز ہے کہ میرا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا ایک ایک سانس اور ایک ایک لمحہ کتابِ فطرت کی طرح شفاف تھا

اور دوسری چیز یہ ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں' اس میں تصنع اور بناوٹ بھی کچھ نہیں ہے' یاد رکھو! میں آپ کے ہاں مصلح (Reformer) کی حیثیت سے آیا ہوا ہوں یعنی یہ نہیں ہے کہ میری زندگی کچھ ہو' میرے تصورات کچھ ہوں لیکن جب منبر پہ کھڑا ہوں تو پھر میں اللہ والا بنوں۔ کہنے لگے کہ میری زندگی بالکل سیدھی سی ہے۔ یہ ''متکلفین'' بڑا عجیب لفظ ہے۔ یہ جو خضاب لگا کر سفید بالوں کو سیاہ کر لیتے ہیں' اس کو ''کلف'' کہتے ہیں'' میں اپنے والاں نوں خضاب لا کے تہاڈے سامنے نہیں آیا ہو یا' او بالکل نیچرل تہاڈے سامنے آ❶''۔Reformer (مصلح) کے لیے دو باتیں بڑی ضروری ہیں ❶: میرا اپنا کوئی مفاد نہیں ہے اور ❷ میں کوئی ایکٹر بن کر تمہارے سامنے نہیں آیا' میری زندگی کتاب فطرت کی طرح کھلی ہے۔ وہ جو رسول اللہ ﷺ سے مخالفین نے کہا تھا کہ تم جو کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے وحی آتی ہے' کیسے پتہ چلے کہ تم سچے ہو' جھوٹ نہیں کہتے ہو؟ ہر مذہب پرست' ہر شخص' یہ کہے گا کہ انہوں ﷺ نے پھر ایک معجزہ دکھا دیا اور کہا کہ یہ دیکھ لیجیے صاحب! یہ سچے ہیں۔ معجزہ دکھایا تھا لیکن بڑا اہم معجزہ تھا۔ کہا تھا کہ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ((10:16 میں کہیں باہر سے تمہارے اندر نہیں آیا' اجنبی نہیں ہوں' مریخ سے نہیں ٹپکا' میں نے اپنی پوری چالیس سال کی زندگی تمہارے اندر گزار دی ہے' میں اپنے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا' تم خدا کو شاہد رکھ کر کہو کہ کیا اس قسم کی زندگی کسی جھوٹے کی ہوتی ہے یا سچے کی ہوتی ہے؟ اور میرے متعلق خود فیصلہ کرو' وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ ((38:86 میں خضاب لگا کر تمہارے سامنے نہیں آیا۔ اور پھر خضاب لگانے والوں کے بالوں کا جو حشر ہوا کرتا ہے وہ نیچے نیچے سے سفید' اوپر اوپر سے کالے سے' براؤن سے ہوتے ہیں' پھر اس کے بعد پوچھو نہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ کیا لفظ ہے صاحب! کہ نہ میرا کوئی اپنا اس میں فائدہ ہے' اور نہ میں کچھ بناوٹ میں ہوں' میری زندگی کھلی کتاب ہے۔

انسانی زندگی کی مفاد پرستیوں کے مختلف روپ اور وحی کی اہمیت

جو شخص کسی اصلاح کے لیے اٹھے اُس میں دو باتیں ہونی چاہئیں: اس کا ذاتی کوئی مفاد نہ ہو۔ مفاد روپے پیسے میں نہیں ہوتا' عزیزانِ من! روپیہ پیسہ تو بہت بعد کی چیز ہے' ایسے مفادات ہیں جن کا نام نہیں رکھا جا سکتا۔ پہلی چیز یہ ہے کہ تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور دوسری چیز یہ ہے کہ یہ اپنی زندگی کو پیش کرے کہ دیکھ لو میں نے خضاب نہیں لگایا ہوا۔ باقی اگلی بات یہ رہی کہ تم اگر اس کو نہ مانو گے تو اس کا

---

❶ میں اپنے بالوں کو خضاب لگا کر نہیں آیا' وہ تو فطری طور پر جو ہیں' تمہارے سامنے ہیں۔

کچھ نہیں بگڑے گا' یہ نہیں کہ تم نے انکار کر دیا تو یہ ساری خدا کی اسکیم ہی فیل ہو جائے گا' یہ بیکار چلا جائے گا جو کچھ میں تمہیں دے رہا ہوں۔ یہ بات تمہارے لیے مخصوص نہیں' نہ کسی زمان سے نہ کسی مکان سے' اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ کہا کہ **اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ** ((38:87 یہ تو تمام نوع انسانی کے لیے ایک کتاب فطرت ہے جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ تم نے ماننا ہے تو تمہارا بھلا اس میں ہے' نہ مانو اور قومیں ہونگی اور زمانے آئیں گے جو اس کو مانیں گے۔ یہ نوع انسان کے لیے تو آخری راستہ ہے' آخری سہارا ہے' انسانیت کا آخری سہارا ہے' وہ یہ کتاب ہے۔ تم نہیں مانو گے' اس وقت تم کہو گے کہ اس سے ہمارا کیا بنا اور کیا بگڑا۔ **وَلَتَعۡلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعۡدَ حِيۡنٍ** ((38:88 مستقبل یہ بتا دے گا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کس قدر سچائی پر مبنی ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اس کا انجام' اس کے عواقب' کچھ مدت کے بعد تمہارے سامنے آئیں گے۔ اقوام عالم جس غلط روش پر چلے گی' کچھ عرصے کے بعد اس کے نتائج ان کے سامنے آئیں گے اور ان نتائج سے وہ قومیں خود پرکھ لیں گی کہ یہ قرآن سچ کہتا ہے یا یہ غلط کہتا ہے۔ اس سے سوال یہ نہیں ہے کہ تم نہ مانو گے ''تے میرا سودا وکنوں بند ہو جائے گا[1]''۔ اس کا کچھ نہیں بگڑتا' یہ صرف تمہارے لیے نہیں ہے' تمام اقوام عالم کے لیے ہے' نوع انسان کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ یہ **ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ** ((38:87 ہے۔ کیا بات ہے۔ یہاں ذکر کا لفظ جو بتایا ہے! یہی بات اقبالؒ نے ''جاوید نامہ'' میں کہی ہے۔

ذکرِ حق از امتاں آمد غنی

رہ گئی رسم اذاں' روح بلالی نہ رہی

قوموں کے ساتھ یہ کلمہ حق محبوس نہیں ہے کہ ایک قوم ہے اگر اس نے اس کو اپنایا ہے تو یہ تو پھر یوں ہو گیا' کہ وہ اگر اسے چھوڑ دیتی ہے تو یہ فیل ہو گیا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ اسلام آگے نہیں چلا' وہ میں نے لکھا تھا کہ ''کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟'' یہ عام خیال پیدا ہو رہا ہے اور ہمارا یہ نوجوان طبقہ' یہ خیال عام لیے ہوئے ہے اور اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔ ہم جو اس کے سامنے اسلام پیش کرتے ہیں وہ ہے ہی چلا ہوا کارتوس' وہ خول ہی خول ہے: ''رہ گئی رسم اذاں' روح بلالیؓ نہ رہی'' اس کے اندر بارود نہیں ہے لیکن اسلام کی تو یہ صورت نہیں ہے کہ وہ کسی وقت خول رہ جائے اور اس میں بارود نہ رہے۔

ذکرِ حق از امتاں آمد غنی
از زمان و از مکاں آمد غنی!

---

[1] تو میرا سودا سلف بکنا بند ہو جائے گا۔

وحی کی طرف سے عطا کردہ نشانِ راہ کسی قوم کا یا کسی قت کا محتاج نہیں ہوتا

یہ نہ کسی زمانے (Time) کے ساتھ محبوس ہے' نہ کسی خاص Space (مکاں) کے ساتھ محبوس ہے' نہ کسی ملک کے اندر محصور ہے' نہ کسی قوم کے اندر

ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است

جو قوم بھی اس پر عمل کر رہی ہے' یہ بات نہیں ہے کہ یہ اس کا ہو جاتا ہے' یہ قانون تو الگ ہے' Objectively (معروضی طور پر) ایک چیز ہے' وہ جو کھمبا کھڑا ہے سائن پوسٹ (نشانِ راہ) ہے' راستہ چلنے والوں کا وہ محتاج نہیں ہے' راستہ چلنے والے اس کے محتاج ہیں' وہ اپنے مقام پہ کھڑا ہے۔ اس نے اس کی پرواہ نہیں کی' غلط راستہ اختیار کر لیا ہے تو کر لیا ہے' وہ اپنے مقام پہ کھڑا ہوا بتا رہا ہے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے! وحی وہ علم ہے جو Objectively (خارج سے) خدا سے ملتا ہے اور کائنات میں Objectively (معروضی طور پر) کھڑا رہتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہم مانیں تو وہ صحیح راہنمائی ہو' ہم نہ مانیں تو وہ راہنمائی غلط ہو جائے۔

ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است
احتیاجِ روم و شام اورا کجا است

کہ جی! سارے دنیا کے مسلمانوں میں آپ بتایئے اسلام نہیں رہا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بس اسلام فیل ہو گیا۔ یہ اس کے فیل ہونے کا سوال ہی نہیں ہے' وہ تو اپنے مقام پر' چوراہے میں کھڑا ہے' وہ سائن پوسٹ (نشانِ راہ) ہے۔ اور اس کے بعد کہا کہ

حق اگر از پیشِ ما بردار دش

اگر ہم نے اس کی خلاف ورزی کی' تو یہاں سے خدا نے وہ راہنمائی ہمارے ہاں سے اٹھا لی۔

پیش قومے دیگرے بگذاردش

(اقبالؒ: 1947ء جاوید نامہ۔ ص۔ 91)

دنیا کی کوئی اور قوم اس کو سنبھال لے گی' وہ وہاں چلنا شروع ہو جائے گا' تمہاری احتیاج اور محتاجی تو نہیں ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ صٓ کی آخری آیت تک ہم آ گئے۔ آئندہ ہم سورۃ الزمر' 39 ویں سورۃ' لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



450الزُّمَر

پہلا باب: سورۃ الزمر (1 تا 7)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿١﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ
الدِّيْنَ ﴿٢﴾ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ
اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ۬ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ
كَفَّارٌ ﴿٣﴾ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ
الْقَهَّارُ ﴿٤﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ
وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿٥﴾ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ
وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ
اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ
فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿٦﴾ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۟ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا
يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿٧﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1980ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز 23ویں پارے کی 39ویں سورۃ الزمر سے ہو رہا ہے:(39:1)۔

قرآنِ حکیم ایک مکمل ضابطہء حیات ہونے کے علاوہ اپنے بیان میں بھی منفرد صفات کا حامل ہے

ابتدا ہوتی ہے تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (39:1) قرآن کریم ایک ضابطہ حیات ہونے کی جہت سے جہاں منفرد ہے، وہاں اس کے اندر جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، وہ بھی ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اصل میں جسے ہم قرآنِ کریم کہتے ہیں، وہ الفاظ

ہی کا تو مجموعہ ہے۔ وہ الفاظ بھی منفرد ہیں، اس کی تعلیم منفرد ہے، اس کے حقائق منفرد ہیں اور جو الفاظ اس کے لیے چنے گئے ہیں، وہ خود بھی منفرد ہیں۔

وحی کے لیے تنزیل کا لفظ قابلِ غور ہے اور انسانی علم کے لیے؟

یہی جو تنزیل کا لفظ آیا ہے، جو نازل ہونا ہے، ہم نے تو کبھی ان چیزوں پر غور نہیں کیا، غور کرنا تو ہم پہ حرام قرار دیدیا گیا ہے۔ یہ خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے، یہ منزل من اللہ ہے، ہم یہ الفاظ بولتے چلے جاتے ہیں اور کبھی کھڑے ہو کر سوچتے نہیں کہ اس کے معنی کیا ہیں، قرآن حکیم میں یہ لفظ کیوں استعمال ہوا ہے، نزولِ قرآن کے کیا معنی ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو درحقیقت اس کی انفرادیت کو Establish (قائم) کرتے ہیں۔ یہ الفاظ وحی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ اب علمی دنیا والے اس کو Appreciate (پسند) کر سکتے ہیں کہ یہ کیا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ انسانی علم ہو، اس کا طریقِ حصول کوئی بھی ہو، اس میں انسان کی اپنی محنت، کاوش، کسب و ہنر، صلاحیت، قابلیت، فکر، غور و تدبر کی یہ ساری چیزیں شامل ہونگی تو پھر وہ علم حاصل کر سکے گا۔ یہ جتنی چیزیں ہیں، وہ انسان کے اپنے اندر ہوتی ہیں، وہ انہی صلاحیتوں سے کام لیتا ہے تو وہ علم حاصل کرتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے ہو، تدریس کے ذریعے ہو، مطالعہ کے ذریعے، مشاہدہ کے ذریعے، تجربہ کے ذریعے، اس کے اندر یہ چیز ہونی چاہیے۔ آپ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تو پڑھ ہی نہیں سکتا، اس میں تو اس کا ذہن نہیں ہے، اس میں یہ اس چیز کی قابلیت ہی نہیں ہے، بھئی! تم اسے نہیں سمجھ سکتے، تم میں اس کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کے اندر کوئی چیز ہوتی ہے جس سے علم حاصل ہوتا ہے۔ انسانی علم کہیں بھی ہو، کسی نوع کا ہو، کسی زمانے کا ہو، بڑی سے بڑی شخصیت کا بھی ہو، اس میں یہ چیز ہوگی کہ اس کے اندر کوئی چیز تھی۔ اصطلاح میں اسے Subjective (داخلی) کہتے ہیں، یہ چیز اندر سے ہوتی ہے، خود لفظ Education (ایجوکیشن) کے معنی ''اندر سے کسی چیز کا باہر لانا'' ہوتے ہیں۔

تعلیم، (Education: ایجوکیشن) اور وحی میں ایک بنیادی فرق ہے

وہ جو ہمارے ہاں تعلیم کو Education (ایجوکیشن) کہتے ہیں، یہ Education (ایجوکیشن) نہیں ہے، یہ Information (معلومات) ہے۔ ایجوکیشن کے تو معنی ہیں کہ ''انسان کی اندرونی صلاحیتوں کی نشوونما کرنا، اس کے اندر جو کچھ ہے، اسے نشوونما دے کر باہر نکالنا''۔ بہرحال علم انسانی کے متعلق یہی چیز ہے، وہ کتنا ہی بڑا Genius (نابغہ) ہو، اس کے اندر سے کوئی چیز باہر آتی ہے۔ اس کے برعکس وحی ایک الگ ہی منفرد اور مستثنیٰ ذریعہ علم تھا کہ جس میں اس کے اندر سے یہ چیز نہیں ہوتی، یہ حصولِ علم کا ذریعہ نہیں تھا، یہ باہر سے بالکل منفرد کوئی چیز اندر آتی تھی۔ کسی اور کے لیے یہ بات نہیں ہوتی۔ یہ خارج سے ایک چیز آتی تھی، جسے اب ہمارے ہاں

Objective (خارج سے) کہتے ہیں۔ اس میں اس کے اپنے اندر جو کچھ ہے مثلاً محنت و کاوش، کسب و ہنر، فکر و تدبر، شعور، ان میں 450 الزُّمَر کسی چیز کا دخل نہیں تھا، وہ تو خارج سے آ رہی ہے جسے کہیں کہ اوپر سے اتر رہی ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ یہ جو وحی کا تصور ہے، اس تصور کے لیے یہ ایک لفظ ہے کہ یہ وہ علم ہے جو اسے باہر سے آتا ہے، اس کے اندر سے باہر نہیں آتا، یہ وحی ہے۔ یہ جو نازل ہونا ہے، اب اس کا کیا ترجمہ کیا جائے گا۔ انگریزی زبان میں بھی وحی کے لیے انہوں نے Revelation کا لفظ دیا ہے کہ یہ۔۔۔۔۔ Revealed to the ہے۔ اس کے معنی ہوتا ہے کہ "پردہ کشائی کرنا، پردہ اٹھانا" تو گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیزیں تو پہلے موجود تھیں، ان پر پردہ پڑا ہوا تھا، اس کے سامنے سے وہ پردہ اٹھا دیا۔

وحی کے لیے لفظ نزول کی اہمیت اور اس کی خصوصیت

اس میں یہ نہیں ہے کہ وہ چیز بھی خارجی علم کی حیثیت رکھتی ہے لیکن پہلے ان چیزوں کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ قرآن کریم یہاں تنزیل کا لفظ لایا ہے، وحی کا مادہ "و ح ی" ہے جس کے معنی، میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ "نازل ہونے" کے ہیں، یعنی اوپر سے کسی چیز کا اندر آنا" اور اس "تنزیل" لفظ کے باب کے اندر یہ ہے کہ وہ بتدریج، رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ، کسی چیز کا آنا ہے۔ اور اگر وہ جو Disclosure یعنی پردہ اٹھا دینا ہے کہ پہلے سے ہر چیز موجود ہے، پردہ اٹھ گیا ہے، تو اس میں پھر تنزیل نہیں رہتی۔ وہ جو نبی اکرم ﷺ کی تیئیس سالہ نبوت کی زندگی تھی، اس میں یہ جو علم تھا وہ بتدریج نازل ہوتا رہا، خارج سے اترتا رہا، قلبِ نبی ﷺ پر آتا رہا اور تدریجاً آتا رہا، اب یہ نزول اس کی طرف سے ہوا، اس کے لیے تنزیل کا لفظ ہوا۔ اس کا ترجمہ کونسی زبان کر سکے گی، اس لیے کہ زبانیں تو انسانی تصورات کے لیے بنتی ہیں جبکہ یہ ایک تصور ہی انسانوں سے ماوراء ہے۔ کسی زبان میں اس کے لیے لفظ نہیں مل سکتا۔ اس کے لیے Inspiration لفظ نہیں ہے اور Revelation بھی صحیح مفہوم نہیں دے رہا۔

وحی کے برعکس تصوف کی دنیا میں کشف اور الہام کا پایا جانے والا تصور سراسر غیر قرآنی ہے

وہ جو Revelation یا Revealed چیز تھی، وہ اصل میں عیسائیوں کے ہاں ان کے تصوف کی چیز تھی، اس کے لیے ہمارے ہاں لفظ کشف ہے، وہ جو ہمارے ہاں تصوف میں بھی آتا ہے، جسے کشف اور الہام کہتے ہیں، الہام Inspiration ہے اور جو ہمارے ہاں کشف ہے وہ وہ چیز ہے کہ جو ان کے ہاں Revelation ہے۔ یہ وحی تو میں نے کہا ہے کہ منفرد قسم کا ایک تصور ہے، لفظ ایک اس کے لیے یہ آ سکتے تھے اور یہ پھر نازل ہونے کے لفظ میں کتنی عجیب چیز ہے۔ کن چیزوں کے لیے خدا نے کہا کہ یہ آسمان سے نازل ہوتی ہیں؟ اس نے کہا کہ بارش نازل ہوتی ہے، زمین پہ آتی ہے، اس میں زمین کا ذرا بھر کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا، یہ ہوتا ہے جسے نزول کہا جاتا

ہے۔خدا کا ایک قانون ہے جس کے مطابق وہ بارش بنتی ہے‘ جن کے لیے وہ بارش برستی ہے‘ان میں زمین کا ذرا بھر کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا۔اگلی چیز پھر یہ ہے کہ زمین کس قسم کی ہے جو اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔بنجر ہے‘اس میں نشوونما کی صلاحیت نہیں ہے‘ پانی اس پہ بھی پڑے گا‘ نازل اس پہ بھی وہ ہوگا لیکن اس میں روئید گی نہیں ہوگی۔اگر زمین تیار ہے تو اس میں صلاحیت موجود ہے‘اس میں سے روئید گی بھی ہوگی۔یہ اگلی چیز ہے‘ یہاں زمین آتی ہے۔جہاں بارش کا برسنا ہے اس میں زمین کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

وحی کی کنہ اور حقیقت‘ نیز لفظ رسولِ امین اور نبوت کا مفہوم

ایک لفظ نزول میں آپ دیکھیے کتنی جامعیت آجاتی ہے! قرآن مجید کے ان الفاظ کے اندر تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ(39:1) کہا ہے کہ یہ خارج سے ملا ہوا علم ہے‘ اسے کتاب کہا ہے۔اور پھر بعض ترجموں میں انگریزی زبان والوں نے اس کا ترجمہ Sent Down کیا ہے۔یہ لفظی ترجمہ تو ہو سکتا ہے لیکن وہ جو الکتاب ہے‘ اگر اس کے لیے یہ آگے آئے تو وہ ترجمہ یہی ہوگا کہ He has sent down the book (اس نے کتاب نیچے بھیجی ہے) تو وہ Book (کتاب) تو اوپر سے نہیں آئی تھی۔یہ تو قرآن مجید میں ہے جو ملا ہے۔ان کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ ہمیں ایسے ہی کیا پتہ چلے کہ یہ وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ہونا تو یہ چاہیے کہ آسمان سے جو ایک لکھی لکھائی ہوئی کتاب ہے‘ وہ اتر رہی ہو‘ اس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں‘ تو پھر ہم تسلیم کریں کہ ہاں واقعی کوئی چیز تمہیں آسمان سے بصورت وحی ملتی ہے۔اس کا جواب انہی الفاظ میں دیا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اسے دیکھ لیں‘ سنو! وہ اگر اس کو چھو بھی لیں اور ان کے ہاتھ میں بھی یہ کتاب آجائے تو پھر بھی یہ ایمان نہ لائیں۔بتایا یہ ہے کہ وہ کٹ حجتیاں کرتے ہیں‘ مطلب یہ ہے کہ وہ جو Sent down the Book ہے‘ کتاب کا اوپر سے کسی طرح سے نیچے اترنا ہے‘ اس سے بھی یہ تصور نہیں آتا۔

عزیزانِ من! وحی کی ماہیت‘ کنہ اور حقیقت ہی مختلف تھی‘ ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکتے کہ وحی کیسے ملتی تھی۔لیکن یہ جو الفاظ ہیں‘ یہ بتاتے ہیں کہ اس میں صاحب وحی کی اپنی فکر و کاوش کا کوئی دخل نہیں تھا۔یہ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی(53:3) ہے کہ وہ اپنی خواہش‘ آرزو‘ فکر و تدبر سے کچھ نہیں کہتا تھا اور پھر جو لفظ رسول ہے وہ خود ساری بات واضح کر دیتا ہے۔آگے چل کر ایک سورۃ کے اندر ہے کہ اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ(69:40) ان باتوں کا کہنے والا (یعنی جس کی زبان سے یہ تم تک پہنچ رہی ہیں) یہ ہمارا معزز پیغامبر ہے۔بہت سے لوگوں کو اس آیت سے دھوکا لگتا ہے کہ یہ ہمارے رسول کا قول ہے۔تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تو پھر رسول کا قول ہو گیا‘ یہ خدا کا تو نہ ہوا۔انہوں نے غور نہیں کیا کہ یہاں کیا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔اس نے یہ قول محمد عربی ﷺ نہیں کہا۔

سوال یہ ہے کہ رسول کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ وہ دوسرے کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ایک شخص جو دوسرے کا پیغام آپ تک پہنچاتا ہے یہاں وہ قرآن مجید ہے۔اگلی ہی آیت میں کہا ہے کہ وَمَا ھُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ(69:41) یہ ہمارے ہی ارشادات ہیں جنہیں یہ تم تک پہنچا

رہا ہے۔ یہ کسی شاعر کے تخیلات نہیں ہیں' سنو! ہمارا یہ رسول امین ہے۔ امین' جو پیغامبر ہے' وہ دوسرے کا پیغام لفظاً لفظاً تمہارے تک 450الزُّمَرْ پہنچائے گا' وہ اس میں اپنی طرف سے ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کرے گا۔ لیکن وہ پیغام تو اسی کی زبان سے آپ کو ملے گا' وہ آ کر یہی کہے گا کہ صاحب! انہوں نے مجھے بھیجا ہے اور انہوں نے یہ کہا ہے کہ آپ کل چار بجے ہمارے ہاں تشریف لائیے گا۔ اس کی زبان سے یہ پیغام نکل رہا ہے لیکن جونہی آپ نے کہا کہ پیغامبر ہے' یہ پیغام ہے' اسے پوچھو گے کہ کیا تم اپنی طرف سے کہتے ہو' کہ جی نہیں صاحب! یہ انہوں نے فرمایا ہے' میں تو انہی کے الفاظ دہرا رہا ہوں۔ یہ جو الفاظ کا دہرانا ہے' یوں یہ قول رسول کہا ہے' اس کی حیثیت آگے پیغامبر کی ہوتی ہے۔ ملتا تو اس طرح کہ اپنی سعی و کاوش اور فکر و تدبر کا کوئی دخل نہیں' یہ Objectively (خارج سے) ملتا ہے' وہ پہنچاتا ہے تو پیغامبر کی حیثیت سے پہنچاتا ہے' پیغامبر امین ہے۔

عزیزانِ من! قرآن مجید پہ جھومتے چلے جائیے۔ یہ لفظ رسول نے بات صاف کر دی' خاص طور پہ جب امین ساتھ کہا تو یہ بات تو اور پکی ہوگئی۔ ملے گا تو وہ زبان محمد ﷺ سے ہی' زبان الفاظ نبوت سے ہی ہیں لیکن وہ اس کے الفاظ نہیں ہونگے' وہ کسی اور کے الفاظ تم تک پہنچا رہا ہے اور امین ہے' اس میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا۔ یہ ہے وحی۔ خدا کی طرف سے ملا تو نزول ہوا' جس کو یہ ملا ہے اس نے آگے پہنچایا تو یہ رسالت ہوئی۔ اب خدا کا کلام ہم تک بعینہٖ پہنچ گیا' اس کی وساطت سے پہنچا۔ جس کی وساطت سے پہنچا' نہ تو اس کے ملنے میں اس کا اپنا دخل' نہ پہنچانے میں اس کا اپنا کوئی دخل ہے۔ کلامِ خداوندی کا انسانوں تک آنے کے لیے کیا طریقہ ہے؟ یہ جو طریق علم تھا' خدا سے ملنا اور آگے پہنچانا' یہ تھی وحی' یہی تھی نبوت۔ یہ ہے جو ختم ہوئی ہے' اب یہ ذریعہ علم باقی نہیں رہا۔ خدا کے پیغام جو اس طرح سے انسانوں کے لیے تھے وہ محفوظ ہو گئے' غیر متبدل ہو گئے' قرآن مجید میں درج کر دیئے گئے اور اس کے بعد یہ ذریعہ علم نہیں رہا۔

اب یہ کہنا '' کہ یہ جتنا کچھ ہوتا ہے یہ کشف ہوتا ہے' الہام ہوتا ہے' اولیاء اللہ کو یہ سارا کچھ ہوتا ہے'' یہ سب خلافِ قرآن حکیم ہے۔ ایک وحی ہی ایسی چیز تھی کہ جس میں اس کا اپنا دخل نہیں ہوتا تھا' خارج سے علم کی ایک چیز ملتی تھی' اس کے بعد انسانوں کے لیے باقی ذرائع علم وہی ہیں' خواہ کتنے ہی مرتبے کا انسان کیوں نہ ہو جائے' ذرائع علم وہی ہیں کہ اس میں اس کی اپنی کاوش کا دخل ہوگا' اپنی فکر کا دخل ہوگا' یہ وحی نہیں ہوسکتی' خدا کی طرف سے وہ علم نہیں ہوسکتا۔ کشف والہام سب خلافِ قرآن حکیم طریقے ہیں' یہ تمام ختمِ نبوت کے دروازے توڑنے کے حیلے ہیں۔ وہ ذریعہ علم ختم ہو گیا' یہ وحی کا ملنا ہے جسے نبوت کہتے ہیں۔ یہ وہ پیغام تھا جو نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے زبانی ملتا تھا' وہ لکھا گیا اور محفوظ کر دیا گیا۔ تو تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ (39:1) یہ ضابطہء قوانین خدا کی طرف سے بتدریج ہے۔ یہ خارجی طریق سے (Objectively)' جس میں اس رسول کی اپنی کاوش اور فکر کا کوئی دخل نہیں ہے' ملا۔ اور کتاب کی خصوصیت الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ

)(39:1 ہے' یہ عزیز اور حکیم ہے۔ اس کی طرف سے یہ دو چیزیں اکٹھی آئیں۔ یہ قرآن کریم کا ہی اعجاز ہے۔ 450الزُّمَرْ

لفظ عزت کے معنی تعظیم نہیں بلکہ اقتدار کے ہوتے ہیں اور ذاتِ خداوندی اگر عزیز ہے تو حکیم بھی ہے

ہمارے ہاں تو عزت کا یہ لفظ Respect (تعظیم) کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کے معنی تعظیم نہیں ہوتے' اس کے معنی ''اقتدار'' ہوتا ہے' ''قوت والا'' کے ہوتے ہیں کیونکہ ہر جو صاحبِ اقتدار ہے' وہ اپنی عزت کراتا ہے اس کے لیے اس کے معنی عزت و تعظیم ہو گئے ورنہ اس کے اصل معنی ''اقتدار'' کے ہی ہیں۔ بات بڑی صحیح ہے' اقتدار والے سے وہ اقتدار لے لیجیے پھر پوچھیے کہ کون اس کی عزت کرتا ہے۔ پھر تو

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

آپ دیکھیے یہ عرب بڑی عجیب قوم تھی۔ ایک ہی چیز میں کہ اقتدار کے معنی عزیز کے یا عزت کے ہیں' تعظیم کے معنی اس لیے آئے کہ وہ اپنی تعظیم کراتا ہے۔ جب اس کی وہ عزت یعنی اقتدار ختم ہوتا ہے تو تعظیم تو پھر رہتی نہیں ہے۔ بہرحال' عزیز کے معنی ہیں ''صاحبِ اقتدار''۔ اور دنیا میں دو چیزیں اقتدار اور Reason (حکمت) کبھی اکٹھی نہیں ہوتی تھیں' جو صاحبِ اقتدار ہے' جس کے پاس قوت ہے اور وہ پھر العزیز ہے یعنی وہ کہ جس کے سوا کسی دوسرے کو اقتدار ہے ہی نہیں' اسے تو کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ اپنے کسی حکم کے لیے کوئی Reason (حکمت) دے' اس نے تو حکم دینا ہے۔ وہ مسئول ہی نہیں ہے' پوچھا جائے کہ یہ حکم کیوں دیا ہے تو ان کے حضور میں گستاخی ہوگی' پھانسی پر لٹکا دیں گے کہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ ''کیوں'' نہیں پوچھا جاتا لیکن وہ العزیز ایسا ہے کہ اس کے ساتھ الحکیم ہے' اپنی ہر بات کے لیے Reason (حکمت) دیتا ہے' حکمت دیتا ہے۔ اور جب بھی اقتدار اور Reason (حکمت) اکٹھا ہو جائے تو وہ ہے نظام جو انسانیت کے لیے ہے۔ انسان اور حیوان میں فرق ہی یہ ہے کہ حیوان حکم کے تابع ہوتا ہے' ڈنڈے کے تابع ہوتا ہے' وہ Reason (حکمت) نہیں مانگتا۔ انسان Reason (حکمت) مانگتا ہے ''کیوں'' پوچھتا ہے' اس سے اس کا اطمینان ہوتا ہے پھر اس کے بعد جو وہ تعمیل کرتا ہے تو وہ اس کے حکم کی تعمیل نہیں ہوتی' اپنے فیصلے کی تعمیل ہوتی ہے جو یہ خود اس فیصلے پہ Reason (حکمت) کی وجہ سے پہنچا ہے۔ دیکھا آپ نے کتنا فرق پڑ گیا۔ تو وہ العزیز ہے۔

خدائے علیم و بصیر کی طرف سے قرآنِ حکیم کے لیے ہر ہر لفظ کا انتخاب اور باہمی ربط بذاتِ خود ایک معجزہ ہے

آپ دیکھیے کہ یہ تنزیل ہے اور الکتاب ہے۔ یہ اس اللہ کی طرف سے ہے جو العزیز ہے' الحکیم ہے۔ تو یہ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم

کے جو الفاظ ہیں' یہ الفاظ ہی تو قرآن کریم ہیں' یہی تو وحی ہیں' یہ منفرد ہیں اس کا انداز منفرد ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ[450] الزُّمَر بِالۡحَقِّ)(39:2 العزیز کی طرف سے یہ الکتاب نازل ہوئی ہے۔ ضابطہء قانون وہی دے گا جو صاحب اقتدار ہوگا لیکن اس میں ساتھ ہی اس کے جو "The why of it" ہے' وہ اس کا Reason (حکمت) ہے' اس کا Argument (دلیل)' اس کی علت ہے' اس کا یہ مقصد سب کا سب' ساتھ بتایا ہوا ہے۔ یہ بالحق ہے۔ ایک چیز ہوتی ہے جو محض ذہنی ہوتی ہے' جسے آپ Fantasy (بے لگام تخیل کی تخلیق) کہتے ہیں' یہ تصوراتی ہوتی ہے' محض نظریاتی ہوتی ہے' عملی دنیا سے' ٹھوس حقیقتوں سے' اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس عربوں کے ہاں حق کہتے ہی اس بات کو تھے جو ٹھوس ہو کر آپ کے سامنے اپنا ثبوت بہم پہنچا دے' محسوس شکل میں سامنے آجائے۔ یہ ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے۔ اب تو حق ہمارے ذہنوں میں وہ Abstract (غیر محسوس) چیز ہی آتی ہے۔ ذہنی طور پر ہم نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہاں واقعی یہ حقیقت ہے' جسے ہم Truth (حق) کہتے ہیں لیکن عرب اس کو حق نہیں کہتے تھے۔ وہ حق اس وقت کہتے تھے جب کوئی نظریہ' کوئی تھیوری' عملاً محسوس شکل میں سامنے آتی تھی۔ دیکھیے کتاب کی کتنی خصوصیات بیان ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ کہ اس کا ذریعہ علم تنزیل ہے' وہ الکتاب ہے' پھر وہ اللہ کی طرف سے ہے جو الہ ہے' جس کو اقتدار مطلق حاصل ہے' وہ اقتدار عزت اور حکمت دونوں کے امتزاج کا نام ہے۔

لفظ الحق کا مفہوم

اس آیت ((39:2 میں چار الفاظ ہیں۔ آپ غور کیجیے قرآن حمید کہاں لے جاتا ہے۔ وہ کتاب نازل ہوئی ہے تو اس شکل میں نازل ہوئی ہے کہ وہ اپنے ہر دعوے کو محسوس شکل میں لا کر دکھا دے گی۔ یہ ہے الحق۔ الحق پہ ہی اگر میں آؤں تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں بھی کتنے درسوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ قرآن حمید کی بڑی اہم چیزیں ہیں۔ حق وہ ہوتا ہے جو محسوس شکل میں سامنے ہو لیکن وہ اٹل ہو' اپنے مقام کے اوپر کھڑا ہو' غیر متبدل ہو۔ اب جو غیر متبدل چیز ہے' اپنے مقام پر جم کر کھڑی ہوئی ہے' اس میں تو جمود ہوگا۔ مثلاً یہ میرے سامنے کا جو ستون ہے' یہ ایک چیز ہے' یہ اپنے مقام پہ کھڑی ہے لیکن یہ تو جامد ہے۔

عرب اس قسم کے اٹل جامد کو حق نہیں کہتے تھے۔ سیدھی سادی سی قوم تھی' لمبے چوڑے فلسفے میں تو جاتی ہی نہیں تھی' وہ زندگی کے جو روزمرہ کے مشاہدات تھے' محسوسات تھے' انہی سے وہ اس قسم کے الفاظ استعمال کرتی تھی۔ وہ عرب ایک چیز کہتے تھے کہ ''جو اپنے مقام کے اوپر اٹل بھی رہے' محکم بھی رہے اور ضروریاتِ زمانہ اور تقاضا کے ساتھ ساتھ ہلتی جلتی' بدلتی بھی رہے' جامد نہ ہو' متحرک بھی ہو' اپنے مقام پہ اٹل بھی ہو'' تو وہ اسے حق کہتے تھے۔'' آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں دو متضاد صفتیں ہیں۔ اگر وہ متحرک ہے' ہلتی جلتی ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ

گر پڑے اِدھر اُدھر ہو جائے' اگر وہ اپنے مقام پہ کھڑی ہے تو وہ جامد ہو جائے۔ وہ کہتے تھے کہ ان دونوں صورتوں میں یہ حق نہیں ہے یہ جو دروازہ ہے وہ اس کو الحق کہتے تھے کہ وہ ''اپنے مقام کے اوپر ہمیشہ کھڑا ہوتا ہے اور ضرورت کے مطابق جب جی چاہے وہ بند ہو جاتا ہے' جب جی چاہے وہ کھل جاتا ہے''۔ اسے حق کہتے تھے۔ اور کتاب کے متعلق بالحق کہنا اس لیے ہے کہ اس کی اقدار' اس کے اصول' اس کی حدود' اپنے مقام کے اوپر اٹل ہیں وہ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) ہیں' انہیں کوئی وہاں سے تبدیل نہیں کر سکتا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے' اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق' آپ قوانین بناتے چلے جایئے' By Laws بناتے چلے جایئے' تشریحات کرتے چلے جایئے' وہ الحق ہے مثلاً دروازے کو ضرورت کے مطابق بند کر لیجیے' ضرورت کے مطابق کھول دیجیے' آدھا کھول لیے' پورا کھول لیے۔ یہ بند ہوتا ہے' کھلتا چلا جاتا ہے' مگر اپنے مقام پہ اٹل بھی ہے۔ جس میں یہ دو قسم کی متضاد صفتیں بیک وقت موجود ہوں' وہ لوگ اس کو دروازے سے تشبیہ دے کر اس کے لیے الحق بولتے تھے۔

مذہب اور دین کے تصورات میں بنیادی فرق ہے

یہ ہے الحق جو قرآن حکیم کا ہے' یہ تغیر پذیر نہیں ہے' یہ اپنے مقام پہ اٹل بھی ہے اور متحرک بھی ہے۔ وہ جسے ہم دروازے کی چول کہا کرتے تھے یہ جو قبضہ ہے' اگر یہ کبھی ڈھیلا ہو جائے تو مصیبت ہو جاتی ہے' اب یہ تغیر پذیر ہو گیا' اور اگر وہ جامد قبضہ ہے' اس کو زنگ لگ جائے' وہ کھلے ہی نہیں' یا بند ہی نہ ہو تو وہ دروازہ ہی نہیں رہتا' وہ دیوار ہو جاتا ہے۔ جب دروازوں کے قبضے زنگ آلود ہو جائیں کہ وہ کھلیں ہی نہیں' بند بھی نہ ہوں' اپنے مقام کے اوپر جامد ہوں تو وہ مذہب ہوتا ہے۔ ہزار سال پہلے کا بنا ہوا دروازہ آثار قدیمہ میں لے لیجیے' وہ نہ کھلتا ہے' نہ بند ہوتا ہے' کہتے جایئے کہ کیا بات ہے صاحب! کیا دروازہ بنا دیا کسی وقت کسی نے! وہ تو دروازہ ہوتا ہی نہیں' وہ تو دیوار ہوتا ہے۔ اور اگر اس کی صورت یہ ہو کہ وہ ہو ہی نہیں تو پھر تو وہ کھلا ہوا سوراخ رہ گیا' دروازہ بھی نہ رہا' یہ سیکولرازم ہے۔ الحق تو اپنے مقام پر محکم بھی ہے' اس کے اندر ثبات ہے' اور وہ زمانے کے تقاضے کے مطابق کھلتا بھی ہے' بند بھی ہوتا ہے' اس کے اندر تغیر بھی ہے۔ یہ جو Performance & Change (ثبات اور تغیر) کا امتزاج ہے یہ ہے جسے دین کہا جاتا ہے' یہ ہے کتاب کا بالحق نازل ہونا۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ حکیم کو بطورِ ضابطہء حیات عطا کرنے کا مقصد اور شرک کی وضاحت

عزیزانِ من! اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کتاب سے کیا کیا جائے' یہ کتاب کاہے کے لیے دی؟ کہا کہ بات بس اتنی سی ہے کہ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ (39:2) اس کی محکومیت اختیار کرو۔ اب یہاں یہ بتا دیا کہ اللہ کی محکومیت کا ذریعہ کیا ہے۔ یہ ذریعہ ہے اس کی کتاب۔ پیچھے سے ذکر تو کتاب کا چلا آ رہا ہے' کہا ہے کہ اس کی محکومیت اختیار کرو' یہ اسی کے قوانین ہیں جن کے لیے کہا ہے کہ ان کی اطاعت کرو۔ یہ ہے اس

کتاب سے مقصد۔ اب سوال یہ ہے کہ کس انداز سے اطاعت کرو؟ کہا کہ **مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّیۡنَ**((39:2 اطاعت کو اس کے لیے خالص 450 الزُّمَر کرتے ہوئے کرو۔ کتاب اللہ یا خدا کے قوانین واحکام کے اندر اگر آپ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین بھی شامل کرلیں گے اور ان کو الوہیّت کا درجہ دیدیں گے یعنی ان کو ابدی اور غیر متبدل تصور کرلیں گے تو وہ خدا کی اطاعت مخلصاً نہیں ہوگی' اس کے اندر شرک ہوجائے گا۔ اگر آپ اس میں خدا کو لاتے ہی نہیں ہیں بلکہ اس قانون سازی کا پورے کا پورا اختیار واقتدار انسانوں کو دیتے ہیں' تو وہ سیکولرازم ہوجائے گا۔ جس کو آپ کفر کہیں گے۔ اگر آپ یہ کچھ کریں کہ کچھ خدا کا بھی لے لیں اور کچھ انسانوں کا بنایا ہوا بھی لے لیں اور انسانوں کے بنائے ہوئے ان قوانین کو الوہیّت کا درجہ دیں یعنی ابدیت کا درجہ' غیر متبدل ہونے کا درجہ تو یہ شرک ہوگیا۔ الوہیت وابدیت اور غیر متبدل ہونے کی یہ خصوصیت صرف خدا کے قوانین کو ہے' اگر انسانوں کے قوانین کو بھی آپ نے یہ درجہ دیدیا تو یہ شرک ہوگیا' آپ نے ان کو خدا بنالیا۔

شرک کی تعریف یہ ہے کہ انسان قرآنِ حکیم کے علاوہ انسانوں کی بنائی ہوئی مختلف فقہوں کی پیروی کرے

قرآنِ حکیم نے جب شرک کا یہ کہا' اہلِ کتاب پر' یہودیوں پہ' خاص طور پر اعتراض کیا کہ تم نے اپنے احبار ورہبان کو **اندادًا من دون اللّٰہ** بنا رکھا ہے' اپنے علماء اور مشائخ کو خدا بنا رکھا ہے تو ان میں سے ایک عیسائی تھے' وہ مسلمان ہوگئے تھے' صحابیؓ تھے' انہوںؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ حضور ﷺ! میں تو خود عیسائی تھا' ابھی کل مسلمان ہوا ہوں' ہم ان کو خدا تو نہیں سمجھ کر بنا رہے تھے' ہم ان کی پرستش تو نہیں کررہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ کیا کہا ہے۔ آپ ﷺ نے کہا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ وہ جس چیز کو حلال قرار دیتے ہیں' تم اس کو حلال سمجھتے تھے جس کو وہ حرام قرار دیتے تھے تم حرام سمجھتے تھے' کہنے لگے ہاں بات تو یہی تھی' آپ ﷺ کہنے لگے کہ یہی تو خدا بنا لینا ہے۔ یہ تو صرف خدا کا اختیار ہے کہ آپ اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام' اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال سمجھیں' اگر اس کے ساتھ آپ ان کو بھی ملا لیتے ہیں تو کہا کہ اسی کو تو خدا بنانا کہتے ہیں اور یہی تو شرک ہے۔ یہ جو اس نے فرقہ بندی کو شرک کہا ہے تو اس کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں تمام فرقے الگ ہوتے ہیں۔ جب یہ جو ایک Source یا ایک ذریعہ یا ایک ضابطہ ہے ہر ایک اس کی اطاعت نہ کرے بلکہ یہ کسی اور کی کرے' یہ امام ابوحنیفہؒ (150-80ھ) کی کرے' وہ امام شافعی ؒ (204-150ھ) کی کرے' یہ امام حنبلؒ (241-164ھ) کی کرے' یہ امام بخاریؒ (256/260-194ھ) کی کرے' جب آپ نے ان کی اطاعت شروع کی تو آپ فرقے ہوئے' تو قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ شرک ہے۔ جب ایک کتاب ہو' ایک خدا ہو' ایک حاکم ہو' اسی کے قوانین مانیں گے تو تفرقہ کیسے ہوگا' ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ ایک اتھارٹی کا حکم مانتے ہیں کہ Keep to the left بائیں طرف چلو' اس میں کہیں فرقہ نہیں ہوتا ہے' سب کے سب ایک ہی سائیڈ میں چلتے ہو۔ اگر آپ اس سے سرکشی برتتے ہیں' اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو وہ تو جرم کی بات ہے۔ اگر سرکشی

برتتے ہیں کہ نہیں، یہ تو غلط ہے، ہم Keep to the right (دائیں طرف چلیں) گے، یہ ایک فرقہ بنا۔ یہ بغاوت ہوئی۔ کوئی حکومت 450 الزُّمَر بھی اس کو برداشت نہیں کرسکتی کہ آپ اس کے قانون کے بالمقابل ایک اور قانون بنالیں۔ یہ فرقہ بنتا ہے۔ ہر فرقہ کسی نہ کسی شخصیت کے قوانین کی اطاعت کرنے سے بنتا ہے، جسے فقہ کہتے ہیں، ان کو غیر متبدل قرار دینے سے، یہ درجہ الوہیت ہوگیا۔ یہ صرف خدا کے جو قوانین ہیں ان کو حق حاصل ہے کہ وہ غیر متبدل ہیں، بدل نہیں سکتے۔ جونہی کسی اور کو آپ نے وہ خصوصیت دیدی کہ جو صرف خدا کے لیے ہے تو وہ خدا کے مقابل میں **انداداً من دون اللّٰہ** ہوگئے اور یہ شرک ہوگیا۔ یہاں کہا ہے کہ یہ اطاعت **مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ** (39:2) ہے۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر، نہایت شد و مد سے اس کی اطاعت کے لیے جاؤ۔ یہاں ایک ایک لفظ غور طلب ہے: **فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ** (39:2)۔ یہ ایک رسول سے کہا ہے کہ یہ ہم نے تمہیں بات کہی ہے۔

ملتِ اسلامیہ میں احبار ورہبان کا کردار: خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہے

عزازانِ من! آگے کہا کہ الا (39:3) اس چیز کا اعلان کردو، لوگوں سے کہہ دو کہ **لِلّٰهِ الدِّيۡنُ الۡخَالِصُ** (39:3) کائنات میں تم دیکھو کہ الدین الخالص کس طرح سے جاری وساری ہے۔ کائنات کی کوئی شے کسی اور کے قانون کے تابع نہیں چلتی۔ انسانی دنیا میں بھی تم اعلان کردو کہ دینِ خالص، اطاعتِ خالص، محکومیتِ خالص قوانینِ خداوندی کی کرو۔ **وَالَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ** (39:3) ان قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر جو دوسروں کو اپنا حاکم اور مطاع بنالیتے ہیں، جن کی اطاعت کرتے ہیں، جن کی فرماں برداری کرتے ہیں، تو یہ اوروں کو اپنا کارساز و کارفرما بنانا ہے۔ اور یہ زیادہ اطاعت کا جو زور ہے، قرآنِ کریم نے جن کو احبار و رہبان کہا ہے تو اس میں علما بھی آتے ہیں اور یہ جو ہمارے ہاں پیرانِ طریقت ہیں، وہ بھی آتے ہیں۔ تو اس زمانے میں عیسائیت میں اور ایران کی مجوسیت میں یہ تصور بہت زیادہ تھا، خود یہودیوں کے اندر بھی یہ چیز تھی، ان میں علما بھی تھے اور ان کے ساتھ زیادہ تر وہ بھی تھے جنہیں ہم اپنے ہاں پیر کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ سب چیزیں وہاں سے آئی ہوئی ہیں۔ تو ان سے جب کہتے تھے کہ صاحب! آپ ان لوگوں کی پرستش کرتے ہیں، ان لوگوں کو خدا بنارہے ہیں تو وہ کہتے تھے، آج بھی کہتے ہیں کہ **مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى** (39:3) نہیں، ہم ان کی پرستش نہیں کرتے، ہم ان کی پوجا نہیں کرتے ہیں، ہم تو ان کے ذریعے خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

خدا تک پہنچنے کے لیے مرشد کے سہارے کا غیر قرآنی تصور اور قرآنی آئین کی عمل داری کی اہمیت

آپ نے دیکھا ہے آج بھی یہی کہتے ہیں کہ معرفتِ خداوندی کے لیے مرشد کا ہونا نہایت ضروری ہے، یہ خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ خدا کہتا ہے کہ جب کوئی بندہ مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں، میں تو اس کی شہ رگ سے بھی قریب ہوں، وہ کہتے ہیں

کہ نہیں!''اوتھے پوڑیاں لا کے چڑھنا پیندا اے'' (وہاں سیڑھیاں لگا کر چڑھنا پڑتا ہے)' وسیلے کے بغیر تو خدا تک پہنچ ہی نہیں سکتا اور 450 الزُّمَر یہ سارے وسیلے ہیں' ہم ان کو خدا نہیں بناتے۔ یہی وہ کہتے تھے اور یہ بھی کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! جب تصور پرستش کی جگہ اطاعت اور محکومیت کا آجائے اور ضابطہءخداوندی آپ کے پاس ہو تو پھر وسیلے کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ جو کہا ہے کہ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ (39:2) اطاعت خالص کر کے کتاب کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ کتاب سے ہی خالص اطاعت ہو سکے گی' انسان کی تو نہیں ہو سکے گی۔ کسی انسان کی بھی اطاعت آپ کریں گے تو وہ خالص خداوندی اطاعت نہیں ہوگی' اس کا نام کچھ بھی کیوں نہ رکھ لیں۔ اور جو خدا کی اطاعت ہے' یہ ذہنی چیز نہیں ہے۔ جو کتابِ خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے وہ خدا کی اطاعت ہے۔ حکومت پاکستان کی اطاعت کیا ہے؟ صرف یہ کہ تعزیراتِ پاکستان کی اطاعت' قوانینِ پاکستان کی اطاعت۔ اور حکومت کیا ہے؟ یہ کہ جس کی طرف سے یہ حکم آیا ہے یا جس نے یہ کہا ہے۔ آپ تلاش کر کے دیکھ لیجیے' صوبائی حکومت لاہور میں دیکھ لیجیے' سنٹرل وہاں جا کر دیکھ لیجیے' وہ آپ کو کہیں بیٹھی ہوئی' مائی بڈھی نظر نہیں آئے گی۔ اور اس کی طرف سے حکم آتا رہتا ہے' قوانین آتے رہتے ہیں' اس کی طرف سے سزائیں بھی ملتی رہتی ہیں۔ کس کی طرف سے یہ ملتی ہیں؟ اس کا وجود ہی کوئی نہیں ہے۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے؟ اس کے لیے قانون کی کتاب ہوتی ہے۔ حکومت کی طرف سے ایک قانون کی نافذ کردہ کتاب ہوتی ہے' ایک قانون ہوتا ہے' اس کی اطاعت کو اس حکومت کی اطاعت کہا جاتا ہے۔

اگر کتاب اللہ کی تعلیم کو نظر انداز کر دیا جائے تو پورا معاشرہ ملوکیت کی اور وسیلوں کی زد میں آجاتا ہے

خدا کی جو اطاعت ہے وہ اس کی کتاب کی اطاعت ہے۔ حکومتیں چلتی ہی اس طرح سے ہیں۔ کتاب یہ ضابطہ قانون نہ دے تو وہ تو ملوکیت کا استبداد ہوتا ہے۔ تو یہ خدا کی الکتاب کی جو اطاعت ہے' وہ ہے خدا کی اطاعت۔ جب الکتاب آپ کے پاس موجود ہے' اس کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے تو پھر اس تک پہنچنے کا وسیلہ چہ معنی دارد؟ یہ ساری Terms (اصطلاحات) آپ دیکھیے کہ کس قدر انسان کو فریب میں ڈالتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہوں۔''اوہ کیندے نیں تو اوتھے بیٹھا رہ اسی اوہنوں اوتھے لبن چلے آں' تیرا کی اے ایویں ای کہہ دینداایں'' (معاذ اللہ۔ وہ کہتے ہیں کہ تم وہیں بیٹھے رہو' ہم آپ کو وہیں تلاش کرنے چلے ہیں۔ تمہارا کیا ہے۔ یہ ایسے ہی کہہ دیتا ہے)۔ وہ کہتا ہے کہ میں اتنا قریب ہوں۔ یہاں کہا ہے کہ هُوَ مَعَكُمۡ اَيۡنَ مَا كُنۡتُمۡ (57:4) تم کہیں بھی ہو وہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ وسیلے کی تلاش کرتے ہیں' حضرت صاحب کے پاس اس لیے جاتے ہیں کہ یہ پہلے تو خود ہی مقربین بارگاہِ خداوندی ہیں اور پھر ہم ان کے وسیلے سے بھی خدا کی بارگاہ کے قریب پہنچ جائیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ ان سے جب پوچھیے تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں' ہم ان کی پرستش نہیں کرتے' ہم تو خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ڈھونڈ رہے ہیں' ان کو ہم وسیلہ بنا رہے ہیں۔ یاد رکھیے! وسیلے کا جو لفظ بھی ہے

یہ ہمارے ہاں تو وسیلہ ہے جس کو آپ کہتے ہیں ''او تھے تیکر پہنچن دا کوئی وسیلہ'' (وہاں تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ)۔ یہ نظامِ باطل ہے۔450الزُّمَرْ

ہم نے وسیلوں کے غلط تصورات کی ساری بنیاد اپنے غیر قرآنی نظریات پر کھڑی کر رکھی ہے۔

عزیزانِ من! یہ جتنے بھی باطل کے نظام ہیں، ان میں وسیلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وسیلے کے بغیر تو آپ گورنمنٹ کا پیسہ گورنمنٹ کے خزانے میں بھی داخل نہیں کرا سکتے جب تک وہ جو بیچ میں بیٹھا ہوا ہے، اس کو نہ دیں۔ یعنی ان سے لینا تو ایک طرف رہا، ان کو جو دینا ہے اس کے لیے بھی راستے میں وسیلہ ہوتا ہے، وہ اپنا ٹول ٹیکس الگ مانگتا ہے۔ اور یہ جتنے آپ خدا تک پہنچنے کے وسیلے لاتے ہیں وہ آپ سے کوئی کم ٹول ٹیکس (Toll Tax) تو نہیں لیتے۔ یہ سارے ہی غلط تصور ہیں، عزیزانِ من! جب کتابِ خداوندی کی اطاعت آئے گی تو یہ سارے تصورات بیچ میں سے چھٹ جائیں گے۔

وسیلے کے معنی درجہ، مرتبہ، عزت، ہوتے ہیں۔ وہ جو قرآن مجید میں ہے کہ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ (5:35) اس کے معنی کیے جاتے ہیں کہ صاحب! خدا نے کہا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرو، وسیلے کے یہ معنی پنجابی اور اردو کے ہیں جبکہ آیتِ قرآن مجید یہ ہے کہ تم وقار چاہو، عزت چاہو، مرتبہ چاہو، درجہ چاہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (6:132) ہر ایک کا درجہ اس کے اعمال کے مطابق ہمارے ہاں مرتب ہو جاتا ہے۔ اس وسیلے کے یہ معنی ہیں مگر یہ ہیں کہ ان سے پوچھو تو یہ کہتے ہیں کہ جی، خدا تک پہنچنے کے لیے ہم تو ان کے پاس جاتے ہیں، ہم وہاں جہاں بھی جائیں گے ان کے Through (ذریعے سے) جائیں گے۔ یہ وہی ملوکیت کا تصور ہے، بادشاہت کا تصور ہے۔ یہ جسے آپ حقیقی شہنشاہ کہتے ہیں یہی شہنشاہیت کا تصور خدا کے متعلق ہے۔ یہ بالکل وہی ہے جیسے یہاں کے حکام تک آپ کی کوئی درخواست براہِ راست نہیں پہنچ سکتی، اس کے لیے راستے میں سیڑھیاں لگی ہوتی ہیں، ان کو خدا تک پہنچنے کے لیے بھی اس قسم کے وسیلے کی سیڑھیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جن کو یہ وسیلے کہتے ہیں وہ اگر نیک نیت ہیں تو بھی قرآن مجید کہتا ہے کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ (17:57) یہ ان کو لاتے ہیں کہ ہم خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ڈھونڈ رہے ہیں، ان کے خیال میں جو بڑے سے بڑا مقرب بھی ہے ان سے بھی پوچھو تو وہ کہیں گے کہ صاحب! ہم تو خود خدا تک پہنچنے کے لیے کچھ کوشش کر رہے ہیں۔ وہ کیا کہا ہے کہ وَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ یَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ (17:57) وہ خدا کی رحمت کے خواہش مند اور متلاشی ہوتے ہیں، وہ اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں، ان کی تو اپنی کیفیت یہ ہے۔ وہ تمہارے لیے خدا تک پہنچانے کا وسیلہ کیسے بنیں۔

وسیلے کے غلط تصور کی بنا پر ہی ذہنوں میں خدا کا غلط تصور قائم ہوتا ہے

ہمارے ہاں یہ سارے تصورات آئے کہ جب ہم نے خدا کو ایک شہنشاہ، بادشاہ، آمرِ مطلق کی حیثیت سے سمجھا، پھر وہ اس کا دربار

بھی لگا' وزراء بھی ہوئے' درباری بھی ہوئے' مصاحب بھی ہوئے۔ سب سے بڑی تباہی مصاحبوں کے ہاتھوں سے آتی ہے۔ پھر ان کے ہاں' یہاں سے وہاں تک' دربان ہیں اور عرضیاں پہنچانے والے ہیں' تمام نقشہ جتنا بھی آمر اور مطلق بادشاہ کا ہوتا ہے' وہ ہم نے خدا کے تصور میں قائم کیا ہے۔ پھر اس تصور کے ماتحت سارے لوازمات ساتھ آئے۔ یہ ہے ہمارے ذہن میں خدا کا تصور۔ الکتاب کی رو سے محکومیت اختیار کرنے والوں کا' ہمارے ہاں وہ خدا کا تصور ہے ہی نہیں' قانون کا تصور ہی ہمارے ذہن سے نکل گیا ہوا ہے۔ جیسا میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ ہم اس ہزار سال کے اندر ملوکیت کے بہت زیادہ خوگر ہو گئے تھے۔ 450 الزُّمَر

حکم اور قانون میں فرق' مروجہ تصور خدا اور قوانینِ خداوندی میں فرق اور اس کے اثرات

عزیزانِ من! ملوکیت میں قانون نہیں ہوتا' حکم ہوتا ہے۔ ہم احکامِ خداوندی کو تو سمجھتے ہیں لیکن قوانینِ خداوندی ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ جونہی کسی حکم کے متعلق کہا کہ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (6:34) تو وہ قانون بن گیا۔ اور ہوتا کیا ہے؟ حکم کے متعلق یقین نہیں ہوتا کہ اب یہ حکم دیا ہے' اس کے بعد پتہ نہیں اور کیا حکم دیدیں۔ یہ روز ہوتا ہے جو آپ ملازم کو صبح سے شام تک حکم دیتے ہیں۔ جب کوئی ایک حکم جو ہے' وہ غیر متبدل ہو جائے تو اُسے قانون کہتے ہیں لیکن قانون کے اتباع میں پھر وہ خدا نہیں رہتا جو ہمارے ذہنوں میں ہے ''کہ او تھے کی پرواہ میاں! او تھے بے پرواہیاں۔ او بے پرواہیاں والا خدا فیر نہیں رہندا کہ پھڑ لے عملاں والیاں نوں' چھڈ دے او گنہگارنوں' اے ہے نا تہاڈا خدا'' (میاں! وہاں کوئی پرواہ نہیں' وہاں تو بے پرواہیاں ہیں۔ وہ پھر بے پرواہیاں والا خدا نہیں رہتا کہ باعمل کو پکڑ کر حوالۂ دار و رسن کر دے اور گناہگار کو معاف کر دے۔ وہاں تو یہ ہے آپ کا خدا)۔ لیکن جب خدا ایک قانون بنا دے' ضابطہء قانون نازل کر دے' اُسے غیر متبدل کہہ دے' کہے کہ میں بھی اس میں تبدیلی نہیں کروں گا اور الحی قیوم ہو تو اس میں یہ بھی نہیں ہے کہ اشرف صاحب تو یہ نہیں کریں گے' ان کے بعد جو ان کا Successor (جانشین) ہوگا' وہ اس کو پکڑ کر رکھ لے گا۔ کیسا ہی قانون ہو' اگر اس میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے' اس کا امکان ہے' وہ نہ کرے' اس کا Successor (جانشین) کرے۔ آج دنیا کے اندر آپ دیکھیے' ساری دنیا جو تھی وہ امریکہ کے صدر کے انتخاب کا فیصلہ سننے کے لیے گوش بر ریڈیو بیٹھی ہوئی تھی' ساری دنیا کے اندر یہ دیکھنے کے لیے لرزش اور لغزش آ رہی تھی کہ ان دونوں میں سے کون اس کے بعد صدر ہوتا ہے۔ پتہ نہیں پالیسی میں کیا کیا Changes (تبدیلیاں) ہو جائیں۔ اس کے بعد آپ رات کو بی بی سی میں سنیئے' مختلف حکومتوں کی طرف سے' امریکہ کے صدر کے بدلنے کا جو ردِ عمل ہے' وہ آ رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ جو پہلے کے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط تھے وہ قابلِ تغیر و تبدل تھے کہ نیا آ کر پتہ نہیں کیا کر دے۔ خدا وہ ہے جس نے بدلنا نہیں' مرنا نہیں' جس کو ابدیت ہے' اس نے اپنے سارے احکام کو منضبط کر کے' آپ کو کتاب کی شکل میں دیا اور کہہ دیا کہ ان میں

ہم بھی تبدیلی نہیں کریں گے۔ ''لاتبدیل'' بھی کہا اور لا مبدل بھی کہا' تبدیلی نہیں ہوگی' کوئی ان کو تبدیل نہیں کر سکے گا۔ اس لیے کہ ختمِ 450 الزُّمَر نبوت کے بعد تبدیلی کا جو ایک ذریعہ تھا کہ کوئی اور نبی آ جائے' خدا ہی دوسرے احکام لے آئے' وہ بھی اس نے ختم کر دیا۔ عزیزانِ من! اپنے آپ پہ اتنی بڑی پابندی تو دنیا میں کوئی بھی نہیں لگائے گا کہ وہ قانون کی تبدیلی کا سلسلہ ہی ختم کر دیا۔ کیا بات ہے! یہ ہے تصور جو اس نے حکومت کا دیا ہے۔ دنیا کو اس قدر امن ہو جائے' اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ ہیں وہ قواعد اور قوانین اور اصول اور اقدار جو مستقل ہیں' ان میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی تو آپ کو کتنا اطمینان ہے! اور اگر یہ صورت ہو کہ پتہ نہیں جو موجود ہے' یہی مزاج شاہاں ہے' کس وقت اپنے پہلے حکم کو بدل دے' یہ نہ بدلے' اس کا Successor (جانشین) آ کر بدل دے' حکومت کا تختہ الٹ جائے۔ یہ ہے فرق حکومتِ خداوندی اور انسانی حکومت میں۔ یہ انسانیت مار کھا کھا کر' ٹھوکریں کھا کھا کر' اس طرف آئے گی' سکون و اطمینان انسان کو نصیب ہی اس وقت ہوگا جب اس کو پتہ ہو کہ یہ ہے قانون اور یہ بدلا نہیں جائے گا۔

انسانی دنیا میں خدا کو اپنی بات سنانے کے لیے کسی حضرت صاحب کی ضرورت نہیں ہوتی' وہ خود سن کر جواب دیتا ہے

کہا ہے کہ جنہیں یہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان کو قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لیے اپنا وسیلہ بناتے ہیں تو اُس نے کہا کہ میں تو تمہارے اتنا قریب ہوں کہ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186 جب بھی کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں براہِ راست اس کی پکار سنتا ہوں مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں وہ ان کے Through (ذریعے) ہی جاتے ہیں: حضرت صاحب میرے لیے دعا کرنا۔ ارے بھئی! تیرا خدا کہاں چلا گیا جو تیری نہیں سنتا؟ کہ جی! وہ اپنے مقرب بندوں کی زیادہ سنتا ہے۔ وہی جو یہاں کا حکم ہوتا ہے' عرضی بعد میں مرتب ہوتی ہے' سفارشی پہلے ڈھونڈا جاتا ہے کہ صاحب! ''اوہدے تیکر کوئی پہنچن والا ڈھونڈ لیا ہیگا ای'' (اس تک رسائی رکھنے والا کوئی تلاش کر لیا ہے)۔ وہی تصور خدا کے متعلق ہمارا آیا ہوا ہے۔ جسے ہماری درخواست کہتے ہیں کہ ''جی دعا اوہدے کولوں کراؤ جا کے'' (جی! اس سے دعا کراؤ) وہ بندے کی براہِ راست دعا نہیں سنتا۔ وہ کہتا ہے کہ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَان (2:186۔ کہا کہ یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو ان کے ذہنوں میں' انسانوں نے' جو خود ساختہ تصورات بنا لیے ہیں' ڈالی ہیں حالانکہ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ فِیْ مَا ھُمْ فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ (39:3۔ کہا کہ ان چیزوں کا فیصلہ ہو جائے گا' براہِ راست قرآن کریم کی طرف آ جاؤ گے تو ایک دن میں فیصلہ ہو جائے گا' نہ آؤ گے تو عقل کا جو Trial & Error (سعی وخطا) کا تجرباتی طریقہ ہے' اس کی رو سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے جاؤ گے' وقت تو لگ جائے گا' ایک دن وہاں آ جاؤ گے جہاں قرآن کریم کہتا ہے۔ تو اطاعت اور محکومیت کسی انسان کی نہیں' غیر متبدل قوانین کی ہے۔ چھان پھٹک کر' دیکھ بھال کر' پرکھ کر' دیکھ لو کہ یہ ہیں اور اس کے بعد انہیں تسلیم کر لو اور اس کے بعد پھر راوی چین لکھتا

ہے: اطمینان کی نیند سو جاؤ' ان کی اطاعت کرتے رہو' کوئی کسی قسم کی گرفت نہیں اگر تم خلاف ورزی نہیں کرتے۔ وہ اپنے آپ کو اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ)(6:163) کہتا ہے' یہ سربراہِ مملکت ہی نہیں' نبی اکرم ﷺ جو مقامِ نبوت پہ بھی ہیں' وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ اگر میں بھی ان کی خلاف ورزی کرونگا تو میں بھی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ یہ ہے قانون۔

کتاب اللہ کے ساتھ ہونے والا سلوک

وہ کیا ہے جس چیز کا فیصلہ ہوگا؟ کہا کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ)(39:3) ان کو ہدایت نہیں ملتی' جو جھوٹ بولتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ خدا کی بات نہیں ہے۔ اب ایک تو یہ بات ہے کہ یہاں لفظ کفار ہے' اور کفر کے معنی حقیقت کے اوپر پردہ ڈالنے والا ہوتا ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ خدا کے قوانین کیا ہیں' جن پہ یہ پردے ڈالے ہوئے ہیں؟ وہ خدا کی محفوظ کتاب ہے' آخر یہ اس کو کیا کریں گے' یہ اس میں تبدیلی تو نہیں کر سکتے۔ انہوں نے ایک عقیدہ ناسخ ومنسوخ کا بنایا ہے کہ اس میں سے پانچ سو آیتیں منسوخ ہیں۔ جبکہ خدا نے یہ نہیں کہا بلکہ انہوں نے خود یہ فیصلہ کر لیا۔ لیکن آخر وہ بات بھی چھوٹ چھٹا گئی۔ کتاب تو موجود ہے مگر آپ نے دیکھا کہ اس کو کیسے چھپایا ہے کہ ناظرہ پڑھتے رہو' معنی کی طرف نہ جاؤ' آؤ بھی معنی کی طرف تو ترجمے یا تفسیریں دی ہوئی ہیں' صرف ان تک رہو' اس کا مقصد صرف ثواب حاصل کرنا ہے۔ اطاعت ومحکومیت انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی ہے' ہزار برس پہلے کے بنائے ہوئے قوانین کی یا آج کے انسانوں کے قوانین کی ہے۔ دیکھا! کیا یہ کتاب کے اوپر جھوٹ نہیں بولتے؟ کیا یہ نہیں کہتے کہ ہم اس کتاب کو مانتے نہیں کہ یہ خدا کی ہے؟ تو پھر اس کے اوپر کیا پردہ ڈالا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ)(39:3) انہیں ہدایت نہیں مل سکتی' یہ صحیح راستے پہ آ نہیں سکتے۔ کہتا ہے کہ خدا تک پہنچانے کے لیے راستے میں مقربینِ بارگاہ خداوندی بنا لیے ہیں۔

خدا تعالیٰ کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ اور قرآنِ حکیم کا ارشاد

کہا کہ سب سے زیادہ ان عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو مقربِ بارگاہِ خداوندی بنا رکھا ہے' کہیں کہتے ہیں کہ وہ تین میں ایک یہ خدا ہے' کہیں اس کو ابن اللہ کہتے ہیں۔ کہا کہ ان سے بھی پوچھو کہ وہ خدا کا بیٹا کیوں مانتے ہیں؟ یہ کہتے ہیں کہ اسی لیے مانتے ہیں کہ انسان اپنے بیٹے کی بات بہت جلدی مانتا ہے۔ اور چہیتا بیٹا' اکلوتا بیٹا کہ ''جیہدی ماں وی بیچارے دی نہیں ہیگی' مر گئی ہوئی ہیگی اے'' (جس بے چارے کی ماں بھی نہیں ہے' کہتے ہیں کہ وہ مر گئی ہے)۔ تو اس لیے انہوں نے جو کفارہ کا عقیدہ بنایا ہے' وہ ابن اللہ کی بات سے بنایا ہے۔ پہلے اس کو خدا کا چہیتا بیٹا بنایا' اس چہیتے بیٹے کو پھانسی پہ چڑھایا' پھر اس کا جو خون بہا تھا' وہ خون بہا انسانوں کے گناہوں کے کفارے کی شکل میں تھا کہ انہوں نے ہمارے گناہوں کا کفارہ دیدیا ہے اس لیے ان کو یہ مقرب بنایا اور اس سے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ

ہمارے گناہوں کا کفارہ مل گیا۔ کہا ہے کہ لَوْ اَرَادَ اللّٰہُ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰی مِمَّا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ)(39:4۔ اس کتاب کا عجیب 450 الزُّمَر
انداز ہے۔ جہاں کہیں کسی کی طرف سے تھوڑی سی شگفتگی' تھوڑا سا طنز آتا ہے' یہاں بھی یہ ذرا نازک سا طنز اس کے اندر آیا ہے' وہ اس میں جواب دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ ؑ کو اپنا بیٹا بنالیا' کہا کہ ذرا سوچو تو سہی کہ اگر ہم نے کسی کو بیٹا بنانا ہوتا تو یہ تکلیف و تکلف ہی کیوں کرتے؟ کہ ایک بیچاری کنواری لڑکی' پہلے اس کو حمل ٹھہرایا جائے' تو پہلی چیز تو یہی سوچو کہ ایک جوان کنواری جس کی شادی نہیں ہوئی' اس لڑکی کو جو حمل ٹھہر جائے تو کہا کہ پوچھو اس بیچاری کی حالت کیا ہوگی۔ یہ تو آج تم نے عقیدہ بنالیا کہ وہ خدا کا بیٹا تھا' وہ کیسے ثابت کرے گی کہ یہ خدا کا بیٹا ہے۔ اور دوسری جگہ خدا نے خود کہہ دیا کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کا بیٹا ہے۔ کہا کہ ان سے پوچھو کہ ہماری کونسی بیوی تھی' جس کا پھر یہ بیٹا ہوا ہے' کبھی بیویوں کے بغیر بھی بیٹا ہوا کرتا ہے؟ یاد رہے! یہ حضرت مریم کو خدا کی بیوی نہیں کہتے' یہ عجیب چیز ہے۔ کہا کہ ذرا پوچھو ان لوگوں سے کہ یہ اس طرح سے جو ناک کو ہاتھ لگانے والی بات' ہماری طرف منسوب کر رہے ہیں کہ ایک عورت کے بطن سے ہم اپنا بیٹا' ایک لڑکا پیدا کریں' اس کے لیے مصیبت یہ کہ ثابت نہ کر سکے' ان کی کیفیت یہ کہ وہ اُس کو ہماری بیوی نہ بنائیں۔ تو کہا کہ اگر ہم نے کچھ بیٹا ہی بنانا ہوتا تو جو کائنات کو ہم عدم سے وجود میں لے آئے ہیں' ان میں سے ایک کا کا ''ساہڈے کولوں نئیں سی بنایا جاندا' ایہدے لئی ساہنوں پاپڑ ویلنے پینڑے سن'' (ہم سے ایک لڑکا نہیں بنایا جا سکتا تھا کہ جس کے لیے ہمیں پاپڑ بیلنے پڑتے)۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ جو ہم نے اپنا بیٹا بنالیا' مگر اس بیچاری کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے' یہ کوئی نہیں سوچتا۔ یہاں ایک ہی لفظ سُبْحٰنَهٗ)(39:4 ہے کہ وہ ان تمام خرافات سے بلند ہے' دور ہے' ان سے ماوراء ہے۔ تم اس لیے ان کے مقربین اور وزراء اور مصاحبین بناتے ہو اور اس کے بیٹے بناتے ہو کہ یہ اس کے لیے باعثِ تقویت بنے۔ یہ اسی لیے بناتے ہیں کہ بیٹا ہے' باپ کی تقویت کا موجب بنتا ہے' یہ سارے اس کے مصاحب' جتنے بھی ہیں' ان سے مل کر حکومت قائم ہوتی ہے۔ کہا کہ سُبْحٰنَهٗ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ)(39:4۔ آہاہا! واحد کا لفظ کہاں آیا ہے! وہ اکیلا ہی اتنی قوتوں کا مالک ہے کہ کائنات میں کوئی اس کی سرتابی نہیں کر سکتا۔ یہ وزیر اور مصاحب اور صاحبِ اقتدار اور اس تک پہنچانے والے مقربین' یہ اس کے بیٹے' سُبْحٰنَهٗ ((39:4 وہ ان تصورات سے دور' بہت دور ہے۔ وہ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ((13:16;39:4 ہے۔

لفظ قہار کا لغوی مفہوم یعنی گرفت کرنے کی قوتِ نافذہ رکھنے والا اور مجرم اقوام کا حشر

اب یہاں ((13:16;39:4 میں لفظ قہار آ گیا۔ ہمارے ہاں لفظ قہر ہے اور قہر سے ہی یہ مبالغے کا صیغہ قہار ہے' قاہر بھی وہ ہوتا ہے جو قہر والا ہو اور اس کے بعد عربی زبان کے اندر یہ وہ صیغہ ہے جس کو Superlative (تفصیلِ کُل) کہتے ہیں۔ قہر کے معنی غلبہ اور

قوت کے ہی ہوتے ہیں۔اس نے العزیز کہا' قانون کے پیچھے اگر قوتِ نافذہ نہ ہو کہ جو قانون شکنی کرے اس کی گرفت ہو سکے' وہ قانون 450 الزُّمَر قانون نہیں ہوتا' وعظ ہوتا ہے۔مگر یہ ہیں کہ کہتے چلے جارہے ہیں۔قرآن حکیم میں یہ ہے کہ مومن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔اس لیے حکومتِ خداوندی یعنی قرآنی حکومت کے متعلق کہا ہے کہ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (22:41)انہیں حکومت دیں گے تو یہ امر بالمعروف کریں گے۔امر کے معنی قانون کے ذریعے روکنا ہے' جن چیزوں کو قرآن حکیم نے جائز قرار دیا ہے وہ ان کا حکم دیں گے' جن کو اس نے ناجائز قرار دیا ہے ان سے روکیں گے۔یہ ہمارے ہاں جتنے مولوی صاحبان واعظ ہیں' یہ سب اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ وہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔یہ کیسے کر رہے ہیں؟ کہتے ہیں کہ وعظ کر رہے ہیں''او بابا خدا واسطے' میں سو واری تہانوں دسیا ہیگا اے' ایس طراں نہ کریا کرو' نہیں کردے تے جاؤ تسی اپنی قبر اچ پینا اے''او بابا! خدا کے واسطے سنو! میں نے تمہیں سو بار کہا ہے کہ اس طرح نہ کیا کرو۔اگر نہیں کرتے تو جاؤ! تمہیں اپنی قبر میں جانا ہے (اور مجھے اپنی میں)۔چلو جی فریضہء امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو رہا ہے جی۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

یاد رکھو! اگر کسی قانون کے اندر Penalty Clause (فوجداری شق) نہ ہو تو وہ قانون نہیں ہوتا۔ اور Penalty Clause (فوجداری شق) کو نافذ کرنے والی قوت اگر پیچھے نہ ہو تو پھر وہ قانون نہیں رہتا۔یہ جس کو آپ قوتِ نافذہ کہتے ہیں' ایک حکم کو دیکھنا کہ اس کی تعمیل ہو رہی ہے' یہ ہے وہ قوت جسے ''قہر'' کہتے ہیں کہ جو اس سے سرتابی برتے' پھر وہ اس سرتابی برتنے والے کی گردن کو مروڑ سکے' کلائی کو مروڑ سکے' اس کو قانون کے سامنے جھکا سکے۔یہ ہے قانون' یہ ہے وہ قہر جس سے خدا کو ''قہار'' کہا جاتا ہے اور یہ ہوتا ہے اس کا قانون شکن کے خلاف غلبہ تسلط اقتدار۔قانون کا اتباع کرنے والوں کے لیے تو کہتا ہے کہ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (2:38)ان کو کسی قسم کا ڈر ہی نہیں ہوگا۔یہ ہوتا ہے قانون شکن کے لیے' اور یہ ضروری چیز ہے' اگر مجرمین کو ان کے جرم پر گرفت کرنے والی کوئی قوت نہ ہو تو پھر اسے Lawlessness (لاقانونیت' بدامنی) کہتے ہیں' یہ پھر جو اس معاشرے کے اندر شریف انسان ہیں ان پر زندگی گزارنے کے لیے سانس لینا بھی اجیرن ہو جاتا ہے۔یہ گرفت کرنے والی قوت مجرم اور ظالم کی کلائی مروڑنے' انہیں گرفت میں رکھنے' ان مظلوموں کی دعائیں لینے کے لیے ہو۔کیا بات ہے قرآنِ کریم نے کس انداز میں بیان کیا ہے! ذکر چلا آ رہا ہے ان اقوام کا کہ انہوں نے یہ سرکشی برتی' انہوں نے یہ جرم برتا' انہوں نے یہ خلاف ورزی کی' ہم نے وارننگ دی' تنذیر دی' آگاہ کیا' بتاتے رہے او تباہ ہو جاؤ گے' او ختم ہو جاؤ گے وہ بالکل نہ مانے' جب نوبت یہاں انتہا تک پہنچ گئی تو کہا کہ فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا (6:45)وہ قوم جو ظلم پہ اتری ہوئی تھی ہم نے اس کی جڑ کاٹ دی۔اندازہ لگائیے! کہا ہے کہ پھر ہم نے ان کی جڑ کاٹ دی۔

ظلم کے خاتمے پر مظلوم کی زبان پر آنے والے بے ساختہ الفاظ: ''الحمدللہ'': وہ واحد کافی ہے 450الزُّمَر

اور کہا کہ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ)(6:45 کیا مقامِ حمدیت ہے' ظالم کی جڑ کٹ جائے تو مظلوم کی زبان سے بے ساختہ نکلتا ہے: الحمدللہ۔ واہ واہ واہ! خدا اپنے لیے نہیں کہہ رہا کہ تم میرے متعلق کہو کہ تُو بہت بڑا بادشاہ ہے' کہا کہ ہم نے ظالم کی جڑ کاٹ دی اور مظلوموں کی زبان سے بیک وقت بے ساختہ نکلا کہ الحمدللہ۔ یہ ہے اس کی قہاریت کہ ظالم کی جڑ کاٹ دی۔ اقبالؒ (1938-1877ء) نے جو بندۂ مومن کو کہا ہے کہ وہ خدا کی صفات کو علیٰ حد بشریّت اپنے اندر رکھتا ہے کہ

قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق ❶

یہ یہی بات ہے جو میں نے ابھی ابھی عرض کی ہے۔ تو یہ قہر کے معنی یہاں آ گئے۔

قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

ظالم' جابر اور مستبد کے لیے اس کی آہنی گرفت ہے۔ وہ جو اللہ کے بندے' شریف انسان بستے ہیں' ان کے حق میں یہ شفقت ہے۔ یہ ہے وہ چیز کہ جس کو ''قہار'' کہا گیا ہے۔ اور پھر الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ((39:4; 13:16 کہا ہے کہ کیا وہ واحد کافی نہیں ہے اس لیے کہ جس کی کیفیت یہ ہے کہ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ)(39:5 سلسلہ کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔

کائنات میں پایا جانے والا ہر قانون غیر متبدل بھی ہے اور متحرک بھی۔ یہ ہے ہمارا الحق

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ حق کے اندر یہ چیز ہے کہ وہ اپنے مقام پر ثابت بھی ہو' Establish (قائم) بھی ہو اور پھر اس میں ساتھ کے ساتھ اس قدر تغیر بھی آتا چلا جائے کہ وہ جامد نہ کھڑا ہو۔ اب یہ دیکھیے جو کہا کہ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ)(39:5 آپ دیکھیے گا کہ اس کا ہر قانون جو کائنات میں چل رہا ہے وہ تو غیر متبدل ہے اور تغیر کی صورت یہ ہے کہ اگر یہ قیامت تک کے لیے' دن ہی دن رہتا' کبھی رات نہ آتی تو آپ سو ہی نہ سکتے۔ یہ موسموں کی' ہواؤں کی' پانیوں کی' جو تبدیلیاں ہیں' یہ نہ ہوتیں تو کتنا جامد ہوتا۔ انسان بور ہو جاتا۔ لہٰذا اگر اس کے اندر یہ تغیر نہ ہوتا تو یہ تخلیقِ کائنات کا سلسلہ ہی نہ چل سکتا۔ یہ الحق ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ قانونِ فطرت اپنے مقام پر تو غیر متبدل ہے لیکن اس کے اندر آپ دیکھتے ہیں کہ تبدیلیاں اور تغیرات کیسے آتے چلے جاتے ہیں۔

دن اور رات کا اختلاف آپ دیکھیے' قرآن حمید نے بار بار اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دیکھیے کہ قانون کتنا محکم ہے' سورج کبھی بھی کسی دن یہ نہیں کہتا کہ صاحب! رات میں جاگتا رہا ہوں' آج تھوڑا سا اور سو لینے دیجیے۔ سورج کسی ایک دن بھی ایک منٹ کے

---

❶ اُس کی نفرت بھی عمیق' اُس کی محبت بھی عمیق قہر بھی اُس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

[اقبالؒ: ضربِ کلیم (مردِ بزرگ)]

کروڑویں لمحے کے لیے ایسا کہہ دے تو یہ سارا سلسلہء کائنات تہس نہس ہوجائے۔ یہ جو تغیر ہے' یہ نہایت ضروری ہے۔ کہا ہے کہ 450 خلق الزُّمَرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ((39:5۔ الحق میں نے کہا تھا کہ اپنے مقام کے اوپر محکم ہو اور اس میں تغیر واقعہ ہونے والی چیز ہو۔ سنیے! اگلے لفظوں میں کیا بات کہی۔ بات تو اختلافِ لیل ونہار کی تھی کیونکہ یہ وہ مثال ہے جو ہر ایک کے سامنے ہے' ہم روز اس تغیر کو دیکھتے ہیں۔ لفظ ہیں کہ یُکَوِّرُ الَّیۡلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیۡلِ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ)(39:5۔ اب تو ہمارے ہاں پگڑی ہوتی ہی نہیں' پہلے پگڑی گئی تھی' ٹوپی آئی تھی' پھر وہ ٹوپی گئی تو ٹنڈ ہی آ گئی:

رہا کھٹکا نہ چوری کا' دعا دیتا ہوں راہزن کو

لیکن جو پگڑی تھی' قرآن مجید دن اور رات کی گردش کو یہ مثال دے رہا ہے' اس زمانے کے چودہ سو سال پہلے کے بدوؤں کو سمجھا رہا ہے۔ تو یہ چیز ہے جو گردش کے اندر رہتے ہوئے کیسے تبدیلی ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہا ہے کہ دن' رات کے سر پہ پگڑی لپیٹتا ہے' رات دن کے سر پہ پگڑی لپیٹتی ہے۔ اور کیا بات ہے! گردش کا تصور اور اس میں ایک ایسی چیز کہ وہ اپنے مقام پہ بھی کھڑا ہے' سر اور پگڑی کا لپیٹ بھی اس کے گرد آ رہا ہے۔ کہا ہے کہ دیکھتے نہیں ہو ہمارا الحق' کائنات کے سلسلے کے قوانینِ اٹل' تغیرات کی یہ کیفیت جیسے دن رات کے سر پہ پگڑی لپیٹتا ہے اور رات دن کے سر پہ پگڑی لپیٹتی ہے۔ یہ محکم بھی ہیں اور متحرک بھی۔

اس قدر محیر العقول سلسلہء کائنات بھی ایک مدتِ متعین کے لیے ہی ہے

کہا ہے کہ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ((39:5۔ یہ ہوتا کیسے ہے؟ کہتا ہے کہ یہی چاند اور سورج کو ہم نے اس طرح سے قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے کہ وہ پگڑیاں لپیٹتے رہتے ہیں۔ اور کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ((39:5۔ اب یہاں قرآن کریم آ گیا۔ اتنی سی بات تو ہر سائنٹسٹ بھی کہے گا جو پہلے کہی ہے۔ ان میں سے ہر ایک یَجۡرِیۡ ((39:5 چلا جا رہا ہے۔ کیا یہ ہمیشہ کے لیے ہوگا؟ اس قسم کی ابدیت تو خدا ہی کے لیے ہے۔ کہا کہ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ((39:5 یہ ایک مدت کے لیے ہے جو قانون کی رو سے مقرر کر دی گئی ہے' یہ سلسلہء کائنات ابدی نہیں رہ سکتا' اختتام پذیر ہوگا۔ قانون کے تابع چلے گا' قانون کے تابع ہی اس میں اضمحلال واقع ہوگا۔ عزیزانِ من! ابھی سے سائنٹسٹوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ سورج کے اندر سے یہ حرارت جس مقدار سے خارج ہو رہی ہے تو نظر آتا ہے کہ ایک دن اس کے اندر سے حرارت ختم ہو جائے گی اور جونہی وہ حرارت ختم ہی نہیں وہ کہتے ہیں کہ اس درجے سے اگر کم ہوئی تو سارے کرّے ٹکرا جائیں گے۔ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی((39:5 ہے۔ کہا کہ اَلَا هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفَّارُ ((39:5۔ یہاں غفار کہا ہے۔ کہا ہے کہ یہ سارا کچھ تم سوچتے نہیں ہو کہ یہ سورج اس ہمارے کرۂ ارض سے کم از کم ۱۳ لاکھ گنا بڑا ہے اور پھر علم الافلاک والے بتا رہے ہیں کہ یہ کائنات نظامِ شمسی پورا' سورج بمع اپنے Climax کے تو صحرا میں ریت کے ایک ذرے کے برابر ہے۔

غور وفکر کرنے والوں کے لیے خدائے علیم وخبیر کی غفاریت کی ایک مثال

450الزُّمَر

کہا کہ اس اتنے عظیم الجثہ کائنات کے نظام کو جو چلانے والا ہے' عزیز تو وہ ہے لیکن اس کا یہ غلبہ اور تسلط کاہے کے لیے ہے؟ کہا ہے کہ یہ ''غفار'' کے لیے ہے تاکہ تمہیں حفاظت مل جائے۔یعنی اگر اوپر سے ذرا سی قانون شکنی ہو تو پوچھو نہیں کہ وہ سورج کتنی زمینوں کو لے ڈوبے۔یہ چھوٹا سا تارا جو ٹوٹتا ہے' جسے آپ دم دار تارا کہتے ہیں' یہ ان کرّوں میں سے کسی وقت وہ چھوٹے چھوٹے کچھ ذرے ٹوٹ جاتے ہیں' وہ فضا میں آتے ہیں۔خدا کی غفاریت دیکھیے' اُس نے ہمارے اس Atmosphere سے محفوظ کہا ہے' کیا بات ہے قرآن مجید کی' عزیزانِ من! وہ کیا کیا کچھ نہیں کہہ گیا۔وہ فرانس کے ڈاکٹر مورس بکائے (1989-1911ء) سے پوچھیے' وجد میں آجاتا ہے جب ان چیزوں پہ آتا ہے۔یہ جو Atmosphere (فضا) ہے' یہ وہ جو اوپر سے جب یہ ٹوٹتے ہیں' یوں نظر آتے ہیں کہ وہ چھوٹی سی دھاری ہے لیکن وہ کروڑوں من کے ہوتے ہیں' ان میں سے اگر کوئی ایک بھی سیدھا یہاں آ گرے تو آپ پوچھیے نہیں کہ کیا ہو۔یہاں سے وہاں تک' درمیان میں' یہ کتنے میلوں کا Atmosphere (فضا) بنایا ہے' اس کو سقفِ محفوظ کہا ہے یعنی وہ چھت جو تمہاری حفاظت کرتی ہے۔ وہ جب اس کے اندر آتے ہیں تو اس کے اندر سائنس کا ایک قانون ہے کہ اس گردش کے اندر وہ پستے ہی اس طرح سے ہیں کہ وہ ریت کے ذرے کے درجے سے بھی کم ہو جاتے ہیں۔اب یہ وہ ذرے ہیں جن کی وجہ سے سورج کی روشنی آپ تک آتی ہے' روشنی براہِ راست کسی چیز تک آ ہی نہیں سکتی' وہ کسی چیز کو چمکاتی ہے تو وہ پھر آگے آتی ہے۔یہ ہیں اتنے اتنے بڑے کرّوں کے ٹکڑے جو ٹوٹتے ہیں۔کہا کہ یہ جو ہم نے ان کو اپنے قانون کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے' وہ جو ہمارا غلبہ ہے' وہ غفاریت کے لیے ہے کہ تم محفوظ رہو۔اور دیکھو! ہمارے ہاں جب یہ بخشنے والا اس کا ترجمہ کیا تو وہ اَن جوڑ چیز آجاتی ہے کہ چانداور ستاروں کو اس لیے مسخر کیا تا کہ وہ تمہیں بخش دے۔یہ غفار کا صحیح ترجمہ اور تصور نہیں ہے۔

انسانی زندگی کی ابتدا کا معاملہ

اب آیا پھر وہ انسانوں کی دنیا کی طرف۔کہا کہ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (39:6) یہ چیز یعنی انسان کی تخلیق' اس سے پہلے بڑی تفصیل سے آچکی ہے' اب راستے میں تو یہ قرآن حکیم بھی ان کی طرف اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے' اگر میں بھی پھر تفصیل میں جاؤں گا تو وہ جو درس ہے' اسی محور کے گرد گھومتا چلا جائے گا' ہم آگے نہیں بڑھ سکیں گے اس لیے ہر بار اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔یہ جو آج سائنس کا منتہا ہے کہ زندگی کی ابتدا ایک لائف سیل سے' جرثومہ ءحیات سے' جو واحد تھا' ہوئی ہے' اُسے قرآن حکیم نے نفس کہا ہے۔ہم اس کو کیا سمجھ سکتے تھے' ان سائنٹسٹ نے ہمیں سمجھایا ہے کہ اُسی میں سے تم جوڑا بنے۔تو وہ جو سنگل لائف سیل ہے' وہ

یوں کہیے کہ جوشِ نمود سے پھٹتا ہے تو اس میں سے جو دو ٹکڑے ہوتے ہیں' میں عام الفاظ میں بات کر رہا ہوں' سائنس کی تو بات ہی اور ہے 450 الزُّمَر ان میں سے ایک جو ہوتا ہے' وہ ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ وہ مؤنث ہوتا ہے' ایک مذکر ہو جاتا ہے' وہ ایک دوسرے کا جوڑا ہو جاتا ہے اور پھر سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ پہلا وہ نفسِ واحدہ ہے' پھر اس میں اس کا یہ جوڑا ہے۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں چودہ سو سال کے بعد سائنس کے انکشافات اور ہماری کم فہمی

اب سائنس کی آنکھوں دیکھی بات ہو رہی ہے۔ وہ جو میں نے کہا ہے کہ موریس بکائے (1989-1911ء) ہے وہ ان آیات کے اوپر آ کر وجد میں آیا ہے کہ قرآن حکیم یہ کیا چیز چودہ سو سال پیشتر کہہ گیا ہے۔ یہ بات اس سے پیشتر ہماری سمجھ میں بھی نہیں آ سکتی تھی لیکن ہم نے کیا کیا' بجائے اس کے کہ کہیں کہ صاحب! یہ بات ابھی سمجھ میں نہیں آتی' ہم نے تورات کے افسانے لیے اور وہ یہ کہ نفسِ واحد تو ہو گیا بابا آدمؑ افسانے کا یہ سلسلہ وہاں تورات سے ہی چلا ہے۔ یعنی یہ انسانی ذہن کے لیے مشکل تھا کہ وہ یہ کہتا۔ آج تو ہمیں پتہ ہے کہ عورت اور مرد کے باہمی جنسی اختلاط سے آگے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے' پہلا انسان کیسے پیدا ہو گیا کہ جب نہ پہلے کوئی مرد تھا نہ عورت تھی۔ تو اس کو کسی طرح سے انہوں نے مٹی کا ایک پتلا بنانا تھا' یہ ذہن انسانی کا تراشیدہ ہے اور اس میں غصہ ہونے کی بات نہیں ہے' ہم آپ بھی اس دور کے اندر ہوتے کہ جب ابھی سائنس نے یہ ترقی نہیں کی تھی تو ہم بھی خیر یہی کچھ مانتے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ لوگ اپنی ان حقیقتوں کو ابدی حقائق سمجھ رہے ہیں کہ جو قابلِ تغیر و تبدل نہیں ہیں' بس یہ غلطی ہے ورنہ جو حقائق ہیں وہ تو جوں جوں انسان کا علم اوپر بڑھتا جائے گا قرآن حکیم میں مضمر حقائق پر سے پردے اٹھتے چلے جائیں گے۔ قرآن کریم نے خود کہا ہے کہ ہم انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں بے نقاب کرتے چلے جائیں گے' ہر نشانی کے بے نقاب ہونے پہ یہ حقیقت تمہارے سامنے آئے گی کہ انہ الحق قرآن کریم نے واقعی سچ کہا تھا۔ تو اس طرح سے ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی اور پھر یہ انسان کی ابتدا نہیں' یہ زندگی کی ابتدا ہے۔ یہ مختلف ادوار میں سے زندگی گزری۔ دآبہ چار پاؤں پہ رینگنے والے' دو پاؤں پہ' چلنے والے' اُڑنے والے' یہ سارا جو قصہ ہے وہ اسی میں سارا چلا آ رہا ہے۔

انسان تخلیق کو تو سمجھ سکتا ہے اُسے بنانے میں اس کی کاریگری نہیں ہے نیز انعام کا تصور اور رحم مادر میں تخلیق مدارج

آگے کہا ہے کہ وَاَنۡزَلَ لَکُمۡ مِّنَ الۡاَنۡعَامِ ثَمٰنِیَۃَ اَزۡوَاجٍ (39:6 دیکھو یہاں ''انزل'' کا لفظ پھر آیا ہے کہ جس میں تمہاری ہنرمندی کا دخل نہیں تھا کہ کس طرح سے ہم نے یہ حیوانات میں سے آگے پیدا کرنا شروع کیا ہے' ان کی نسلوں کو آگے بڑھایا' انسانوں کی نسلوں کو آگے بڑھایا۔ اس میں انسانی فکر کی کاریگری نہیں ہے' یہ بنے بنائے ہوئے قانون ہیں' ہم ان قوانین کو سمجھ تو سکتے ہیں لیکن بنا نہیں سکتے۔ جو قوانین انسان کے بنائے ہوئے نہیں ہیں' اس کے لیے وہاں یہ لفظ ''نَزَلَ'' آتا ہے۔ عربوں کے ہاں جن کو ہم انعام یعنی مویشی کہتے

ہیں وہ ان کی چار ہی قسمیں کہا کرتے تھے: اونٹ، بکری، گائے اور بھیڑ یہ ان چار کو ہی انعام کہتے تھے مویشی کہتے تھے اور ان میں سے نر 450 الزُّمَر
اور مادہ کے جوڑے ہیں تو یہ آٹھ ہو گئے۔ یہ ان کے ہاں ثمٰنیۃ ازواج ہے۔ پھر آگے بڑھے کہ یَخْلُقُكُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ)(39:6۔ ان آیات کو لے کر وہ سائنٹسٹ ❶ کہتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ رحمِ مادر کے اندر یہ جو تخلیقی مدارج میں سے گزرنا ہے اس کے لیے کہا ہے کہ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ)(39:6 اس میں تمہیں کتنے ہی مدارج میں سے ہم نے گزارا تب کہیں جا کر یہ کیفیت پیدا ہوئی کہ جو انسانی بچہ تھا وہ آیا اور پھر چونکہ خدا المصور بھی ہے کہ اس نے اس کو رحمِ مادر میں فارم بھی دی۔

رحمِ مادر کی حیران کن کیفیت اور اس کے اندر پھر انسانی بچے کی نشونما کا طریق اور اقتدار کا تصور

کہا ہے کہ جب تک رحمِ مادر میں ہوتے ہو تو وہ عجیب انداز میں تم میں تخلیقی تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے کبھی ایک حالت پھر اس کے بعد دوسری حالت اور یہ سب کچھ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ)(39:6 ہے۔ یہ اس زمانے میں کون کہہ سکتا تھا؟ آج کے اناٹومی والے بتا سکتے ہیں یہ جو گائنا (Gynaecology) کا علم ہے میں تو اس کا ماہر نہیں ہوں ان کی پہنچائی ہوئی معلومات ہی ہم تک ہیں ہم براہِ راست تو نہیں جانتے وہ کہتے ہیں کہ یہ جنین تین پردوں کے اندر رہتا ہے یعنی پیٹ رحم اور وہ جھلی جس کے اندر جنین ہوتا ہے۔ اس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک تو اوپر کی Skin (جلد) ہے پھر دوسرا اندر جو رحم ہوتا ہے پھر وہ رحم کا ایک پردہ یہ تین پردے ہوئے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ خود رحم کا پردہ بھی دو جھلیاں ہوتی ہیں اور ایک خود رحم کی دیوار تو یہ تین پردے بن جاتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کیا ہے لیکن بہر حال یہ تین ہی پردے تاریکیوں کے ہیں۔ ان تاریکیوں کے پردے کے اندر مختلف تخلیقی مراحل میں سے گزار کر اس نے تمہیں پیدا کیا۔ اس کے بعد کہا کہ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ)(39:6 او یہ ہے تمہارا رب۔ پہلے اللہ کہا کہ جو صاحبِ اقتدار ہے اور اس کے بعد رَبُّكُمْ کہا کہ تمہیں نشونما دینے والا ہے۔ یہ نشونما ہی ہے جو ایک لائف سیل سے انسان کی شکل میں ایک پیکر آ کر نمودار ہو جاتا ہے۔ پھر کہا کہ لَهُ الْمُلْكُ)(39:6 اب بھی تم نہیں مانتے کہ وہ بادشاہت ملوکیت اقتدار صرف اس کے لیے ہی ہے کسی انسان کے لیے نہیں ہو سکتا۔ انسان تو ان سب مراحل میں سے ہی گزر کر پیدا ہوتے ہیں تو ایک انسان کو کیسے حق ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے انسان کے اوپر اپنا حکم چلالے۔ لَهُ الْمُلْكُ)(39:6 بات وہی آخر میں آتی ہے کہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں ہے۔

کہا ہے کہ اپنا حکم انسانوں پہ چلاتے ہو تو اپنے حکم کے تحت انسان پیدا کر کے بتاؤ۔ پیدا کرنا تو ایک طرف رہا تم اپنے حکم کے

---

❶ یہ مورس بوکائے (1989-1911ء) کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے لیے دیکھیے اس کی کتاب:

The Bible, The Qur`an and Science (Translated from the French by Alastair D.Pannel and the Autor): Islamic Book Service, Lahore, 1998۔

ماتحت خود ہی ہمیشہ تک زندہ رہ کر تو ذرا بتاؤ۔ اور سنو! لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ (39:6) اس کے سوا کسی کا اقتدار نہیں ہے۔ اور اس قسم کے دلائل و شہادات کے بعد فَاَنّٰی تُصۡرَفُوۡنَ (39:6) پھر تم کہاں بھٹکے جا رہے ہو؟ کدھر جا رہے ہو۔ کہا کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، یہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم نے ووٹس لینے ہیں اور اس کے بعد ہم نے پھر حاکم بننا ہے اور پھر اقتدار کی باگ ہمارے ہاتھ میں آنی ہے، اس لیے ہم بار بار یہ سب چیزیں، یہ پروپیگنڈہ جو پبلسٹی مہم ہے ہم نے الیکشن کے لیے شروع کر رکھی ہے۔ نہیں، سنو! اِنۡ تَکۡفُرُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنۡکُمۡ (39:7) اگر اس کے باوجود تم اس بات کو نہیں مانتے کہ انسان کو انسان پہ حقِ حکومت حاصل نہیں ہے تو جاؤ اس کی سزا بھگتو، ہم تمہارے محتاج نہیں ہیں کہ ہم اپنے لیے یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں۔

خدا کی ذات تو کسی کی طرف سے خوشنودی کی محتاج ہی نہیں ہوتی

عزیزانِ من! اور پھر اگلی آیت کے اندر تو وہ دوسری بات بھی اٹھا دی، جو ہم کہتے ہیں کہ خوشنودیِ باری تعالیٰ کے لیے ہم یہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہم غنی ہیں، ہم تمہارے محتاج ہی نہیں ہیں۔ کسی کی خوشنودی کے لیے کچھ کرنا اس کی سب سے بڑی احتیاج ہوتی ہے کہ اس کو خوش کرتے ہیں اور یہیں سے تو ساری موت واقع ہوتی ہے۔ اس کو خوش کرنے کے لیے جو کچھ یہ کرتے ہیں، اسی میں تو خود اپنا بیڑہ غرق کرتے ہیں، قوم کا کرتے ہیں۔ یہ وہی بادشاہت کی بات ہے کہ اسے خوش کر لو تو بس اس کے بعد راوی عیش لکھتا ہے۔ اگر وہ ناراض ہو گیا تو تباہی آ جائے گی۔ یہ تو وہی بادشاہت کا تصور ہے۔ کہا ہے کہ وَلَا یَرۡضٰی لِعِبَادِہِ الۡکُفۡرَ (39:7) یہ جسے آپ رضامندی کہتے ہیں، پسند نہیں کرتے۔ وہ کہتا ہے اپنے لیے یہ بات نہیں ہے کہ تم کفر کرو گے تو ہم پسند نہیں کرتے کہ بھئی! ہمیں یہ پسند نہیں، ہم ناپسند کرتے ہیں۔ پھر تو یہ ہو گیا کہ ہم کریں گے تو پھر خدا اس سے خوش ہو گیا۔ عزیزانِ من! ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہو کر سوچنے والی بات ہے۔ کہا ہے کہ وَلَا یَرۡضٰی لِعِبَادِہِ الۡکُفۡرَ (39:7) جو غلط تباہ کن روش ہے، اسے ہم تمہارے لیے پسند نہیں کرتے، یہ روش اچھی نہیں ہے، ہم تو غنی عنِ العالمین ہیں "او تہاڈے بھلے دی کینا پیا میں" (ارے بھائی! میں تمہارے بھلے کی ہی کہہ رہا ہوں)۔ یہ ایک چیز ہے۔ یَرۡضٰی لِعِبَادِہِ الۡکُفۡرَ وَاِنۡ تَشۡکُرُوۡا یَرۡضَہُ لَکُمۡ (39:7)۔ عزیزانِ من! قرآن کریم کو یوں سمجھا کریں، اس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے لفظ سے یوں نہ آگے گزر جایئے گا۔ یہ لَکُمۡ (39:7) نے ساری بات صاف کر دی جو ہم کہتے تھے کہ خدا کی رضامندی کے لیے، خدا کی خوشنودی کے لیے، ہم یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہم تو غنی عنِ العٰلمین ہیں، ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔

بات خدا تعالیٰ کے خوش ہونے یا ناراض ہونے کی نہیں ہے بلکہ اس کے عطا کردہ نظامِ حیات کو اپنانے کی ہے

خوشنودی اور ناراضی تو انسانی جذبات کا نام ہے صاحب! خدا تو اس سے ماورا ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ کفر نہ اختیار کرو، وہ

ہم اپنے لیے نہیں کہتے، تمہارے ہی لیے کہتے ہیں کہ سنکھیا نہ کھاؤ مر جاؤ گے، تم سنکھیا کھاؤ گے تو میں تو نہیں مر جاؤں گا۔ وہ سنکھیا اگر تم نہیں کھاتے تو وہ یہ نہیں ہے کہ آپ نے مجھے خوش کر دیا، آپ نے اپنی زندگی کا سامان بہم پہنچا دیا ہے، کھالیا تو یہ نہیں ہے کہ میں ناراض ہو جاؤں گا، آپ خود مر جاؤ گے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ وہ جو فلاسفر ❶ کہتا ہے کہ مجھے تم بتادو کہ اس قوم نے اپنے لیے کس قسم کا خدا تجویز کر رکھا ہے تو میں اس قوم کی ساری تہذیب تمدن معاشرت سب بتادوں گا۔ عزیزانِ من! یہ خدا ہے جو قرآن حمید نے ہمیں دیا ہے۔ اگر صرف خدا کا قرآنی تصور ہی آپ کے ہاں قائم ہو جائے تو پوچھو نہیں کہ آپ کے ہاں کتنا بڑا انقلاب آجائے۔ یہ ہے جسے خدا پر ایمان کہتے ہیں۔ یہ ماننا ہی نہیں ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ یہ خدا کا ایک تصور ہے۔ اسی تصور کے ماتحت پھر انسانی دنیا کے نظام کا تصور قائم ہوتا ہے۔ کہا کہ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی)(39:7 میں، تمہارے ہی لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر اس کے مطابق چلو گے تو تم بچ جاؤ گے، خلاف ورزی کرو گے تو تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اور ہمارا قانونِ مکافات یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی نظام میں قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت کوئی دوسرے کے عمل کا ذمہ دار نہ ہوگا

کہا ہے کہ یہ ہے وہ چیز جو ہم کہتے ہیں کہ تمہارے نظام میں یہ ہو، یہ نہیں کرو گے تو پھر ہر بالا دست اپنا بوجھ تمہارے اوپر لادے گا۔ پوچھتے ہیں صاحب! کہ یہ اسلامی نظام کی خصوصیاتِ کبریٰ کیا ہونگی۔ یہ وہ ہونگی کہ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی)(39:7 کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، نہ کوئی دوسرے پہ جبر کرے گا کہ میرا بوجھ تم اٹھا کر لے چلو۔ یہاں ہر ایک اپنی ذمہ داری خود نہیں ادا کرتا ہے، اپنی ذمہ داری کو دوسرے کے اوپر ڈالتا ہے، جو اسے کرنا ہوگا، کوشش یہ کرتا ہے کہ وہ فائل کسی طرح سے دوسری میز پہ چلی جائے۔ چھوٹے سے پیمانے پہ میں مثال کے طور پہ کہہ رہا ہوں کہ اپنی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا۔ اور پھر قرآن حکیم کی یہ چیز ہے کہ جو کچھ مجھ سے غلطی ہوئی ہے، میں نے ہی بھگتنا ہے، کوئی دوسرا نہیں بھگت سکتا۔ یہ ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی)(39:7۔ اور اگلی چیز جو سورۃ النجم آیت ((53:38 میں آئی ہے، اس میں اگلا ٹکڑا ہے کہ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی)(53:39 اور انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لیے وہ محنت کرتا ہے، جو محنت نہیں کرتا اس کا حق کوئی نہیں ہے۔ معذور ہونا اور بات ہے۔ معذور کے لیے بھی اس نے کہا ہے کہ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ((51:19 جو محنت کرنے سے معذور ہے اس کا حق ہے کہ اس کی ضروریات پوری کرو۔ اور جو کر سکتا ہے مگر لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ((53:39 جو محنت نہیں کرتا، اس کا کوئی حق ثابت نہیں ہے۔

---

❶ یہ ہے جان لاک (1632-1704ء)۔ اس کی کتاب کا نام (1690ء) Two Treatises of Government ہے۔

انسان کے دل میں ایک گزرنے والا خیال بھی اس انسان کے عمل کا حصہ ہے

450الزُّمَر

کہا ہے کہ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ مَّرْجِعُکُمْ فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (39:7) یہ ذہن میں کہہ دینا کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں' کوئی پوچھنے والا نہیں ہے' یہ خدا کا بڑا غلط تصور ہے۔ اس کا قانونِ مکافات تمہیں گھیرے ہوئے ہے' تم نے اس کے سامنے آنا ہے' تم نے اس کے نتائج بھگتنا ہیں۔ اور کس کے کام ہیں' اور اس کا احاطہ کہاں تک جاتا ہے سنو! اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (39:7) وہ دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہے۔ اور عمل کی بنیاد تو پڑتی ہی دل میں گزرنے والے خیالات سے ہے صاحب! وہاں تک سے وہ واقف ہے۔ اس کے قوانین کا ماننا یا نہ ماننا' تمہارے اپنے فائدے اور نقصان کے لیے ہے اور اسے اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے قانونِ مکافات کی رو سے ہر شخص اپنے اعمال کے نتائج خود بھگتتا ہے' کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اور تمہارا ہر قدم اس کے قانونِ مکافات کی طرف اٹھ رہا ہے۔ تم اس کے دائرے سے باہر کہیں نہیں جا سکتے۔ اس لیے تمہارے ایک ایک عمل کا نتیجہ تمہارے سامنے آ کر رہے گا' صرف انہی اعمال کا نہیں جو محسوس طور پر نظر آتے ہیں' تمہارے اُن خیالات اور ارادوں تک کا بھی جو تمہارے دل میں گزرتے ہیں لیکن انسان کی حالت عجیب ہے۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

آج ہم سورۃ الزمر کی آیت 7 تک آ گئے۔ 8ویں آیت سے' عزیزانِ من! آئندہ لیں گے۔



رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀...❀...❀

دوسرا باب: سورۃ الزمر (8 تا 20)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ
مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ڰ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ
النَّارِ ۝٨ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَاۗىِٕمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ۭ قُلْ هَلْ
يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝٩ قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى
الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝١٠ قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝١١ وَاُمِرْتُ
لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝١٢ قُلْ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝١٣ قُلِ اللّٰهَ
اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ۝١٤ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ۭ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝١٥ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ
مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۭ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ۭ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ۝١٦ وَالَّذِيْنَ
اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝١٧ الَّذِيْنَ
يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا
الْاَلْبَابِ ۝١٨ اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۝١٩ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا
رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ
الْمِيْعَادَ ۝٢٠

عزیزانِ من! آج نومبر 1980ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الزمر کی آیت 8 سے ہو رہا ہے: (39:8)۔

انسانی نفسیات کی خودغرضی کی کیفیت اور خدا پرستی کا تصور

450الزُّمَر

یہاں انسان کی ایک خودغرضی کی عجیب قسم کی مثال سامنے آئی ہے اور یہ وہ چیز ہے جو ہر روز ہمارے ساتھ بھی بیتتی ہے' ہمارے تجربے اور مشاہدے میں بھی آتی ہے۔ بات ان کی ہو رہی ہے جو خدا کو مانتے ہیں اور ماننے والوں کے متعلق کہا ہے وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ (39:8) انسان کو جب کوئی مصیبت آتی ہے تو گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتا ہے اور منتیں مانگتا ہے۔ اس طرح نظر آتا ہے کہ بس وہ خدا پرستی کا مجسمہ ہے۔ اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ (39:8) اور جب وہ مصیبت ٹل جاتی ہے' فراخی نصیب ہو جاتی ہے' آسانی نصیب ہو جاتی ہے تو وہ سب کچھ بھول جاتا ہے' پھر تو یہ ہوتا ہے کہ کہاں کا خدا' کہاں کے احکام اور کہاں کی وہ باتیں' اور کہاں کی وہ منتیں جو وہ اس مصیبت کے عالم میں کرتا تھا۔ یہ روزمرہ کے واقعات ہیں۔ وہ جسے ہم کہتے ہیں کہ اچھے اچھے ہینکر خاں بھی' جب مصیبت میں پھنستے ہیں' تو پھر ان کو خدا یاد آ جاتا ہے' خدا ہی کیا پھر تو آپ دیکھیں گے کہ وہ قبروں پہ بھی جا کر سجدے کر رہے ہوتے ہیں۔ انسان کی یہ کیفیت ہے۔ عزیزانِ من! یہ ایمان کی کمزوری یا ایمان کا نہ ہونا ہے۔ بعض تو اس قسم کے بھی یورپ کے محققین ہیں' جو خدا کو نہ ماننے والے ہیں۔ وہ کہتے ہی یہ ہیں کہ انسان مصیبتوں میں پھنسا تو اس نے خدا کا تصور تراشا کیونکہ اس وقت اس کو کوئی سہارا چاہیے تھا جس کی وجہ سے وہ زندہ رہتا' اور کوئی سہارا تو دنیا میں مل نہیں رہا تھا تو اس نے ایک موہوم سہارا تراشا' جس کو اس نے خدا کہا۔ گویا ان کے نزدیک خدا کا جو تصور ذہنِ انسانی نے تراشا وہ مصیبت کے زمانے کی بات ہے' مشکلات کے زمانے کی بات ہے۔ اگر ان کی بات کو نہ مانا جائے تو پھر بھی خدا کے ماننے والوں کی صورت یہ ہے اور عام طور پر بھی آپ دیکھیں گے کہ کیفیت یہی ہے۔ خوشحالی کے زمانے میں' مرفع الحالی کے زمانے میں' جب کوئی مشکلات نہ ہوں تو خدا اس وقت یاد ہی نہیں آتا۔ خدا یاد آنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے احکام' اس کے قوانین' اس کی عائد کردہ پابندیاں' اس وقت کوئی چیز نہیں ہوتی' وہ اس وقت میں ہی ہوتی ہے لیکن جونہی ذرا سی گردش آتی ہے ''جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا'' تو اس وقت پھر خدا یاد آ جاتا ہے۔ کہا ہے کہ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ (39:8) یہ نہیں کہ خدا کو بھولتا ہے بلکہ وہ اس وقت کہتا تھا کہ اگر مصیبت دور ہو جائے تو یا اللہ! میں یہ کروں گا اور اگر ایسا ہو جائے تو میں وہ کروں' پھر وہ اس وقت وہ تمام چیزیں بھول جاتا ہے۔

مرفع الحالی اور تنگ دستی کے دوران انسان کی متضاد نفسیاتی کیفیات کی نوعیت

میں وہ جو ایک لطیفے کی بات کبھی کبھی سنایا کرتا ہوں' وہ یہی چیز ہے کہ ایک میراثی کا بیل گم ہو گیا تھا تو اس نے مختلف مزاروں پہ جا کر

منتیں ماننی شروع کیں: یا گیارہویں والے! میرا بیل مل جائے تو میں گیارہ روپے کی نیاز دوں' اور آگے بڑھا۔ کہا کہ میاں میرا اگر بیل مل 450الزُّمَر جائے تو میں سترہ روپے کی نیاز دوں اور آگے بڑھا' یا گھوٹ پیر! اگر میرا بیل مل جائے تو پچاس روپے کی نیاز دوں۔ یہ پرانے زمانے کی بات ہے جب یہ دس بیس روپے کا تو بیل ہوتا تھا۔ تو ایک نے اس سے یہ کہا کہ تمہارا وہ بیل تو زیادہ سے زیادہ بیس روپے کا تھا' تُو تو ڈیڑھ سو روپے کی منتیں مان چکا ہے' تُو یہ کیا کرے گا۔ کہنے لگا ''ذرا سنگی ہتھ پے لین دے' ساریاں نوں پُر دیاں گا'' (ذرا اس بیل کی گردن میرے ہاتھ میں آنے دو' سب کو جُل دیدوں گا)۔ تو وہ بعینہٖ یہی بات ہے' جب تک یہ بیل ملتا نہیں ہے اس وقت تک یہ ساری چیزیں ہوتی ہیں۔ کہا ہے کہ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ (39:8) اور اس وقت پھر یہ جو مشکل رفع ہوئی' مصیبت دور ہوئی تو بجائے اس کے کہ خدا کی طرف دھیان جائے اور گوشوں کی طرف دھیان گیا کہ جناب! اس نے یہ کیا' اس کی وجہ سے یہ کچھ ہوا' میں نے فلاں جگہ منت مانی تھی' فلاں پیر صاحب سے جا کر یہ کہا تھا' ان کی دعا کارگر ہوگئی ہے' تعویذ کیا تھا یہ اس کی وجہ سے ہو گیا' فلاں ٹونہ کیا تھا۔ کہتا ہے کہ پھر وہ ان گوشوں کی طرف آ جاتا ہے۔ یہ خدا کو چھوڑ کر پھر اور خدا بناتا ہے' ان کی تلاش کرتا ہے۔ کیفیت انسان کی یہ ہوتی ہے۔ لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ (39:8) اور یہی وہ لوگ ہیں جو اس کے راستے سے اس کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہ چیز تو قرآن حکیم نے یہاں ایسے کہی ہے کہ انفرادی طور پہ بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک مفلسی انفرادی ہو یا اجتماعی' اُسے قرآن حکیم نے عذاب کے لفظ سے تعبیر کیا ہے' اور رزق کی افراط کو بھی

جیسا میں نے کہا ہے' یہ روزمرہ کے واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں جن کا ہم پہ اطلاق ہوتا ہے لیکن اجتماعی طور پر قوموں کے اوپر جو اس کا اطلاق ہوتا ہے وہ ایک بڑی اہم چیز ہے لہٰذا قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ جب مفلسی اور غریبی قوموں پر آئے تو یہ خدا کا عذاب ہوتا ہے۔ گویا اس کے بعد یہ جو مفلسی اور غریبی ہے' یہ بھی ایک چیز ہے جس سے ایک مصیبت آتی ہے' عذاب آتا ہے اور پھر اس کی وجہ سے بھی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں لیکن اس نے دوسری جگہ ایک اور اہم بات کہی ہے۔ یہ تو وہ وقت ہوا جب یہ کہتا ہے کہ جب وہ مصیبت میں پھنستا ہے تو خدا یاد آ جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ جب یہ قومیں مصیبت میں یعنی کسی قوم کے اوپر مفلسی اور غریبی آتی ہے تو یہ چیز تباہی کا موجب ہوتی ہے' یہ اس قوم کے اوپر خود خدا کا عذاب ہوتا ہے کہ وہ قوم اپنی روٹی کے لیے بھی دوسروں کی محتاج ہو جائے لیکن دوسری

طرف وہ یہ کہتا ہے کہ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا)(28:58 جو قومیں تباہ ہوئیں تو وہ افلاس اور غریبی اور مفلسی کی بنا پہ ہی تباہ نہیں ہوئیں، وہ بھی تباہی کی ایک شکل تھی، بہت سی قومیں وہ تھیں کہ جب ان میں رزق کی افراط ہوئی، معاش کے دروازے کھلے، خوشحالیاں زیادہ آئیں، تو اس کی وجہ سے بھی وہ تباہ ہوگئیں اور یہ بڑی اہم چیز ہے۔

قوموں کے زوال کی ایک دوسری وجہ افراطِ زر بھی ہے مثلاً سویڈن اور بنی اسرائیل کی اندرونی حالت

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم مشرق کی قومیں یا کم از کم ہم جو لوگ ہیں، اگر ہم مفلسی کے ہاتھوں تباہ ہو رہے ہیں، خدا کا عذاب ہے، تو یورپ کی قومیں جہاں ان کو معاش کی فکر نہیں بلکہ ان کے ہاں کی معیشت افراط زر تک پہنچی ہوئی ہے، وہ اتنی خوشحالیاں ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس فالتو رزق کو کیا کریں، وہ ہم سے زیادہ خستہ وخوار ہیں۔ تو گویا اگر غربت اور افلاس کی وجہ سے اقوام پر تباہی آتی ہے تو پھر انہیں تو تباہی نہیں آنی ہے۔ مگر صورتِ حال یہ ہے کہ وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ وخوار ہو رہے ہیں۔ میں نے اگلے دن کہا تھا اور یہ تو واقعہ ہے کہ اس وقت دنیا میں سویڈن سب سے بہتر ویلفیئر اسٹیٹ کہلاتی ہے کہ جس میں گویا اتنا کچھ کھانے پینے کو ہے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کیا کریں، بڑی مرفع الحال قوم ہے مگر دنیا میں سب سے زیادہ خودکشی کے واقعات اسی سویڈن میں ہوتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ جو چیز دولت کی افراط ہے، اس سے ایک قوت کا نشہ ہوتا ہے، قوت صرف تلوار کے ہاتھ میں لینے سے ہی نہیں ہوتی، یہ دولت کی جو قوت ہے، یہ تو اس سے کہیں بڑی چیز ہے۔ اس کی مثال یہ یہودی ہیں، یہ تو آج چار دن کی بات ہے کہ ان کو یہ چھوٹی سی مملکت مل گئی، ان کو Wandering Jews (خانہ بدوش یہودی) کہتے تھے۔ ان کی پوری تاریخ خانہ بدوش کی سی ہے، ان کا کوئی گھر ہی نہیں تھا، اس قوم کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ آج بھی اس ذرا سی مملکت کے سوا دنیا میں اور کہیں ان کی کوئی مملکت نہیں۔ اور آپ حیران ہونگے کہ دنیا کی جو بڑی بڑی سپر پاورز ہیں امریکا اور یورپ کی جو ساری پاورز ہیں، وہ یہودیوں کے پنجے کے اندر ہیں۔ یہ ابھی امریکا کی صدارت کا جو انتخاب لڑا گیا ہے، اس کا وہ سارا دارومدار یہودیوں پہ ہوتا ہے۔ یہ مٹھی بھر یہودی اس لحاظ سے دنیا کی ہر قوم میں، ہر ملک میں پھیلے ہوئے ہیں کہ دنیا کی جتنی معیشت (اکانومی) ہے، وہ ساری ان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے ہاں یہ ریگن [1] جیتا ہی اس لیے ہے کہ اس نے اپنے Campaign (انتخابی مہم) کے اندر کہا ہی یہ تھا کہ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ

---

[1] رونالڈ ریگن (-1911)، 1980 میں امریکا کا صدر منتخب ہوا، پھر 1984 میں دوبارہ صدر امریکا بنا۔ 1966 میں ریپبلکن کی طرف سے کیلی فورنیا کا صدر بنا اور 8 سال کا تک یہ عہدہ اس کے پاس رہا۔

اسرائیلیوں کے خلاف یہ کیا جائے اور وہ کیا جائے گا اور پی ایل او❶ (PLO)) کی مدد کی جائے گی' یہ سب غلط ہے' میں ان اسرائیلیوں کی مدد کرونگا' میں ان کی حمایت کرونگا۔ وہ ان کی حمایت نہیں کر رہا تھا بلکہ یہودیوں کے وہاں ووٹس تھے یعنی اس نے خود اپنے ہی ووٹس نہیں' ان کے ووٹس بھی خریدے ہوئے تھے۔ تو یہ جو دولت کی قوت ہے' یہ بہت بڑی قوت ہے۔ اور یہ تو ہمارے ہاں Age of Economics (معاشیات کا دور) ہے' تاریخ میں اس کو کہتے ہی اقتصادیات کا دور ہیں۔ Age of Economics (دورِ اقتصادیات) میں دولت Deciding Factor (فیصلہ کن عنصر) ہے اور اسی کی وجہ سے دنیا کے اندر یہ سارے مظالم ہو رہے ہیں۔ وہ کمزور قوموں پر' غریب قوموں پر' اسی دولت کے نشے کے طور پر ہو رہے ہیں۔

وحی کی عطا کردہ اقتدار کو نظر انداز کرنے کے باعث ہمارے ہاں غریب اور امیر زادوں اور مفلس و خوشحال اقوام کی حالت زار

یہ جو قرآن مجید نے کہا ہے کہ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ((28:58) بہت سی ایسی قومیں تھیں کہ وہ دولت کی افراط کی وجہ سے تباہ ہوگئیں۔ جیسے ہمارے ہاں کے چھوٹے چھوٹے امیر تو ہم بھی دیکھتے ہیں' جو دولت مند لوگ ہیں' وہ پھر اقدار (Value) کی ان تمام چیزوں کو بھول جاتے ہیں' اپنے اوپر کوئی پابندی عائد نہیں کرتے' وہ روپے سے ہر چیز خریدتے چلے جاتے ہیں۔ افراد میں یہ ہوتا ہے اور جب یہ چیز قوموں کے اندر پیدا ہو جائے' یورپ کی اقوام کی حالت یہی ہے کہ وہاں ان قوموں کے اندر کسی قسم کی کوئی Value' کوئی اقدار' اخلاق کی کوئی پابندی ہے ہی نہیں تو قرآن مجید نے کہا ہے کہ اس طرح سے بھی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں کہ دولت کی افراط کا نشہ ان کو بدمست کر دیتا ہے اور پھر وہ کسی قسم کی اخلاقی پابندی کی پابند نہیں رہتی ہیں۔ اقوام یوں بھی تباہ ہوتی ہیں۔ یہ جو قرآن حمید نے کہا ہے کہ جب مصیبت میں پھنسے تو اس وقت خدا یاد آتا ہے اور اس کے بعد جب ہم اس (قوم) کو آسائشیں دیتے ہیں اس کا افلاس دور ہو جاتا ہے' دولت ملتی ہے' ثروت ملتی ہے' حشمت ملتی ہے' تو وہاں پہنچ کر پھر یہ قومیں ان اقدار (Value) کو' ان پابندیوں کو' بھلا دیتی ہیں اور اس طرح سے تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس آیت کے اندر دونوں صورتیں ہیں۔ قرآن مجید نے جو کہا ہے وہ یہ ہے کہ انفرادی طور پہ بھی اور اجتماعی طور پر بھی' قوموں کی شکل میں بھی' یہی ہوتا ہے کہ جہاں قومیں مفلسی اور غریبی کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہیں تو دوسری طرف دولت کی افراط کی بنا پر جو جنون سوار ہوتا ہے' اس کے ہاتھوں بھی قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ ''ایمان'' کے معنی' ''یقین'' کے معنی یہ ہیں کہ مستقل اقدارِ خداوندی کی محکمیت پر یقین ہو' حالات کچھ بھی ہوں' اس دامن کو ہاتھ سے نہ

---

❶ تنظیم آزادئ فلسطین

چھوڑا جائے۔ کسی وقت اگر کسی طرح سے ہنگامی طور پر افلاس اور مفلسی بھی آ گئی ہے تو اگر ایمان کا یہ دامن ہاتھ میں رہے گا تو وہ چند دن کی 450 الزُّمَر بات ہوگی، وہ مفلسی دور ہو جائے گی۔ اور اگر خوشحالی اور مرفع الحالی آ گئی ہے تو اس وقت بھی اگر اقدار کے اس دامن کو ہاتھ میں رکھا جائے گا تو وہ دولت بے اعتدالی پیدا نہیں ہونے دے گی، انسان کا توازن قائم رہے گا۔ اور توازن صرف اقدار کا وہ لنگر ہے جس کی بنا پہ کشتی کا توازن قائم رہتا ہے، وہ ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔ کہا ہے کہ یہ لوگ جو دولت کے نشے میں مدہوش ہو جاتے ہیں اور اس وقت پھر کسی قسم کی اقدار کی پابندی نہیں کرتے تو قُلۡ تَمَتَّعۡ بِکُفۡرِکَ قَلِیۡلًا ۖ اِنَّکَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ (39:8) ان لوگوں سے کہہ دو کہ قرآن کریم نے اس کو کفر کہا ہے، دولت کے نشے میں پہنچ کر اقدار سے انکار کر دینا، ان کی پرواہ نہ کرنا کفر ہے۔ کہا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو خدا کو اس طرح سے مانتے ہیں، اُن کے متعلق کہا ہے کہ ایسی حالت میں اقدارِ خداوندی کی کوئی پرواہ یا نگرانی نہ کرنا، کفر ہے۔ تو کہو کہ اس کفر کی بنا پر چند روزہ اس افراطِ دولت کے ہاتھوں تم تمتع کر سکتے ہو، ان سے فائدہ حاصل کر سکتے ہو، انجام تباہی ہوگا۔ ہمیں ساری تاریخ بتا رہی ہے کہ کمزوری کی حالت میں تو قومیں تباہ ہوئی ہیں جبکہ بیشتر قومیں تاریخ کے اندر وہی ہیں جو دولت اور حشمت کی فراوانی کی بنا پر ہی تباہ ہوئی تھیں اور ان کا سب کچھ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔

اقدارِ خداوندی پر عمل کے سلسلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شب و روز اور اس پر ہمارے ہاں لیا جانے والا مفہوم

اس کے مقابلے میں قرآن کریم ان لوگوں کو لاتا ہے جو خدا کی اقدار اور خدا پر یقین رکھنے والے ہیں، ایمان رکھنے والے ہیں، ہر حالت میں یہ دیکھنے والے ہیں کہ ہمیں اس کے احکام کو کس طرح عمل میں لانا چاہیے۔ قرآن کریم نے ان احکام کو مختلف مواقع پر بیان کر رکھا ہے، کبھی امن و سلامتی کا کہہ کر، کبھی ظالم کی کلائی مروڑنے کا کہہ کر، کبھی جھک جانے کا کہہ کر، کبھی سامنے کھڑے ہو جانے کا کہہ کر، مثلاً ضعیفوں کی مدد کے لیے جسے جھکنا کہتے ہیں، سرکشی کو دبانے کے لیے قوت کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لیے کھڑے ہو جانا ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں ہیں جو خدا کی اقدار یا اس کے احکام کی رو سے طے ہوتی ہیں۔

ان کے متعلق کہا ہے کہ اَمَّنۡ ہُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَۃَ وَ یَرۡجُوۡا رَحۡمَۃَ رَبِّہٖ (39:9) یہ گروہ، یہ قوم، یہ جماعت، یہ شخص ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ دن بھر تو مصروف رہتے ہیں، قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں، اپنی جملہ صلاحیتوں کو نظامِ خداوندی کے لیے وقف کیے ہیں اور یہ سب اس لیے ہے کہ ان کی نگاہ صرف مفاد عاجلہ پر نہیں ہے، وہ مستقبل پر بھی نگاہ رکھتے ہیں اور بہت محتاط رہتے ہیں کہ ان میں کوئی خرابی واقع نہ ہو جائے۔ وہ چاہتے یہ ہیں کہ خدا کی رحمت و ربوبیت کا نظام عام ہو جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا گیا کہ اِنَّ لَکَ فِی النَّہَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا (73:7) دن میں تمہارے لیے بڑے لمبے چوڑے

پروگرام ہوتے ہیں' ان میں مصروف رہتے ہو۔ تو یہ لوگ پھر اس کے بعد راتوں کی تنہائیوں میں یا اس وقت کہ جب وہ مصروفیات نہیں رہتیں تو پھر یہ غور وفکر کے لیے بیٹھتے ہیں۔ ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ وہ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا [1] (39:9)

پہلے میں یہ عرض کروں کہ ان آیات سے ہمارے یہاں کیا مطلب لیا جاتا ہے۔ جب عبادت کا مفہوم ہمارے ہاں پرستش ہو گیا تو اب جتنی اس قسم کی چیزیں آئیں گی وہ پرستش کی ہی کوئی نہ کوئی شکل ہے جس میں ان کو لے جایا جائے گا۔ اس کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو رات کی تنہائیوں میں نفل پڑھتے رہتے ہیں' نماز جو فریضہ ہے' تو وہ کبھی نماز میں کھڑے ہوتے ہیں' جو قیام نماز کا فریضہ ہے' تو کبھی سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ تو وہ رات بھر یا رات کا بیشتر حصہ' نفل پڑھتے رہتے ہیں۔ گویا یہی قیام سجدہ ہے' وہ نماز کی رکعت کا قیام سجدہ ہے اور رات کا پروگرام یہ ہے کہ پھر وہ جو باقی وقت ہے' اب اس کے لیے خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق یہ چیزیں بندھیں کہ حضور ﷺ رات کو کھڑے ہوتے تھے تو اتنا قیام کرتے تھے کہ آپ ﷺ کے پاؤں سوج جایا کرتے تھے۔ اس کا نام عبادت رکھا ہوا ہے۔ پھر آپ کے ہاں یہ جو بڑے بڑے اولیائے کرام ہیں ان کے متعلق انہوں نے اس قسم کی کہانیاں بنائی ہوئی ہیں کہ وہ ایک ہزار رکعت نماز نفل کی ادا کرتے تھے۔ کبھی بیٹھ کر کوئی حساب نہیں لگا تا کہ اس میں وقت کتنا لگتا ہے۔ وہ جو نو لکھ ہزاری تھے' انہوں نے نو لاکھ مرتبہ قرآن کریم ختم کیا تھا۔ کوئی کبھی نہیں سوچتا کہ اس میں وقت کتنا درکار ہے لیکن بہر حال ان کے ہاں کی بہت بڑی عبادت گناتے ہی یہ ہیں کہ وہ ساری رات نفل پڑھتے رہتے تھے' وہ ایک ہزار نفل پڑھتے تھے' وہ دس ہزار نفل پڑھتے تھے۔ اب سمٹ سمٹا کر ہمارے ہاں یہ چیز آ گئی ہے' وہ یہی شکل باقی رہ گئی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی مصروفیات کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد اور آپ ﷺ کی سعی وکاوش کا نتیجہ: ساری رات نوافل پڑھنا نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ جس سے قیصر وکسریٰ' روم وایران کی تہذیبیں حرفِ غلط کی طرح مٹا دی گئیں

عزیزانِ من! اس کے برعکس نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ راتوں کو تمہارے ساتھ اور لوگ بھی ہوتے ہیں' رات کا کچھ حصہ سونا بھی چاہیے' دن میں بہت مصروفیت ہوتی ہے' آپ لوگوں کے سامنے بڑا Heary (بھاری) پروگرام ہوتا ہے۔ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ راتوں کو بیٹھ کر آنے والے دن کے پروگرام کے متعلق تفصیلات طے ہوتی ہیں' غور وفکر ہوتا تھا۔ سوچیے! جن کے سامنے اتنا عظیم انقلاب لانے کا پروگرام ہو' دنیا بھر میں انقلاب لانا ہو اور انقلاب کی یہ شکل نہیں ہے کہ انہوں نے وعظ و

---

[1] جو قوانینِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتا ہے۔ اپنی جملہ صلاحیتوں کو نظامِ خداوندی کے لیے وقف کیے ہے۔ راتوں کو کھڑے اور جھکے ہوئے' اس کی اطاعت کوشی میں مصروف رہتا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص1070)

نصیحت کرنی ہے۔ (انہوں نے تو عملی طور پر یہ نظام متشکل کرنا ہے تو کیا وہ رات بھر یا رات کا بیشتر حصہ یوں نفل پڑھتے رہیں گے، وہ نظام450الزُّمَرُ کی تشکیل کے لیے پروگرام کس طرح سے بنائیں گے)۔

دنیا میں اس زمانے کے اندر دو ہی تو سلطنتیں، دو ہی تو تہذیبیں تھیں۔ ایک Persian (فارس کی) یا ایرانی تہذیب تھی اور دوسری روما کی تہذیب وسلطنت تھی۔ جس طرح آج ❶ دو سپر پاورز ہیں، اس زمانے کی دو ہی یہ سپر پاورز تھیں۔ ان دونوں سپر پاورز کے ساتھ عربوں کی اس مٹھی بھر جماعت کا تصادم تھا، وہاں نہ کوئی ساز تھا، نہ یراق، نہ وسائل تھے، وہ صحرا میں بیٹھے ہوئے تھے، دائیں بائیں دنیا کی یہ اتنی بڑی سپر پاورز تھیں، ان کے ساتھ یہ ٹکراؤ تھا۔ پھر خود عرب کے اندر بھی جو قبائل تھے، ان کے ساتھ بھی مخالفت تھی۔ یہ تھا ان کا پروگرام۔ اگر ان کی صورت یہ ہوتی کہ دن میں جو کام کاج تھے، وہ کرتے اور ساری رات نفلوں میں گزار دیتے تو وہ پروگرام کس طرح سے بنا سکتے تھے کہ ان کے ساتھ ٹکراؤ میں کرنا کیا ہے۔ اور ٹکراؤ میں انہوں نے جو کچھ کیا، وہ چند دن کے اندر تھا اس کے بعد نہ ایران کا کسریٰ باقی رہا، نہ رومن کا قیصر باقی رہا، دونوں تہذیبیں ختم کر کے رکھ دیں۔ مملکتیں ہی ختم نہیں کیں، تہذیبیں ختم کر کے رکھ دیں۔ یہ تو بڑا اہم پروگرام تھا۔ اس پروگرام کے لیے ان کی کیفیت یہ تھی کہ دن میں تو اپنے پروگرام کو Carry-out (لاگو) کرتے تھے، جو بھی ان کے لیے دن بھر مصروفیات کا پروگرام ہوتا تھا، یہ کرتے تھے اور اس سے فارغ ہونے کے بعد، پھر جو کچھ کیا ہوتا تھا اس پہ نظر ثانی کرتے تھے، جو کرنا تھا اس کا پروگرام بناتے تھے۔ اب اس پروگرام کی دو شقیں ہیں۔ یہ ہیں جن میں سے ایک کو ''قیام'' کہا جا رہا ہے اور پھر دوسرا وہ ہے جسے ''سجدہ'' کہا جاتا ہے۔

زندگی بھر کے لیے کامیاب زندگی کا کامیاب پروگرام: قیام وسجدہ

عزیزانِ من! حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں دو ہی مقام آتے ہیں: (1) کسی کے سامنے کھڑے ہو جانا، (2) کسی مقام پر جھک جانا اور یہ بڑی چیز ہے۔ کہا کہ یہ فیصلہ کرنا کہ جھکنا کہاں ہے اور سامنے کس کے کھڑے ہونا ہے، بڑا ہی اہم ہے۔ مظلوم کے سامنے آپ کھڑے ہو جاتے ہیں تو یہ بدترین ظلم ہے، ظالم کے سامنے جھک جاتے ہیں تو یہ بدترین جرم ہے۔ مظلوم کے سامنے جھکیے، ظالم کے سامنے کھڑے ہو جایئے (1) یہ قیام ہے، (2) وہ سجدہ ہے۔ ساری زندگی میں یہ مقام آتے رہیں گے، سوچنے کی بات یہ ہو گی کہ ''قیام'' کا کونسا موقع ہے اور ''سجدہ'' کا، جھکنے کا کونسا موقع ہے۔ اس پر بڑا غور وخوص کرنا ہوگا۔ یہیں دونوں ہی باتیں ہیں لیکن غلط مقام پہ غلط چیز کا اختیار کر لینا، تباہی کا موجب ہو جائے گا۔ نبی اکرم ﷺ کو پہلا ''قیام'' کا جو حکم ملا تھا وہ پہلا حکم یہ ملا تھا کہ يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ❷ (74:1)۔

---

❶ یاد رہے یہ بات نومبر 1980ء کی 14 تاریخ کو کہی گئی تھی جب امریکا اور یو ایس ایس آر دو ہی سپر پاورز گنی جاتی تھیں۔

❷ اے وہ کہ جس کے ذمے، عالمِ انسانیت کو سنوار کر، ایک جہانِ نو کو وجود میں لانے اور اس طرح حق کے نظام کو ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔1379)

آپ کو یاد ہوگا اور میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ اس آیت کے ہمارے ہاں ترجمے یہ کیے جاتے ہیں کہ ''اے کملی اوڑھنے والے! یہ کملی اوڑھنا تو بات نہیں ہے۔ ''یہ جو موسم خزاں کے بعد نئی کونپلیں اور شگوفے پھوٹتے ہیں۔'' اسے تدثیر کہتے ہیں' یہ اس کی بات ہے۔ یہ بات کچھ تفصیل چاہتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے لیے المدثر کے لقب کا قرآنی مفہوم' اور ہمارے ہاں کے تراجم کی حالت اور ڈینیسن کا اقتباس

عزیزانِ من! اس آیت ((74:1 میں کہا ہے کہ ''اے خزاں دیدہ کائنات کو بہارِ نو اور نئی شگفتگی سے آشنا کرنے والے! قُمْ (74:2) یہاں قُمْ آیا ہے' یہ ''قیام'' ہے۔ پہلے ایک لفظ کے اندر پورے انقلاب کا جو تصور یا مقصود تھا وہ دیا ہے کہ گلشنِ کائنات' خزاں دیدہ ہو چکا تھا' اس کی بہار اور شگفتگی کے لیے قم کہا۔ آپ اس زمانے کی مغرب کے مورخین کی لکھی ہوئی تاریخیں دیکھیے' وہ کہتے ہیں کہ ''کائنات کی زندگی میں کہیں شگفتگی اور شادابی نظر نہیں آتی تھی''۔ یہ ان کے الفاظ ہیں۔ یہ کائنات بالکل ایک خزاں دیدہ چمن ہو چکی تھی۔ یہ الفاظ ایک ممتاز مورخِ تہذیب ڈینیسن (Denison) کے ہیں۔ اس کا ایک پہلا اقتباس علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات [1] The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں دیا ہے وہ کہتا ہی یہ ہے کہ

----

[1] قارئین کی دلچسپی کے لیے وہ اقتباس' جان ہاپکنز ڈینیسن (J.H. Denison) کے اپنے الفاظ میں درج ذیل ہیں:

"It seemed then that the great civilization that it had taken four thousand years to construct was on the verge of disintegration, and that mankind was likely to return to that condition of barbarism where every trible and sect was against the next and law and order were unknown- ......The old tribal sanctions had lost their power. Hence the old imperial methods would no longer operate. The new sanctions created by Christianity were working division and destruction instead of unity and order. It was a time fraught with tragedy. Civilization, like a giganitic tree whose foliage had overarched the world and whose branches had borne the golden fruits of art and science and literature, stood tottering, its trunk no longer alive with the flowing sap of devotion and reverence, but rotted to the core, riven by the storms of war, and held together only by the cords of ancient customs and laws, that might snap at any moment. Was there any emotional culture that could be brought in, to gather mankind once more into unity and to save cicilization? This culture must be something of a new type, for the old sanctions and ceremonials were dead, and to build up others of the same kind would be the work of centuries. (See J.H. Denison, Emotion as the Basis of Civilization, Charles Scribner`s Sons New York, 1928, PP. 267-68).

(باقی اگلے صفحہ پر)

''تہذیب کا جو اتنا عظیم شجر تھا' وہ بالکل سوکھ چکا تھا' گرنے والا تھا' کہیں زندگی کی کوئی رمق نظر نہیں آتی تھی۔ اور اس کے بعد عرب[450] کی سرزمین سے یہ ایک شخص اٹھا' اس نے اسی درخت کو نہیں' پورے صحنِ کائنات کو ایک گلستاں میں تبدیل کر دیا''۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ)(74:1 اے وہ جو کائنات کے چمنِ خزاں دیدہ کے درختوں پہ بہار نو لانے والا ہے! قُمْ)(74:2 اُٹھ!

لفظ قُمْ کا پروگرام انسانیت کے لیے جہانِ نو کو جنم دینے کے لیے تھا

اب نظر آیا کہ یہ ''قم'' کے معنی کیا ہیں۔ کہا ہے کہ فَاَنْذِرْ)(74:2۔ ایک ایک لفظ ہے عزیزانِ من! سارا پروگرام اس کے اندر ہے' نصب العین اس کے اندر ہے۔ کہا ہے کہ فَاَنْذِرْ((74:2 یہ جو انسانیت غلط راستوں پہ چل رہی ہے' اس کے تباہ کن نتائج سے ان کو آگاہ کر دے۔ یہ تو ہے اس کا ایک Negative Aspect (منفی پہلو) کہ اس سے ان کو آگاہ کر دے۔ یہ صرف آگہی مقصود نہیں ہے۔ آگے کہا ہے کہ ! وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ)(74:3 اور اپنے رب کی کبریائی قائم کر۔ تمام کائنات کو' تمام اقوامِ عالم کو' نشو نما دینے والے رب کی' ربوبیت قائم کر۔ یہ ہے عزیزانِ من! قیام' اس کے لیے اٹھ کر کھڑا ہونا ہے۔ آپس میں یہ جو ''قیام اور سجدہ'' ہے' اس کے مقام کی کیفیت یہ ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ)(48:29 محمد رسول ﷺ اور ان کے رفقاءؓ مخالفین کے سامنے چٹان کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن باہمی طور پر ایک دوسرے کے سامنے ریشم کی طرح نرم ہو کر جھک جاتے ہیں۔ یہ سجدہ ہے' وہ قیام ہے۔

(گذشتہ سے پیوستہ) اس کا رواں ترجمہ یہ ہے: اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ مشید جو چار ہزار سال میں جا کر تعمیر ہوا تھا' منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے اور نوعِ انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین وضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا...... قدیم قبائلی آئین اپنی قوت واحترام کھو چکے تھے۔ اس لیے اب ملوکیت کے اندازِ کہن کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین و دساتیر کو رائج کیا تھا وہ نظم وضبط اور وحدت و یک جہتی کے بجائے تشتت وافتراق اور ہلاکت وبربادی کا موجب بن رہے تھے۔ غرض یہ کہ وقت وہ آ چکا تھا جب ہر وقت فساد ہی فساد نظر آ رہا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند وبالا درخت جس کی سرسبز وشاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پہ سایہ فگن تھیں اور آرٹ' سائنس اور لٹریچر کے زرّیں ثمرات سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں' اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت واحترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلہ حرب وضرب کے طوفانوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے' اور یہ ٹکڑے صرف رسوماتِ پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ نہ معلوم کب گر پڑیں۔ کیا (ان حالات میں) کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوعِ انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دے اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لے! اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ پرانی رسومات وآئین سب مردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور قوانین مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا (پرویزؒ: معراجِ انسانیت' ادارہ طلوعِ اسلام' کراچی' 1949' ص ص.156 اور 776)۔

450الزُّمَر

علامہ اقبالؒ کے ہاں لفظ صلوٰۃ اور قرأت کا استعمال اور اس کا مفہوم

یہ چیزیں اقبالؒ (1938-1877ء) کے پروگرام میں مختلف مقامات پر آئی ہیں مثلاً یہی جو صلوٰۃ ہے' اس کو ایک علامت قرار دے کر وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ جو مومن ہے۔

دو گیتی را صلا از قرأت اوست

قَرَء کے معنی Proclamation (اعلان) کرنا ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ مومن کی جو قرأت ہے' خدا کے پیغام کا جو اعلان کرتا ہے' وہ تو یوں ہے کہ گویا وہ پوری کائنات کو' دونوں جہانوں کو' اپنی قرأت سے آواز دیتا ہے۔

مسلمان لایموت از رکعت اوست

اس کی نماز وہ ہوتی ہے کہ جس سے وہ زندۂ جاوید ہو جاتا ہے' لایموت ہو جاتا ہے۔

نداند کشتۂ ایں عصرِ اثر بے سوز

یہ زمانہ' جس کے دل میں سوز اور درد ہی نہیں ہے' وہ اس حقیقت کو جان ہی نہیں سکتا۔

ہم نے اس قَدْ قَامَتِ الصَّلوٰۃُ کے عظیم پروگرام کو نوافل کی شکل میں تبدیل کر دیا

قیامت ہا کہ در قد قامت اوست

مومن جب قَدْ قَامَتِ الصَّلوٰۃُ کہتا ہے تو دنیا کے اندر کیا تہلکہ آ جاتا ہے! یہ ہے قَدْ قَامَتِ الصَّلوٰۃُ۔ یہی اب جو ہمارے ہاں کا قیام ہے' یہی جو قَدْ قَامَتِ الصَّلوٰۃُ وہ اب نوافل کے اندر تبدیل ہو گیا کہ ساری رات نفل پڑھتے رہیے۔ یعنی یہ کہ انسان کوئی کام ہی نہ کر سکے۔ اور پھر جو میں نے کہا تھا کہ ''قیام و سجود'' کے متعلق یہ طے کرنا کہ کہاں اٹھنا ہے' کہاں جھکنا ہے' وہ کہتا ہے کہ

یہ مصرع لکھ دیا کہ کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

یہ جو ''قیام اور سجدہ'' ہے' اس کا غلط انتخاب اور غلط وقت تو آج ہمارے سامنے ہے۔ اپنوں کے سامنے تلواریں (بالِ جبریل) لے کر اٹھے ہوئے ہیں' جہاں جھکنا تھا' وہاں وہ جو دوسرے تمہارے اور اسلام کے اتنے بڑے مخالف ہیں ان کی جوتیاں چاٹنے کے لیے جھکتے چلے جا رہے ہیں' وہاں سجدہ کر رہے ہیں' یہاں قیام ہو رہا ہے یعنی یہ الٹ ہو گیا۔ کہا کہ مومن راتوں کی تنہائیوں میں هُوَ قَانِتٌ ((39:9 ہیں۔ قانت کے اس لفظ نے ساری بات طے کر دی تھی' عزیزانِ من! یہ تو قرآن کریم ہے خدا کا کلام' خدا کے چنے ہوئے الفاظ ہیں۔

450الزُّمَر

عربوں کے ہاں لفظ سِقَاءٌ قَنِيتٌ کا مفہوم

آپ کو یاد ہے میں نے سِقَاءٌ قَنِيتٌ بتایا تھا۔ وہ کیا ہوتا ہے؟ عربوں کے ہاں پانی کی تو بڑی کمی تھی' پانی ان کے ہاں بڑی قیمتی متاع تھی۔ وہ جاتے تھے' مشکیزہ میں پانی بھرتے تھے' اس طرح سے سلا ہوا اس مشکیزے کا منہ ہوتا تھا کہ پانی کا ایک قطرہ بھی اس میں سے نہ ٹپکے لیکن جہاں اس پانی کی ضرورت ہو' وہاں اس کا منہ کھلے' ضرورت کے مطابق پانی دیدے تو پھر باقی پانی کو سنبھال کر رکھ لے۔ ضرورت کے مطابق وہ اس میں سے دیدے اور پھر جہاں ضرورت نہیں ہے اس کو محفوظ رکھ لے۔ یہ جو لفظ آیا ہے یہ ہوتا تھا ان کے ہاں مشکیزہ جسے وہ قنیت یا قانت کہتے تھے۔ وہ جماعت ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو' قوتوں کو' دولتوں کو' حشمتوں کو' اس مشکیزے کی طرح محفوظ رکھتی ہے' بے جا ایک قطرہ بھی صرف نہیں کرتی' جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں اس کا منہ کھول دیتی ہے' جب ضرورت پوری ہو جاتی ہے پھر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتی ہے۔ یہ تھی جماعتِ مومنین۔ اب ان کا ''سجدہ'' اور اس کا ''قیام'' سمجھ میں آ گیا۔ لفظ قانت نے بات بتا دی تھی کہ قرآن حمید کیا کہہ رہا ہے۔ اور جب اس کا الٹ ہو جائے یعنی پیاس سے تڑپ رہے ہیں تو مشکیزہ بند ہے قرآن حمید نے کہا ہے کہ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) جس رزق کو بہتے ہوئے چشمے کی طرح جاری رہنا چاہیے تھا' یہ جو مصلین ہیں' یہ جو نمازی ہیں' وہ اس رزق کے اوپر بند لگا لیتے ہیں' اپنے لیے اس کو روک لیتے ہیں' اور جو اپنے لیے روکتے ہیں تو اسراف میں اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔ یہ قانت وہ مشکیزہ تھا اور ایک ان کے ہاں کا دوسرا مشکیزہ تھا' جہاں ضرورت ہے منہ بند ہے' جہاں ضرورت نہیں ہے سوراخ ہو رہا ہے' ایک ایک رات میں لاکھوں روپے لٹائے جاتے ہیں' ساتھ پڑوس کے مکان کے اندر ایک بچہ محض دوائی نہ ہونے کی وجہ سے مر رہا ہوتا ہے اس کے لیے کچھ نہیں ہے۔

جماعت مومنین کے پروگرام کی نوعیت

کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو پھر رات کی تنہائیوں میں بیٹھتے ہیں' جو دن کے ہنگاموں سے فارغ ہو جاتے ہیں تو پھر وہاں اس پروگرام کے متعلق سوچتے ہیں۔ یہ ہے سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا (39:9) یہ کاہے کے لیے ہے؟ یہ يَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ (39:9) کے لیے ہے۔ یہ جو روزمرہ کے کاروبار ہیں' وہ تو کرتے ہیں' ان کے سامنے Future (مستقبل) ہوتا ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ مستقبل کے لیے تو ایک پلان بنانا ہوگا' پروگرام بنانا ہوگا' بڑا سوچنا ہوگا۔ وہ مستقبل کا سوچتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ اس وقت تو سب کچھ خیر ہے' کہیں اس وقت کوئی خطرہ لاحق نہ ہو جائے' وہ مستقبل کا سوچتے ہیں۔ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ (39:9) نشوونما دینے والے کے جو سامانِ نشوونما ہیں' اس کے متعلق پروگرام بناتے ہیں کہ کیسے حاصل ہوگا' کیسے تقسیم کیا جائے گا۔ کہا کہ ایک یہ جماعت ہے اور ایک وہ تھی کہ ذرا سی تکلیف آئی تو دہائی مچانے لگ گئے' ذرا سی آسائش نصیب ہو گئی خدا فراموشی اختیار کر لی۔ کہا کہ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

)(39:9ان سے پوچھوکیا یہ دونوں گروہ کبھی برابر ہو سکتے ہیں' ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔اور یہاں یَعْلَمُوْنَ کہا ہے کہ یہ بات علم وبصیرت کی 450 الزُمَر ہے۔اوراسی لیے کہا ہے کہ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ)(39:9 جو ہم کہہ رہے ہیں' اس کو وہی سمجھ سکیں گے جو انتہائی عقل ودانش سے کام لیں گے' جذبات اورعقیدت اورتقلید سے نہیں۔ پہلے کہا ہے کہ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ)(39:9۔یہی ایک ٹکڑا عجیب ہے صاحب! قرآن کریم کی رو سے صاحبِ علم اور وہ جس کو علم نہیں ہے' یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

اولواالباب کی زندگی بھر کی سوچ کا نتیجہ

کہا ہے کہ یہ باتیں وہ سمجھ سکیں گے جو الباب ہیں۔میں نے کہا ہے کہ جسے اولواالباب کہتے ہیں وہ ہیں جن میں ''عقل داتت کڈیا ہو یا''، یعنی جسے عقل کا نچوڑ نکالا ہوا کہتے ہیں' یہ ہوتا ہے جن کو اولواالباب کہتے ہیں۔صرف عقل مند ہی نہیں' یہ لفظ عربی زبان میں ہے۔انتہائی عقل کی بات' جو نچوڑ عقل وبصیرت اور دانش وبینش کا ہے۔کہا ہے کہ وہ لوگ اس بات کو سمجھ سکیں گے جو ہم نے کہا ہے۔اسی لیے کہا کہ قُلْ یٰعِبَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ)(39:10ان سے کہہ دو کہ اے جو دعویٰ کرتے ہو کہ ہم خدا کو مانتے ہیں! تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کیا کرو۔ اس سے کیا ہوگا؟ یہ کہ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ) (39:10 اگر انہوں نے یہ صحیح Proportion(تناسب) قائم رکھا یعنی قیام کے وقت قیام کیا' سجدے کے وقت سجدہ کیا تو ان کی یہ زندگی متوازن وخوبصورت ہو جائے گی۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں نیکی کے لفظ کی بجائے حسنات کا لفظ استعمال کیا ہے

آپ کو یاد ہوگا اور میں بتاتا ہوں کہ قرآن حکیم میں جس کو ہم نیکی کہتے ہیں' یہ کیا ہے۔نیکی تو عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے' یہ تو سب فارسی کے الفاظ آئے ہوئے ہیں۔اس کے لیے حسنات لفظ ہے' حسن لفظ ہے اور اس حسن کی بنیاد صحیح Proportion(تناسب) ہوتی ہے' صحیح توازن ہوتا ہے' ذرا سا جسے Out of Proportion(تناسب سے باہر ہونا) کہتے ہیں' آرٹسٹ اس کو Appreciate(پسند) کرسکتا ہے کہ ایک آنکھ کی یہ سیاہی اگر ایک بال برابر بھی ذرا یوں ہٹی ہوئی ہو تو آپ دیکھیے کہ وہ بھینگا ہے اور اس کا سارا حسن ختم ہو جاتا ہے۔یہ جسے آپ قرآن حکیم کی رو سے نیکی یا خیر کہتے ہیں' اُسے اس نے حسنات یا حسن کہا ہے' جس میں توازن قائم رکھنا ضروری ہے۔خدا کے جو قوانین یا اقدار ہیں' وہ انسانی زندگی کا توازن قائم رکھتی ہیں' یہ معاشرے کا توازن قائم رکھتی ہیں' یہ جو انسانیت کی عالمگیر برادری ہے اس کا توازن قائم رکھتی ہیں۔یہ حسنات ہیں۔((39:10میں کہا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اس دنیا کے اندر فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ)(39:10 یہ حسنات کی زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ان کی یہ زندگی خوبصورت ہو جائے گی۔

لفظ عبادت کا مفہوم ''پرستش'' کرنے کا نتیجہ اقوامِ یورپ اور خدا کا حکم

450 الزُّمَرْ

اب یہ جو بات ہے کہ رات بھر نفل پڑھنے سے اس کا اثر اس زندگی پہ نہیں پڑتا' اس کے لیے ہمارے ہاں عبادت کا مفہوم پرستش لے لیا' ان نوافل کے اندر قیام اور سجدہ آ گیا' اب اس سے وہ کچھ حاصل نہیں ہو رہا تو وہ ثواب ہوگا جو قیامت میں جا کر ملے گا' ہر چیز ذہنی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ (39:10) اسی دنیا کی زندگی میں بھی یہ چیزیں مل جائیں گی۔ اور اگلی چیز یہ بتائی کہ دنیا میں جن قوموں نے ترقی کی' تو اس میں وہ قومیں تھیں جو اپنے ہی ہاں محصور ہو کر' محدود ہو کر' نہیں بیٹھ گئیں' وہ دنیا کے اندر نکلیں' وہ دنیا کے اندر پھیلیں مثلاً یہ یورپ کی اقوام ہیں' انہوں نے آج ساری دنیا میں ممتاز حیثیت اختیار کی ہوئی ہے۔ ان کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنے ہی وطن کے اندر پاؤں توڑ کر بیٹھی رہے' وہ قومیں ساری دنیا میں پھیل گئی تھیں۔ انہوں نے یہ امریکہ دریافت کیا تھا۔ یہ ان کے ہاں کی جتنی قوت اور ترقی ہے' اس کا راز اس میں ہے کہ وہ اپنے ہی ملکوں کے اندر پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھے رہے تھے' اپنے اپنے ملکوں سے نکل گئے تھے۔ اور یہ جو تعلیم تھی' یہ سب سے پہلے کس نے دی؟ سنو! ان سے کہنا کہ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ (39:10) ان سے کہو کہ اسی صحرا کی سرزمین کے اندر جو تم بیٹھے ہو' یہاں اگر یہ کچھ نہیں ملتا تو پھر کیا ہوا' خدا کی زمین بڑی وسیع ہے' باہر نکلو۔ اور یہ باہر نکلے' عزیزانِ من! اسی دور میں وہ پورے ایران میں' مصر میں اور یہ جتنی بازنطینی ایمپائر (سلطنتیں) تھیں' ان کے اندر وہ نکلے اور یہاں وہ ملتان تک آئے ہوئے تھے' یہ لوگ چین تک پہنچے ہوئے تھے۔ یہ اتنا سا ٹکڑا قرآن حکیم کے اندر حکم کا ہے' تو یہ اس حکم کی تعمیل میں نکلے مگر یہاں یہ کہتے ہیں کہ ''مولا نے دینا اے' چھپر پھاڑ کے دے گا'' (یہ مولا نے دینا ہے' وہ چھپر پھاڑ کر دے گا)۔ قرآن حکیم نے قوموں کو یہ راز بتایا کہ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ (39:10) خدا کی زمین بڑی وسیع ہے۔ اگر حسن کارانہ زندگی بسر کرنے کے لیے ایک خطہ زمین راس نہیں آتا تو کسی دوسری جگہ ساز گار فضا تلاش کرو۔ یونہی ہمت ہار کر نہ بیٹھ جاؤ' استقامت سے کام لو۔ اس میں ذرا استقامت اور استقلال کی ضرورت ہوگی۔

زمین کی وسعتوں کا اندازہ کرنا استقامت کا متقاضی ہے اور اس سلسلہ میں بغیرِ حساب کا قرآنی مفہوم بڑا قابل غور ہے

کسی قسم کا بھی جھونپڑا ہو' اس کے اندر آدمی بیٹھا ہو' تو اطمینان سے بیٹھا رہتا ہے۔ اگر اس میں تھوڑی سی تبدیلی بھی آتی ہے تو اس کے لیے اپنے آپ کو Adjust (ہم آہنگ) کرنا پڑتا ہے۔ یہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ انسان کی تو صورت یہ ہے کہ جہاں آپ کی چارپائی ہوتی ہے اگر وہ کسی دوسرے کمرے میں بچھا دی جائے تو رات کو نیند نہیں آتی۔ یہ ہمارے جیسی جو افیون خوردہ قومیں ہیں' یہ ان کی حالت

ہے۔آج بھی یورپ کی قومیں ہیں جنہوں نے اپنے ہاں جہاں نوردی کی یہ عادت ڈالی تھی۔آپ دیکھتے ہیں کہ یہ ایک تھیلا ہوتا ہے وہ 450 الزُّمَر
انہوں نے کمر پہ ڈالا ہوتا ہے، ساری دنیا میں چل رہے ہیں، ساری دنیا کا پیدل سفر کر رہے ہیں، سائیکل کے اوپر ساری دنیا کا سفر کر رہے ہیں، وہ میاں بیوی ہیں، موٹر سائیکل پر نکلے ہوئے ہیں۔ ہر سال پہاڑ کی چوٹی پہ جا رہے ہیں، وہاں تو ایک تنکا نہیں ہوتا، سبزی کا پتہ تک نہیں ہوگا مگر یہ ہیں کہ آ رہے ہیں مر رہے ہیں، پھر آ رہے ہیں، پھر مر رہے ہیں۔قرآن حکیم نے کہا تھا کہ یاد رکھو! جو ہم نے کہا ہے کہ یہ زمین بڑی وسیع ہے تو اس کے لیے استقامت کی ضرورت ہوگی۔ایورسٹ کی چوٹی پہ تو وہی ٹیم پہنچتی ہے جو ہر سال آتی ہے، گرتی ہے، مرتی ہے، پھر اگلے سال اس کے اوپر چڑھتی ہے۔ یہ استقامت ہے۔ کہا ہے کہ استقامت کے ساتھ یہ جو خدا کی وسیع زمین ہے اگر اس میں چلو تو سنو! وہ ڈھونڈھنے والے کو دنیا بھی نئی دیتا ہے۔مثلاً وہ انڈیا کو ڈھونڈنے کے لیے آیا تھا، اسے امریکا مل گیا۔تو یہ جو علاقہ ہے جو آپ کے ہاں کی ٹیم آئی ہے، اسے ویسٹ انڈیز اسی معنی میں انہوں نے کہا تھا۔اُس نے سمجھا کہ یہ انڈیا آ گیا ہے لیکن خدا کی زمین وسیع ہے، ایک کولمبس نے جو زمین دریافت کی ہے، وہ جو امریکا ہے، اس کا جو آدھا حصہ ہے وہ ساری دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے۔ سات سمندر پار سے یہ جو چند انگریز تھے جو ہندوستان میں آئے، اندازہ لگائیے کہ وہ اس قوم کے اندر سو سال تک کے لیے حکومت کر گئے، افریقہ کی ساری بستیوں کے اندر ان کی حکومت تھی۔کہا کہ اگر ذرا استقامت سے کام لیا جائے تو اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (39:10) اس کا اجر خدا اس انداز سے دے گا جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔ ''بغیر حساب کے'' یہ معنی نہیں ہیں کہ وہاں خدا کے ہاں کوئی حساب و کتاب کی کتاب ہی نہیں ہے جیسا کہ یہ کہتے ہیں کہ ''اوتھے کی پرواہ اے راکب! اوتھے بے پرواہیاں'' (وہاں، اے راکب! کوئی پرواہ نہیں ہے۔ وہاں تو بے پرواہیاں ہیں)۔اس کے دو معنی ہیں۔ایک تو عام معنی یہ ہیں کہ وہ جو تم اپنے ذہن میں حساب رکھتے ہو کہ اس کا اتنا ملے گا، یہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔قرآن حکیم نے کہا ہے کہ وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ (50:35) تم اپنے پیمانوں کے مطابق جو سمجھتے ہو کہ اس کے لیے وہ اتنا ملے گا، ہمارے ہاں جو آتے ہو تو ہم تمہارے پیمانوں سے کہیں زیادہ دیتے ہیں، ہمارے پیمانے تمہارے پیمانوں سے بہت بڑے ہیں۔تو یہ جو ہم اپنے پیمانوں سے تمہیں دیتے ہیں، یہ تمہارے حساب کے اعتبار سے بہت زیادہ ہوتا ہے، ایک تو یہ ہے بغیر حساب۔ اور اس کے اندر ایک بڑا اہم نکتہ بھی ہے۔حساب کی رو سے جو ایک دوسرے کا دینا لینا ہوتا ہے وہ تو Calculation (حساب شمار) سے ہوتا ہے کہ تم نے اتنا دیا، آپ دکاندار کو پیسے دیتے ہیں، وہ اس حساب سے آپ کو چیز دیتا ہے، آپ کچھ دیتے ہیں وہ کچھ دیتا ہے، یہ حساب ہوتا ہے۔ بینک میں آپ جمع کرتے ہیں، وہاں سے کچھ نکالتے ہیں، یہ آپ کا Account (حساب کا کھاتہ) ہوتا ہے۔ وہ آپ سے کچھ لیتا ہے اور اس کے بدلے میں کچھ دیتا ہے۔اور خدا کے متعلق ہے کہ ہم جو تمہیں دیتے ہیں وہ بغیر حساب دیتے ہیں، ہم تم سے لیتے کچھ نہیں ہیں، دیتے ہی چلے جاتے ہیں ''او تہاڈے نال حساب کرن بیٹھے تے اک دن دی روٹی نہ لبھے تہانوں'' (وہ اگر تمہارے ساتھ حساب کرنے بیٹھے تو تمہیں

450الزُّمَر

ایک دن بھی کھانا نہ ملے)۔کیا بات ہے بغیر حساب کی۔

تصوف کی دنیا میں خدا کے ہاں سے عدل مانگنے کا نتیجہ

وہ بچپن میں تصوف کے متعلق ہمیں پڑھایا کرتے تھے کہ ایک بہت بڑے عبادت گزار ولی اللہ تھے' بارہ سال تک وہ ایک پتھر کی چٹان پہ بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے رہے'انہوں نے بڑی عبادت کی۔ بارہ سال کے بعد آواز آئی کہ ہاں تیری عبادت مقبول ہوگئی' مانگ کیا مانگتا ہے' کیا مانگوں ایک درویش کی سمجھ میں وہ بات نہ آئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ پھر اس قسم کے درویش کے معجزے لاتے ہیں کہ وہ مقدس داڑھی والے' جبے شبے والے آئے تھے۔اس نے یہ پوچھا کہ کیا بات ہوگئی۔اُس نے کہا کہ بارہ سال کے بعد یہ آواز آئی ہے اور بڑی لمبی عبادت کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ مانگ کیا مانگتا ہے' مجھے سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ یہ مقدس داڑھی اور جبے والا شیطان تھا' اس نے کہا کہ بات سیدھی سی ہے اس سے کہو کہ میں عدل مانگتا ہوں۔اس نے کہا کہ یا اللہ! میں عدل مانگتا ہوں۔ کہنے لگے ٹھیک ہے'ہم عدل دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ بارہ سال تم اس چٹان پر بیٹھے اب بارہ سال یہ چٹان تمہارے سر پہ بیٹھے گی۔دیکھا! حساب کیسے ہوتا ہے!! بارہ سال چٹان کو سر کے اوپر رکھے ہوئے بیٹھا رہا' عبادت کرتا رہا۔ بارہ سال کے بعد پھر آواز آئی کہ مانگ کیا مانگتا ہے' پھر وہ کہتا ہے کہ میں بغیر حساب فضل مانگتا ہوں' تیرا عدل نہیں مانگتا۔

خدائے رحیم وکریم کے ہاں بغیر حساب کا پیمانہ عجیب وغریب نوعیت کا حامل ہے مگر استقامت کا متقاضی ہے

عزیزانِ من! جب میں نے ''بغیر حساب'' کے اوپر غور کیا تو پوچھو نہیں کہ کیا کیفیت ہوئی۔ہم تو یہ سانس جس پہ زندگی کا دارومدار ہے اگر ایک سانس کا حساب کرنے بیٹھیں تو اس کی قیمت نہ دے سکیں۔آخری سانس جب ہوتے ہیں ''تے ترلے لیندے پھردے ہوندے نیں''❶ مریض بھی اور سارے لواحقین بھی کہ ڈاکٹر صاحب! کچھ کیجیے' چار سانس اور چاہئیں۔ وہ اس کو ساری عمر مفت دیتا ہے' بغیر حساب دیتا ہے۔کہا ہے کہ ہمارے راستے پہ' ہمارے پلڑے میں آکر دیکھو تو سہی' دیکھو کہ ہم کس طرح بغیر حساب دیتے ہیں۔ عزیزانِ من! استقامت چاہیے' کہا ہے کہ باہر نکلو' پھر دیکھو بغیر حساب کیا کچھ ملتا ہے! اور اس کے لیے رسول نے قُلْ (39:11) کہا ہے' اور وہ وَ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ)(39:10 مومنین سے کہا تھا کہ خدا کی زمین بڑی وسیع ہے یونہی ہمت ہار کر نہ بیٹھ جاؤ' استقامت سے کام لو۔

---

❶ ترستے اور منتیں کرتے پھرتے ہیں۔

450الزُمَر

قرآن کریم پرستش کے برعکس قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے روشناس کراتا ہے

رسول سے کہا ہے کہ قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ (39:11) ان سے کہو کہ مجھے تو اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ کا حکم دیا گیا ہے۔ اب عبداللہ کا وہی ترجمہ ''میں خدا کی پرستش کرتا رہوں'' ہو گیا۔ دنیا کا ہر مذہب اپنے اپنے رنگ میں پرستش پوجا پاٹ کرتا ہے۔ اس کے اندر کیا خصوصیات ہیں؟ پرستش کی شکل دینے سے تو کوئی بات صاف نہیں بنتی' اس کا نام اور رکھ دینے سے تو نتائج میں فرق نہیں پڑتا۔ عزیزانِ من! یہ بات پرستش کی نہیں ہے۔ اور جب یہی بتا دیا کہ اعبد کے معنی کیا ہیں تو بات صاف ہو گئی۔ میں نے کہا ہے کہ اعبد کے معنی محکومیت کے ہیں' قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے ہیں۔ اور یہاں کہہ دیا کہ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ (39:11) میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت اس طرح سے کروں کہ اس میں کسی اور کی اطاعت اور فرماں پذیری کا شائبہ تک نہ ہو۔ دین [1] کے معنی ''اطاعت'' کے ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ اطاعت کو خالص خدا کے لیے کرتے رہو۔ اب عبادت کے معنی سمجھ میں آ گئے۔ اگر عبادت کے معنی پرستش ہوتے تو آگے اطاعت کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کہا ہے کہ مجھے حکم یہ دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداری اور محکومیت خالصتاً قوانینِ خداوندی کی اختیار کروں' اس کے اندر کسی اور چیز کی شرکت نہ ہو' اگر یہ ہوا تو وہ شرک ہو جائے گا۔ احکامِ خداوندی کے ساتھ ذرا سی بھی انسانوں کے کسی حکم کی آمیزش ہو جائے تو شرک ہو جاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہاں مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ (39:11) کہا ہے کہ اس ''اطاعت'' میں کسی اور کی اطاعت اور فرماں پذیری کا شائبہ تک نہ ہو۔ مجھے یہ کہا گیا ہے۔

تصوف میں پرستش کی آبیاری کا طریق کار' اس کا ماحصل اور قرآنِ کریم کا حکم کہ مجھے مسلمین کی ایک جماعت تیار کرنی ہے

عزیزانِ من! اب ایک اور بات آ گئی' پرستش تو ایک انفرادی چیز ہوتی ہے کہ کمرے کے اندر بیٹھا ہوا آدمی ساری رات نوافل پڑھتا رہے' تسبیحاں پڑھتا رہے' وظیفہ کرتا رہے' اکیلا بیٹھا ہوا ہو۔ اور وہ جو سب سے زیادہ پرستش تصوف میں ہوتی ہے' وہ تو ہوتی ہی خلوت میں ہے' وہ تو جلوت میں نکلتے ہی نہیں ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں سنایا کرتا ہوں کہ حضرت صاحب سے ملنے گئے کہ صاحب! پابوسی کے لیے حاضر ہوئے ہیں' تو کہنے لگے کہ وہ تو نہیں ملیں گے' حجرے میں اندر ہیں اور باہر نکلتے ہی نہیں ہیں' چالیس دن کا وظیفہ ہے' وہ اس میں مصروف ہیں۔ پوچھنے لگے کہ آج کل آپ کس چیز کا وظیفہ فرما رہے ہیں' کہنے لگے کہ آج کل وہ ''سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ'' (6:11) کا

---

[1] یہ لفظ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تاج العروس میں اور پطرس بستانی کی محیط المحیط میں لکھا ہے کہ یہ لفظ ''اطاعت'' اور ''فرماں پذیری'' کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کتاب الاشتقاق میں اس لفظ کے معنی ''اطاعت' روش اور ملت'' کے لکھے ہیں۔ نیز دیکھیے پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور 1960 ص ص۔ 681 تا 684

وظیفہ کر رہے ہیں۔قرآن کا حکم ہے کہ جاؤ اور زمین میں چلو پھرو اور ہمارے فائدے دیکھو۔مگر وہ ہیں کہ اپنے حجرے کے اندر بند بیٹھے ہوئے چالیس دن ''سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ '' کا وظیفہ کر رہے ہیں۔تو یہ تو ساری پرستش انفرادی ہوتی ہے لیکن عزیزانِ من! یہاں یہ کیا کہا ہے کہ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ)(39:11ان سے کہہ دو کہ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کروں۔اور آگے کہا ہے کہ وَ اُمِرۡتُ لِاَنۡ اَکُوۡنَ اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ)(39:12 حکم یہ ہے کہ مجھے مسلمین کی ایک جماعت تیار کرنی ہے' مجھ سے کہا ہے کہ سب سے پہلا رکن تُو بن۔یہی نہیں کہا کہ مجھے کہا ہے کہ تُو مسلم بن بلکہ اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ)(39:12 بننے کا کہا ہے' پہلے دن جماعت کا حکم دیا ہے۔اور یہ چیز ہوتی ہے کہ وہ آیا کرتا ہے کہ پریزیڈنٹ نے آکر پہلا ووٹ کاسٹ کیا' انہوں نے پہلا دستخط کیا اور وہ پہلا ممبر بنا۔یہ جو چیز ہے یہ اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ)(39:12 ہے۔رسول نبی اکرم ﷺ کی حیثیت ایک مسلم کی ہے لیکن یہ اسلام انفرادی چیز نہیں ہے' یہ اول المسلمین ہے' اگر انہوں نے آگے یہ مسلمین کی جماعت تیار نہ کی تو یہ اول المسلمین ہو ہی نہیں سکتے تھے۔پہلا تو اسی صورت میں ہوگا کہ بعد میں اور بھی ساتھ ہوں ورنہ پہلے کیسے کہا جائے گا۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ خدا کی عبودیت' محکومیت' اطاعت' خالصتاً اس کی اطاعت ہو' کسی چیز کی ذرا سی بھی آمیزش نہیں ہو' پھر یہ وہ چیز ہے جسے سجدہ کہا' اسلام کہا' جھکنا نہیں کہا۔میں پہلا فرد ہوں' پھر میں مسلمین کی جماعت تیار کروں گا۔

قرآنِ حکیم جیسی لاریب اور واضح تعلیم کے برعکس فرقہ بندی کی بنیادوں پر قرآن مجید کے مختلف تراجم کا تذکرہ

عزیزانِ من! آج کسی سے کہیے کہ آپ کون ہیں' وہ کہے کہ مسلمان ہوں تو آگے سوال ہوتا ہے کہ ''جی مسلمان؟ کون مسلمان' یعنی مسلمان کہنے لگے تو تسلی نہیں ہوتی' سنی یا شیعہ؟ پہلے تو یہ آجائے گا جی! کہ مثلاً! سنی مسلمان ہوں۔سنی مسلمان سے کیا مطلب؟ اہلحدیث ہو یا اہل فقہ؟ کہ جی وہ اہلِ فقہ ہوں' کونسے اہلِ فقہ؟ جی! حنفی یا شافعی یا مالکی؟ آپ ان میں سے کونسے ہو؟ کہ جی! حنفی ہوں۔پھر سوال ہوتا ہے کہ دیوبندی ہو' بریلوی ہو؟ اور یہ تو ابھی شریعت کا معاملہ ہے۔طریقت کی طرف آیئے تو پوچھیے نہیں کہ وہاں خانوادے کتنے ہیں' چشتی اور سہروردی اور نقشبندی بس چلا چل ہے۔خالی مسلمان کہنے سے تو کام ہی نہیں چل سکتا۔آپ کے ہاں بحث ہوا کرتی تھی کہ قرآنِ کریم کے ترجمے وہ ہیں' جہاں فخر سے لکھا ہوتا ہے کہ یہ حنفی مسلک کے مطابق ترجمہ ہے۔احادیث کے مجموعے اکٹھے ہوتے ہیں' تو وہ جو تعارف ہوتا ہے' اس میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک ہے مشکوٰۃ المصابیح بہت اچھی حدیث کی کتاب تھی لیکن اس کا جو جامع ہے' وہ شافعی ہے' اس واسطے حنفیوں کے نزدیک کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں ہے' اللہ کا شکر ہے کہ ایک مجموعہ ایسا تیار ہوگیا ہے جو حنفی نقطہ نگاہ سے احادیث کا مجموعہ ہے۔قرآن مجید کا ترجمہ حنفی نقطہ نگاہ سے' احادیث کا مجموعہ حنفی نقطہ نگاہ سے تو گویا نظر آیا کہ وہ رسول ﷺ کو یا حنفی بنایا ہے یا شافعی بنایا ہے۔قرآن مجید اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ)(39:12 کہتا ہے اور یہ نام بھی خدا نے کہا کہ ھُوَ سَمّٰکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ (22:78) یاد رکھو! خدا

ان کا نام خدا نے مسلم ہی رکھا تھا نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ اور یہ نئی بات نہیں ہے، پہلے بھی جو قومیں گزری ہیں ان میں بھی جو ایسے تھے 450 الزُّمَر اور اس نے کہا ہے کہ خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ تم تو وہ مسلم نام رکھتے پھرو، مولوی صاحب نے تو حنفی کہا ہے، اس نے تو شافعی کہا ہے، اس نے سُنّی کہا ہے، اس نے اہلحدیث کہا ہے، آج اس کے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ **یا للعجب!!**

قرآنِ حکیم کی زبان سے نبی اکرم ﷺ کا ایک اہم اعلان

خدا نے اسی لیے کہا کہ **اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ** (39:12) اس جماعت کا پہلا فرد بن جاؤں۔ عزیزانِ من! یہی جو صرف مسلم ہونا ہے، یہ **مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ** (39:11)۔ اس کے برعکس جونہی اس کے ساتھ آپ یہ اضافے کریں گے تو آپ خدا سے بھی ہٹ جائیں گے، رسول سے بھی ہٹ جائیں گے کیونکہ رسول نہ سُنّی تھا، نہ شیعہ تھا۔ اور اس کے بعد یہ جو مقام ہے، یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبانی خدا کہتا ہے کہ **قُلْ** (39:13) کہہ دے، یہ ایک ایسا عقیدہ نہیں ہے کہ تو، اپنی ذات تک رکھے۔ اندازہ لگائیے کہ رسول ﷺ کی زبان سے یہ بات جو "قل" ہے، وہ یہی نہیں ہے کہ تُو ایسا تسلیم کر کہ ایسا ہوگا بلکہ یہ اعلان کردے۔ کیا اعلان کردے؟ کہ **اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ** (39:13) اعلان کردے کہ اگر میں بھی خدا کے قانون کی نافرماں برداری کرونگا تو میں بھی خدا کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ مگر یہاں کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سب کو بخشوا کر جنت میں لے جائیں گے۔ وہ اپنی ذات کے متعلق ہے کہ خدا کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ اگر میں بھی خدا کی نافرماں برداری کروں گا تو میں بھی عذابِ خداوندی سے ڈرتا ہوں۔ جو خود خدا کے عذاب سے ڈرتا ہے، تو کیا وہ مجرموں کو بچا کر جنت میں لے جائے گا؟ یہ ہے سوچنے کا مقام۔

خدا اور انسان کے دائرہ اختیار کی الگ الگ نوعیت کی وضاحت

پھر کہا کہ **قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ** (39:14) پھر اعلان کردو کہ میرا مسلک تو یہی ہے، میں تو خالص خدا کی اطاعت کرتا ہوں اور **فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ** (39:15) تم اس کے سوا جس کی جی چاہے محکومیت اختیار کرو، مجھے اس سے واسطہ نہیں ہے۔ میں تو یہ کرتا ہوں، بھئی! تم حنفی کی کرو، بخاری کی کرو، شافعی کی کرو، میں تو صرف خالص خدا کی اطاعت کرتا ہوں۔ کتنی بڑی چیز ہے یہ! کہ **فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ** (39:15)۔ اور وہ جو میں بات کہا کرتا ہوں کہ دیکھو! یہاں **مَا شِئْتُمْ** آیا ہے۔ یہاں خدا کی مشیت نہیں ہے، خدا کی مشیت تو اس کے اپنے دائرے میں اس نے رکھی ہے۔ انسانوں کو جو صاحبِ اختیار بنایا ہے تو کہا ہے کہ تمہارے اس دائرے میں تمہاری مشیت چلتی ہے، ہم دخل نہیں دیتے، تمہیں مجبور نہیں کرتے کہ تم ضرور یہی راستہ اختیار کرو اور یہ نہ کرو، اپنے اختیار و ارادے سے جو راستہ چاہے اختیار کرو۔ ہماری مشیت یہ تھی کہ تمہیں صاحبِ اختیار و ارادہ بنا دیا، اب تم اپنی مشیت سے اپنے لیے راستہ خود اختیار کرو۔ کہا

کہ میں تو یہ خالص خدا کی محکومیت کرتا ہوں' تمہارا جو جی چاہے کرو' جس کی جی چاہے محکومیت اختیار کرو' جس کی جی چاہے پرستش اختیار 450 الزُّمَر کرو۔اور قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ((39:15 انہیں بتادو کہ تم بھگتو گے' اپنا نقصان کرو گے جو تمہارے ساتھ ہونگے' تمہارے ہم آہنگ ہونگے' تمہارے گروہ میں سے ہونگے' وہ بھی تمہارے جیسے ہونگے' وہ بھی اپنا نقصان کریں گے' تم بھی اپنا نقصان کرو گے' میرا نقصان تو نہیں کرے گا۔کہا کہ اَلَا ذٰلِکَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ)(39:15 سوچو کہ یہ کتنا بڑا نقصان ہے! یہ جو انسان کرتا ہے' اپنے ہاتھوں سے خود نقصان کرتا ہے۔راستہ صحیح سامنے آجاتا ہے اس کے باوجود غلط روش کے اوپر چلتا ہے' کتنا واضح نقصان ہے جو کر رہے ہیں۔اور اس کے بعد اس قسم کے معاشرے کا' ایسے نظام کا جس میں محکومیت مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ہو انجام کیا ہوگا' یہاں مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کہا ہے' تخصیص ہی نہیں ہے کہ خدا کو چھوڑنے کے بعد پھر ان میں سے بھی کوئی راستہ صحیح ہوسکتا ہے۔صراط مستقیم جس کی تم دعائیں مانگتے' وہ ایک ہی راستہ صحیح ہے۔کہا ہے کہ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ((11:56۔اس نے کہا ہے خدا کی طرف لے جانے والا تو ایک ہی راستہ ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمادیا کہ میں تو اس راستے پہ چلتا ہوں' تمہارا جی چاہے جس راستے پہ چلو' اپنا نقصان آپ کرو گے۔

افراد کی تباہی کے بعد قوموں کی تباہی کی نوعیت

اگر یہ کرو گے تو پھر قوموں کے متعلق کہا کہ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ذٰلِکَ یُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ یٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ)(39:16 اس کے بعد تباہی آجائے گی۔اب یہ جو تباہی کی اگلی شکل بتائی ہے' ایسا نظر آتا ہے کہ اوپر سے بھی شعلے برسیں گے' نیچے سے بھی شعلے برسیں گے۔تو وہ ان کے مسلک کے بعد اب اس کے بعد وہی چیز آئے گی کہ وہ قیامت میں جہنم میں ہوگا' جہنم کے شعلے ایسے ہوں گے' اوپر سے بھی برسیں گے' نیچے سے بھی برسیں گے۔وہ ٹھیک ہے وہاں ہونگے لیکن اللہ تعالیٰ نے قوموں کی خود ایک عذاب کی شکل بتائی ہے کہ جو اوپر سے بھی آتا ہے اور نیچے سے بھی آتا ہے۔یہی قوموں کے متاع حیات کو خاکستر میں تبدیل کرنے والے ہیں۔کہا ہے کہ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِکُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِکُمْ اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّ یُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَفْقَهُوْنَ ((6:65 بتادو' غور کرو کہ ہم کیسے پھیر پھیر کر باتوں کو بیان کرتے ہیں تاکہ کچھ تو تمہارے سمجھ میں آئے سمجھ جاؤ تم کہ ہم کیا کہتے ہیں۔کہا ہے کہ تم جن غلط راستوں پہ چل رہے ہو' خدا کی اقدار کو چھوڑ کر اپنا نظام جو تم نے بنا رکھا ہے' اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ تباہی ہوگی۔کہا ہے کہ قوموں کے اندر تباہی کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں' کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِکُمْ ((6:65 اوپر کے جو تمہارے لوگ ہوتے ہیں' تمہارے سربراہان ہوتے ہیں' اربابِ اقتدار ہوتے ہیں' اوپر کا طبقہ ہوتا ہے'

کبھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھوں نیچے کے طبقے کے اوپر عذاب اور تباہی آتی ہے۔ تباہی کی ایک شکل یہ ہوتی ہے۔ اوراس 450 ڈبالزُّمَر سے جب نیچے والا جو طبقہ ہے' کبھی تنگ پڑتا ہے تو اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ ((6:65 نیچے کا طبقہ' جن کو تم نے پاؤں تلے روندا تھا' وہ اٹھتا ہے' اس کے ہاتھوں سے عذاب آجاتا ہے۔

ہم مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کے محسوس نشانات اور باتوں کو پھیر پھیر کر لانا کہ تم سمجھ جاؤ

عزیزانِ من! قرآن مجید کیا کیا عذاب کی شکلیں بتا رہا ہے۔ ہمیں تو تاریخ میں پیچھے جانے کی ضرورت نہیں' ہماری زندگی میں یہ جو تاریخ ہمارے دور کی گزر رہی ہے' اس میں آپ دیکھیے کس طرح سے یہ شکلیں آ رہی ہیں۔ اوپر سے تباہی لانے والے طبقے کا عمل' نیچے سے اٹھنا جو ہوتا ہے' وہ کہتا ہے پھر یوں ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے پھر تباہی اور عذاب کی ایک تیسری شکل اور ہوتی ہے کہ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا ((6:65 قوم کی پارٹیاں بن جاتی ہیں اور ان پارٹیوں میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ پھر وہ ایک اوپر کے طبقے کا آدمی' نیچے کے طبقے کو لے کر ایک طرف ہو جاتا ہے' پھر دوسرا دوسری طرف ہو جاتا ہے: يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ((6:65 اور وہ آپس میں ٹکراتے ہیں اور تباہ ہو جاتے ہیں۔ کیا بات ہے قرآن مجید کے یہ کہنے کی! کہ اُنْظُرْ ((6:65 ذرا دیکھو کس طرح ہم پھیر پھیر کر باتیں تمہارے سامنے لاتے ہیں کہ تم سمجھ جاؤ کہ ہم کیا کہتے ہیں۔

ذاتِ خداوندی کسی کو ڈراتی نہیں بلکہ وہ بدعملی کے خوفناک نتائج سے آگاہ کرتی ہے

اب یہ جو کہا ہے کہ اوپر سے شعلے اور نیچے سے شعلے' وہ یہ شعلے ہوتے ہیں کہ اس طرح سے قوموں کی قومیں تباہ اور خاکستر ہو جاتی ہیں۔ ذٰلِکَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ)(39:16۔ اس کا ترجمہ عام طور پہ کیا جاتا ہے کہ اس طرح سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ ڈرانے کی بات نہیں ہے "خَوْفٌ" کے معنی ہوتا ہے کہ کسی کو آنے والے خطرے سے ڈرانا' آگاہ کرنا۔ ایک تو اپنے آپ سے ڈرانا ہوتا ہے اور ایک بات یہ ہوتی ہے کہ یہ جو آنے والی تباہی ہے وہ اس کے انجام سے آگاہ کرتا ہے' ان خطرات سے تمہیں آگاہ کرتا ہے کہ بڑے ہی خوفناک ہیں' وہ ان سے تمہیں آگاہ کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے ڈراتا نہیں ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں کی چیز ہے کہ بچوں کو ڈراتے ہیں اور پھر اسی طرح اللہ میاں کا ڈر بچپن سے ہی ہم ڈالتے ہیں' یہ غلط ہے۔ ڈر تو بڑی نفسیاتی بیماریاں پیدا کرتا ہے اور قرآن کریم مومن کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت جو بتاتا ہے وہ یہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ((2:38 وہ ہر قسم کے خوف سے محفوظ رہیں گے۔ تو یہ اس کا انتہا لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ((2:38 بتاتا ہے' تو کیا وہ تمہیں قدم قدم کے اوپر ڈراتا چلا جائے گا؟ عزیزانِ من! ڈر نہیں' وہ تمہاری غلط روش کے خطرناک نتائج سے تمہیں آگاہ کرتا ہے۔ اور اس کے بعد کہا ہے کہ اس سے بچنا چاہتے ہو تو يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ

((39:16اے میرے بندو! بچنا چاہتے ہوتو میرے قوانین کی نگہداشت کرو۔ بات ختم ہوگئی' ڈرانے کی بات نہیں ہے۔ جہاں قانون کا اتباع ہوتا ہے' وہاں ڈرنے کی تو بات ہی کوئی نہیں ہوتی' ڈرنا تو لاقانونیت سے ہوتا ہے کہ معلوم نہیں کہ کیا ہو۔

اب چھری صیاد نے لی اب قفس کا در کھلا

طاغوت کے معنی شیطان کی عبادت کرنا نہیں ہے بلکہ غیر خدائی قوتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے ہیں

میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ قانون بھی کس قسم کا ہو؟ کہا ہے کہ وَ الَّذِیۡنَ اجۡتَنَبُوا الطَّاغُوۡتَ اَنۡ یَّعۡبُدُوۡهَا وَ اَنَابُوۡۤا اِلَی اللّٰهِ لَهُمُ الۡبُشۡرٰی ((39:17۔''طاغوت'' کے معنی ''ہر غیر خدائی قوت اور سرکشی'' کے ہوتے ہیں۔ترجمہ کیا جاتا ہے کہ وہ جو شیطان کی عبادت کرتے ہیں' پرستش کرتے ہیں۔ شیطان کی پرستش تو کوئی بھی نہیں کرتا۔ یہ طاغوت کی عبادت کرنے کے کیا معنی ہوئے؟ کہ غیر خدائی قوتوں کی محکومیت اختیار کرنا' ان کی اطاعت اختیار کرنا۔ کہا ہے کہ کسی غیر خدائی قوت' سرکش قوت' جو خدا کے خلاف چلانے والی ہو' جو اس کے حکم کی تابع کرنے والی ہو' اس سے اجتناب کرے۔ آگے کہا کہ اَنَابُوۡۤا اِلَی اللّٰهِ ((39:17ہر بات میں' ہر معاملے میں' وہ خدا ہی کے قوانین کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ لَهُمُ الۡبُشۡرٰی((39:17ان کے لیے بڑی خوشخبریاں ہیں۔ یہ بُشۡرٰی عجیب ہے۔ یہ کہنے کے بعد کہا کہ اے رسول! فَبَشِّرۡ عِبَادِ((39:17ہمارے بندوں کو یہ خوشخبری دیدے۔ وہ کونسے بندے ہیں؟ کہا ہے کہ عِبَادِ الَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَهٗ ((39:18یہ ہمارے بندے ہیں کہ جب وہ ہماری بات کو سنتے ہیں' خدا کی کتاب کو دیکھتے ہیں' آگے یہ بات ہے کہ پھر وہ اس کا اتباع کرتے ہیں۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہمارے ہاں پائی جانے والی سوچ کا معیار

اب یہاں ہمارے ہاں کے مترجمین نے یہی ایک چیز غلط نہیں کی ہے' انہوں نے اس کے اندر بہت بڑی غلط فہمیاں پیدا کردی ہیں۔ انہوں نے سوچا ہی نہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ وہ قرآن حمید کو سنتے ہیں اور پھر اس کی اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔ گویا قرآن حمید میں اچھی باتیں بھی ہیں اور (معاذ اللہ) بری باتیں بھی ہیں' بری باتوں کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس کی اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ ہے کلام اللہ کی صورت' یہ ہے کیفیت خدا کی کتاب کی یا للعجب!! وہ آگے ہی ہے کہ یہ ہماری پوری کتاب احسن ہے' یہ تو حسن ہی حسن ہے۔ اب یہ کہنا کہ اس میں سے اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں' ان لوگوں نے سوچا ہی نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو ایک برہمو سماجی ❶ تحریک چلی تھی' انہوں نے کہا تھا کہ یہ اہل مذہب آپس میں لڑتے جھگتے ہیں' آؤ ایک نیا مذہب تیار

---

❶ ہندوؤں کا ایک مکتب فکر جس کی بنیاد 1830ء میں راجہ رام موہن رائے (1833-1774ء) نے بنگال میں رکھی۔

کرتے ہیں' اس (راجہ رام موہن رائے) نے برہموسماجی تحریک چلائی تھی کہ ہر مذہب کی اچھی اچھی باتوں کو ہم لے لیتے ہیں اور ان کو اکٹھا کر کے ایک مذہب بناتے ہیں اس کی پیروی کریں۔ گویا اچھی اچھی باتوں کے معنی ہوئے کہ اس میں جو بری بری باتیں ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہیں' ان میں سے اچھی اچھی باتیں لے لیتے ہیں۔ تو یہ تھی برہموسماجی تحریک۔ ہم قرآن حمید کا یہ برہموسماجی ترجمہ کر رہے ہیں کہ یہ بندے ہمارے ہیں' جو اللہ کے اس کلام کو سنتے ہیں اور پھر اس کی اچھی اچھی باتوں کی اطاعت کرتے ہیں (معاذ اللہ)۔ 450الزُّمَرْ

مومنین کی عملی زندگی میں قرآنی الفاظ کے مطابق رکوع اور سجود کا حقیقی مفہوم کہ ہر معاملے میں خدا کی ہدایت کیا ہے

اَحۡسَنَهٗ سجدے اور قیام کی وہ بات جو پہلے بیان کی گئی ہے اس کو سامنے رکھتے ہیں اور پھر یہ دیکھتے ہیں کہ اس بات یا اس واقعہ یا اس معاملہ کے مطابق قرآن کریم کا کونسا حکم ہے جو اس سے مطابقت رکھتا ہے پھر وہ اس کی اس وقت پیروی کرتے ہیں۔ اگر اس کا حکم یہ ہے کہ تلوار لے کر کھڑے ہونا ہے تو وہ کھڑے ہو جاتے ہیں' حکم ہے کہ یہاں صلح کے لیے جھکنا ہے تو جھک جاتے ہیں۔ تو وہ جو اس معاملہ کے متعلق بہترین شکل قرآن کریم تجویز کرتا ہے اس شکل کو اختیار کرتے ہیں۔ یہاں تدبر کی ضرورت پڑ گئی۔ وہ جو الباب کہا تھا' صاحبانِ عقل و دانش کہا تھا' یہاں قرآن کریم میں غور و تدبر کی ضرورت پڑی' قرآن کریم میں تو ہر قسم کے احکام ہونگے' میں نے کہا ہے کہ تلوار اٹھانے کے بھی ہونگے' جھک جانے کے بھی ہونگے۔ تدبر یہ ہوگا کہ یہ معاملہ پیش نظر ہے کہ اس کے اوپر یہ غور کریں گے' تدبر کریں گے پھر یہ دیکھیں گے کہ احکام قرآنی میں سے کونسا حکم ہے جو اس کے اوپر اس وقت منطبق ہوتا ہے۔ یہ ہے قرآن کریم کا وہ احسن' موزوں ترین صحیح ترجمہ۔ احکامِ خداوندی میں' اس واقعہ' اس واقعہ کے متعلق جو موزوں ترین حکم ہے' اس کی اس وقت اطاعت کریں گے۔ کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ ہَدٰىہُمُ اللّٰہُ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ((39:18 یہ دیکھیے' یہ ہیں وہ صاحبانِ عقل و بصیرت۔ تو گویا قرآن کے کس حکم کی کن حالات میں اطاعت کرنی چاہیے' مختلف احکام ہیں۔ یہاں تدبر کی' شعور کی' بصیرت کی' ضرورت آئے گی۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی ہدایت کے اوپر چلتے ہیں' ہر معاملے کے وقت دیکھنا کہ اس میں خدا کی ہدایت کیا ہے۔

وقت کے تقاضوں کے مطابق احکامِ خداوندی کا منطبق ہونا بھی حکمت پر مبنی ہے

جب یہ صورت ہو کہ ہزار برس پہلے جو کبھی کسی نے' کہیں انسانوں کی ایک جماعت نے' خواہ کتنے ہی بڑے امام ہوں' انہوں نے کچھ قانون بنا دیئے آج اسی طرح سے ان کے اوپر آپ نے عمل کیے رکھا' سوچنا ہی نہیں ہے کہ یہ قابلِ عمل بھی ہیں یا نہیں ہیں' یہ سوچنا ہی نہیں ہے۔ وہ تو قرآن حکیم کے متعلق بھی یہ کہتا ہے کہ جب کوئی معاملہ سامنے آئے تو یہ دیکھو کہ اس کے مختلف احکامات میں سے

کونسا حکم ہے جو اس خاص واقعہ کے اوپر منطبق ہوتا ہے' اس کی اطاعت کرو۔ یہ ہیں جو ہدایت کے اوپر ہیں۔ کہا ہے کہ اَفَمَنۡ حَقَّ عَلَيۡهِ كَلِمَةُ الۡعَذَابِ اَفَاَنۡتَ تُنۡقِذُ مَنۡ فِى النَّارِ ((39:19 جو اس روش کو چھوڑتا ہے وہ تباہی کی طرف جاتا ہے۔

کہا ہے کہ جو خود اپنے ہاتھوں سے تباہی کی طرف آجاتا ہے' اے رسول! کیا تو اُسے تباہی سے' النار سے' بچا سکتا ہے۔ شفاعت کی یہیں نفی ہوگئی۔ خدا کہہ رہا ہے کہ کیا تُو بچا سکتا ہے' یہ رسول سے کہہ رہا ہے۔ حضور ﷺ نے تو کبھی نہیں (معاذ اللہ) فرمایا ہوگا کہ میں بچاتا ہوں لیکن ہم صبح و شام شفیع المذنبین' بچانے والا کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اَفَاَنۡتَ تُنۡقِذُ مَنۡ فِى النَّارِ ((39:19 اے رسول! کیا تُو اس کو عذاب سے بچا سکے گا؟ یہ نہیں کہا کہ رسول نے یہ دعویٰ کیا تھا (معاذ اللہ) کہ میں بچالوں گا۔ رسول نے تو دو آیات پہلے ہی یہ کہا تھا کہ اگر میں بھی اس کی نافرماں برداری کروں گا تو میں بھی اس کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہنے کا یہ ایک انداز ہے کہ اور تو اور رہے' اے رسول! تُو بھی اس کو نہیں بچا سکتا۔ ہمارے مولوی صاحب وعظ کیا کرتے تھے' ان کے وعظ بڑے مزیدار ہوتے تھے کہ کون کہتا ہے کہ گناہ نہ کرو' کون اس سے باز رہ سکتا ہے' گناہ کرو' جی بھر کے گناہ کرو' جتنا جی چاہے گناہ کرو' سورۃ الرحمن کی آیت کا ایک دفعہ ورد کرو تو سارے گناہ دھل جائیں گے۔ یہاں خدا رسول سے کہتا ہے کہ اَفَاَنۡتَ تُنۡقِذُ مَنۡ فِى النَّارِ ((39:19 تُو بھی النار سے نہیں بچا سکتا۔ لٰكِنِ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ ((39:20 اس کے برعکس وہ لوگ جو خود قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں' یہ وہ ہیں کہ جن کو ہم کہتے ہیں کہ بخشے جائیں گے۔ یہ وہیں لکن آیا ہے۔

لفظ لٰکِنِ اور غُرَفٌ کا قرآنی مفہوم

لکن نے تو بات ہی اور کردی۔ کہا ہے کہ لَهُمۡ غُرَفٌ مِّنۡ فَوۡقِهَا غُرَفٌ مَّبۡنِيَّةٌ ((39:20 عربی زبان کا ایک ''غُرَفٌ'' لفظ ہے اور یہ عجیب جامع زبان ہے' یہ عجیب انتخابِ خداوندی ہے۔ ان عربوں کے ہاں کوئی ایسا زندگی کا نقشہ' ایسا معاملہ' جس میں فراوانیاں بھی ہوں' شادابیاں بھی ہوں' سرفرازیاں بھی ہوں' اس دائرے سے آگے' کونسی بات رہ جاتی ہے کہ شادابیاں ہوں' پھر اس کے ساتھ اس کی فراوانیاں ہوں تو یہ ذلت اور نکبت کے ساتھ حاصل نہیں ہوسکتیں۔ جہاں یہ تین چیزیں (فراوانیاں' شادابیاں اور سرفرازیاں) اکٹھی ہوں تو وہ اس کو غُرَفٌ کہتے تھے۔ کہا ہے کہ غُرَفٌ مِّنۡ فَوۡقِهَا غُرَفٌ مَّبۡنِيَّةٌ ((39:20 بلندیوں کے اوپر اس قسم کی چیزیں' جن کی ہم نے بنیادیں بڑی مضبوط بنائی ہونگی' کوئی زلزلہ ایسا نہیں آسکے گا جو ان کو ڈھادے۔ کہا ہے کہ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ (39:20) شادابیوں کے لیے رواں پانی جاری ہیں۔ وَعۡدَ اللّٰهِ ((39:20 خدا یہ وعدہ کر رہا ہے۔ کہا ہے کہ لَا يُخۡلِفُ اللّٰهُ الۡمِيۡعَادَ ((39:20 خدا کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ عزیزانِ من! کتنا بڑا اطمینان ہے! جس کے وعدے پہ آپ کو اتنا اعتماد ہو کہ کبھی وعدہ خلافی نہیں

450الزُّمَرْ

ہوگی ورنہ صورت یہ ہے۔

ترے وعدے پر جیے ہم' تو یہ جان جھوٹ

جانا

کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

(غالب)

خدا تعالیٰ کی ہستی تو وہ ہستی ہے جو قادرِ مطلق ہونے کے باوجود اپنے اصولوں کی پابند ہے

عزیزانِ من! یہ قادرِ مطلق ہے جس کے اختیار پہ کوئی پابندی خارج سے عائد شدہ نہیں ہے' کتنی بڑی پابندی وہ عائد کرتا ہے۔یعنی انسان تو صاحبِ اختیار ہے کہ میں وعدہ کروں اور اس کے بعد مکر جاؤں' اس کا مجھے اختیار ہے۔خدا اپنے اوپر یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ ہم جو وعدہ کرتے ہیں ہم مکریں گے ہی نہیں' ہم اس کی خلاف ورزی کریں گے نہیں' کر سکتے ہیں مگر کریں گے نہیں۔اور دوسری جگہ تو اور بڑی بات ہے۔کہا ہے کہ **كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا** (25:16) بفرضِ محال اگر تم دیکھو کہ صاحب! وعدہ پورا نہیں ہو رہا تو تم خدا سے پوچھ سکتے ہو کہ تم نے وعدہ کیا تھا وہ کیوں نہیں پورا کیا۔خدا پر ایمان رکھنے والوں کی تو ہمارے ہاں یہ کیفیت ہے۔اب ہمارے ہاں سب سے بڑی تباہی جو آئی ہوئی ہے' وہ یہی ہے کہ کسی کی بات پہ اعتبار ہی نہیں ہے۔آدمی کو سکون ہی نہیں مل سکتا' تسکین ہی نہیں مل سکتی اگر اعتماد نہ ہو۔یہ تو اعتماد باہمی ہے جس سے معاشرہ قائم ہوتا ہے۔یہاں کوئی اعتماد نہیں ہے۔کہا ہے کہ **لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ** (39:20) تمہیں کس طرح سے بتائیں کہ ہم اپنے وعدہ پہ پورا اترتے ہیں۔وعدے کے معنی ہی قانونِ خداوندی ہیں۔ہم وعدہ خلافی نہیں کرتے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ قانونِ خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔اور اس کے بعد آگے محسوس مثال دے کر سمجھایا ہے کہ دیکھتے ہو ہم نے یہ وعدہ کیا تھا وہ کیسے پورا ہو رہا ہے! یہ ہم اگلے درس میں لیں گے۔

ہم سورۃ الزمر کی آیت 20 تک آ گئے' عزیزانِ من! 21ویں سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ



تیسرا باب: سورۃ الزمر (21تا40)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ
فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ۭ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿٢١﴾ أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ
فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ أُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٢﴾ اَللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيْثِ
كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ
ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿٢٣﴾ أَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ۭ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿٢٤﴾ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ
لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٥﴾ فَأَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا
لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٧﴾ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٢٨﴾ ضَرَبَ
اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا
يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٩﴾ إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿٣١﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ
عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ إِذْ جَآءَهٗ ۭ أَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ أُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿٣٣﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٣٤﴾ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ أَسْوَأَ الَّذِيْ عَمِلُوْا
وَيَجْزِيَهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٣٥﴾ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَمَنْ
يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿٣٦﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ۭ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ﴿٣٧﴾ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلْ أَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ أَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ
كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ أَوْ أَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ۭ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۭ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٣٨﴾ قُلْ يٰقَوْمِ
اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ إِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٩﴾ مَنْ يَّأْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٤٠﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1980ء کی 21 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورۃ الزمر کی آیت 21 سے ہو رہا ہے :(39:21) 1450 الزُّمَر

خدا کے وعدے سے مراد خدا کا وہ قانون ہوتا ہے جو کبھی نہیں بدلتا

سابقہ درس میں بیسویں آیت کے آخری الفاظ تھے: وَعۡدَ اللّٰہِ لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ الۡمِیۡعَادَ)(39:20 یہ خدا کا وعدہ ہے اور خدا کے وعدے میں کبھی خلاف ورزی نہیں ہوتی، جسے ہم وعدہ خلافی کہتے ہیں، نہیں ہوتی، اس کا ہر وعدہ اٹل ہے اور پورا ہو کر رہتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جس چیز کو قرآن کریم نے خدا کا وعدہ کہا ہے، آج کی اصطلاح میں اُسے خدا کا قانون کہا جائے گا۔ وعدہ یہی ہوتا ہے کہ اگر تم نے یہ کیا تو میں یہ کر دوں گا۔ اور اگر یہ وعدہ ایسا ہو کہ مستقل ہو، اس میں کبھی اختلاف نہ ہو سکے، تو اسی کو قانون کہتے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے بتایا تھا کہ انہوں نے قانون کی جو Definition (تعریف) کی ہے وہ ہے:If, Then, Always۔ قوانینِ فطرت ہی ان کی نگاہوں میں تھے یعنی اگر (If) یہ ہو، اس کا نتیجہ (Then) یہ ہو گا، اور ہمیشہ (Always) ہو گا۔ اور یہ حکم ہوتا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے وقت میں دوسرا حکم دیدیا جائے پہلا حکم بدل جائے لیکن جب لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ((10:64 ہو کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی تو ایسا حکم ہے جس میں یہ بتایا جائے کہ یہ کرو گے تو نتیجہ یہ ہو گا۔ پہلی چیز تو یہی ہے۔

ایک حکم ہوتا ہے ''حکم حاکم مرگ مفاجات'' آپ پوچھ نہیں سکتے کہ میں ایسا کرونگا تو کیا ہو گا، مجھے کیا ملے گا، نتیجہ کیا ہو گا، علت کیا ہو گی، اس کی حکمت کیا ہو گی۔ یہ جو حکم ہوتا ہے یہ مستبد حاکموں کا حکم ہوتا ہے، ڈکٹیٹروں کا حکم ہوتا ہے، آمروں کا حکم ہوتا ہے، ملوکیت ہوتی ہے، بادشاہت ہوتی ہے، آپ یہ نہیں پوچھ سکتے کہ ایسا کیوں کہا گیا ہے اور ایسا کرنے کا نتیجہ کیا ہو گا۔ وہاں تو ہوتا ہے کہ نتیجہ نہیں یہ ہمارا حکم ہے لیکن جس حکم کے ساتھ اس کی علت و غایت بتائی جائے کہ یہ حکم دیا جا رہا ہے اور اگر اس کا اتباع کرو گے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا، اب یہی وہ حکم اس انداز کا نہ رہا۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآن کریم میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے، بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ ایک اس قسم کا حکم دیا ہے لیکن اس حکم میں تو یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ بتایا ہے کہ کیوں حکم دیا ہے، بتایا ہے کہ اگر (If) اس کا اتباع کرو گے تو (Then) اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اور اس کے ساتھ اگلی شرط یہ ہوئی کہ ہمیشہ (Always) ایسا ہو گا۔ تو اب سائنٹسٹ نے Law (قانون) کی یہ Definition (تعریف) متعین کی۔ قرآن نے چودہ سو سال پہلے یہ کہا کہ یہ کرو گے تو یہ ہو گا اور ہمیشہ ایسا ہو گا:If, Then, Always۔ تو اسی لیے آپ کو یاد ہو گا کہ میں شروع سے کہتا چلا آ رہا ہوں کہ جہاں بھی یہ چیزیں بطور حکم خدا کی طرف سے بطور Direction (ہدایت) آئیں، اگر آج ہم نے ان کا ترجمہ Law یا قانون کر لیا تو بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ خدا کا قانون یہ ہے۔ وَعۡدَ اللّٰہِ ((39:20 خدا کا قانون یہ ہے کہ لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ الۡمِیۡعَادَ)(39:20 اس وعدے میں کبھی تبدیلی نہیں ہو گی، اس وعدے کے کبھی بھی خلاف نہیں

ہوگا۔محکم، مستقل، ابدی، غیر متبدل، قانون ہے اور اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ جب یہ کہا کہ **لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ الْمِیْعَادَ** ((39:20 الزُّمَر بات سمجھ میں آ گئی کہ ایک قانون ہے جو بتایا جارہا ہے۔

قوانینِ فطرت اور انسانی زندگی کے لیے قوانین میں فرق

اب یہ قوانین، قوانینِ فطرت میں بھی ہیں، سارا کارگہ ء کائنات خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق چل رہا ہے اور چل اس لیے رہا ہے کہ انہیں اس سے سرتابی کا، اس سے سرکشی کا، اختیار نہیں ہے، وہ کبھی اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتے، وہ مجبور پیدا کیے گئے ہیں۔ یہی قوانین اس نے انسانی زندگی کے لیے بھی دیئے ہیں جو قرآنِ کریم کے اندر ہیں۔قوانین یہ اسی قسم کے ہیں یعنی ویسے ہی ہیں کہ اگر ان پہ عمل کروگے تو یہ ہوگا۔ یہ قانون ہے کہ **اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:21) ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ یہ قانون ہے، مستقل ہے، محکم ہے، غیر متبدل ہے۔ان قوانین میں اور قوانین فطرت میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں تو کسی شے کو اس کا اختیار نہیں کہ اس کی خلاف ورزی کرے۔ انسان صاحبِ اختیار ہے، اس میں دونوں چیزیں ہوئیں کہ اس کے مطابق کروگے تو یہ نتیجہ نکلے گا، اس کی خلاف ورزی کروگے تو یہ نتیجہ نکلے گا۔ قانون دونوں صورتوں میں ہے۔

خارجی کائنات میں اور انسانی دنیا میں فرق صرف اختیار وارادے کا ہے

اب یہ جو چیز انسانوں کی صورت میں کہی ہے کہ ایسا کروگے تو یہ ہوگا، اس میں یہ ہے کہ ایک تو یہ چیز بڑی غیر محسوس ہوتی ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی، پھر اس کے اور اس کے نتیجہ نکلنے میں ایک مدت، مہلت کا وقفہ ہوتا ہے، اور وہ چیز ظالم کے دل میں بڑا ہی فریب پیدا کرتی ہے، وہ سمجھتا یہ ہے کہ مجھے کون پوچھ سکتا ہے، اس لیے کہ اسی وقت تو اس کی کلائی نہیں مروڑی جاتی۔مظلوم کے دل میں یہ ہوتا ہے اور وہ کہتا بھی یہ ہے کہ صاحب! یہ ظلم مجھ پہ ہورہا ہے اور تم کہتے ہو کہ اس کی کھیتی پنپ نہیں سکتی، یہ کامیاب نہیں ہوسکتا، یہ تباہ ہورہا ہے، ہوتا ہے، مگر یہ ایسا تو ہے نہیں۔تو کہا جائے گا کہ اس میں تو مہلت کا وقفہ ہے مگر وہ کہتا ہے کہ ”کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک“۔ یہ شخص[1] کیا بات کہہ جاتا ہے، کیسا اطمینان دلایا کہ نہیں میاں

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

---

[1] یہ اشارہ مرزا اسد اللہ خاں غالب (1869-1797ء) کی طرف ہے۔

مہلت کے وقفے کی نوعیت اور حقائق کو پیش کرنے کا معجزانہ انداز 450الزُّمَر

مظلوم کے دل میں یہ فطری چیز ہوتی ہے کہ ہم تو ساری عمر یہ مصیبتیں برداشت کرتے ہی مرجائیں گے' اس کے بعد اگر اثر ہوا تو پھر مجھے اس سے کیا حاصل ہے کہ یہ تباہ ہوگا۔ یہ ایک چیز ہے لیکن وہ مہلت کا وقفہ تو ہر صورت میں ہے' قانون فطرت میں بھی ہے۔ اب یہ جو چیز ہے میں اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ یہ غیر مرئی (Invisible) ہوتی ہے' غیر محسوس (Imperceptible) ہوتی ہے' آدمی محسوس طور پر دیکھ نہیں سکتا کہ واقعی یہ مستبد حکمران اور ظالم تباہ ہو رہے ہیں حالانکہ ساتھ کے ساتھ ان کی تباہی ہوتی جا رہی ہوتی ہے لیکن وہ ظاہر کی آنکھوں سے دیکھا نہیں جاتا۔ اس لیے انسان اس فریب میں ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں ہو رہا' یہ محسوس نہیں ہوتا۔ اس پہ یقین رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ ایسا ہو کر رہے گا' مجھے اگر اس وقت محسوس نہیں ہوتا تو کوئی بات نہیں۔ وہ محسوس اس طرح سے نہیں ہوتا۔ عزیزانِ من! دیکھنے کی بیسیوں چیزیں ہیں جو محسوس نہیں ہوتیں مثلاً گھڑی کی سیکنڈ کی سوئی بھی اور منٹ کی سوئی بھی میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اکھڑ گئی ہوں' گھڑی تو چل رہی ہوتی ہے اور اس نے وہ وقت دینا ہوتا ہے' ایک گھنٹے کے بعد وہ جو گھنٹے والی سوئی ہے وہ ایک ہندسے کے بعد دوسرے پہ جاتی ہے لیکن آپ سامنے رکھ چھوڑیئے' آپ کہتے ہیں کہ اس میں تو کچھ بھی نہیں ہو رہا حالانکہ وہ اس وقت بھی چل رہی ہوتی ہے۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ دانہ آپ زمین میں بوتے ہیں تو اس میں نشوونما ہو رہی ہوتی ہے' آپ کو محسوس نہیں ہوتا لیکن قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ جب اس نے یہ قانون کی بات کہی تو وہ اس کی محسوس مثالیں سامنے لاتا ہے کہ تم دیکھو اور وہ ہمیشہ کائناتی قانون یا Laws of Nature یا فطرت کے جو قوانین ہیں' ان کو سامنے لاتا ہے۔ اب دیکھیے یہ قرآن کریم کا معجزانہ انداز ہے۔ کہا ہے کہ لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ الۡمِیۡعَادَ (39:20)۔ بات یہ کہی کہ ایک قانون بتایا۔ اب انسانوں کی دنیا کے اندر تو قانون بتایا تھا کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی' اس کے لیے وہ محسوس طور پر ایک مثال سامنے لاتا ہے کہ دیکھتے نہیں ہو: اَلَمۡ تَرَ (39:21) یہ جو یہاں ''تر'' ہے' یہ آنکھوں سے دیکھنے کی بات ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھتے ہو کہ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیۡعَ فِی الۡاَرۡضِ (39:21) دیکھتے ہو کہ بادلوں سے بارش برستی ہے' اس میں سے ندی نالے رواں ہوتے ہیں۔ ثُمَّ یُخۡرِجُ بِہٖ زَرۡعًا مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہٗ (39:21) اس میں کھیتیاں اگتی ہیں' پودے اگتے ہیں' رنگا رنگ پھول آتے ہیں' پھل پیدا ہوتے ہیں۔ کھیتوں کی یہ کیفیت ہے کہ ثُمَّ یُخۡرِجُ بِہٖ زَرۡعًا مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَجۡعَلُہٗ حُطَامًا ط (39:21) کھیتی ابھرتی ہے' خوشے لگتے ہیں' ان میں دانے آتے ہیں' یہ کھیتی پک جاتی ہے' زرد ہو جاتی ہے' بھوسہ الگ ہو جاتا ہے' دانے الگ ہو جاتے ہیں' ایک ایک دانے سے سات سات سو دانے نکلتے ہیں: اَلَمۡ تَرَ دیکھتے نہیں ہو تم اسے! آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اس قانون کی ہمہ گیری ہے' قرآن کریم اس کی نتیجہ خیزی کو محسوس مثال سے سامنے لایا ہے کہ دیکھتے نہیں

ہوتم اس کو۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ مثالیں حقائق تک پہنچنے کا سبب بنتی ہیں

کہنا تو اس نے یہ ہے کہ تمہارے ہاں بھی یہی صورت ہے کہ جس قسم کا کوئی بیج بوئے گا' اس قسم کی فصل کاٹے گا لیکن وہ بات ماتھے کی آنکھوں سے نہیں دیکھی جاسکتی' سمجھایا اس نے اس چیز کو ہے جو ہم ماتھے کی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ کچھ کہنے کے بعد یہ ہے جو آگے بات آتی ہے۔ کہتا ہے کہ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِاُولِی الۡاَلۡبَابِ (39:21) صاحبانِ عقل وبصیرت کے لیے اس قسم کی مثالوں میں صحیح بات تک پہنچنے کے لیے بڑا مواد ہوتا ہے۔ یعنی بات یہ نہیں تھی کہ اس نے یہ بیان کرنا تھا کہ بارش برستی ہے اور فصلیں اگتی ہیں۔ قرآن حکیم نہ تو Agriculture (زراعت) کی کتاب ہے' نہ کوئی سائنس کی کتاب ہے۔ اس نے یہ مثال لاکر کہا ہے کہ اس بات کے اندر جو میں نے کہی ہے' صاحبانِ عقل وبصیرت کے لیے بڑا ہی سامان موعظت ہے' وہ اس سے اصل بات تک پہنچ سکتے ہیں جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ عزیزانِ من! اندازہ لگائیے فطرت کے قانون کے مشاہدات اور اس کے ساتھ غور وفکر کی بات آگے کہی ہے۔ اس غور وفکر کے بعد کہا کہ اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَہُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ (39:22) دیکھیے! اسلام کے لیے دل کی کشاد اس طرح سے ہوتی ہے کہ قوانین فطرت پر غور وخوص کرو' پھر اس کے بعد یہ سوچو کہ یہی قوانین' جب انسانی زندگی پر منطبق ہوتے ہیں' تو ان کا بھی اس طرح سے یقینی طور پر نتیجہ نکلے گا۔ ظلم کا نتیجہ کامرانیاں نہیں ہوسکتا' یہ قانون ہے۔

دل ودماغ کی آبیاری کے لیے وحی چراغِ راہ ہے

وہ Law of Nature (قانونِ فطرت) کی بات کہتا ہے۔ وہ کھیتی اُگنے کی مثال دے رہا ہے' آخر میں کہہ رہا ہے کہ یوں صرف دیکھنے کی بات نہیں' اس پہ غور کرنے سے تم اس حقیقت تک پہنچ جاؤ گے جو درحقیقت میں تمہارے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ اور یہ طریقہ ہے کہ اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ (39:22) اسلام کے لیے سینے کے کھل جانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ قوانینِ فطرت پر غور وفکر کریں۔ سوچیے' عزیزانِ من! جہاں ہمارے ہاں غور وفکر ہی حرام ہو' فطرت کے قوانین کا تصور ہی نہ ہو' وہاں اسلام کے لیے شرح صدر کیسے ہوسکتا ہے۔ یعنی اس کے لیے کیا لفظ ہے! اس کے لیے کشاد کی ضرورت ہے' اس سے ان کا سینہ کھل جاتا ہے کہ جو قوانینِ فطرت پر غور وخوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہی قوانین' جو انسانی زندگی کے لیے خدا نے دیئے ہیں' وہ بھی اسی طرح سے نتیجہ خیز ہونگے' اس کے قوانین اٹل ہیں۔ جو عقل وبصیرت کی رو سے اس نتیجے پہ پہنچے اور فَہُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ (39:22) پھر قرآن کریم کی شمع اور اس کی جو روشنی ہے' وہ اس کے ہاتھ میں ہو یَمۡشِیۡ بِہٖ فِی النَّاسِ (6:122) اُسے لے کر پھر وہ انسانوں کی دنیا میں چلے پھرے۔ یہ ہے

اسلام۔ اسلام کے لیے کشادِ قلب میں پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ عقل وفکر سے کام لے کر مشاہداتِ فطرت پر غور کرے۔ سوچیے' عزیزانِ 450 الزُمَر من! کہ جس مقام پہ آج ہم ہیں' اس میں ہم تو اسلام کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کا تو طریقہ یہ ہے۔ ہمارا شرح صدر کس طرح سے ہوسکتا ہے جبکہ اسلام کے متعلق' ہم تو جانتے ہی نہیں ہیں کہ قوانینِ فطرت کیا ہیں' وہ کس طرح کارفرما ہیں' کس طرح نتیجہ خیز ہیں' کیسے اٹل ہیں؟ وہ سب کچھ ہم نہیں جانتے۔

وحی کی روشنی کے بغیر تنہا عقل انسانی کی زبوں حالی کا ماجرا اور اقوامِ مغرب کی مثال

عزیزانِ من! پھر یہ ہے کہ تنہا عقل وفکر اور قوانین فطرت ہی نہیں' یہ تو مغرب کی ساری قومیں اس کو لیے ہوئے ہیں۔ یہاں تک تو وہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ قوانین اٹل ہیں اور نتیجہ خیز ہیں' وہ اس سے آگے نہیں بڑھتے کہ انسانی زندگی کے لیے یہ بھی اسی طرح قوانین ہیں' وہ بھی اسی طرح سے نتیجہ خیز ہوتے ہیں اور اٹل ہیں۔ وہ اس سے آگے کیوں نہیں بڑھتے؟ کہا کہ اگلی شرط یہ ہے کہ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ((39:22 وہ اپنی عقل کو وحی کی روشنی میں چلائے۔ مشاہداتِ فطرت سے انسان کی عقل کی پختگی پہلی شرط ہے' یہ نہیں ہے تو اگلی شرط بیکار ہے۔ سورج کی روشنی سے فائدہ اٹھانے کے لیے آنکھوں کا کھولنا اشد ضروری ہے' ناگزیر ہے' آنکھیں نہیں کھلی ہونگی تو سورج کی روشنی فائدہ نہیں دے گی اور سورج کی روشنی نہیں ہوگی تو کھلی ہوئی آنکھیں بھی فائدہ نہیں دیں گی۔ مغرب جہاں جا کر تباہی پہ پہنچ رہا ہے' وہ یہ ہے کہ وہ عقل انسانی کی رو سے ان تمام مراحل کو طے کر رہا ہے' وحی کی روشنی اس کے پاس نہیں ہے' وہاں وہ اپنی عقل سے ہی فیصلے کرتا ہے اور تباہی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں عقل وفکر ہی سرے سے نہیں ہے' اگلی تو آ ہی نہیں سکتی یعنی آنکھیں ہی بند ہیں تو سورج کا ہونا ہمارے لیے کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ وہ اہلِ مغرب فطرت کے قوانین پہ غور کر کے کم از کم دنیاوی مفاد تو حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں سے نہیں تو چاند پہ پہنچ کر وہ کہتے ہیں کہ وہاں مملکت قائم کر لیں گے۔ اس قدر قوانینِ فطرت کے مطالعہ کے بعد انہوں نے فطرت کی تسخیر کی ہے' ساری دنیا پہ حکومت کر رہے ہیں۔ اگلی چیز اور ہے کہ قرآنی وحی کی روشنی وہ شمع نورانی ان کے ہاتھ میں نہیں ہے تو ان کی زندگی کی راہیں تاریک ہیں۔

دنیا بھر میں مذہب پرست قوموں کی کیفیت

ہمارے ہاں تو خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ((22:11 ہمارے لیے نہ اس دنیا کی راہیں روشن ہیں اور نہ عاقبت کی حالانکہ قرآن مجید کہتا ہے کہ وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى ((17:72 جو اس دنیا کا اندھا ہے' وہ عاقبت میں بھی اندھا ہوگا۔ یہ ہے جسے اس نے خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ((22:11 کہا' دنیا میں بھی تباہی' آخرت میں بھی نقصان۔ مذہب پرست قوم کی یہ کیفیت ہوتی

ہے۔ساری دنیا میں جہاں جہاں مذہب کا غلبہ ہے وہ قوم کبھی ترقی نہیں کرسکی' نہ کرسکے گی' اس لیے کہ وہاں عقل وفکر سے کام لینا حرام قرار دیا جاتا ہے' وہاں فتویٰ دیا جاتا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال حرام ہے۔ وہ سوال کسی ایک مذہب کا نہیں ہے' جس جس قوم نے بھی اس دنیاوی مقاصد میں ترقی کی ہے' وہ قوم وہ ہے جس نے مذہب کو چھوڑ دیا ہے' تو وہ وہاں سے نکل کر دنیاوی مفاد تو حاصل کرگئی۔ اب یہ بات ہے کہ ان کی قومی اعتبار سے وہ تباہی آتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ قرآن حکیم کی وحی کی روشنی ان کے پاس نہیں ہے۔ عقل انسانی اور وحی کی روشنی کا نام دین ہے۔

قرآنِ حکیم کا دنیائے انسانیت کے لیے فلاح و بہبود کا پروگرام اور شرحِ صدر کے لیے وحی کی اہمیت مگر سمجھو تو!!

آپ نے دیکھا کہ قرآن حکیم نے شرح صدر بتایا ہے' اسلام کے لیے شرط یہ بتائی ہے کہ قوانینِ فطرت اور ان کی نتیجہ خیزی پر غور وفکر کرو اور اس سے پھر اس نتیجے پہ پہنچو کہ جو قوانین قوموں کی فلاح و بہبود اور تباہی کے لیے دیئے گئے ہیں' وہ اسی طرح سے اٹل ہیں جس طرح فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ کہا ہے کہ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ(39:22) جن کے دلوں کے اندر اس کے لیے احساس تک بھی نہ ہو کہ یہ کیا قوانین ہیں' کس طرح کارفرما ہیں' کیسے نتیجہ خیز ہیں' کیا کچھ ہو رہا ہے' تو وہ کبھی صحیح راستے پہ آ ہی نہیں سکتے' ان کے لیے ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ(39:22) ہے' وہ کھلی ہوئی گمراہی کے اندر ہیں۔ کہا ہے کہ ذرا دیکھیے تو سہی کہ خدا نے یہ جو کتاب نازل کی ہے' اس کتابِ خداوندی کی خصوصیاتِ کبریٰ کیا ہیں؟ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ (39:23) اس نے بات بیان کی ہے کہ یہ احسن ہے' یہ جسے انگریزی زبان میں Superlative Degree (درجہ تفصیلِ کُل) کہتے ہیں' یہ وہ لفظ ہے یعنی جو کسی شے کی مکمل ترین شکل ہو۔ یہ حسن میں تکمیل تک پہنچی ہوئی کتاب ہے' اور حسن نام ہے صحیح Proportion (تناسب) کا' صحیح توازن کا۔ یہ اتنی Balanced (متوازن) کتاب ہے' احسن کے درجے پہ پہنچی ہوئی یہ کتاب ہے۔ اس کی خصوصیات یہ ہیں کہ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (39:23) اس کے اندر باہمی ربط ہے' ایک مضمون کو دوسرے کے ساتھ مشابہت حاصل ہے' اس میں کسی طرح سے بھی تضاد نہیں ہے' یہ سب چیزیں ملتی جلتی ہیں لیکن اس کے لیے تو غور وفکر چاہیے' شرحِ صدر کی ضرورت ہے' یہ ان آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے کہ کس طرح ان میں ربط باہمی ہے۔ اور جو غور وفکر کو ہی حرام سمجھیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ بڑے فخر سے' دھڑلے سے' کہیں گے کہ صاحب! جو قرآن کریم ہے' وہ بے ربط ہے' اس میں تو ربط ہی کوئی نہیں ہے' کبھی دیکھیے حضرت نوحؑ کا قصہ ہے' پھر وہ حضرت لوطؑ کا قصہ چلا آ رہا ہے' کہیں کھیتی کی مثال آ رہی ہے' کہیں چاند کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ ارے

450الزُّمَر

محرم نہیں ہے تُو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

متضاد چیزوں سے حقائق تک پہنچنے کا طریق اور قرآنِ حکیم کا بات کو کھول کر سمجھانے کا انداز

اس حجاب کو تو دل کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ جب شرح صدر ہی نہیں ہوگا تو ربط کہاں سے نظر آئے گا۔ کہا کہ یہ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا ((39:23 ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ مَّثَانِيَ ((39:23 ہے۔ Juxtaposition ہوتا ہے ''دو متضاد چیزوں سے حقیقت کو واضح کرنا' متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لاکر مطلب کی وضاحت کرنا'' اور یہ ایک بڑا ہی مؤثر و بیّن طریق ہوتا ہے' مثلاً روشنی کے مقابلے میں تاریکی۔ بات روشنی کی سمجھ آجاتی ہے جب پتہ ہو کہ تاریکی کیا ہوتی ہے' اگر کہیں تاریکی ہو ہی نہیں' تو آپ سمجھیں ہی نہیں کہ روشنی کسے کہتے ہیں۔ رات کی تاریکیوں کے بعد پہلی کرن آتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ سورج نمودار ہوا۔ چوبیس گھنٹے اگر سورج ہی رہے تو اس کے متعلق آپ Define (متعین) ہی نہ کر سکیں کہ روشنی کسے کہتے ہیں۔ یعنی یہ ایک انداز ہوتا ہے' طریق ہوتا ہے متضاد چیزوں کو آمنے سامنے رکھ کر مطلب کی وضاحت کرنے کا۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

وہ جو قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے' جسے آپ اضداد کہتے ہیں' وہ میری ''تبویب القرآن'' [1] میں اضداد پر ایک Chapter (باب) ہے کہ قرآن حکیم نے متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لاکر کس طرح سے اپنی بات کو واضح کیا ہے۔ یہ اس طرح سے جو چیزیں آمنے سامنے لائی جاتی ہیں' ان کو مثانی کہتے ہیں' یہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے لانا اور کسی چیز کو دہرانا ہے۔ اسے انگریزی میں By Juxtposition کہتے ہیں۔ تصریف آیات اس کا طریقہ ہے' قرآن حکیم ان چیزوں کو دہراتا ہے' ان چیزوں کو تضادات سے آمنے سامنے لاتا ہے' اس میں ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت ہے۔ اور یوں پوری کی پوری کتاب الحمد سے والناس تک ایک مربوط کتاب بھی ہے اور اپنی وضاحت آپ بھی کرتی ہوئی چلی جاتی ہے' کبھی دہرا دہرا کر اور کبھی تضادات کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے لاکر تاکہ بات کھل کر سمجھ میں آسکے۔

علم و دانش کا پیڑ خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو' عملی جذبے کے بغیر ثمر بار نہیں ہو سکتا: یہ قلب (جذبے) کی چیز ہے

کہا ہے کہ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى

---

[1] اس کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: تبویب القرآن' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1977' ص ص۔ 151 تا 161' عنوان ہے: اضداد (فلسفۂ اضداد)

سبحان اللہ! 450 الزُّمَر اللّٰہِ ((39:23 ایک چیز ہے کہ جسے آپ ذہنی طور پر، فکری طور پر Appreciate (پسند) کرتے ہیں مثلاً کیا بات ہے! نکتہ ہے صاحب! وجد آ گیا! ذہن تک اس کا تعلق ہے، وہ تعلق آگے نہیں بڑھتا۔ کہا کہ یہ جو چیزیں ہم نے بتائی ہیں، وہ اولی الالباب عقل و فکر کی بات ہے، غور و تدبر کی بات ہے، علم و بصیرت کی بات ہے۔ لیکن اس کتاب کا مقصود صرف یہ نہیں ہے کہ تمہیں ذہنی جلا دیدے، تمہارے ذہنوں میں آ جائے کہ صاحب! بڑی بلند فکری سی کتاب ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ اس کا مقصد تو دلوں کے اندر تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ آپ اسے جذبات کہہ لیجیے، انسانی نفسیات کہہ لیجیے، انسانی قلب کہہ لیجیے، وہ اندر ایک قوت ہے جو انسان کے عمل کی محرک ہوتی ہے۔ یہ جو ذہنی طور پر آپ کسی چیز کو سمجھ لیتے ہیں، وہ آپ کے لیے کسی عمل کی محرک نہیں بنتی ہے۔ مثلاً نیکی بڑی اچھی چیز ہے، سچ بولنا بڑا اچھا ہے، کون ہے جو یہ کہتا ہے کہ نہیں، یہ اچھا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر کیوں نہیں سچ بولتا۔ یہ جو کہا ہے کہ یہ سچ بولنا بہت اچھا ہے، یہ ایک فکری اور ذہنی چیز ہے۔ اُسے کہیں گے تو شاید وہ گھنٹوں نہیں، مہینوں اس کے اوپر لیکچر دیتا چلا جائے گا کہ سچ بولنا بہت اچھا ہوتا ہے، دلائل پہ دلائل دیتا چلا جائے گا مگر بولے گا جھوٹ۔ یہ تضاد کیا بات ہے! وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، دماغ سے کہہ رہا ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ وہ سچ بولے یہ قلب کی چیز ہے، قلب محسوس کرے کہ جھوٹ بولنے سے نقصان ہوگا اور سچ بولنے سے فائدہ ہوگا۔ یہ ہے کہ ''قلب محسوس کرے''۔ دماغ تو صرف دلائل دے گا۔

دل اور دماغ کی باہمی رفاقت قلبِ سلیم کے ساتھ متحرک جذبے کی بھی متمنی ہوتی ہے

آپ کو یاد ہے اس سے پہلے بھی یہ چیزیں آئی ہوئی ہیں۔ یہ بڑی اہم چیز ہے جو قرآن حکیم کہتا ہے۔ سقراط (469-399 B.C.) نے جو کہا تھا کہ Knowledge is Worship یہ اس کا فلسفہ ہے کہ نیکی علم کا نام ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ علم نہ ہو تو انسان برائی کے راستے پر بھی جاتا ہے لیکن کسی چیز کا جو محض علم ہونا ہے، یہ انسان کے عمل کا محرک نہیں ہوتا کہ وہ صحیح راستہ بھی اختیار کرے۔ کتنی چیزیں ہیں جن کا ہمیں علم ہے مثلاً فریب دینا غلط ہے، وعدہ خلافی کرنا غلط ہے، استبداد غلط ہے، ظلم غلط ہے، یہ کسے علم نہیں ہے۔ ان چیزوں کے متعلق لیکچر پہ لیکچر، تقریروں پہ تقریریں چلی آ رہی ہیں اور کیا اس کے خلاف جا رہا ہے۔ تو جو چیزیں آئیں، سقراط کا جو پہلا مسلمہ ہے کہ اگر کسی چیز کا علم ہو تو وہ نیکی ہوتی ہے، صرف علم Virtue (نیکی) نہیں ہوتا۔ علم سے ایک بات سیکھی جا سکتی ہے کہ سنکھیا مہلک ہے، علم بتا دے گا کہ سنکھیا مہلک ہے، اس کے بعد یہ بات کہ مجھے سنکھیا نہ کھانا چاہیے، نہ کسی دوسرے کو دینا چاہیے، یہ اگلی چیز ہے۔ یہ جو علم سے فائدہ اٹھانا ہے، صحیح مصرف میں لانا ہے یہ محرک جذبہ اور ہے، یہ جسے اندر قلب کہا جاتا ہے اس میں ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم قلبِ سلیم پر زور دیتا ہے کہ قلب جھک جائے۔ اگر قلب ان چیزوں کے سامنے جھک جائے جنہیں، عقل نے صحیح مانا ہے، پھر آدمی صحیح راستہ اختیار کرتا ہے۔

صرف علم سے نہیں کرتا۔آپ کو یاد ہوگا وہ (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1869-1797ء) کا شعر میں عام طور پہ دہرایا کرتا ہوں[450] وہ کیا عجیب چیز کہہ گیا ہے:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یہ اگلی کیا چیز ہے جو ''طبیعت ادھر نہیں آتی؟'' کیا بات ہے اس شخص کی! وہ نہایت سادہ سا شعر ہے' بہت بڑا فلسفہ ہے جس کو حل کر گیا ہے' یہ ارسطو' سقراط وغیرہ' کی تردید کر گیا ہے اور زندگی میں جو ہمارا تجربہ ہوتا ہے' اس تجربے کی شرح کر گیا ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد

ہم سب جانتے ہیں کہ جو جبر واستبدا ہے وہ فرد کے لیے بھی' قوم کے لیے بھی' انسانیت کے لیے بھی' تباہ کن ہوتا ہے' یہ اس لیے ہے کہ اس میں کچھ لذت ملتی ہے ''منہ میٹھا ہوندا ہیگا جناب''۔تو یہ جو چیز ہے جو قرآن حمید نے یہاں کہا تھا کہ اولی الالباب ہیں' صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں جو ان چیزوں پہ پہنچتے ہیں تو فوراً وہ چیز آئی کہ وہ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ سقراط والا معاملہ ہے' سمجھنے کی ہی ساری بات ہے' بالکل نہیں' یہ صرف سمجھنے کی بات نہیں ہے۔ یہ ہے تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (39:23) ان قوانینِ خداوندی کے انجام پہ جن کی نگاہ ہوتی ہے' وہ ذہن سے سمجھتے ہیں تو کانپ اٹھتے ہیں' ان کا دل اس کے سامنے جھک جاتا ہے۔قرآن حمید یہاں وہ دونوں چیزیں لے آیا۔محض سمجھنا ہی کافی نہیں ہے۔

قرآنی شمع کو نظر انداز کرنے سے سیرت سازی کی مفلسی فکری نہیں' قلبی ہے: اہل مغرب کی اور قرآنِ کریم کی مثال میں فرق

بڑے بڑے مفکر' کتابوں کے بڑے بڑے مصنف' آپ دیکھیں گے کہ علم کے اعتبار سے اتنے اونچے ہیں مگر سیرت پہ نگاہ ڈالیے تو نہایت گھناؤنی نظر آتی ہے' علم کا کوئی شائبہ ہی ان کے کردار میں نظر نہیں آتا۔اور مغرب والوں نے تو ان دونوں چیزوں کو الگ ہی کر لیا' اب ان کے ہاں Private Ethics & Public Ethics دو الگ الگ چیزیں ہیں' علم شے ہی اور ہے' فلسفہ شے ہی اور ہے' ذاتی کردار شے ہی اور ہے۔وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔پہلی ضروری چیز یہ ہے: مشاہدات فطرت' قوانینِ فطرت' ان کا مطالعہ' مشاہدہ' عقل وفکر کی رو سے نتیجے پر پہنچنا' پھر قرآن حکیم کی شمع کو ہاتھ میں لینا اور اس سے بھی فکری طور پر یہ نہیں کہنا کہ قرآن حکیم کی کیا بات ہے' یہ بہت عجیب مستند کتاب ہے۔کہا ہے کہ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ (39:23) اس سے جلد کانپ اٹھے' دل جھک جائے' کہا ہے کہ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ (39:23) یہ ہے ہدایتِ خداوندی۔کیا بات ہے صاحب! کس قدر خوبصورت انداز میں یہ شخص کہہ دیتا ہے کہ

450الزُمَر

خرد نے کہہ بھی دیا 'لاالہٰ' تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
(اقبالؒ:ضربِ کلیم)

یہ '' کچھ بھی نہیں''، بڑی چیز ہے۔ وہ جو پہلی چیز تھی وہ بھی کچھ نہیں' ذہنی اور دماغی طور پر بھی' آپ ان نتائج پہ پہنچ گئے کہ صاحب! ہاں' فلسفیانہ حیثیت سے فکری طور پر بڑی بلند چیز ہے مگر'' دل ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں''۔ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ ثُمَّ تَلِيۡنُ جُلُوۡدُهُمۡ وَقُلُوۡبُهُمۡ اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ((39:23 یہ ہے ہدایت' یہ Mechanically (میکانکی طور پر) حاصل ہونے والی چیز نہیں ہے' یہ رسمیات سے چیز پوری نہیں ہوسکتی' یہ ذہنی اور فکری طور پر بھی یہ جو چیز ہے یہ سمجھنا ضروری ہے لیکن ہدایت وہی نہیں ہے۔ ضروری یہ ہے کہ ذہن اور فکر کو متاثر کرے' انسان کے قلب کو متاثر کرے اور پھر یہ اس راستے کے اوپر چلے تو پھر طبیعت ادھر آ جاتی ہے۔ کیا بات ہے! ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ ((39:23 یہ ہے ہدایتِ خداوندی' یہ ہے صحیح راہنمائی' یہ ہے صحیح راستے پہ چلنے کا طریقہ۔

اب بات سمجھ میں آ گئی ہے ایک تو وہ ہے کہ جو بہرحال غوروفکر ہی نہیں کرتے' پھر جو غوروفکر کرنے والے ہیں فکری طور پہ دیکھیے تو کتنے کتنے جناب کمرے بھرے ہوئے ہیں کتابیں لکھ لکھ کر' سوسو جلدیں ہیں ایک ایک قرآن کی تفسیر کی۔ '' دل ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں''، یہ ہے ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ((39:23 جو اس طریق کے اوپر' صحیح راستے کے اوپر نہیں آتا' اس کے سامنے صحیح راستہ آتا ہی نہیں ہے' فکری طور پر اگر اس کے متعلق ساری عمر یہ سب کرتا رہے' وہ کہتا ہے کہ نہیں' اگر اس کا اثر قلب پہ نہیں ہے' وہ متاثر نہیں ہے' تو وہ صحیح راستے پہ نہیں آ سکتا۔ کہتا ہے کہ ایک اور بھی بات ہے کہ اَفَمَنۡ يَّتَّقِىۡ بِوَجۡهِهٖ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ (39:24) دوسری قسم کے لوگ ہیں' یہ وہی ہیں جنہوں نے ذہنی طور پہ معلوم کرلیا ہے کہ یہ چیز واقعی خطرناک ہے' تباہ کن ہے' اس تباہی سے بچنے کے لیے قانونِ خداوندی ہی سے اس کی حفاظت ہوسکتی ہے مثلاً اگر انگلی آگ میں ڈال لی ہے اور وہ جل گئی ہے تو اس کے لیے جو خدا نے جڑی بوٹی بتائی تھی' جس کی مرہم بنائی تھی' اس سے اس کو آرام ہوگا۔ قانون کی خلاف ورزی کے جو تباہ کن نتائج ہیں' ان سے بچنے کے لیے قرآن نے جو دوسرا قانون دیا ہے وہ اس کے اتباع سے ہے' ٹونے ٹوٹکے سے نہیں۔

ظلم واستبداد کا سدِ باب کرنا تنہا عقلِ انسانی کے بس کی بات ہی نہیں ہے: ایک توجہ طلب نکتہ

اگلی چیز یہ ہے کہ ظلم واستبداد کی رو سے جو تباہیاں آتی ہیں قرآن حکیم کہتا ہے کہ وہ لوگ ہیں جو ان کو روکنے کے لیے پھر اپنی ہی

تدبیریں کرتے رہتے ہیں' قانونِ خداوندی کو سپر نہیں بناتے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ نہیں' اس سے ظلم واستبداد نہیں رک سکتا۔ تم نے خدا کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے' اس کی وجہ سے معاشرے کے اندر یہ تباہیاں آرہی ہیں' اس کی حفاظت کا ذریعہ یہ ہے کہ خدا کے قانون ہی کی طرف آؤ' اس سے عذاب سے بچا جاسکتا ہے اور خدا کا قانون یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ (11:14) تم نے جتنی غلط کوشیاں کی ہیں' ان کے مقابلے میں اتنی ہی ان سے زیادہ صحیح باتیں کرو' تو پھر اس کا کفارہ ہوسکے گا۔ اور اگر تم اپنی ہی تدبیروں سے چاہو گے کہ یہاں یہ کمزوری رہ گئی تھی مثلاً وہاں تھوڑے پولیس والے کھڑے کیے تھے اس واسطے یہ ہوگیا ہے' زیادہ فورس کر دیجیے اور یہ اس قسم کا قانون بنالیجیے' اور اس قسم کا انداز اختیار کر لیجیے تو اس سے تباہی سے بچ جاؤ گے' قرآن حکیم کہتا ہے کہ اپنی ہی تدبیروں سے چاہتے ہیں کہ خدا کے قانون کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے بچ جائیں۔ یہ نہیں ہوسکتا' تباہ کن نتائج سے نہیں بچا جاسکتا۔

عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں کہ یہ قرآن حکیم کیا ہے۔ کہتا ہے کہ نہیں بچ سکتے یہ ایسا کچھ کرنا ان کی بھول ہے۔ اس کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے تو پھر اسی کے قانون کی طرف رجوع کرنے سے تم بچ سکتے ہو۔ اور یہ جو رحیم کہا ہے' رحم کہا ہے' رحمت کہا ہے' وہ یہ ہے کہ جہاں اس کے قانون کی خلاف ورزی سے تباہی آتی ہے' اس نے اس کے مداوا کے لیے بھی' ایک تجویز رکھی ہوتی ہے۔ آگ کے جلنے سے جہاں انگلی میں درد ہوتا ہے' اس نے اس کے ساتھ ہی ایک بُوٹی پیدا کی ہے' تمہیں اس کا علم ہونا چاہیے' وہ لگادو گے تو اس سے آرام ہو جائے گا۔ رحمت یہ ہے کہ اگر اس کے قانون کی خلاف ورزی سے کوئی تباہی آتی ہے' تکلیف آتی ہے تو اس نے اس کی Provision (فراہمی) کر رکھی ہے کہ اس کے لیے مداوا کیا کیا جائے گا۔ اضداد یہ بھی ہیں۔ کہا کہ یہ ہے اس کا طریقہ۔ تباہی کے وقت بھی یہ لوگ پھر خدا کے قانون کی طرف نہیں آتے' اپنی ہی غلط کوشیوں سے تباہیاں لاتے ہیں اور پھر اپنی تدبیروں سے اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی دوہری گمراہی ہے۔ وَقِیْلَ لِلظّٰلِمِیْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (39:24) ظہورِ نتائج کے وقت کہا جائے گا کہ جتنا جی چاہے تم اپنی یہ تدبیریں کرتے رہو' تمہارے اعمال کے جو تباہ کن نتائج تھے' تمہیں ان نتائج کو چکھنا پڑے گا۔ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ (39:25) وہاں پہلے خارجی کائنات آئی تھی' وہاں فطرت کے قوانین تھے اور مشاہداتِ فطرت ہی کی طرف توجہ دلائی تھی۔

قوموں کی موت وحیات کے سلسلہ میں قرآنی قوانین کی صداقت کے پیشِ نظر سابقہ اقوام کا تذکرہ

اب یہاں (39:25) میں بات ہوئی ہے کہ انسانوں کی دنیا میں تباہیاں کیسے آتی ہیں تو اس کے لیے قرآن مجید کیا کرتا ہے؟ کرتا یہ ہے کہ اقوامِ سابقہ کی تاریخ کو سامنے لاتا ہے کہ تم دیکھ لو۔ یہ فرعون' نمرود اور شدّاد اور ان لوگوں کی قرآن مجید جو تاریخیں (Histories)

لاتا ہے' وہ ہمارے لیے کیا ہیں' وہ یہ ہیں کہ جب جس زمانے میں' جس قوم میں' جس ملک میں' کوئی ایک انسان خدا ہونے کا دعویٰ کر دے کا 450 الزُّمَر اور اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ((79:24 کہہ دے گا تو ساری قوم ڈوب کر مر جائے گی۔ اور کہا ہے کہ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ((10:64 یہ بات کسی خاص فرعون کے متعلق نہیں ہے' جہاں بھی کسی کی انانیت نے یہ کہا' جہاں بھی وہ مستبد ہوا اور جابر ہوا اور آمر ہوا اور ڈکٹیٹر ہوا اور اس نے رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى کا دعویٰ کیا' نتیجہ اس کا تباہی ہوگا۔ یہ ہے جو قرآن مجید کہتا ہے۔ اسی لیے جب وہ انسانوں کی دنیا کی طرف آتا ہے کہ ہمارے ان قوانین کی خلاف ورزی سے تباہی آئے گی تو وہ اپنے دعوے کی صداقت کے ثبوت میں تاریخی شواہد پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ((39:25 اس سے پہلے بھی قومیں گزریں' ان سے جب کہا کہ سنکھیا کھاؤ گے تو ہلاک ہو جاؤ گے' انہوں نے کہا کہ کیا باتیں کر رہے ہو' ہلاک ہو جاؤ گے!'' دیکھو تو سہی ہم کیسے پنپ رہے ہیں۔

سرکش عقل انسانی شعور کو ہی مفلوج کر دیتی ہے تو انہیں تباہی نظر نہیں آتی

اس کے بعد کہتا ہے کہ فَاَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ)(39:25 تباہی پھر ان کے اوپر ان مقامات سے آ گئی جو ان کے عقل و شعور میں بھی نہیں تھے۔ اپنی تدبیروں سے' عقل و شعور کی رو سے' تو انہوں نے وہ خانے بند کیے تھے' یہاں سے بھی نہ آئے' یہاں سے بھی نہ لیکن وہ تباہی ان راستوں سے آ جاتی ہے جو ان کے عقل و شعور میں بھی نہیں ہوتے۔ اور وہ عقل و شعور میں کیوں نہیں ہوتی؟ اس لیے کہ یہ قوت کا جنون' عزیزانِ من! عقل و شعور کو ماؤف کر دیتا ہے' شرابی کی سمجھ میں بات نہیں آتی کہ یہاں کہاں سے تباہی آئے گی ''کون آ سکدا اے ساڈے سامنے'' (ہمارے سامنے کون آ سکتا ہے!) یعنی یہ جو نشے کی انانیت ہوتی ہے' وہ صحیح نتیجے کو دیکھنے نہیں دیتی' یہ بصارت اور سماعت اور سمجھ اور فہم سارے ماؤف ہو جاتے ہیں۔ دوسرا آدمی جس نے نہیں پی ہوتی ہے' جس کو نشہ نہیں ہوتا' وہ یہ کہتا ہے کہ ''او اینوں آ گل وی نظر نہیں اوندی ایس اندھے نوں'' (اس اندھے کو یہ بات بھی نظر نہیں آتی)۔ نظر آتی ہو تو انسان ایسا نہیں ہے کہ اس کے باوجود پھر وہ اس آگ میں ہاتھ دیدے' اس کو آگ نظر نہیں آتی۔ وہ تو مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ((39:25 ہوتی ہے۔ وہ صرف فکری طور پر چاہتے تھے کہ تدبیروں سے بچ جائیں' نہیں بچ سکتے' وہ تو ایسے مقامات سے تباہی آتی ہے جو ان کے عقل و شعور میں بھی نہیں ہوتے۔

رومن ایمپائر کی سبق آموز داستان تباہی کی زندہ شہادت ہے اور وضاحتِ قرآن کریم کی غرض و غایت

عزیزانِ من! تاریخِ عالم اس سے بھری پڑی ہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ اگر آپ گبن کی Decline & Fall of the Roman Empire پڑھ کر دیکھیں تو اس میں وہ دکھا رہا ہے کہ اس دور میں رومن ایمپائر کے اندر اتنے اتنے بڑے عقلمند اور مفکر تھے'

اور تاریخ کے سامنے ایسی چیزیں آتی ہیں، وہ کہتا ہے کہ اب جو میں لکھ رہا ہوں تو پڑھنے والے یہ کہیں گے کہ ان اندھوں کو وہ نظر نہیں آ تا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اس کا کیا، علاج کا نظر نہیں آ تا تھا۔ آج بھی نہیں نظر آ تا۔ جو مدہوش نہیں ہوتے وہ آج بھی یہ بات کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات بھی نظر نہیں آتی۔ کہا ہے کہ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْیَ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ((39:26۔ ہمارے ہاں تو ہر چیز قیامت پہ اٹھا رکھی ہوتی ہے کہ وہاں جا کر ملے گا، عذاب بھی وہاں ملے گا، ثواب بھی وہاں ملے گا۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ قوموں کا عذاب یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی کے اندر ذلت ہے، وہ قوم ذلیل ہو جاتی ہے۔ عزیزانِ من! دوسری قوموں کے مقابلے میں ذلیل ہو جانا اور اپنے آپ کو ذلیل سمجھنا یہ ہے خِزْیَ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا)(39:26۔ کہا ہے کہ یہ تو یہاں کی بات ہے اور معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَکْبَرُ ((39:26 یہ تو حال کی بات ہے اور مستقبل میں جو عذاب آنے والا ہے، تباہی آنے والی ہے، وہ اس سے بھی زیادہ شدید ہوتی ہے۔ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ)(39:26 اے کاش! یہ اس بات کو سمجھتے جو ہم کہہ رہے ہیں لیکن میں نے جو عرض کیا ہے کہ وہ سمجھیں کیسے، وہ تو انہوں نے سمجھ کی اور بوجھ محسوس کرنے کی صلاحیتوں کو مفقود کر رکھا ہوتا ہے۔ یہ لَوْ کَانُوْا)(39:26 عجیب بات ہے کہ سمجھنے کی صلاحیت تو ان میں ہوتی ہے، اے کاش! یہ ان کو کام میں لے آئیں حالانکہ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ)(39:27 ہم اس قرآن میں مختلف مثالوں، اور اقوامِ سابقہ کی تاریخی شہادتوں سے مطالب کی وضاحت کرتے ہیں لَعَلَّهُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ)(39:27 تا کہ کسی طرح سے تو یہ سمجھ جائیں۔ اس مقصد کے لیے ہم نے قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ)(39:28 کہا ہے۔ قرآن کے معنی ہوتا ہے، اعلان عام کر دینا ہوتا ہے۔ Proclamation یہ تمام نوعِ انسانی کے لیے اعلانِ عام ہے، یہ عربیًّا ویسے تو عربی زبان کے لیے لفظ ہے لیکن بنیادی طور پر خود عربی کے معنی ہی ''واضح'' کے ہیں۔

تباہی کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی پکار نیز لفظ عِوج اور عَوج کا بنیادی فرق

قرآن حکیم تمام نوعِ انسانی کے لیے اعلانِ عام ہے، نہایت واضح ہے۔ اور آگے غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ)(39:28 کہا ہے۔ یہ عربی زبان عجیب زبان ہے۔ عِوج کا یہ لفظ ع کے زیر کے ساتھ ہے، اگر یہی لفظ ع کے زبر کے ساتھ ہو یعنی عَوج ہو تو سُنیے! عَوج اس ٹیڑھ کو کہتے ہیں جو آنکھوں سے دیکھی جا سکے مثلاً دیوار ٹیڑھی، لکڑی ٹیڑھی، جو محسوس شکل میں ٹیڑھ پن نظر آ جائے اس کو وہ عَوج کہتے ہیں۔ اور وہ پیچ وخم، وہ خمیدگی اور ٹیڑھ پن، جو عقل وبصیرت کی رو سے سمجھ میں آئے، اسے عِوج کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ ((39:28 ''اے دوفٹا لے کے نہ ماپن، پئی جاؤ تسی کہ جی سیدھ ہے یا نہیں'' (یہ پیمانہ لے کر نہ ماپیں کہ لو جی! آپ جانیں کہ یہ سیدھی ہے یا نہیں)۔ عقل وبصیرت کی رو سے یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ اس میں کوئی پیچ وخم نہیں ہے، کوئی ٹیڑھ پن نہیں۔ یہ اعلانِ عام

ہے واضح کتاب ہے اس میں کوئی ٹیڑھ پن نہیں ہے لیکن یہ عقل وبصیرت سے سمجھ میں آئے گی۔اس کے مقصد کے لیے میں نے عرض کیا تھا کہ 450 الزُّمَرْ
قرآن حمید جہاں کوئی بات لَعَلَّھُمْ سے کہتا ہے تو اس لَعَلَّھُمْ کے معنی یہ ہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا اگر ایسا تم نے کیا تھا۔ یہاں کہا ہے کہ لَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ ((39:28 تاکہ یہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں۔ جب یہ یقین ہوجائے کہ مکمل کتاب ہے واضح کتاب ہے پیچ وخم کوئی نہیں ہے منزل مقصود تک صحیح پہنچانے والا راستہ ہے تو پھر تو بہر حال اتنا کچھ سمجھنے کے بعد چاہیے کہ وہ صحیح راستے پہ چلیں بشرطیکہ یہ ان کے قلب کو متاثر کرے۔

غلط اور صحیح راستے کی پہچان کی وضاحت

کہا ہے کہ صحیح راستہ کیا ہے غلط راہ کیا ہے یہ بھی ایک مثال سے بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔سارے قرآن مجید کی دعوت اس کی تعلیم اس کا پیغام صرف ایک ہے اور وہ ہے ایک خدا کے قوانین کی اطاعت کسی اور کو اس کے ساتھ نہیں ملانا۔اب اگر انسانوں کے وضع کردہ قانون کو ساتھ ملایا تو یہ شرک ہوگیا آپ اس کا کچھ بھی نام رکھ لیجیے لیکن وہ خدا کے ساتھ انسانوں کے وضع کردہ قانون ہونگے اور اگر آپ تنہا انسانوں کے وضع کردہ کو ہی لیں خدا کو درمیان میں نہیں لائیں تو یہ کفر ہوتا ہے جسے سیکولرازم کہتے ہیں۔اس میں وہ کہتے ہیں کہ مذہب کو دخل نہیں ہوتا۔اب سیکولرازم کی بات آئی ہے تو میں دومنٹ میں آپ سے ایک بات کہوں گا۔اگر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو مذہب کہہ دیا جائے تو ہوتی تو وہ بھی سیکولرازم ہے وہ فریب نفس ہوتا ہے مگر اُسے سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ اسلامی ہے یہ مذہبی ہے یہ سب کچھ ہے۔اگر ایک خدا ہی کا ہو یعنی لا الٰہ الا اللّٰہ ہو کہ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے صرف خدا صاحبِ اقتدار ہے۔تو یہ ہے اسلام یہ ہے دین۔

بیسیوں حاکموں کی بجائے صرف ایک حاکم کی محکومی میں پایا جانے والا فرق

کہا ہے کہ آؤ اس کو بھی ایک مثال سے سمجھو ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیْہِ شُرَکَآءُ مُتَشٰکِسُوْنَ)(39:29 ایک شخص کسی گھر میں نوکر ہو جاتا ہے وہاں بیس آدمی ہوتے ہیں یا کسی فرم میں کسی دکان میں کسی فیکٹری میں نوکر ہو جاتا ہے وہاں کا مالک ایک نہیں ہوتا دسیوں ہوتے ہیں شاید وہ جو ہمارے ہاں لمیٹڈ کنسرن بنا لیتے ہیں وہ سارے شیئر ہولڈرز ہی آقا ہوتے ہیں یا ہمارے ہاں کی حکومتیں ہوتی ہیں پٹواری سے لے کر کمشنر تک اور چپڑاسی سے لے کر چیف سیکرٹری تک پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کتنے حاکم درمیان میں آتے ہیں۔قرآن حکیم کہتا ہے کہ سوچو کسی ایسے شخص کی کیفیت کا کسی ایسی جگہ نوکر ہو جائے کہ جس میں وہ بیسیوں ہوں اور بیسیوں ایسے ہوں کہ وہ ہم مزاج بھی نہ ہوں ہم آہنگ بھی نہ ہوں ایک دوسرے سے جھگڑتے بھی ہوں اور بڑے غصیلے ہوں بات بات پہ ناراض بھی ہو جائیں ایک کچھ حکم دے دوسرا کچھ حکم دے نہ مانے تو جوتا لے لیں جھگڑنا شروع کردیں۔کہا ہے کہ سوچو! اس نوکر بیچارے کی حالت کیا ہوگی۔اس بیچارے کے لیے کیا مثالیں قرآن حکیم دیتا ہے۔اس کا ایک دن نہیں گزارا ہوسکتا۔کہتا ہے سوچو تو سہی اگر کسی کو اس قسم کی نوکری کرنی پڑے اور اس

کے مقابلے میں وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ)(39:29 اور دوسرا وہ کہ صرف ایک کا ملازم ہو۔ کہتا ہے کہ سوچ لیا کہ اس کے اندر فرق ہوتا ہے؟ یہی فرق ہے اسلامی نظام میں' خدا کے دین میں' اسلامی مملکت میں اور خودساختہ اسلاموں کے نظام کے اندر۔ کہا ہے کہ خود ہی ہمیں بتاؤ کہ هَلۡ يَسۡتَوِيٰنِ مَثَلًا)(39:29 کیا یہ دونوں ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟

خدا پر ایمان کے معنی اور قرآنِ کریم کی مثال

عزیزانِ من! یہ ذہنی چیز نہیں ہے کہ ہم خدا پر ایمان لے آئے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ' اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ الٰہ کا ترجمہ معبود کر دیا' معبود کے معنی یہ کیے کہ جس کی پرستش کی جائے اور مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ اب قوانین اور اختیارات تو بیسیوں کے ہوئے اور پرستش صرف اس خدا کی ہوئی۔ اسلام میں پرستش کا یہ تصور نہیں ہے۔ یہ جو نوکر ہوا ہے قرآن کریم نے مثال دی ہے' یہ جو اس کے ہاں بیس آقا تھے' کیا یہ ان کی نمازیں پڑھا کرتا ہے۔ وہ تو نوکر کی مثال دیتا ہے کہ جس نے ان کے حکم کی' ان کے فیصلوں کی' اطاعت کرنی ہے' ان کی تعمیل کرنی ہے۔ مثال سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ جو ایک خدا کو الٰہ ماننا ہے' اس کے معنی کیا ہیں۔ یہاں الٰہ تو بیسیوں انسانوں کو مانا جاتا ہے اور نماز اس ایک کی پڑھ لی جاتی ہے حالانکہ سجدہ کے معنی ہی کسی کے حکم کے سامنے جھک جانا ہیں۔ یہ ہے وہ ایک الٰہ کی ملازمت' اس کو سجدہ کرنا:

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!
(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

اس ایک کا ہو جائے تو یہ جو دسیوں کا ملازم تھا' اس سے نجات مل جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلانِ عظیم: ایک الٰہ کے قانون کی اطاعت' اس میں کوئی فرقہ نہیں

عزیزانِ من! ایک کے ہونے کے لیے تو آپ کسی ایک کی طرف منہ کریں گے تو بیسیوں کی طرف آپ کی پشت ہو گی۔ اگر آپ کوشش کریں کہ بیسیوں کی طرف اسی طرح سے منہ ہو تو یہ نہیں ہو سکتا۔ کہا ہے کہ اِنِّىۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِىَ لِلَّذِىۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِيۡفًا)(6:79۔ یہ ہے اعلانِ ابراہیمؑ کہ میں ہر طرف سے منہ موڑنے کے بعد صرف ایک طرف اپنا رخ کرتا ہوں' کہا کہ یہ ہے توحید۔ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ)(6:79 اگر ایک وقت میں ان کے سامنے کئی رخ ہوں تو یہ شرک ہے۔ یہ جتنے آپ کے ہاں فرقے ہیں' جتنا تفرقہ ہے' الگ الگ فقہیں ہیں' ان لوگوں کے الگ الگ فرقے ہیں' الگ الگ نمازیں ہیں' یہ مختلف الٰہ ہیں' جن کی تکمیل ہو رہی ہے۔ ایک خدا کو الٰہ ماننے والی جوامت ہے اس میں تفریق' تفرقہ' فرقہ بندی ہو ہی نہیں سکتی' وہ تو ایک کے احکام مانتے ہیں۔ آپ یہ چھوٹا سا

ایک حکم مانتے ہیں Keep to the Left کا' کوئی تفرقہ نہیں' کوئی اختلاف نہیں' وہ سارے کے سارے اس موڑ پہ جا کر قانون کی اطاعت کرتے ہیں یہیں اس طرف چلے جائیں گے' گول دائرہ آئے گا' وہ بائیں کی طرف مڑتے چلے جائیں گے' شیعہ سُنّی وہابی حنفی اہلحدیث کوئی اس میں تفرقہ نہیں ہے۔ سامنے ایک قانون کی اطاعت نظر آتی ہے۔

صرف ایک کا حکم ماننے کے نتیجہ میں ہر قسم کی مذہبی اور سیاسی تفریق ختم ہو جاتی ہے

اب' عزیزانِ من! جہاں مذہب آتا ہے' وہ جو میں بتایا کرتا ہوں کہ انار کلی ❶ میں شام کو جا کر دیکھیے' یہاں سے وہاں تک ہزاروں کی تعداد میں مخلوق ہوتی ہے' ان میں کوئی تفرقہ نہیں ہوتا' کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوتا' اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں' مسلمانوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے یعنی اس میں ابھی مذہب نہیں آیا۔ جونہی وہاں مغرب کی اذان ہوئی' دس اس مسجد میں' بیس اس مسجد میں' وہ اُدھر یہ اِدھر' مذہب آیا تفرقہ پیدا ہوا۔ صدر اول میں تو جس نے لا الہ الا اللہ کہا تھا' وہ ہر الٰہ سے مڑ کر ایک الٰہ کی طرف آیا مگر اب ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہاں الٰہ والی پہلی بات نہیں ہے' ان میں تفرقہ ہے جونہی ان کے ہاں وہ الٰہ آتا ہے تو وہ کتنے الٰہ ہوتے ہیں' ہر مسجد کا الٰہ الگ الگ ہے۔ یعنی وہ صلوٰۃ' وہ مسجد' وہ سجدہ کہ جس نے ان میں وحدت پیدا کرنی تھی' وہ ان میں اختلاف کا مشہور ذریعہ بن گیا یعنی اس طرح سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان میں سے بھی جو نماز نہیں پڑھتے' ان میں پھر بھی باہر بازار میں اختلاف نہیں ہوتا۔ یہ جو پڑھنے والے ہیں' یہ چلتے ہیں۔ اور پھر جو کسی مسجد کے اندر وہ دوسرا چلا گیا اور اُس نے یہاں جا کر ہاتھ باندھے اور یہاں والے وہیں اس کے پیچھے پڑ گئے جبکہ یہ باہر والے جو ہیں یہ کبھی اختلاف ہی نہیں کرتے کہ ''توں پتلون دی جیب اچ کیوں ہتھ رکھے ہوئے نیں' تے توں ایس پاکٹ اچ کیوں رکھے ہوئے نیں' جتھے مرضی رکھ'' (تم نے پتلون کی جیب میں کیوں ہاتھ رکھے ہیں' اور تم نے اس جیب میں کیوں؟ (وہاں تو یہ ہے کہ) جہاں مرضی ہو رکھ)' وہاں کوئی اختلاف نہیں۔ یعنی عجیب چیز ہوتی ہے کہ جسے آپ سیکولرازم کہتے ہیں' جس میں مذہب نہیں آتا' اس میں تو پھر بھی یہ اتفاق ہوتا ہے اور جونہی وہ مذہب آتا ہے ہر ایک کی نماز الگ' ہر ایک کی مسجد الگ۔ کہا کہ سوچو کہ جو اتنوں کا ملازم ہو' اس کی کیا درگت بنتی ہوگی۔ کہا کہ هَلۡ يَسۡتَوِيٰنِ مَثَلًا (39:29) کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہوگی؟ کبھی نہیں ہو سکتی۔ بات میں نے سمجھائی ہے' غالباً آپ کی سمجھ میں بات آ گئی ہوگی۔ کہا کہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (39:29) بات تو بڑی صاف ہے لیکن اس کے باوجود یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ یہاں جو آپ سارے مسلمان اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے' جسے کہتے ہیں کہ وہاں جانے

---

❶ لاہور پاکستان کا ایک مشہور پرانا بازار

سے ''اس کی درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے'' قطعاً غلط ہے' یہ جو ایک تھے وہ سبھی اس کے دربار میں پہنچنے کے لیے الگ الگ ہو گئے۔ 450الزُّمَر
ہے کہ لَا یَعْلَمُوْنَ (39:29) اتنی سی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ان کا نوکر اچھا ہے جو بیسیوں کی نوکری کر رہا ہے' یا ایک کا نوکر اچھا ہے۔ کہا ہے کہ باقی ان سے جھگڑنے کی بات نہیں ہے۔

مذہب کی دنیا میں تو قدم قدم پر جھگڑا نظر آتا ہے لیکن ظہورِ نتائج کے وقت بات واضح ہو جائے گی

جو معاملہ ہے وہ یہ ہے کہ اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (39:30) یہاں جھگڑتے رہتے ہیں' معاملہ یہاں ختم نہیں ہوتا' یہاں کی زندگی تو بہرحال ختم ہونے والی ہے۔ عزیزانِ من! ہمارے ہاں رسول اللہ ﷺ کے متعلق روز جھگڑا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں یا حضور ﷺ وفات پا گئے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ انک ((39:30 یقیناً تُو بھی مرنے والا ہے' یہ بھی مرنے والے ہیں۔ دونوں کے لیے ایک ہی لفظ ہے: مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (39:30) طبعی زندگی کی جو موت ہے' وہ تو ہر جسم کو ایک جیسی آتی ہے لیکن یہ موت خاتمہ نہیں کر دیتی۔ کہا کہ ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ عِنْدَ رَبِّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ (39:31) یہ جھگڑے جو یہاں تم کر رہے ہو' یہ ساتھ لیے ہوئے وہاں جاؤ گے' انہوں نے بھی مرجانا ہے تم نے بھی' پھر وہاں یہ جھگڑا خدا کے سامنے آئے گا تو وہاں بات چلے گی۔ جب ان کے نتیجے سامنے آئیں گے تو بات واضح ہو جائے گی کہ کس نے صحیح کیا تھا اور کس نے غلط۔

خودساختہ شریعت کے تحت خدا کے حکم کا انکار یا ''تکذیب'' کرنا کفر بھی ہے اور بڑا ظلم بھی

کہا ہے کہ صحیح اور سچی بات جو یہاں سامنے آ رہی ہے' دراصل یہ تو بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں' دو کیٹگر یز ہیں' کہا کہ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَبَ عَلَی اللّٰہِ وَ کَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَہٗ (39:32) اس سے زیادہ ظالم اور کون ہوگا کہ جو اپنی طرف سے بات کہے اور یہ کہے کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے' فَمَنْ اَظْلَمُ ((39:32 اس سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے جو جھوٹ بولے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اور دوسرا وَ کَذَّبَ بِالصِّدْقِ (39:32) اس کے سامنے یہ سچی بات آئے اور وہ اسے تسلیم نہ کرے یعنی وہ جھوٹی بات لانے والا اور یہ سچی کو تسلیم نہ کرنے والا' اس کو جھٹلانے والا ہو' یہ دونوں ہی اَظْلَمُ ہیں۔ نبوت کا سلسلہ تو ختم ہوا۔ اس کے بعد جو بھی اس کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹ بولے گا کہ مجھے خدا کی طرف سے یہ ملتا ہے۔ وہ تو کبھی کبھی ہی کوئی ❶ بنتا ہے' حضور ﷺ کے بعد بیّن طور پر مظہر ہوتا ہے کہ یہ مفتری علی اللہ ہے' جھوٹ بولتا ہے' یہ تو ہم میں سے ہر ایک کہتا ہے لیکن اگلی بات خدا کی طرف سے جو آئی ہوئی کتاب ہے' اس کو عملاً جھٹلاتا ہے' اس سے زیادہ ظالم بھی کوئی نہیں ہے' ادھر ہماری نگاہ نہیں جاتی۔ یہ کفر نہیں ہے' یہ نہیں کہا کہ اس سے انکار کرتا ہے' جھٹلانا اور

---

❶ یہ جھوٹے نبی بننے والوں کی طرف اشارہ ہے۔ نبوت کا سلسلہ نبی اکرم ﷺ کے بعد ختم ہوگیا۔

چیز ہے۔ یہ مانے کہ یہاں یہ ٹھیک بات ہے لیکن اپنے عمل سے یہ ثابت کرے کہ یہ غلط ہے۔ فریب کاری سے تباہی آتی ہے، فریب کاری 450الزُّمَر کرتا چلا جائے، اسے تکذیب کہتے ہیں، وہ مانے کہ ہاں صاحب! فریب کاری بری چیز ہے لیکن کہتا ہے کہ اَلَیۡسَ فِیۡ جَهَنَّمَ مَثۡوًی لِّلۡكٰفِرِیۡنَ ((39:32 یہ دونوں ایک قسم کے کافر ہوتے ہیں: غلط چیز کو خدا کی طرف منسوب کرنے والا اور جو سچی بات آئے تو اُسے اس طرح سے اپنے عمل سے جھٹلانے والا' کہا ہے کہ مَثۡوًی لِّلۡكٰفِرِیۡنَ((39:32 اِن دونوں کا کفر ایک جیسا ہوتا ہے حالانکہ یہ اس کی صداقت کا زبان سے اقرار کر رہا تھا۔

کفر کے مقابلے میں متقی کا مفہوم' اس کے عمل کا فطری نتیجہ یا ماحصل یا اس عمل کی جزا

اس کے مقابلے میں کہا ہے کہ وَ الَّذِیۡ جَآءَ بِالصِّدۡقِ وَ صَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ)(39:33 وہ ہے جو خدا کی طرف سے سچی بات لایا یعنی جس نے سچائی کو پیش کیا ہے اور وہ ہے کہ جس نے اپنے عمل سے اس کو سچ کر دکھایا تو یہی لوگ ہیں جو غلط روش کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رہیں گے۔

عزیزانِ من! یہ ہیں جن کو متقی کہا جاتا ہے۔ اس کا بدلا کیا ہے؟ یہ بدلے کا لفظ ہمارے ہاں ایسا ہے کہ وہ صلہ' معاوضہ' بدلا ہو۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اصل میں جزا کے معنی عمل کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا فطری نتیجہ کیا ہے' اس کی جزا کیا ہے؟ بہرحال ہم بدلا یا معاوضہ کہنے کے خوگر ہیں۔ یہ کیا ہے؟ یہ دو لفظ ہیں عزیزانِ من! یہ بڑی چیز ہے۔ کہا ہے کہ لَهُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ((39:34 خدا کے ہاں سے انہیں' جو چاہیں گے ملے گا۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے! اب ذہنوں میں یہ سوال آ گیا کہ ہوسکتا تھا کہ ہمارے جیسے کوئی ذہن ہوں وہ کہیں کہ جب یہ کہا ہے کہ جو چاہو گے ملے گا تو ہم تو ایک بری چیز چاہیں گے تو کیا وہ بھی ملے گا؟ کیونکہ آپ نے جو کہا تھا کہ جو چاہو گے ملے گا اور وہ آرزو ہی غلط ہو اور وہ ہماری ہو' تم نے تو پابندی نہیں لگائی تھی؟ کہا یہ تھا کہ لَهُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ ((39:34 خدا کے ہاں سے انہیں جو چاہیں گے ملے گا۔ قرآن کریم ہے' اس نے کہا کہ جن لوگوں کی ہم یہ بات کہہ رہے ہیں کہ وہ جو چاہیں گے ملے گا' ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ وَ مَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ ((76:30 وہ اپنی آرزوؤں کو خدا کی مرضی کے ساتھ ہم آہنگ رکھے ہوئے تھے' وہ اس کے خلاف کرتے ہی نہیں ہیں۔ واہ واہ واہ! یہ ان کی بات ہو رہی ہے۔ کہا ہے کہ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الۡمُحۡسِنِیۡنَ ((39:34 وہ جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں' ان کے اعمال کا ایسا ہی نتیجہ ہوتا ہے' میں نے یہ کہا ہے کہ جزا کا لفظ جو آتا ہے' وہ اس عمل کے اندر ہوتا ہے' وہ نتیجہ ہوتا ہے' وہ باہر سے نہیں ملتا' مثلاً سنکھیے کے اندر ہلاکت ہوتی ہے' پانی کے اندر زندگی بخش صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ پانی ہم پئیں تو باہر سے کوئی کہے کہ اچھا بھئی ''آ اے زندگی دی پڑیا وی نال کھا لے اک'' (یہ اس کے ساتھ زندگی کی ایک پڑیا بھی کھالو)۔ وہ زندگی پانی کے اندر ہوتی ہے' وہ ہلاکت سنکھیے کے اندر ہوتی ہے' جزا کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ حسن کارانہ نظام کے ماتحت زندگی

بسر کرنے کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کو لَھُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ ((39:33 ہوتا ہے۔عزیزانِ من! اگر کسی قوم کے اندر یہ نظام پیدا ہو جائے تو ہر ایک کی صحیح آرزو جو اس قانون کے مطابق ہے' پوری ہوتی چلی جائے' اسی کو جنت کہتے ہیں۔

باطل نظام کے اور قرآنِ حکیم کے نظامِ عدل کے خدوخال

اور اُدھر غلط نظام میں کیا ہوتا ہے؟ سنو!

بے نیازی سے تری ناز اٹھائے کیا کیا
جو نہ چاہا وہ ہوا اور جو چاہا نہ ہوا
مبدائے فیض سے بس اتنا گلہ ہے مجھ کو
جو نہ مانگا وہ ملا اور جو مانگا نہ ملا

باطل کے نظام میں یہ ہوتا ہے کہ جو نہ چاہا وہ ہوا اور جو چاہا وہ نہ ہوا۔ اور صحیح نظام میں لَھُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ ذٰلِکَ جَزَآءُ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ((39:34 وہ جو کچھ چاہیں انہیں اپنے نشونما نے دینے والے کے قانونِ مکافات کی رو سے ملے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ چاہیں گے ہی وہی جو قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ جو لوگ بھی حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کریں گے ان کے اعمال کا ایسا ہی نتیجہ ہوگا۔ آگے کہا کہ مکافاتِ عمل کا جو نظام ہے' وہ انسانی فطرت کے متعلق بڑا صحیح ہے۔کوئی انسان بھی جسے معصوم کہتے ہیں کہ جس سے ساری عمر کوئی لغزش ہی نہ ہوئی ہو نہیں ہوتا' کچھ لغزشیں ہوتی ہیں۔ اگر وہاں یہ معیار ہو جائے کہ وہ جس کی زندگی میں کوئی لغزش نہیں ہوگی وہ جنت میں جائے' تو پھر اس کے فرشتے ہی اس کو آباد کر سکیں گے یا اس کے کوئی منتخب افرادٖ عام نوعِ انسانی تو اس سے محروم رہے گی۔ اس نے کہا ہے کہ ہمارا میزان یہ نہیں ہے بلکہ مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُہٗ فَھُوَ۔۔۔((101:6.7 دونوں پلڑے ہیں' حسن کارانہ عمل کے لیے ایک طرف' جو اس سے کچھ لغزشیں ہوئیں وہ میزان کی دوسری طرف' معیار یہ ہے کہ جس طرف کا پلڑا جھکے گا' اس کی مطابق اس کی زندگی ہو جائے گی۔ یہ نہیں ہے کہ وہ جنت میں جانے والے کا جو پلڑا نیکیوں کا جھکا ہے تو اس کے دوسرے پلڑے میں کوئی برائی ہی نہیں ہوگی' 51% پاس مارکس (نمبر) ہیں' اس میں 49% غلطیاں ہوتی ہیں۔ اب سوال یہ ہیں کہ یہ کیا ہوتا ہے؟

لغزش اور معصیت میں فرق' حضرت مسیحؑ کی طرف کفارے کا غلط عقیدہ اور اعمال کے پلڑے کا تصور

عزیزانِ من! وہ جو پاس مارکس کا معیار مقرر کیا ہے' وہ جو اس کی کثرت ہوتی ہے' وہ ان غلطیوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ اصول یہ ہے کہ اِنَّ الۡحَسَنَاتِ یُذۡھِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ((11:14 ہمواریاں' ناہمواریوں کو چٹ کر جاتی ہیں۔ یہ تو غلطیاں یا لغزشیں ہیں لیکن معصیت

الزُمَر 450 جہالت سے، غلطی ((6:54 يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ کہا ہے کہ نہیں ہے۔ کہا ہے کہ یہ ارادتاً قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی نہیں ہے، کوئی اس قسم کی لغزش ہوجائے اوراس کے بعدفوراًاس کی ندامت ہوجائے'لغزش ہوگئی تو کہا کہ یہ جو چیزیں ہیں'اس کے اس پلڑے میں ہونگی لیکن وہ دوسرا پلڑا جھکتا ہوا ہوگا'اس نے پاس مارکس حاصل کر لیے ہونگے۔ یہاں کفارہ نہیں ہے کہ تمام قسم کی معصیت کوشیاں کرتے چلے جاؤ'(ان کے بقول) حضرت مسیحؑ نے وہاں اپنی ایک جان دیدی' سارے کے سارے جنت میں جائیں گے' حضرت صاحب نے دعا کردی سارے کے سارے جنت میں جائیں گی' حضور ﷺ کی شفاعت پہ ایمان رکھ لیا تمام کے تمام جنت میں جائیں گے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ وہاں تو اصول یہ ہے کہ مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ((101:6 بھلائیوں کا پلڑا جھکنا چاہیے۔ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِىْ عَمِلُوْا ((39:35 یہ اس قسم کی جو لغزشیں ہونگی'ان کے جو نتائج ہیں'وہ جو ان کے تعمیری کام ہیں وہ ان کا خود کفارہ بن جائیں گے۔

عزیزانِ من! بات دورنکل جائے گی ورنہ میں Scientific Basis (سائنسی اساس) پر سمجھاؤں' یہ ڈاکٹر بتادیں گے کہ انسانی جسم کے اندر ہر آن Catabolism (فرودی یا انہدامی تحوّل' جاندار نامیاتی اجسام میں زیادہ پیچیدہ سالموں کا سادہ تر ذرّوں میں ٹوٹنا اور اس سے توانائی کا اخراج) اور Metabolism (زندہ عضویہ اور خلیوں میں وہ مجموعی کیمیائی تبدیلی جس کے ذریعے سے خوراک زندہ مادہ یا تخمر مایہ میں تبدیل ہوجاتی ہے اور پھر جس کے ذریعے تخمیز مایہ استعمال ہوتا ہے اور ٹوٹ کر' توانائی' مہیا کرتے ہوئے' سادہ تر مرکبات اور فضلے کی صورت اختیار کرتا ہے) جاری رہتا ہے' مختلف قسم کے سیلز (خلیات) کے اندر لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ کچھ سیلز (خلیات) ہوتے ہیں کہ یہ غلط ہوا' یہ غلط قسم کی غذا ہوئی اور ان چیزوں سے پیدا ہونے والے وہ ہلاکت والے سیلز (خلیات) ہوتے ہیں' وہ بھی اندر پرورش پاتے ہیں لیکن ان کے مقابلے میں ہم اچھی غذا' اچھی ہوا' اچھا پانی لیں' یہ چیزیں استعمال کرتے ہیں' تو ان کے یہ خلیات زندگی بخش ہوتے ہیں۔ ان میں ہمیشہ لڑائی ہوتی رہتی ہے' یہ جو زندگی بخش سیلز (خلیات) ہیں' ان کا پلڑا بھاری رہتا ہے تو صحت ہوتی ہے' ان کا پلڑا کمزور ہوجاتا ہے تو بیماری آجاتی ہے۔ علاج کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو توانائی بخش سیلز (خلیات) ہیں' ان میں تقویت زیادہ کی جائے تاکہ ان کا پلڑا بھاری ہوجائے۔ یہ جو پلڑے کی صورت ہے وہ تو زندگی کے ہر شعبے میں چلی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کے متعلق یہی بتایا ہے کہ وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِىْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ((39:35 وہ جو زندگی کی احسن چیزیں تھیں' انہوں نے وہ چیزیں کیں اور جن کا نتیجہ کچھ تباہی یا کچھ نقصان والا تھا وہ کیں۔ یہ احسن چیزیں ان تباہی والی چیزوں کے اوپر غالب آجاتی ہیں۔ اس لیے یہ زندگی کی منزل میں آگے بڑھ جاتے ہیں' ان کو پاس کر دیا جائے جنہوں نے 51 یا 60 فی صد مارکس لے لیے ہوتے ہیں' انہیں آگے پہنچا دیا جاتا ہے ایک منزل میں۔

450الزُّمَر

خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے

کہا ہے کہ باقی رہا یہ لوگ جو اس وقت تمہیں ڈرا رہے ہیں، دھمکا رہے ہیں کہ یہ کر دیں گے، مار دیں گے۔ کہا کہ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ وَ یُخَوِّفُوۡنَکَ بِالَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ((39:36 یہ خدا سے ماورا دوسری قوتوں سے تمہیں ڈراتے ہیں کہ وہ یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے۔ ان سے کہو کہ میرا خدا ان کے مقابلے کے لیے کافی ہے۔ یہ بڑا ایمان ہے۔ قوانینِ خداوندی کے اتباع سے اپنے آپ کو اتنا محفوظ سمجھنا کہ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، یہ ہے ایمان۔ اور یہ محض عقیدہ نہیں ہے، ایسا ہوتا ہے۔ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ ((39:36۔ یہاں ''عبدہ'' کہا ہے، ہر ایک کے لیے خدا کافی نہیں ہے، وہ جو اس کا غلام بنتا ہے، اس کا عبد بنتا ہے، اس کا محکوم بنتا ہے، اس کی ملازمت اختیار کرتا ہے، اس کے لیے خدا کافی ہے۔ اور سب سے بڑا عبد تو خود رسول ﷺ کی ذات ہے، فخر ہوتا ہے ان کو یہ کہنے میں۔

قرآنِ حکیم کے مروّجہ غلط اور غیر معیاری تراجم کی کیفیت

یہاں کہا ہے کہ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ۝ وَ مَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ مُّضِلٍّ ((37-39:36۔ ترجمے وہی ہیں جیسے میں بار بار کہا کرتا ہوں، ترجمے کہیں پڑھ کر دیکھیے لکھا ہے کہ جس کو خدا گمراہ کر دے، اس کو کوئی راہِ راست پہ نہیں لا سکتا، جس کو خدا ہدایت کے اوپر لے آئے، اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ تو یہ سارا ہی قصہ ختم ہوا جو یہ کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں، جو کچھ پڑھتے چلے آ رہے ہیں یعنی جسے گمراہ کر دے، اسے کوئی ہدایت پہ لا ہی نہیں سکتا، جسے وہ ہدایت دیدے، خود تو آدمی ہدایت پہ آ نہیں سکتا، جسے وہ ہدایت دیدے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ پھر تو بات ہی ختم ہو گئی صاحب! خدا گمراہ کر دے اور اس کے بعد کہے کہ اس کو جہنم میں بھیج دو اس نے گمراہی اختیار کی تھی۔ یعنی جہنم میں انہیں بھیجا جائے گا جنہوں نے گمراہی اختیار کی تھی۔ اور کہا یہ گیا کہ جس کو خدا گمراہ کر دے اس کو کوئی راہ راست پہ نہیں لا سکتا۔ یہ ہے آپ کے ہاں ترجمہ اور یہ آیت ہر خطبے میں، ہر منبر پر، ہر محراب میں، دہرائی جاتی ہے بلکہ یہ جو نکاح وغیرہ کے عام خطبے ہوتے ہیں ان میں یہ ٹکڑا ہر جگہ دیا جاتا ہے کہ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ۝ وَ مَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ مُّضِلٍّ ((37-39:36۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

عزیزانِ من! یہ قرآن حکیم ہے، دو ہی آیتوں کے بعد اس نے کہا ہے کہ ایک اصول کی بات یاد رکھو کہ فَمَنِ اہۡتَدٰی فَلِنَفۡسِہٖ وَ مَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡہَا (39:41) جو صحیح راستہ اختیار کرتا ہے وہ اپنے فائدے کے لیے کرتا ہے، جو غلط راستہ اختیار کرتا ہے اس کے نتائج وہ خود بھگتتا ہے۔ یہاں دو آیات کے بعد تو یہ کہا ہے۔ اگر اس کے معنی یہ ہوں کہ خدا جسے گمراہ کرتا ہے، خدا جسے ہدایت دیتا ہے تو اس بات کے معنی کیا ہوئے۔ وہ بات تو یہ ہے۔ وہ تو بات ہی اس نے وہاں یہ کی ہے کہ جس راستے کو اس نے صحیح کہا ہے، جو اس پہ چلتا ہے وہ منزل مقصود پہ پہنچتا ہے اور جس راستے کو اس نے غلط قرار دیا ہے، اس پہ چلنے والا تباہ ہوتا ہے۔ وہ نہ اسے اس صحیح راستے پہ مجبوراً چلاتا ہے، نہ غلط

راستے پہ مجبوراً چلاتا ہے۔ اس کا ترجمہ ومفہوم یہ ہے کہ جس راستے کو اس نے صحیح راستہ کہا ہے' جو اس کو اختیار کرتا ہے وہ منزل مقصود پہ پہنچ جاتا ہے' جسے اس نے غلط راستہ کہا ہے اس پہ چلنے والا صحیح منزل پہ نہیں پہنچ سکتا۔ بتایا یہ ہے کہ وہ جو غلط اور صحیح راستہ ہے' یہ اس کا بتایا ہوا ہے۔ پھر وہاں یہ بھی ہے کہ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِعَزِیۡزٍ ذِی انۡتِقَامٍ (39:37) دیکھتے نہیں ہو کہ خدا کتنا غالب ہے! کتنے قبضے والا ہے اور کتنا عدل کرنے والا ہے! کتنا غلط کاموں کی سزا دینے والا ہے! یہ وہیں الفاظ آئے ہیں مگر جو مفہوم یا ترجمہ لیتے ہیں وہ مفہوم غلط ہے' وہ ترجمہ غلط ہے۔ اور یہ ہیں کہ اسے دہرائے چلے جاتے ہیں۔

آج کے سائنٹسٹ خدا کی ذات کو صرف خارجی کائنات کی حد تک تو تسلیم کرتے ہیں مگر معاشرتی دنیا میں نہیں

عزیزانِ من! ایک بات اور آ گئی' ایک اور قسم کے یہ لوگ ہیں جو ذہنی طور پر' قوانین کو ماننے والے ہیں' ان میں یہ سارے آ جاتے ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ (39:38) ان سے پوچھیے کہ یہ کائنات کی تخلیق کس نے کی ہے؟ کہا ہے کہ یہاں تک تو کہیں گے کہ خدا نے کی ہے۔ بس وہ خدا کو صرف یہاں خارجی کائنات تک ہی مانتے ہیں' ان قوانین کو اپنی زندگی میں نہیں لاتے۔ یہی تو سیکولرازم ہوتی ہے۔ قُلۡ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (39:38) کہا کہ جب یہاں تک تو مانتے ہو کہ کائنات کی تخلیق تو خدا نے کی ہے لیکن تم اس کے سوا اوروں کو بھی پکارتے ہو۔ اصل ایمان تو یہ ہے کہ اطاعت کس کی کرتے ہو۔ ایک کہتا ہے یہ خدا نے پیدا کیا ہے' دوسرا کہتا ہے کہ نہیں' یہ خود بخود پیدا ہو گئی' ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ فرق یہاں ہوتا ہے کہ جس نے یہ کائنات تخلیق کی' اُسی نے قوانین دیئے' جو ان قوانین کی اطاعت کرتا ہے' وہ صحیح معنی میں خدا کا ماننے والا ہے۔ قرآن حکیم بتاتا ہے کہ جو خارجی کائنات میں قوانین کو ماننے والے ہیں وہ خدا کے ماننے والے نہیں ہیں' قرآن اس کو ایمان قرار نہیں دیتا حالانکہ وہ مانتے ہیں کہ خارجی کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے' وہ کہتا ہے کہ یہ ایمان نہیں ہے۔

خدا کی ذات پر ایمان کا معیار اور اس کو علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کرنے کا طریق

کہا ہے کہ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ اَرَادَنِیَ اللّٰہُ بِضُرٍّ ہَلۡ ہُنَّ کٰشِفٰتُ ضُرِّہٖۤ اَوۡ اَرَادَنِیۡ بِرَحۡمَۃٍ ہَلۡ ہُنَّ مُمۡسِکٰتُ رَحۡمَتِہٖ (39:38) جب ساری کائنات کا خالق اور مالک وہ ہے تو پھر جن ہستیوں کو تم' اس کے سوا پکارتے ہو' ان میں اس قسم کی قوت کیسے ہو سکتی ہے کہ اگر خدا اپنے قانونِ مکافات کے مطابق مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو یہ اس نقصان کو دور کر دیں یا اُسی قانون کے مطابق وہ مجھ پر اپنی رحمت کی نوازش کرنا چاہے تو یہ اسے روک لیں۔ قانون یہ ہے کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے جو خوشگوار نتائج حاصل ہوتے

الزُّمَر 450 ہیں، ان کو کوئی نہیں روک سکتا اور اس کی خلاف ورزی سے جو تباہی آتی ہے، اس سے بھی کوئی نہیں بچا سکتا۔ کہا ہے کہ یہ ہے میرا ایمان اُسے خدا کو ماننا کہتے ہیں۔ اس پر کہا ہے کہ قُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ (39:38) اس مقام پہ میں کہتا ہوں کہ میری حفاظت کے لیے میرا خدا ہی کافی ہے، اس کے قوانین اتنے قوت والے ہیں، اس کے بعد مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ عَلَیْہِ یَتَوَکَّلُ الْمُتَوَکِّلُوْنَ (39:38) مجھے اس کے قانونِ مکافات کی محکمیت پر پورا بھروسہ ہے، بھروسہ کرنے والے، اس کے قوانین پہ بھروسہ کرتے ہیں۔

اپنے اپنے پروگرام پر عمل کرنے والے کے نتائج کی حقیقت خود واضح ہو جائے گی

اور اگلی بات بڑی اہم ہے کہ یہ بات نہ میں وعظ و نصیحت کے طور پر کہہ رہا ہوں، نہ یہ Abstract Talk (غیر محسوس گفتگو) ہے، نہ یہ محض تھیوریز ہیں، نہ یہ نظریات ہیں کہ میں کہتا چلا جا رہا ہوں، وعظ کہتا چلا جا رہا ہوں۔ ایک چیز Pragmatic Test (استنتاجی ٹیسٹ) ہوتی ہے وہ آج کے دور میں کہتے ہیں کہ ویڈیو گیمز نے یہ اصطلاح وضع کی تھی کہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت اس پر عمل کر کے نتیجے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ بالکل صحیح بات ہے۔ گندم از گندم بروید، گیہوں کے دانے سے گیہوں اگے گی۔ اس کا ثبوت کیا ہے؟ یہ کہ وہ دانہ بو دیجئے، دیکھ لیجیے کہ سٹے میں کیا لگا ہے۔ کہا کہ میں نے یہ ساری باتیں جو تم سے کہی ہیں، یہ یونہی تھیوری نہیں ہیں، نظریات نہیں ہیں۔ قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (39:39) اے میری قوم! زیادہ باتیں کرنے کی بات نہیں ہے، میں اپنے پروگرام کے اوپر عمل کرتا ہوں، تم جو کہتے ہو کہ یہ غلط ہے، تمہارا پروگرام صحیح ہے، تم اپنے پروگرام پر عمل کرو۔ میں اس میں دخل نہیں دونگا، تم اس میں دخل نہ دو، مجھے اپنے پروگرام پہ عمل کرنے دو تم اپنے پروگرام پر عمل کرو۔ میں اس میں دخل نہیں دونگا، تم اس میں دخل نہ دو، مجھے اپنے پروگرام پہ عمل کرنے دو تم اپنے پروگرام پہ عمل کرو، تم یہ جو اپنا بیج ہے، وہ اپنی کھیتی میں بو، میں اپنا بیج اپنی کھیتی میں بوؤں گا، نتائج خود بتا دیں گے۔ آگے کہا ہے کہ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (39:39)۔ ''سوف'' کے معنی ہیں کہ ''ابھی پتہ چل جائے گا''۔ کیا پتہ چل جائے گا؟ یہ کہ مَنْ یَّاْتِیْہِ عَذَابٌ یُّخْزِیْہِ وَیَحِلُّ عَلَیْہِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ (39:40) وہ کون ہے جس کو ذلت آمیز تباہی آتی ہے اور پھر وہ آتی اس طرح سے ہے کہ آ کر واپس نہیں جایا کرتی۔ کہا ہے کہ نتائج خود بتا دیں گے۔ یہ ہے دین، یہ ہے اسلام، یہ ہے اس کا نظام جو اپنے زندہ نتائج اسی دنیا میں، اسی زندگی کے اندر بتا دے۔

عزیزانِ من! یہ کتنا بڑا چیلنج ہے کہ جاؤ، تم اپنے پروگرام پہ عمل کرو لیکن میں اتنا چاہتا ہوں کہ مجھے میرے پروگرام پر عمل کرنے دو، یہاں میرا گلہ نہ دباؤ، یہاں دھاندلی نہ کرو۔ میں تمہارے پروگرام یمں دخل نہیں دیتا۔ کیا بات ہے کتنا بھروسہ اور یقین ہے اپنے پروگرام

کی صداقت کے اوپر کہ میں تمہارے باطل کے نظام میں دخل نہیں دیتا' تم اس پہ عمل کرو۔ یہ ہے آزادی اور حریّتِ انسانیت' یہ ہے احترامِ 450 الزُمَر
انسانیت۔ وہ غلط کوش ہیں' غلط کار ہیں۔ کہا ہے کہ ٹھیک ہے تم اپنے پروگرام پر عمل کرو' میں دخل نہیں دونگا۔ نتیجہ نکلے گا تو تم خود کہو گے کہ تم سچ کہتے تھے' ہم جھوٹے ہیں' اس وقت تمہیں یہ کہہ کر زبردستی روکنا کہ یہ نہ کرو' تمہیں اس سے کیسے یقین آ سکتا ہے کہ تمہارا یہ پروگرام غلط ہے' اس لیے کہا کہ کرنے دو' نتائج خود بتادیں گے کہ کس کا پروگرام صحیح ہے اور کس کا غلط۔

ہم سورۃ الزمر کی آیت 40 تک آ گئے' عزیزانِ من! 41ویں آیت سے آئندہ لیں گے



❀...❀...❀

450الزُمَر

چوتھا باب: سورۃ الزمر (41تا48)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ
عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٤١﴾ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ
مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٤٢﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا
وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٤٣﴾ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٤٤﴾
وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ
اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿٤٥﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ
تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٤٦﴾ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا
وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا
يَحْتَسِبُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٤٨﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1980ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الزمر کی آیت 41 سے ہو رہا ہے(:(39:41۔

عیداور نکاح کے خطبہ میں پڑھی جانے والی قرآنی آیت کے غلط ترجمے کے برعکس اس کا قرآنی مفہوم

میں نے پچھلے درس کے آخر میں اشارتاً یہ کہا تھا کہ اسی سورۃ کی 36 ویں اور 37 ویں آیت میں جو کہا گیا ہے' ان کے متعلق عام ترجمہ غلط کیا جاتا ہے اور پھر اس کے اوپر زور دیا جاتا ہے۔ وہ آیات ہیں: وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ o وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ (39:36-37) اور میں نے کہا تھا کہ اس غلط ترجمہ کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ ہر خطبے میں اس کو

دہرایا جاتا ہے' وہ خطبہ جمعہ میں ہی نہیں بلکہ وہ عید کا ہوحتیٰ کہ وہ نکاح تک کا بھی کیوں نہ ہو' یہ آیات ضرور پڑھی جاتی ہیں۔اوران کا ترجمہ 450الزُّمَر کیا جاتا ہے کہ جسے خدا ہدایت دے' اُسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے (معاذ اللہ) خدا گمراہ کر دے' اُسے کوئی راہ راست پہ نہیں لا سکتا یعنی خدا گمراہ بھی کرتا ہے' ذرا اس چیز کو سوچیے۔اور پھر اس کو تواتر اور تسلسل واصرار سے دہرایا جاتا ہے کہ خدا گمراہ کرتا ہے۔قرآنِ کریم میں متعدد مقامات میں ہے کہ شیطان گمراہ کرتا ہے۔اور یہ ہمارے ہاں دہرائے چلے جاتے ہیں کہ خدا گمراہ کرتا ہے۔میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے لیے مجھے کچھ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں' چار ہی آیات کے بعد 41ویں آیت ہے جس سے آج یہ درسِ قرآن کریم شروع ہو رہا ہے' اس میں ہے کہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالۡحَقِّ ((39:41 ہم نے نوعِ انسانی کے لیے یہ ضابطہ ہدایت حق کے ساتھ نازل کر دیا ہے۔ فَمَنِ اهۡتَدٰى فَلِنَفۡسِهٖ‌ۚ وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيۡهَا‌ ۚ)(39:41 اب یہ انسانوں کے اپنے اختیار میں ہے' جس کا جی چاہے ہدایت اختیار کر لے جس کا جی چاہے غلط راستے پہ چلا جائے' جو صحیح راستے پہ چلے گا ہدایت اختیار کرے گا' اس کا فائدہ اس کو اپنے آپ کو پہنچے گا' جو گمراہ ہو گا اس کا نقصان اس کو پہنچے گا۔یعنی تین ہی آیات کے بعد یہ ہے کہ فَمَنِ اهۡتَدٰى فَلِنَفۡسِهٖ‌ۚ وَمَنۡ ضَلَّ ((39:41۔ہم نے تو کتاب نازل کر دی ہے اور انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنا دیا ہے۔اس کتاب کی رو سے جس کا جی چاہے' سیدھا راستہ اختیار کر لے اور اس پہ چل نکلے' جس کا جی چاہے' اسے چھوڑ کر غلط راستے اختیار کر لے' یہ اس کے اختیار کی بات ہے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ جو صحیح راستہ اختیار کرے گا اس کا فائدہ اس کو ہو گا' جو غلط راستہ اختیار کرے گا اس کا نقصان اس کو ہو گا۔یہاں تعلیم قانونِ مکافاتِ عمل کی ہے اور یہی تعلیم سارے قرآن کریم کی تعلیم ہے کہ جس قسم کا کوئی کام کرے گا اس کا نتیجہ اس کو بھگتنا پڑے گا۔بنیادی چیز یہ ہے کہ جو صحیح راستہ اختیار کرے گا' وہ منزل مقصود پہ پہنچ جائے گا' جو غلط راستہ اختیار کرے گا وہ اس منزل سے دور ہوتا چلا جائے گا۔سارے قرآن کریم کی بنیاد اس اصول پر ہے' جسے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔اب اس کے بعد یہ چیز کہی جاتی ہے کہ صاحب! جسے خدا گمراہ کر دے' اسے کوئی صحیح راستے پہ لا ہی نہیں سکتا۔تو آگے پھر یہ اس کو جہنم میں بھیجا جائے گا' اس کو جنت میں لایا جائے گا۔یہ کس جرم کی بنا پر ہے کہ جو گمراہ ہو گا اس کو ہم جہنم میں بھیج دیں گے یعنی وہ کہہ رہے ہیں کہ جس کو ہم گمراہ کریں اسے کوئی راہ راست پہ لا ہی نہیں سکتا اور پھر جو گمراہ ہو گا اس کو ہم جہنم میں بھیج دیں گے۔ارے خود ہی تو گمراہ کر رہے ہو (معاذ اللہ) اور خود ہی اسے جہنم میں بھیج رہے ہیں۔

ہزار برس سے ملتِ اسلامیہ کے خلاف ہونے والی سازش

عزیزانِ من! آپ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیا ہے۔کبھی کبھی تو آپ کے ذہن میں آتا ہو گا کہ یہ شخص یہاں بیٹھا ہوا' ان کے ہر عقیدے کے متعلق یہ کہتا ہے کہ یہ کہاں جا رہے ہیں' کیا چیزیں کر رہے ہیں۔ہزار برس سے متواتر یہ چلا آ رہا ہے' اس مسئلے کے اوپر کتابوں کے انبار

لگے ہوئے ہیں کہ خدا گمراہ کرتا ہے۔کوئی اللہ کا بندہ کھڑا ہو کر سوچتا ہی نہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں' کس کے متعلق کہہ رہے ہیں۔اور سارے قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف کہتے چلے جا رہے ہیں۔انسان کے حسن اعمال کی' مکافاتِ عمل کی' جزا اور سزا کی بنیاد ہی اکھڑ رہی ہے لیکن کہے چلے جا رہے ہیں۔اور جیسا میں نے کہا تھا کہ وہ تو اتنی بڑی گہری سازش ہے' یہ مسئلہ آپ کے ایمان کا جزو بنا دیا گیا ہے کہ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ایمان کے پانچ اجزا تو خود اللہ تعالیٰ نے کہے تھے' چھٹا انہوں نے اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے اور وہ چھٹا یہ ہے کہ خدا گمراہ کرتا (معاذ اللہ)۔اور میں نے کہا تھا کہ وہ چار ہی آیات کے بعد بات صاف ہو گئی ہے۔وہ تو کہا ہی اس نے یہ ہے کہ ہم نے تو ایک ضابطہء حیات بھیج دیا ہے' جو اسے اختیار کرتا ہے وہ خدا کی راہنمائی پر چلتا ہے' جو اسے چھوڑ کر دوسرے راستے اختیار کرتا ہے وہ گمراہ ہو جاتا ہے' اس کا نقصان اسی کو ہوگا۔اور رسول ﷺ سے فرمایا کہ وَمَآ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِوَكِيۡلٍ (39:41) تُو ان کے اوپر داروغہ (Darogha) نہیں مقرر کیا گیا کہ ڈنڈے کے زور سے ان کو صحیح راستے پہ چلائے۔کتاب نازل کی' ان کو عقل و فکر دیدی' صاحبِ اختیار بنا دیا اور ان سے کہہ دیا کہ دیکھیے اس چوراہے کے اوپر ہم نے سائن پوسٹ لگا دیئے ہیں' اب تمہارے جی میں آئے تو شہر کا راستہ اختیار کرو' جی میں آئے تو ملتان روڈ کی طرف چلے جاؤ۔جس طرف تم راستہ اختیار کرو گے' اس منزل کے اوپر پہنچ جاؤ گے یعنی چار ہی آیات کے بعد قرآن کریم نے بات صاف کر دی۔اور خود رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ تُو ان کے اوپر داروغہ (Darogha) مقرر نہیں کیا گیا کہ زبردستی ان کو ایک راستے پہ چلائے۔اور اپنے متعلق (معاذ اللہ) ان کے ترجمے کے مطابق کہ خدا گمراہ کر دیتا ہے تو انسان کا تو اس میں بس ہی کچھ نہیں ہوتا۔یعنی رسول اللہ ﷺ سے جو کہا گیا کہ تُو مجبوراً ان کو ایسا نہیں کر سکتا اور اپنے متعلق کہا گیا کہ ہم جس کو گمراہ کر دیں اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔پھر یہ باز پرس کاہے کی' اور یہ جہنم کاہے کے لیے؟

قرآن حکیم کی حقیقی تعلیم کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ اور حیوانی اور انسانی تخلیق میں فرق

کیا کہا جائے! ایک قرآن حکیم کو چھوڑا تو عقل و فکر کو چھوڑا' ان دونوں کو چھوڑا تو اس کے بعد کہیں کے بھی نہ رہے۔اس کے بعد ایک آیت آتی ہے۔بات تو یہاں انسان کے اپنے اختیار کی ہے' ہم نے اُسے یہ چیز دی اور یہی شرفِ انسانیت ہے۔حیوان صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں بنائے گئے۔سارے قرآن حکیم میں تخلیق انسانی کے سلسلے میں پہلے جتنی کڑیاں آتی ہیں' وہ ساری حیوان کے بچے کی اور انسان کے بچے کی بالکل مساوی چلی آتی ہیں' ایک جیسی چلی آتی ہیں اور آخری مقام پہ آ کر کہا جاتا ہے کہ ہم نے اس باب میں انسان سے حیوان کو مختص کر دیا کہ اسے ہم نے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا۔

انسانی نفس کی خصوصیات اور تصورف میں روح کا مروجہ تصور

یہ جسے ہم صاحبِ اختیار وارادہ کہتے ہیں' اسی کا نام انسان کی ذات ہے' اس کا Self (نفس) ہے۔ یہ چیز صرف انسان کو ملی ہے۔ یہ چیز جو اس کے اندر اپنے معاملات کا فیصلہ کرتی ہے اُسے اس کا Self یا ذات کہا جاتا ہے۔ یہ بحث تو بڑی لمبی چلی جائے گی' قرآن مجید اسے نفس کہہ کر پکارتا ہے لیکن جہاں تک ہماری عملی زندگی کا تعلق ہے' وہ یہی ہے کہ انسان کے اندر ایک قوت دی گئی ہے جو اپنے لیے خود فیصلہ کرتی ہے۔ یہ جو قوت ہے جیسا میں نے کہا ہے کہ اسے وہ نفس کہہ کر پکارتا ہے' اسے وہ خود خدا کی توانائی کا ایک شمہ کہتا ہے یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات میں او پرتو خدا کو اختیار وارادہ حاصل ہے اور اس کا عطا کردہ پھر انسان کو حاصل ہے۔ یہ جو اس کا عطا کردہ جسے یہ نفخ روح کہا گیا ہے' وہ یہ نہیں' عزیزانِ من! کہ خدا کی کوئی روح اتنی ہے اس میں سے اتنا سا حصہ لے کر تو انسان کو دیدیا' وہ تو پھر اس کے پاس پونا (3/4) رہ جائے گا' اس میں تو کمی آجائے گی۔ یہ میں دوسری طرف چلا جاؤں گا تو تصوف کی طرف نکل جاؤں گا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ خدا کی جو روح ہے اس کے حصے انسانوں کے اندر دیئے گئے ہیں' بانٹے گئے ہیں صحیح نہیں ہے۔

نفس انسانی' ماہرین نفسیات' انسانی شعور اور اعضائے انسانی کا تعلق

بہرحال وہ نفس انسانی ہے' انسانی ذات ہے۔ انسانی ذات جو ہے' یہ فیصلہ کرتی ہے' اس کے بعد انسان کا شعور ہے' جسے Consciousness کہتے ہیں۔ یہ اتنی اہم آیت آرہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بڑی دقیق بھی ہے' اس کا تعلق پہلے تو فلسفہ سے کہا جاتا تھا' اب اس دور میں نفسیات یا سائیکولوجی سے اس کا تعلق کہا جائے گا۔ اور قرآن حکیم کی اس آیت پر مغرب کے فلاسفرز اور علمائے نفسیات آج کل اتنی تحقیق کر رہے ہیں' آپ حیران ہونگے کہ میرے پاس اس مسئلے پر کتابوں پہ کتابیں چلی آرہی ہیں۔ اور ہر نئی تصنیف کے بعد قرآن حکیم کی عظمت اجاگر ہو کر میرے سامنے آتی ہے کہ کیا بات ہے! چودہ سو سال پہلے یہی نہیں کہ عرب کی سرزمین میں' پوری کرۂ ارض پر جہاں جہاں فکرِ انسانی کچھ کارفرما تھی' اس دور کے اندر کہیں بھی یہ چیز نہیں آئی تھی۔ اور یہ مغرب کے مفکرین بھی جو کشادہ ظرف ہیں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اس دور کے اندر یہ بات کہنا کسی انسانی فکر کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ یقیناً فوق البشر کوئی سرچشمۂ علم تھا جو یہ کہہ سکتا تھا جو یہ باتیں کہی گئی ہیں۔ وہ لوگ اس کو تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہو رہے ہیں اور اس انسان کے Self (نفس) کے متعلق بڑا ہی کام کر رہے ہیں۔

میں نے کہا ہے کہ انسان کی ذات فیصلہ کرتی ہے اور اس کا جو شعور ہے' وہ اس کے بعد سارے Devices (اختراعات) کرتا ہے جن کی رو سے اس فیصلے کو بروئے کار لانا ہوگا۔ اور انسان کے یہ باقی اعضا ہیں' یہ جتنے بھی Senses (حواس) ہیں یا ہاتھ پاؤں ہیں' یہ

اس کے اس فیصلے کو عملاً بروئے کار لانے کے Instruments یا ذرائع بنتے ہیں' اس طرح تین چیزیں ہوتی ہیں: انسانی ذات جو فیصلہ کرتی ہے کہ (مثلاً) مجھے اس وقت گولی چلا دینی چاہیے یا سرینڈر کر دینا چاہیے' شعور انسان اس فیصلے کو لے کر سوچتا ہے کہ اب مجھے جو حملہ کرنا چاہیے تو کس طریق سے کرنا چاہیے' وہ اس کے لیے طریق سوچتا ہے' یہ شعور ہے' یہ Consciousness ہے۔ اور اگلی تیسری چیز یہ ہے کہ پھر وہ ہاتھ کو حکم دیتا ہے کہ تُو اٹھ اور اس کو ایک طمانچہ لگا دے' وہ ہاتھ اس کا آلہ ہے' اس فیصلے کو بروئے کار لانے کا Instrument ہے' ذریعہ ہے جو ذاتِ انسانی نے کیا' شعور انسانی نے طریقہ سوچا اور انسان کے ان اعضا کو عمل میں لایا۔ یہ انسان کی زندگی کا ایک طریقہ (Mechanism) ہے۔

زیرِ نظر قرآنی آیت کا تعلق خاص طور پر نفس سے اور نفسیات سے ہے

عزیزانِ من! میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ یہ بڑی اہم آیت ہے اور اس کا تعلق خالص فلسفے یا نفسیات سے ہے' میرے لیے اس درس میں اس چیز کو سمجھانا بڑا مشکل ہو جائے گا لیکن بہر حال آیت تو سامنے ہے اس کو ویسے ہی چھوڑ کر تو میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس کے لیے آپ کو بھی' اپنی سمجھ پہ' اپنی فکر پہ' اپنے غور پہ' ذرا زیادہ زور دینا پڑے گا کہ وہ کیا کہتا ہے۔ کہا ہے کہ اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَ یُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ((39:42 اور آخر میں کہا کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ((39:42۔ ہم نے یہ جو کچھ اوپر کہا ہے' وہ لوگ جو غور و فکر سے کام لیں گے' ان کے لیے اس میں حقیقت تک پہنچنے کی بہت بڑی نشانی ہے۔ خود ہی اس نے بتایا کہ اس کی اہمیت کیا ہے۔

نیند کی حالت میں انسان تو زندہ ہوتا ہے مگر اس کا شعور اس کے پاس نہیں ہوتا

یہاں قرآن حمید لفظ نفس ہی لایا ہے۔ کہا یہ ہے کہ موت کے وقت اور نیند کی حالت میں ہم انسانی نفس کو روک لیتے ہیں' نیند کی حالت میں بیدار ہونے پہ واپس کر دیتے ہیں' موت کی حالت میں اس کو اپنے پاس رکھے رہتے ہیں۔ نفس معدوم نہیں ہوتا' مرتا نہیں ہے' ختم نہیں ہوجاتا' فنا نہیں ہوجاتا' وہ زندہ رہتا ہے۔ نیند کی حالت میں اس کو عارضی طور پر روکا جاتا ہے' پھر واپس آجاتا ہے جب انسان بیدار ہوتا ہے' موت کی حالت میں وہ اس دنیا میں واپس نہیں آتا اس کو وہاں روک لیا جاتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے جو موت کی حالت میں تو گویا ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کیا چیز ہے جو روکی جاتی ہے؟ نیند کی حالت تو ہمارے سامنے ہوتی ہے' نیند کی حالت میں جس چیز کو ہم Life یا جان کہتے ہیں' انسان کی جان یا زندگی یا Life وہ نیند کی حالت میں تو برقرار رہتی ہے' انسان زندہ ہوتا ہے' اس کا سارا جسم اسی طرح سے کام کر رہا ہوتا ہے' ویسا ہی سانس آ رہا ہوتا ہے۔ گویا اس سے مراد یہ جو چیز کہی ہے کہ روکی گئی ہے' یہ انسان کی جان یا زندگی نہیں ہے' وہ تو نیند کی حالت میں بھی برقرار ہوتی ہے۔ کیا چیز نیند کی حالت میں نہیں ہوتی؟ انسان کا شعور نہیں ہوتا' Consciousness نہیں ہوتا' بیدار ہوتا ہے تو

وہ واپس آ جاتا ہے۔موت کی حالت میں وہ' یہاں اس مردے کے ہاں' پھر واپس نہیں آ تا' اس کو روک لیا جاتا ہے۔گویا وہ شے جس کی 450الزُّمَرُ سے انسانی ذات کارفرمائی کرتی تھی' وہ ایک شے ہے جو نیند کی حالت میں کام نہیں کر رہی ہوتی' اُسے روکا جاتا ہے۔نظریہ آیا کہ نینداور موت میں ان کی حالت یکساں ہی ہے' اس فرق کے ساتھ کہ نیند کی حالت میں جسمِ انسانی کو زندہ رکھا جاتا ہے تاکہ وہ شعور جب واپس آئے تو وہ اسی طرح سے کارفرما ہو جیسا کہ بیداری کی حالت میں ہوتا ہے' جسمِ انسانی زندہ ہوتا ہے' جو انسانی شعور ہے وہ کچھ وقت کے لیے معطل ہوتا ہے اور جب وہ انسان بیدار ہوتا ہے تو جسم تو پہلے ہی زندہ تھا پھر شعور کام کرنے لگ جاتا ہے۔

مرنے کے بعد انسان کا شعور کسی صورت میں یا کسی شکل میں واپس نہیں آ تا اور زندگی تو نام ہی انسانی شعور یا ذات کے زندہ رہنے کا ہے

موت کی حالت میں ہم دیکھتے ہیں کہ جسم زندہ نہیں ہوتا۔وہ کہتا ہے کہ اس سے فرق نہیں پڑتا۔اصل شے جو تھی وہ تو انسان کا شعور تھا' نیند کی حالت میں' بیداری میں' وہ واپس آ جاتا ہے' موت کی حالت میں ہم اس کو روک لیتے ہیں کہ اب یہ اس فرد کی زندگی کا ایک جہاں اور ہے' ایک دنیا اور ہے' وہ اس کو آخرت کہتا ہے' پھر اس فرد کا شعور وہاں کارفرما ہوتا ہے جس کا جسم یہاں مر چکا تھا۔اس فرد کا وہ شعور یا اس کی ذات نہیں مر چکی ہوتی' وہ زندہ رہتی ہے۔دو باتیں ہوئیں کہ ایک تو وہ کہ موت کی حالت میں جو چیز وہاں چلی جاتی ہے وہ اس دنیا میں پھر واپس نہیں آتی۔لہٰذا یہ تناسخ کے مسائل' یہ مرنے کے بعد کی چیز کہ پھر اس دنیا کے اندر آ جانے والی بات کہ پھر وہ وہاں سے آ گیا اور اس نے یہ باتیں کیں' وہ ساری چیز غلط ہے۔وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کے اندر پھر یہ شعور واپس نہیں آ تا۔شعور مرتا نہیں ہے' فنا نہیں ہوتا' وہ زندہ ہوتا ہے' موت کی حالت میں وہاں ہوتا ہے' نیند کی حالت میں واپس آ جاتا ہے تو انسان کی زندگی اسی طرح برقرار رہتی ہے۔اور زندگی نام ہے شعورِ انسانی کا' ذاتِ انسانی کے زندہ رہنے کا۔

''یتوفیٰ'' یا فوت ہونے کا لفظ صرف انسان کے لیے استعمال ہوتا ہے آخر کیوں؟

یہاں لفظ ''یتوفیٰ'' ہے' توفی کا لفظ ہے یہ وہی ہے جسے ہم وفات کہتے ہیں' یہ عربی عجیب زبان ہے' یہ لفظ صرف انسانوں کے لیے بولا جاتا ہے' حیوانات کے لیے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔اس نے جو يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ ((39:42 کہا ہے' یہیں سے یہ بات کہہ دی کہ یہ بات حیوانوں کے متعلق نہیں ہو رہی' انسانوں کے متعلق بات ہو رہی ہے' کیونکہ حیوانوں کے لیے وہ لفظ ''یتوفیٰ'' ہی نہیں آ سکتا۔کیا بات ہے اس زبان کی! حالانکہ حیوان ذی حیات تو ہوتے ہیں' انسانوں کی طرح زندہ ہوتے ہیں لیکن ان میں شعور نہیں ہوتا' Self Consciousness نہیں ہوتا' وہ Simple Consiousness ہوتا ہے جو حیوانوں میں ہوتا ہے۔یہ چیز صرف انسان کے

لیے ہے اور یہی چیز ہے جو انسان کی ذات یا اس کی خودی کہلاتی ہے جو موت سے مرتی نہیں ہے۔ قرآن نے نیند اور موت کی حالت میں تشابہ بیان کیا ہے' مماثلت بیان کی ہے' میں نے کہا ہے کہ یورپ میں اس پہ بڑی ریسرچ ہو رہی ہے۔ اور اس ریسرچ میں تو Dreams (خوابوں) کے متعلق تو پھر نئے باب کھل رہے ہیں کہ شعور نہیں ہوتا تو یہ خواب کیسے آتا۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جو ان پہ ریسرچ ہو رہی ہے' وہ عجیب گوشوں میں ہو رہی ہے اور یہ ان کے نزدیک بڑا اہم گوشہ ہے۔ بہر حال ہمارے نزدیک یہاں یہ اہم گوشہ نہیں ہے۔

نیند اور موت کی حالت میں انسانی شعور کی کیفیت

میرے کہنے کی بات تو صرف یہ تھی کہ قرآن حمید کہتا یہ ہے کہ نیند اور موت کی حالت میں ہمیں ایک چیز مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے کہ اس میں شعور باقی نہیں رہتا' وہ انسان تو زندہ ہوتا ہے مگر اسے شعور نہیں ہوتا۔ وہ شعور Temporarily (عارضی طور پر) معطل ہوتا ہے جو پھر بیداری کے عالم میں واپس آ جاتا ہے لیکن موت کے عالم میں وہ کہتا ہے ہم اس کو اس دنیا میں واپس نہیں بھیجتے۔ گویا یہ جو موت اور نیند کے اندر اتنی سی مماثلت ہے' وہ اتنی سی ہے' یہ عارضی طور پر شعور کی کارفرمائی کا تعطل ہوتا ہے' موت کی صورت میں وہ شعور اس جسم میں واپس نہیں آتا' اس اعتبار سے تو وہ مستقل طور پر الگ ہوتا ہے لیکن وہ فنا نہیں ہوتا' وہ موجود رہتا ہے۔ اسی لیے اقبالؒ (1938-1977ء) نے اس چیز کو کچھ اس طرح سمجھانے کی کوشش کی کہ

خواب را مرگ سبک داں
مرگ را خواب گراں

نیند کو تم چھوٹی سی موت سمجھو' موت کو بڑی سی نیند سمجھو۔ قرآنِ کریم نے کہا یہ ہے کہ فَيُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ((39:42 ایک وقت معینہ کے لیے وہ نیند کی حالت کے بعد جو بیداری ہوتی ہے' اس میں شعور کی واپسی ہوتی ہے' ایک وقت معینہ تک کے لیے وہ یہاں کارفرما رہتا ہے۔

کوئی انسان بھی حیاتِ آخرت کی کیفیات اور اس کے لوازمات کو موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتا مگر تسلسلِ حیات موجود ہے اور مغرب کے مفکرین کی سوچ

جو حیاتِ آخرت ہے' اس کی کنہ اور کیفیت کس قسم کی ہے' قرآن مجید کہتا ہے کہ تم اپنے شعور کی اس موجودہ سطح پر اس کی کیفیت اور کنہ کو نہیں سمجھ سکتے' دلائل کی رو سے یہ سمجھ سکتے ہو کہ مرنے کے بعد زندگی ملتی ہے' مل سکتی ہے۔ اس پہ بھی آپ حیران ہونگے کہ یہ یورپ کے مفکرین یا یہی علمائے نفسیات وغیرہ جو ہیں' وہ اب اس چیز پہ پہنچ رہے ہیں کہ مرنے کے بعد زندگی Continue (تسلسل مہیا) کرتی ہے'

وہ تسلسلِ حیات تک پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں یہ دو Terms (اصطلاحات) ہیں: ایک تو Survival (بقا) ہے اور دوسری Immortality (حیاتِ ابدی) ہے' یعنی ایک محض زندگی مرنے کے بعد اور دوسری حیاتِ ابدی۔ وہ محض زندگی تک تو بہت پہلے پہنچ چکے ہوئے تھے' اب یہ Immortality (حیاتِ ابدی) تک پہنچ رہے ہیں کہ مرنے کے بعد کی زندگی کے اندر تسلسل ہے اور یہ تسلسل اسی Consciousness یا شعور کا تسلسل ہے' جسے وہ مانتے ہیں۔ اسی لیے وہ یہ کہتے ہیں کہ یہاں کے اپنے تمام خیالات' آرزوئیں' جتنے بھی یہاں کے ہیں' انسان وہ سب کچھ ساتھ لے کر جاتا ہے کیونکہ اس کا شعور وہاں موجود ہوتا ہے۔

جہانِ فردا میں انسانی شعور کا واپس لوٹ آنا حقیقت پر مبنی ہے

قرآنِ کریم نے اس حیات کے متعلق کہا ہے کہ وہ کس قسم کی ہے' یہ تو تم نہیں سمجھ سکتے البتہ مثالوں سے اس نے سمجھایا ہے لیکن اس پہ تو زور دیا ہے کہ یہاں کی تمام یادداشتیں' حافظہ' Memories واقعات' ایک دوسرے کے ساتھ تعارف' یہاں کی آرزوئیں' یہ خواہشات' ان کے احساسات' ان کی یادداشت' یہ سارا کچھ وہاں موجود ہوگا۔ ایک لفظ شعور سے یہ ساری چیز آ جاتی ہے کہ یہ سب کچھ اس کے اندر موجود ہوتا ہے۔ نیند کی حالت میں کچھ بھی ہمیں یاد نہیں ہوتا' جیسے کوئی چیز بھی ہمارے ہاں اندر موجود نہیں ہوتی' بیداری کے بعد ہر چیز واپس آ جاتی ہے۔ کیا چیز ہوتی ہے جو واپس آ جاتی ہے جو اپنے ساتھ ہمارے حافظے کو لاتی ہے' احساسات کو لاتی ہے' جذبات کو لاتی ہے' حسیات کو لاتی ہے' وہ کیا چیز ہوتی ہے؟ اسے شعور کہا جاتا ہے۔ وہ جونہی نیند کے بعد واپس لوٹتی ہے' یہ ساری چیزیں انسان کے اندر آ جاتی ہیں' جو ایک لمحہ پہلے اس میں موجود نہیں تھیں۔ قرآن حکیم کہنا یہ چاہتا ہے کہ جس طرح تم نیند کی حالت میں محسوس کرتے ہو کہ کوئی چیز نہیں تھی' یونہی وہ شعور واپس آیا' یہ ساری چیزیں واپس آ گئیں۔ موت کے بعد یہ جو تمہارا شعور ہے' وہ معدوم نہیں ہو جاتا' وہ فنا نہیں ہو جاتا' وہ محفوظ ہوتا ہے۔ اب یہ چیز کہ جس وقت وہ پھر دوبارہ کارفرما ہو جاتا ہے یا ہم اس کو کر دیتے ہیں' تو جس طرح نیند کے بعد' وہ شعور واپسی کے بعد' اپنے تمام احساسات کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے' حافظہ کو لے کر آتا ہے' موت کے بعد بھی جب وہ شعور کارفرما ہوگا تو اسی طرح سے وہ ساری چیزیں ساتھ لے کر آ جائے گا۔

قرآنِ حکیم کی اشارتاً کہی ہوئی بات اپنے اندر علم وعرفاں کا سمندر لیے ہوتی ہے

کس سطح پہ قرآن حکیم یہ بات سمجھاتا ہے؟ کہتا ہے کہ موت کے بعد کی زندگی کے متعلق یہ چیزیں یوں ہونگی کہ صرف ایک ایک واقعہ ہی نہیں بلکہ تمہارے ہاں کا ایک ایک احساس بھی وہاں موجود ہوگا' ایک دوسرے کا تعارف ہوگا' دل میں گزرنے والے خیالات تک کا معلوم ہوگا۔ اور ایک لفظ سے قرآن حکیم نے بات بتادی کہ جب شعور واپس آ جائے گا تو یہ تمام چیزیں واپس آ جائیں گی۔ کہا ہے کہ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ((39:42 غور وفکر کرنے والی قوم کے لیے اس میں حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں۔ تو وہ حقیقت یہی اصل چیز ہے جس کے لیے قرآن حکیم یہ سب کچھ بیان کر رہا ہے۔ وہ تو نہ فلسفہ کی کتاب ہے' نہ نفسیات کی کتاب ہے' وہ تو ایک

ہی تعلیم ہے جو اس نے دینی ہے کہ انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات اور وہ آرزوئیں بھی جو نا تمام رہ جاتی ہیں جو کامیاب نہیں ہوتی ہیں، یہ تمام نتیجہ خیز ہونگی اور انسان کو ان کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ اس زندگی کے اندر اگر اس کا موقع نہیں ملتا تو کوئی بات نہیں، زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی، زندگی آگے چلتی ہے اور سب چیزیں انسان کے سامنے آئیں گی، ان کے نتائج اسے بھگتنے پڑیں گے۔ عزیزانِ من! بات تو وہ صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیم کا ملخص یہ ہے لیکن اس ضمن میں وہ جو اشارتاً بھی بات کہہ جاتا ہے، علم اور فکر کی دنیا اس کو لیتی ہے اور وہ محوِ حیرت رہ جاتی ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کی دنیا کے اندر یہ چیزیں کوئی انسانی ذہن اور انسانی فکر نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہنا وہ یہ چاہتا تھا جو پہلی آیت تھی کہ جس کا جی چاہے، صحیح راستہ اختیار کرے، جس کا جی چاہے غلط راستے پہ جا پڑے۔ یہ اس کے اختیار کی بات ہے۔ یہ چیز جو اس نے کہی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ اپنے اختیار و ارادے سے ہم نے اگر کوئی غلط کام یا اس قسم کی چیزیں کیں جو ہمارے لیے فائدہ مند ہوئیں اور دوسرے کے لیے نقصان رساں تھیں، ہم نے ظلم کیا، استبداد کیا، غلط راستہ اختیار کیا، تو کوئی بات نہیں، مرنے کے بعد معاملہ ختم ہو جائے گا، صحیح راستہ پہ چلنے والا بھی مر جائے گا، غلط پہ چلنے والا بھی مر جائے گا ''اے جگ مٹھا اگلا کن ڈٹھا''۔ یہ سب غیر قرآنی تصور ہے۔ آپ دیکھیے اس آیت کے اندر اتنی عظیم علمی سطح پہ گفتگو ہو رہی ہے اور مقصد اس کا یہ کہنے کا ہے جو پہلی آیت میں تھا۔ اختیار و ارادہ دینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمہارے اندر محض Biologically (حیاتاتی طور پر) ایک Change (تغیر) واقع ہو گیا۔ وہ یہ ہے کہ تم اپنے تمام اعمال کے، خیالات تک کے، آرزوؤں تک کے، خواہشات تک کے ذمہ دار ہو۔ اور یہ خیال اگر تمہارے دل میں آتا ہے کہ مرنے کے بعد تو معاملہ ختم ہو جائے گا، تو سنو! یہ چیز بالکل غلط ہے۔ اور سمجھایا کس انداز سے؟ اس سے کہ نیند کا عالم سامنے لایا ہے جسے ہم روز دیکھتے ہیں، ہم پہ بیتتی ہے، جاگنے کے بعد ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ اس دوران میں کیا چیز ہوئی تھی۔ وہ مردہ ہے اور یہ سویا ہوا انسان ہے اگر یہ ہمارے ذہن میں نہ ہو کہ اس کی نبض چل رہی ہے، وہ سانس لے رہا ہے تو وہ دونوں یکساں ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کیا چیز نہیں ہوتی؟ یہ کہ شعور معطل ہوتا ہے، شعور واپس آتا ہے تو ہر چیز اس کے ساتھ واپس آجاتی ہے۔

انسانی شعور کی قدر و منزلت صرف اس مادی زندگی کی حدود تک ہی محدود نہیں

یہ جو شعور ہے، یہ نیند کی حالت میں واپس آجاتا ہے، موت کی حالت میں اُسے اس دنیا میں واپس نہیں بھیجا جاتا، وہ حیاتِ آخرت کے اندر کارفرما ہوتا ہے۔ تو جس طرح نیند کے بعد شعور اپنے تمام احساسات اور حافظے کو ساتھ لاتا ہے، اسی طرح سے موت کے بعد بھی جب یہ شعور کارفرما ہوگا تو یہ ساری چیزیں تمہارے ساتھ ہونگی۔ یہ کہنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے یہ کہا ہے کہ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ (39:42) یعنی جو کچھ ہم نے کہا ہے، یہ مقصود بالذات نہیں تھا کہ ہم تم کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ موت میں اور نیند میں فرق کیا ہوتا ہے، شعور کیسے بیدار ہوتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو اصل بات سمجھنے کی ایک علامت تھی، نشانی تھی۔ اصل بات یہ ہے جو ہمارے

نزدیک سمجھانے کی ہے کہ موت کے بعد یہ نہیں ہے کہ انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ چیز ہے جو یورپ کے Materialistic الزُمَر450 Concept (مادی تصورِ حیات) نے پیدا کی تھی کہ مرنے کے بعد انسان ختم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ ساری چیزیں چلی جاتی ہیں۔ اس زمانے میں وہ یہ شہادت لے کر آتے تھے کہ یہ جو انسان کا Brain (دماغ) ہے' جب یہ زندہ ہوتا ہے تو اس میں یہ سب کچھ ہوتا ہے اور موت کے بعد تو جس طرح سے اور انسان کے سارے ہڈیاں' عضلات ختم ہو جاتے ہیں' اسی طرح سے یہ Brain (دماغ) بھی ختم ہو جاتا ہے' Brain (دماغ) ختم ہوا' Consciousness (شعور) گیا' حافظہ گیا' معاملہ ختم ہو گیا' انسان ختم ہو گیا۔ یہ Concept (تصور) تھا۔

آج کی ریسرچ زندگی کے بعد مختلف مراحل کے متعلق غور وفکر کرنے میں مصروفِ کار ہے: نینداور شعور ایک حقیقت کے علاماتی مظہر ہیں

قرآن کریم نے جو پیغام دیا تھا وہ یہی ہے کہ موت کے ساتھ انسان کا خاتمہ نہیں ہوتا' یہ اپنی انفرادیت (Individuality) کو ساتھ لیے ہوئے آگے چلتا ہے۔ اور یہ جو تمہارے ہاں شبہ پڑتا ہے کہ صاحب! یہ دماغ یا Brain تھا' اس کے سیل (خلیات) تھے' وہ اسی قسم کی مادی (Material) چیز تھی' جب باقی جسم گل سڑ گیا' ہڈیاں ہو گئیں' ریزہ ریزہ ہو گیا' پھر کہاں کی زندگی' کہاں کا حافظہ' کہاں کا مواخذہ' کہاں کے احساسات۔ یہ چیز ہے جسے قرآن کریم بار بار مختلف انداز سے سمجھاتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے' وہ اس سطح پہ سمجھا رہا ہے' عام سطح کے اوپر تو اس نے اس زمانے کے بدو کو بھی سمجھایا' آج کی سطح کے اوپر (ڈاکٹر چارلس ایڈورڈ) رائس ❶ (?-1931ء) وغیرہ کو بھی سمجھا رہا ہے' یہ لوگ جو اس پہ کام کر رہے تھے وہاں کے بلند ترین فلاسفرز میں سے ہیں' یہ تو فوت ہو گیا' اب اس کے بعد دوسرے اور آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس سطح پہ بھی یہ سمجھا رہا ہے۔ اور آج جیسا میں نے کہا ہے اس پہ ریسرچ ہو رہی ہے کہ نیند

---

❶ دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے ڈاکٹر چارلس ایڈورڈ رائس (?-1931) کی حسبِ ذیل کتب ابدیتِ حیات پر قابلِ توجہ مواد مہیا کرتی ہیں:

1. Why the Culture of Death is Dying.

2. Questions on Living the Culture of Life.

3. The Vanishing Right to Live: An Appeal for a Renewed Reverence for Life

4- 50 Questions on the Natural Law: what it is and why we Need it.

کی حالت میں کیا کیا Changes (تغیرات) ہوتے ہیں، کیا کیا چیز واقع ہوتی ہے، کس طرح سے وہ واپس آتی ہے، کس طرح سے وہ 450 الزُّمَر
شعور واپس آتا ہے۔ اس میں یہ سب چیزیں آجاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ((39:42 غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے اس بات میں حقیقت تک پہنچنے کی بہت بڑی نشانی ہے، یہ Symptomatic (علامات سے متعلق) چیز ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ مقصود بالذات نہیں ہے، یہ سمجھانے کے لیے، غور و فکر کرنے والوں کے لیے ایک نشانی ہے، بات وہ یہ کہہ رہا تھا۔ بنیادی چیز تو وہی تھی کہ جو صحیح راستہ اختیار کرے گا، اس کا فائدہ اس کو پہنچے گا، جو غلط راستے پہ چلے گا اس کا نقصان اس کو پہنچے گا۔

عربی زبان کی اہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے، اس میں ''ل'' اور ''علیٰ'' کا مفہوم

قرآنِ کریم کے نسخے آپ کے سامنے ہوں اور آپ تھوڑی سی عربی زبان بھی جانتے ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ زبان کتنی عجیب زبان تھی۔ یہ فَمَنِ اهۡتَدٰی فَلِنَفۡسِهٖ ((39:41 میں یہ ''ل'' ہے، اس کے لیے ''لِنَفۡسِهٖ'' ہے اور اگلے میں ہے کہ وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡهَا ((39:41 یہ جو اس زبان کے اندر Prepositions (حروفِ ربط) ہیں یہ بڑی اہم ہیں۔ یہ جو ''ل'' آتا ہے، یہ فائدے کے لیے جو چیز ہوتی ہے اس کے لیے آتا ہے اور یہ جو ''علیٰ'' آیا ہے یہ عام طور پہ جو نقصان کے لیے چیز ہوتی ہے، اس کے لیے آتا ہے۔ یعنی وہ یہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔ اس نے کھول کر بتایا کہ اس کا فائدہ اس کو ہوگا، اس کا نقصان اس کو ہوگا۔ زبان کے اعتبار سے وہ جو ایک حرف لایا ہے، اس حرف میں یہ چیز موجود ہے۔ یوں قرآن حکیم سمجھ میں آتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے قانونِ مکافاتِ عمل میں کسی سفارش کی گنجائش نہیں رکھی

عزیزانِ من! اب یہ بات ہے کہ ہر فرد کو اس کے اعمال کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہر فرد کو نہیں اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ (39:43) جیسا یہاں بھی سفارشیں چلتی ہیں، لوگوں کے حمایتی ہوتے ہیں، اس کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ اس طرح بچ جاتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ کہا ہے کہ یہ لوگ یہ تصور کیے بیٹھے ہیں کہ اسی طرح سے وہاں بھی معاملہ ہوگا، سفارشوں سے بھی بچ جائیں گے، دوسرے کے ساتھ بھی چلے جائیں گے کہ اس کا ہی لحاظ ہو جائے۔ جیسے کہتے ہیں کہ بڑے بڑے جو مقربینِ بارگاہِ الٰہی اور اولیائے کرامؒ ہیں، وہ بھی بخشوا دیں گے۔ کہا ہے کہ یہ ان کا تصور ہے۔ قُلۡ اَوَلَوۡ کَانُوۡا لَا یَمۡلِکُوۡنَ شَیۡـًٔا وَّلَا یَعۡقِلُوۡنَ ((39:43 کہا کہ سوچو تو سہی، جن کے متعلق یہ ذہن میں لیے بیٹھے ہیں، خواہ وہ دیوی دیوتا ہوں یا اس دنیا کے یہ بڑے بڑے ان کے ذہنوں کے اندر جو بڑے بڑے بزرگ اور بڑے بڑے مقربین ہیں، وہ ہوں، سوچو تو سہی کہ انہیں ذاتی طور پر کیا قدرت حاصل ہے، ان کی پیدائش ان کے اپنے ارادے سے نہیں ہوئی، ان کی زندگی ان کے اپنے خود ساختہ قوانین کے تابع نہیں چل رہی، یہ ساری خدا کے قوانین کے مطابق چل رہی ہے۔ کہا

ہے کہ اس قسم کے لوگ' خدا کے مقابلے میں کھڑے ہو کر وہاں کیا بخشوالیں گے' قطعاً نہیں' اور یہ بھی نہیں ہے کہ وہ ان کے نتائج سے اُن الزُّمَر 450 ایسا کرلیں گے کہ وہ تباہیوں سے محفوظ رہ جائیں۔ اور پھر ایسے لوگ کہ جو ۔لَا یَعْقِلُوْنَ ((39:43 ہیں یعنی وہ عقل وخرد کے مالک نہیں ہیں اور یہ عجیب چیز کہی ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں یہ جو پیر صاحبان ہوتے ہیں' ان میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو سمجھدار بھی ہوں' ان کا سمجھدار ہونا بھی ضروری نہیں ہوتا' ان کا باعلم ہونا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ کہا کہ تم یہ چیزیں ذہنوں کے اندر لیے بیٹھے ہو مثلاً دیوی دیوتا اور یہ بات اور یہ فرشتے اور یہ جنات اور پھر آپ کے ہاں کے یہ بڑے بڑے مقرب اور یہ آپ کے ہاں کے پیرانِ طریقت' جن کے متعلق ذہن میں ہے کہ یہ سارے بخشوادیں گے۔ تم خدا کے مقابلے میں کیا سمجھ رہے ہو' خدا کا قانون تو بڑا اٹل ہے۔ **قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا** ((39:44 اُنہیں بتادو کہ یہ تمام خصوصیات کہ وہ آڑے وقت میں انسان کے کام آئیں اور مشکلات میں انسان کے ساتھ کھڑے ہوں' صرف قانونِ خداوندی کو حاصل ہیں' انہیں قطعاً نہیں' کسی کے ساتھ کھڑے ہونے کی استعداد کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ یہ تو خدا کا قانون ہے' اس کے مطابق زندگی بسر ہوگی' وہی ساتھ کھڑا ہوگا تو ہوگا' اگر وہ ساتھ چھوڑ دے تو کوئی ساتھ کھڑا نہیں ہو سکے گا۔

انسان کے لیے اس پوری کائنات میں صرف قانونِ مکافاتِ عمل کی ہی حکمرانی ہے

کہا ہے کہ **لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ** ((39:44 کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اقتدار اور اختیار صرف اس کے قوانین کا ہے اور ہر شخص کا قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے' اس کی مملکت کے احاطے سے کوئی باہر نہیں جا سکتا۔ انسان جہاں جی چاہے بھاگے پھرے' وہ وہاں قانونِ مکافات کی حدود سے باہر جا ہی نہیں سکتا بلکہ یہ جو الفاظ ''راجعون'' اور ''ترجعون'' ہوتے ہیں اس کے معنی سمجھنے کے لیے یہ ذہن میں لائیے کہ یہ جو اشتہاری مفرور مجرم ہوتے ہیں' وہ اِدھر اُدھر بھاگے پھرتے ہیں' کئی کئی سال تک بھاگتے رہتے ہیں اور کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے کہ پھر وہ خود ہی حاضر ہو گیا۔ قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ یہ جو ہمارے اس قانون سے بھاگے ہوئے مجرم ہوتے ہیں' ابدی طور پر وہ بھاگے نہیں رہتے ہیں' جو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس سے دور بھاگ رہے ہیں' درحقیقت ان کا ہر قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہوتا ہے۔ یہ بھی کہانیاں مشہور ہیں کہ وہ ساری رات چلتے رہے' صبح اٹھ کر انہوں نے دیکھا تو وہیں کے وہیں تھے۔ تو قرآن کریم سمجھانے کے لیے یہ کہتا ہے کہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس سے دور بھاگ رہے ہیں' اس کے دائرے اور احاطہ سے' اس کی Jurisdiction (حد) سے' نکل جائیں گے تو یہ غلط کہہ رہے ہیں۔ ان کا تو ہر قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اور اگر یہ چیز اس زندگی میں وہ سمجھیں کہ وہ بچ رہے ہیں تو انسان کا ہر قدم ہر سانس' موت کی طرف اٹھ رہا ہوتا ہے' وہ موت کو قریب تر کر دیتا ہے۔

قرآنی تعلیم کا حرفِ آخر اور انسانیت کی تمام تر بیماریوں کا آخری علاج مکافاتِ عمل پر ایمان لانے پر ہے اور بس![450]الزُّمَر

عزیزانِ من! سمجھانے کے لیے یوں سمجھیے کہ ہر زندہ انسان کا ہر قدم موت کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ جو سمجھتے ہو کہ موت سے معاملہ ختم ہوگا، ختم نہیں ہوگا، وہ تو اور تیز ہو جائے گا۔ وہاں تو یہ نتائج ابھر کر تمہارے سامنے آئیں گے۔ اس لیے انسان بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ عزیزانِ من! قرآن مجید کا یہ ایک ہی پیغام ہے، قرآن مجید کی ایک ہی تعلیم ہے۔ وہ یہی ہے جس پہ اگر بنیادی طور پر ایمان یعنی یقینِ محکم علیٰ وجہ البصیرت حاصل ہو جائے تو پھر انسان نہ ذاتی طور پر غلط رو ہو سکتا ہے، نہ ان انسانوں کا معاشرہ یہ استبداد اور تباہیاں لا سکتا ہے جو آج دنیا میں عام ہو رہی ہیں۔ یہ صرف اس لیے عام ہو رہی ہیں کہ انسان کو اس چیز پہ یقین نہیں رہا کہ مجھے اپنے ہر عمل کا، حتیٰ کہ ہر خیال تک کا، بھی نتیجہ بھگتنا ہے۔ یہ یقین نہیں آ رہا، اس دور میں تو کہیں بھی نہیں۔ ''نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری'' ۔ کہنے کے لیے تو ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمان وہ ہے جو اس پہ ایمان رکھتے ہیں، یہ ایک لفظ ہے جو ہم دہراتے ہیں کہ ایمان رکھتے ہیں۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ کیا تجھے یہ احساس بھی ہے کہ یہ جو کچھ تُو کر رہا ہے، تم سے اس کا مواخذہ ہونا ہے، کیا اس کا یقین ہے؟ ہر غلط کام پر اس کی توجہ ہی اس کی طرف چلی جاتی ہے کہ پولیس کی گرفت میں نہ آ جاؤں، اس کی تدبیر کر لے تو راوی عیش لکھتا ہے۔ گرفت میں بھی آ جائے تو آگے یہ ہوتا ہے کہ عدالت کے معاملے میں ایسا کچھ کر لیا جائے یا رشوت دی جائے یا سفارش لڑائی جائے، کسی طرح سے وہاں سے چھوٹ جاؤں۔ اگر انتہا بھی ہو جائے، جیل میں بھی بھیجا جائے تو داروغے کے ساتھ ایسا انتظام کر لیا جائے کہ جیل کے اندر، باہر کی نسبت زیادہ آسائشیں میسر ہوں۔ ایک ہی چیز ہے جس کی آج دنیا کے اندر کمی ہے، اسی سے انسان کو Sense of Responsibility آتی ہے، ذمہ داری کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ نہیں صاحب! ٹھیک ہے پولیس والے کی نگاہ سے بھی میں چھوٹ سکتا ہوں، عدالت سے بھی شاید چھوٹ سکتا ہوں لیکن اس کے باوجود ایک اور قانون کا دائرہ ہے، اس سے نہیں چھوٹ سکتا، میرا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ ہے اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ((39:44۔ اور آگے بات وہ کہی جس میں ہم سب مبتلا ہیں۔ کہا ہے کہ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ((39:44 یہ حقیقت ہے اس پہ ایمان ہونا چاہیے کہ کائنات کے اندر جو اقتدار و اختیار ہے وہ صرف خدا کا ہے کسی اور کا نہیں ہے، اور اس کے اقتدار و اختیار کے خلاف کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ ہے ایمان، اُسے کہتے ہیں خدائے واحد پر ایمان۔

خدا پر ایمان اور اس کی اطاعت کا عملی مظاہرہ

خدائے واحد پر ایمان کے معنی یہ نہیں کہ میں کہوں کہ اللہ ایک ہے۔ تو کیا اور کسی نے کہہ دیا کہ نہیں! تین ہیں، تو کیا فرق پڑا ان دونوں کی زندگی پر۔ توحید کے معنی یہ ہیں کہ اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہے، کسی اور کی نہیں ہے۔ طبعی زندگی کے اندر عملاً ہم یہ کہہ

رہے ہیں کہ اسی کے قانون کی اطاعت ہے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ صاف ستھری ہوا میں سانس لو گے تو زندہ رہو گے' صاف ستھری ہوا 450 الزُّمَر ہے اس پہ زندگی کا انحصار ہے۔ آپ کے آخری لمحے بھی ہسپتال میں آتے ہیں وہ جسے آکسیجن سلنڈر کہتے ہیں' وہاں بھی آپ کو اسی قانون کی اطاعت کے مطابق چار سانس زندہ رکھا جاتا ہے' اس قانون کے خلاف چل کر کوئی زندہ رہ کر بتائے تو سہی۔ وہ زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ قانون ہے کہ یہ جو صاف مصفا پانی ہے' اس پہ زندگی کا مدار ہے' اس کے خلاف چل کر آدمی دیکھے تو سہی کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اسے توحید کہتے ہیں' صرف ایک قانون یا ایک کا بنایا ہوا قانون۔ وہ کہتا ہے جب طبعی زندگی کے اندر تم یہ کرتے ہو تو انسانیت کی جو تمہاری زندگی ہے اس میں اس چیز کو کیوں بھولتے ہو کہ وہاں بھی اس کے مقرر کیے ہوئے قانون ہیں جو اس نے تمہیں دیئے ہیں۔ اتنا ہی فرق ہے کہ طبعی قوانین میں تمہارا اختیار یہی ہے کہ نہ جینا چاہو تو مر جاؤ' خودکشی کرلو' جیتے جی تو اس کے خلاف نہیں جا سکتے۔ یہ قانون جو تمہیں ہم نے دیئے ہیں اس کے متعلق یہ کہا ہے کہ ٹھیک ہے تمہارا جی چاہے اس کے مطابق چلو' جی چاہے اس کے خلاف چلو لیکن یہ تو یقین رکھو کہ خلاف ورزی کرنے سے یہ نہیں کہ میں چھوٹ جاؤں گا' اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

خدا کو ماننے والوں کی کیٹیگریز اور ایمان کی زندگی

کہا ہے کہ ایک کیٹگری (شق) تو ان لوگوں کی ہے جو خدا کو مانتے ہی نہیں ہیں' خدا کو نہ ماننے کے معنی ہیں کہ خدا کے اس قانون کو نہیں مانتے جو انسانوں کی زندگی کے متعلق ہے۔ طبعی زندگی کے قوانین کو تو وہ مغرب والے ہم سے بھی زیادہ مانتے ہیں' ہم تو قدم قدم پر اس کی بے احتیاطی برتتے ہیں' وہ بڑی احتیاط کرتے ہیں اور اس میں اتنی ریسرچ کرتے چلے جا رہے ہیں لیکن جتنی ریسرچ اُدھر اور جتنا احتیاط اُدھر برت رہے ہیں' اتنی ہی اِدھر انسانوں کی زندگی سے متعلق قوانین سے غفلت اور تغافل برت رہے ہیں۔ اس لیے جو طبعی زندگی ہے' وہ تو اتنی آسائشوں کی زندگی ہوگئی ہے' مگر انسانیت کی جو زندگی ہے وہ جہنم کی زندگی ہو رہی ہے۔

ایک تو وہ ہیں جو میں نے کہا ہے کہ خدا کو مانتے ہی نہیں ہیں' اصطلاح میں ان کو آپ کافر کہہ لیجیے۔ ایک دوسرے ہیں کہ وہ کچھ خدا کے قانون کو بھی بیچ میں لے آتے ہیں اور بیچ میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو بھی لے آتے ہیں۔ اسے شرک کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ کفر بھی اپنے نتائج رکھتا ہے' طبعی زندگی کے اندر ہی سہی' یہ فزیکل لائف کے قوانین کے تابع بھی جو زندگی بسر کرے گا' ایک فرد کرے گا تو صحت مند رہے گا' قوم کرے گی تو فطرت کی قوتوں کو وہ مسخر کرلے گی' اس کو بھی اس طبعی زندگی کی خوشگواریاں تو حاصل ہو جائیں گی۔ کفر اپنا نتیجہ رکھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کہا کہ ایمان یہ نتیجہ رکھتا ہے کہ طبعی قوتوں کو مسخر کرکے خدا کے قانون کے مطابق ان کا استعمال کیا جائے۔ یہ ہے ایمان کی زندگی۔

مخلوط علاج کی طرح مشرکانہ ایمان ذلت اور رسوائی کا باعث بنتا ہے اور خالص قرآن کی طرف دی گئی دعوت سے منہ موڑ لیا جاتا ہے [450الزُّمَرْ]

بہرحال کفر میں طبعی زندگی کی خوشگواریاں تو حاصل ہوجاتی ہیں لیکن یہ جو شرک ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ تو مخلوط علاج ہو رہا ہے۔ تم صبح اٹھتے ہوئے ایلوپیتھک کی ایک دوائی پی لیتے ہوئے گھنٹے بھر کے بعد تم یونانی کی پڑیا پھانکتے ہوئے پھر اس کے بعد ہومیوپیتھک کی دو گولیاں لے لیتے ہوئے پھر ٹونہ کرانے چلے جاتے ہوئے دم کرانے چلے جاتے ہوئے شام کو پوچھو مریض کا حال کیا ہوگا۔ یہ جو چیز ہے کہ خدا کا قانون بھی، اس کے احکام بھی ساتھ اور انسانوں کے بنائے ہوئے قانون بھی ساتھ اور پھر ان دونوں کے اندر یہ بھی نہیں کہ دونوں کی حیثیت ایک قسم کی رہے۔ یہ عجیب آیت آئی۔ عزیزانِ من! کہا ہے کہ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحۡدَهُ اشۡمَاَزَّتۡ قُلُوۡبُ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ ((39:45 جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات اور حیاتِ اُخروی پر یقین نہیں رکھتے جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جملہ اقتدار و اختیار صرف خدا کو حاصل ہے، اس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے تو انہیں یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے۔ یہاں لا یؤمنون بالاٰخرۃ دیکھیے کہ یہ کہاں سے آیا ہے، اصل چیز تو وہی آخرت پر ایمان کی تھی۔ کہتا ہے کہ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِذَا هُمۡ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ)(39:45 ان لوگوں کی کیفیت پھر آہستہ آہستہ یہ ہوجاتی ہے کہ یہ جو ان کے انسانی خدا ہوتے ہیں، وہ ان کے لیے اتنے محبوب ہوجاتے ہیں، ان کی عقیدت خدا کے مقابلے میں اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یہ بڑی غور طلب چیز ہے۔ عزیزانِ من! اب جسے آپ عالمِ اسلام کہتے ہیں یا مسلمان کی زندگی کہتے ہیں، ہم اس پہ آ رہے ہیں، کفر پہ نہیں آ رہے۔ کہا ہے کہ کیفیت یہ ہے کہ ان کے سامنے جب خالص خدائے واحد، تنہا خدا کی اطاعت کے لیے کہا جائے، تو وہ کہتے ہیں کہ ان کے سینے میں درد اٹھنے لگ جاتے ہیں، اس میں نفرت اور عداوت کے شعلے بھڑکنے لگ جاتے ہیں، منہ بسور لیتے ہیں۔ اور جب اس کے ساتھ دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے جو ان کے بڑے مقرب ہوتے ہیں تو بڑے خوش ہوتے ہیں کہ سبحان اللہ صاحب! کیسی اچھی بات کہہ دی! دیکھا اب یہ ٹھیک بات ہوئی، خالص خدا کے قانون کے مطابق کام نہیں چل سکتا صاحب! زندگی چل ہی نہیں سکتی، وہ اس کے ساتھ یہ ملانے پڑتے ہیں۔ قرآن حکیم یہ کہہ رہا ہے کہ انہیں اگر خالص خدا کے قانون یعنی قرآن حکیم کی دعوت دیجیے ''پنجابی اچ کیندے نیں ایناں دے اگاں بل اُٹھد یاں نیں'' (تو پنجابی زبان میں کہتے ہیں کہ ان کو اس بات پر آگ لگ جاتی ہے)۔ اور جب اس کے ساتھ ان کے جو مقرب ہیں، جن کو یہ اپنے ہاں بڑے بڑے بزرگ مانتے ہیں، اس کے ساتھ ان کا نام لیا جائے تو بڑے خوش ہوتے ہیں کہ اب ٹھیک معاملہ بنا۔

یہاں تو یہ تھا کہ جب خدائے واحد کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ نفرت اور عداوت کے جذبات ابھر آتے ہیں۔

الزُّمَر 450 کیا معنی ہیں خدائے واحد کے؟ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم اپنے آپ کو تصریفِ آیات سے سمجھا تا ہے' دوسرے مقام پہ آتا ہے تو اس کی وضاحت کرتا ہے۔ کہا ہے کہ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤی اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ((17:46 جب تُو قرآن کی رو سے خدا کا ذکر کرتا ہے' تو اب نظر آ گیا کہ خدائے واحد کے معنی ہیں کہ خدا کی کتابِ واحد کی تعلیم اور اس کی اطاعت اور اس کے قوانین' خالص قرآن کے قوانین ہیں۔ یہاں اسی لیے اس کی تفسیر میں' اس کی تشریح میں' یہ کہا ہے۔ وہاں یہ تھا کہ و اذا ذکر اللّٰہ ((39:45 الفاظ وہی ہیں' یہاں ہے کہ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤی اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ((17:46 نفرت سے منہ موڑتے ہوئے' بھاگتے چلے جاتے ہیں کہ خالص قرآن حکیم کی بات کی جا رہی ہے اس کے ساتھ کچھ اور کیوں نہیں ملاتے۔ عزیزانِ من! آپ کے ہاں تمام عالمِ اسلام میں آج یہی ہو رہا ہے۔ پورے عالمِ اسلام میں جو خدا پر ایمان رکھ رہے ہیں' خواہ وہ نوے کروڑ ہیں' ایک ارب ہیں یا جتنی بھی آبادی ہے' کوئی بھی ایسا مقام نہیں ہے' جہاں قرآنِ خالص کی اطاعت بھی' کسی حکمت' کسی مملکت' کسی معاشرے میں ہو رہی ہو۔ کفر نہیں ہو رہا' انکار نہیں ہو رہا لیکن یہ بات نہیں ہو رہی۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم میں اسلامِ مرکب کی کوئی گنجائش ہی نہیں

اس سے بھی واضح تر الفاظ ہیں۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا کہ قرآن حکیم کے مقامات کو سامنے لائیے وہ تو خود اپنی بات واضح کرتا چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ)(40:12 یہ اس لیے کہ جب تمہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی تھی' تم اس سے انکار کرتے تھے یعنی خدائے واحد سے انکار کرتے تھے۔ وَاِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا)(40:12 اس کے ساتھ اوروں کو شریک کر دیا جاتا ہے تو پھر تم ایمان لاتے تھے کہ ہاں یہ اسلام ہے ایسا' جس پہ ایمان لایا جا سکتا ہے' یہ اسلامِ مرکب ہے۔ کہا ہے کہ وَاِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ((40:12 جب خدا کے قوانین کے ساتھ اوروں کے قوانین کو شامل کیا جاتا ہے تو تم اس روش کو جھٹ اختیار کر لیتے ہو۔ اب جو میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے معنی احکامِ خداوندی کی اطاعت ہے' یہ قرآن حکیم کی اطاعت ہے۔ اب اگلے الفاظ سن لیجیے۔ کہا ہے کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْكَبِیْرِ ((40:12 حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے' حکم صرف اس کا چلتا ہے۔ الْعَلِیِّ الْكَبِیْرِ ((40:12 انتہائی Sovereignty (مطلق اقتدار) جسے آپ کہیں گے' اقتدارِ مطلق بلند تریں اقتدار' جس سے اوپر کوئی اور نہیں ہے' اس معاملے کے اندر فائنل اتھارٹی وہ ہے۔

خدائے واحد اور قرآنِ خالص کے برعکس شخصیت پرستی کا نتیجہ انسان کو حقیقت سے دور لے جاتا ہے اور جذباتی بنا دیتا ہے' جہاں خدا کا نام محض تبرکاً لیا جاتا ہے [450الزُّمَر]

عزیزانِ من! بات صاف ہوگئی کہ خدا کی کتابِ خالص کی اطاعت کے متعلق کہا جائے تو نفرت اور عداوت کے جذبات دماغوں کے اندر بھڑکتے ہیں' جب اس کے ساتھ انسانوں کے قوانین کو شامل کر دیا جائے تو بہت خوش ہو جاتے ہیں کہ اب ٹھیک اسلام ہے' اس پہ کوئی اعتراض نہیں ہو رہا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا اعتقاد ہمارے ذہنوں میں ہوتا ہے' یہ جو ہمارے مقتدا ہوتے ہیں' وہ زیادہ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس لیے کہ انسان محسوسات کا خوگر ہے' جو محسوس چیز ہے وہ اس سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ خدا تو پھر بھی ایک ذہن کی چیز ہے' تصور کی چیز ہے' عقیدے کی چیز ہے' قرآنِ کریم بھی ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اور یہ جو شخصیتیں ہوتی ہیں' یہ انسان کی نگاہوں کے اندر زیادہ محبوب و مرغوب ہوتی ہیں۔ خدا کے خلاف چوراہے میں کھڑا ہوا کوئی جتنا جی چاہے غلط بیانی کر دے' مسلمان پاس سے گزر جاتا ہے۔ کسی ایسی شخصیت کے متعلق جس کا اعتقاد ان کے دل میں ہے' اس کے متعلق ایک لفظ کہہ کر دیکھیے' وہ گردن اڑا دیتا ہے۔ تو گویا پہلی چیز تو یہ ہے کہ جو خدائے واحد ہے اور جو قرآن خالص ہے' اگر اس کا نام لیا جائے تو اس کے خلاف عداوت اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے' اسے کوئی نہیں سنتا اور اگر اوروں کو ساتھ ملا لیا جائے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا والی بات تو پیچھے چلی جاتی ہے اور شخصیتوں والی جو بات ہے یہ ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ پھر خدا کا نام تبرکاً لیا جاتا ہے اور خالصتاً عمل انسانوں کے بنائے قوانین و احکام کا ہی ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد صرف خدا کے متعلق کچھ کہنا جرم ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں تو میں بہت دے سکتا ہوں لیکن وقت نہیں ہے اور نہ ہی ضرورت ہے۔

انسانوں کو غلام نہ بنانے کے متعلق قرآنِ خالص کی تعلیم' شریعت کے منافی ہے: ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا فرمان

ہمارے ہاں اس دور میں خالص خدا یا قرآن کی دعوت دینا اور یہ کہنا کہ دیکھیے! اس کے قانون کی اطاعت کرو جرم ہے' ہمارے ہاں اسے جرم بنا دیا گیا ہے۔ پہلے یہ چیز نظری طور پر نظر آ رہی تھی' اس دور کے اندر یہ چیز بڑی ہی زیادہ آگے بڑھ گئی ہے۔ مثال کے طور پہ آپ دیکھیے کہ بحث ہو رہی تھی کہ اسلام میں غلامی جائز ہے یا نہیں۔ اس کے بعد تو میں نے اس کے متعلق بہت کچھ لکھا اور یہ قرآنِ کریم میں واضح ہے' قرآن کریم میں تو انسان کو انسان کے غلام بنانے (معاذ اللہ) تصور نہیں کیا جاتا' وہ تو کسی کو کسی انسان کا محکوم نہیں بناتا' غلام تو ایک طرف رہا' وہ تو شرفِ انسانیت اور حریّتِ آدم کا پیغام لے کر آیا ہوا ہے۔ مولانا اسلم جیراجپوریؒ (1955-1879ء) نے یہ چیز اپنے ہاں قرآنِ خالص سے یہ لکھی کہ غلامی کا تصور اسلام میں نہیں کیا جا سکتا' یہ اسلام اور غلامی تو دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہ تم غلام اور

لونڈیاں جو اپنے ہاں شریعت کے اندر لا رہے ہو، اس کی کیا سند ہے۔ وہ (مولانا اسلم جیراجپوریؒ) بہت بڑے قرآنی آدمی تھے، بڑے ہی 450 الزُّمَر علامہ تھے۔ انہوں نے یہ لکھا ہے۔ میں لمبی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ مولانا اسلم جیراجپوریؒ نے خالص قرآن کریم سے یہ چیز ثابت کی تھی۔ مرحوم ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (1979-1903ء) نے اس کا جواب لکھا، ہمارے اس دور میں باطل کے سب سے زیادہ پیروکار جو تھے، یہ بزرگوار تھے، جواب مرحوم ہو چکے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ مؤلف کی غلطی کا اصل سبب یہی ہے کہ انہوں نے صرف قرآن کریم سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ہے جی ان کی کتاب تفہیم القرآن حصہ دوم اور اس کا 292 صفحہ ہے۔ بحث تو بڑی لمبی ہے لیکن میں صرف اس کا ایک فقرہ کہنا چاہتا ہوں کہ ''مؤلف کی غلطی یہ ہے''۔ یہ اب مسلمان کی غلطی ہوگئی کہ وہ قرآنِ خالص سے ثابت کرتا ہے۔ اب یہ دور آ گیا ہے۔ انہیں اس دور کا سب سے بڑا عالم، مفکر، اللہ کا شاہکار کہا جاتا ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ ان کے ہاں متبعین معتقدین جو جی میں آئے، کہیں، خدا بنا دیں۔ مجھے تو صرف ان کا یہ فقرہ کہنا ہے کہ یہ ذہنیت پیدا ہوگئی ہے کہ ''مؤلف کی غلطی یہ ہے کہ اس نے صرف قرآن کریم سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے''۔ اور اس کے بعد انہوں نے اس ہزار سال پہلے کے انسانوں کے اقوال دے کر ثابت کیا ہے کہ غلامی عین شریعت کے مطابق ہے، قرآن کریم کے نہیں، شریعت کے مطابق ہے۔

کوئی یتیم، دادے کی وراثت میں حصہ دار نہیں بن سکتا

انہی کی ایک اور مثال لے لیجیے۔ ان کے ہاں شریعت، وہی شریعت جو انسانوں کے وضع کردہ قوانین ہیں، جن کو قوانین فقہ کہتے ہیں، کا مسئلہ وہ بھی ہے جس کے خلاف یہ لٹھ لے کر کھڑے ہوئے ہیں۔ مثال یہ ہے کہ اگر کسی بچے کا باپ مرجائے، وہ یتیم رہ جائے، اس کا دادا موجود ہو اور اس کے بعد وہ دادا بھی فوت ہو اور اس کی بڑی جائیداد ہو تو کیا وہ یتیم دادے کی وراثت میں حصہ دار بن سکتا ہے؟ تو یہ نظر آتا ہے کہ اس یتیم بچے کو، اس کے مقابلے میں جو اس کا بیٹا یعنی اس کا چچا زندہ ہے، زیادہ کچھ دینا چاہیے، یتیم ہے، بے چارہ، محتاج ہے، کسمپرس ہے۔ ان کی فقہ یا شریعت کا قانون یہ ہے کہ اسے دادے کی وراثت سے محروم کیا جائے گا، سارا اس کے چچا کو اور اس کے بیٹوں کو دیا جائے گا۔ عزیزانِ من! سوچ لیجیے آپ کے ذہنوں میں بھی واقعات ہونگے۔ وہ چھوٹے چھوٹے بچے جو یتیم رہ گئے، باپ مرگیا، کوئی پرسانِ حال نہیں ہے، دادا کے پاس اتنی جائیداد ہے، وہ مرجاتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ یہ جو یتیم ہے، محروم ہو جاتا ہے، اس کو کچھ نہیں مل سکتا۔ یہ بات تو میں نے ابھی آپ کو Reason (عقل) پہ مبنی، عقل وفکر پر مبنی کہی کہ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ عقل کو تو چھوڑ دیجیے، یہ قرآنِ کریم کی نصِ صریح کے خلاف ہے۔ اس پہ بھی بحث چلی۔ اس کے متعلق کہا گیا کہ صاحب! یہ حصہ دینا تو قرآن کریم کے خلاف ہے، کونسی

شریعت ہے جس کے مطابق آپ یہ فیصلے کرتے ہیں!! 450الزُّمَر

1961ء کے عائلی قوانین میں یتیم پوتے کو وراثت کا حق دلانے کی مخالفت: مستند ہے سلف سے خلف تک کا فرمایا ہوا

یہ حضرات اتنے بضد ہیں کہ جب سے یہ قوانین بنے' یہ جو آپ کے فیملی لاز یا عائلی قوانین کہے جاتے ہیں' یہ 1961ء[1] میں بنے تھے' خدا خدا کر کے ان قوانین میں یہ شق داخل ہو گئی کہ اس یتیم پوتے کو حصہ مل سکتا ہے۔ آج اس کے خلاف طوفان مچایا ہوا ہے کہ اس کو منسوخ کرو' یتیم کو کیوں حصہ دیا جاتا ہے۔ سوال یہ پوچھا گیا تھا کہ کیا یتیم دادے کی وراثت میں حصہ دار بن سکتا ہے؟ اس کا جواب (مولانا سید ابوالاعلیٰ) مودودی صاحبؒ (1979-1903ء) ترجمان القرآن مارچ 1952ء میں فرما رہے ہیں۔ انہوں نے اس کے حصے کے خلاف لکھا تھا۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ ان کے ہاں کے قوانین کی سند کیا ہوتی ہے' میں قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر میں یہ کہہ رہا ہوں۔ مودودی صاحبؒ نے لکھا ہے کہ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن وحدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا کہ جس کی رو سے یہ ان یتیم بچوں کو محروم کیا جائے لیکن بجائے خود یہ بات ہے کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک' اس پر متفق ہیں' اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ اب سند ان فقہائے امت ہو گئی صاحب! کیا اتھارٹی ہے' کسی انسان کو کسی دوسرے انسانوں کے لیے قانون بنانے کی اور پھر ان کو ابدیت دیدینے کی کہ قیامت تک کے لیے یہ قانونِ اسلام رہے گا اور اس میں تبدیلی نہیں کی جا سکے گی؟ یہ تو خدا اپنے احکام کے متعلق کہتا ہے کہ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) یہ صرف خدائی صفت ہے' خدا کے قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں' ان میں ابدیت ہوتی ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں' خواہ ان کی بزرگی کا' کتنا ہی بڑا احترام ہمارے ذہن میں کیوں نہ ہو' انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے متعلق اگر یہ ابدیت سمجھ لی جائے کہ قیامت تک کے لیے غیر متبدل ہیں تو یہ تو خدائی قانون کا درجہ دینا ہے۔ سند یہ ہے کہ ''قرآن کریم سے تو مجھے یہ بات نہیں مل رہی ہے کہ ان کو محروم کیا جائے لیکن وہ سلف سے خلف تک تمام فقہاء نے متفق طور پر جب کہہ دیا ہے کہ یہ محروم ہیں تو اب قانون یہی رہے گا۔ وہ خدا کا جو قانون ہے اس پر بحث ہی نہیں ہے۔

تیس سال سے اس بحث کا ماحصل اخلاق سوز خطابات کی شکل میں ملا:: پرویزؒ

عزیزانِ من! میں تو ایک ایک ریفرنس دے رہا ہوں' میرا تو تیس سال سے ان لوگوں کے ساتھ اسی پہ جھگڑا ہے' اسی سے مجھ پہ کفر کے فتوے لگے۔ ایک ہی چیز ہے۔'' او بابا! جو خدائے واحد ہے' جو خدا کی کتاب خالصتاً ہے' وہ ہے پہلی چیز' سند تو پہلے اس کے اندر سے لائیے۔'' اب یہ جو چیز ہے کہ نفرت کتنی ہوتی ہے۔ ہم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا' آج یہ بات سامنے آ گئی کہ قرآن حکیم نے جو کہا ہے کہ ان

---

[1] حکومت پاکستان نے 1961ء میں عائلی قوانین نافذ کیے تھے۔

کے دلوں میں کتنی نفرت ہوتی ہے۔ یہ اسی بحث کے اندر کہتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ (یعنی مقابل میں جو قرآن حکیم پیش کرنے 1450الزُّمَرْ والے ہیں)، اپنی بحث میں بالعموم بازاری غنڈوں کا سا طرز اختیار کرتے ہیں، ان کے مضامین پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شخص ایک غلاظت بھری جھاڑو ہاتھ میں لیے کھڑا ہو اور زبان کھولنے کے ساتھ ہی مخاطب کے منہ پر اس جھاڑو کا ایک ہاتھ رسید کر دے، ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں اور نہ اس قماش کے لوگ اس قابل سمجھے جاسکتے ہیں کہ ان سے کوئی علمی بحث کی جائے۔ یہ ترجمان القرآن مارچ 1952ء کے اندر ان لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے جو قرآنِ خالص کے قوانین کی طرف دعوت دیتے تھے۔ تو قرآن حکیم نے جو کہا ہے کہ جب یہ دعوت دی جائے تو ان کے دلوں کے اندر نفرت اور کینے اور عداوت جوش مارتے ہیں۔ دیکھتے ہیں ان کا مظاہرہ کس شکل میں ہورہا ہے! اس سے بڑی گالیاں بھی کوئی دی جاسکتی ہیں! یہ ہے عزیزانِ من! جو قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ((39:45 خدائے خالص کی طرف دعوت دیجئے، قرآن کریم کے قوانین کی اطاعت کا ذکر کیجئے، تو ان کے سینے میں بغض اور نفرت کے جذبات جوش مارتے ہیں، اس کے ساتھ انسانوں کو ملا دیجیے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔

قرآنی حکومت تو عملاً آپ ﷺ کے عہدِ مبارک میں ہی قائم ہو چکی تھی

کہا ہے کہ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ((39:46 ان سے یہ کہہ دو کہ خدا ہی ہے جو اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا، وہی ہے جس کے قوانین کا اقتدار پوری کائنات کے اندر کارفرما ہے، وہی ہے عالمِ غیب وشہادت، جو چیز مشہود ہے اس کو بھی جانتا ہے، آنے والی چیزوں کو بھی جانتا ہے، مضمر چیزوں کی Potentialities (صلاحیتوں) کو بھی جانتا ہے، جو Actualize (بارز) ہو جاتی ہیں ان کو بھی جانتا ہے، تمہارے مستقبل کو بھی جانتا ہے۔ ایسی ہی ہستی اس قابل ہے جو انسانوں کے لیے قوانین بنا سکے۔ کہا ہے کہ تم اعلان کردو کہ اس وقت تم جو جی میں آئے کہہ لو، جس کی جی چاہے اطاعت اختیار کرلو، خدا کے ساتھ اور ہستیوں کو ملا لیجیے لیکن اعلان کرو کہ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ((39:46 جن باتوں میں یہ تیرے بندے اختلاف کر کے یہ کرتے ہیں، تیرا ہی حکم اس میں فیصلہ کرے گا کہ کون صحیح کہتا تھا اور کون غلط کہتا تھا۔ تو یہ جو ہے کہ خدا کا قانون ہی فیصلہ کرنے والی اتھارٹی بنے گا، تو وہ تو جب حضور ﷺ نے یہ اعلان کیا ہے تو یہ محض نظری اعلان نہیں تھا، چند ہی دنوں کے بعد وہ مملکت، وہ نظام قائم ہو گیا تھا جس میں ہر فیصلہ خدا کی کتاب کے مطابق ہوتا تھا۔

قانون میں تضاد نہ ہوتو فرقہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا

گویا آپ ﷺ نے یہ جو اعلان فرمایا تھا' اس پر اسی زمانے میں' اسی دور میں' عمل ہو گیا تھا' فیصلے اسی کے مطابق ہوتے تھے۔ اسی لیے اس دور میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ ایک ضابطہ قانون کے تابع اگر سب رہیں تو وہاں فرقہ کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔ اس کے اندر ایک ضابطے کے تابع سب رہیں تو فرقے بننے کی یہی شکل ہوگی کہ اس کے اندر کوئی چیزیں ایسی ہیں جو متضاد ہیں' کوئی ان میں سے اس طرح کرتا ہے' کوئی اُسی کتاب کے مطابق اُس طرح کرتا ہے۔ وہ تو قرآن مجید نے خود کہہ دیا ہے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے' اس کا تو دعویٰ یہ ہے۔ تو ایک ضابطہ ہو جس میں کوئی اختلافی بات نہ ہو' سارے انسان اس کا اتباع کریں تو پھر تفرقہ کیسے پیدا ہوسکتا ہے' فرقہ کیسے بن سکتا ہے۔

عزیزانِ من! آپ کوئی فرقہ لیجیے' ان کی آخری سند کسی نہ کسی انسان پر جا کر ختم ہوگی۔ فرقہ بنتا ہی شخصیت سے ہے' یہ شخصیت پرستی ہوتی ہے۔ بات بالکل صاف ہے۔ جیسا میں عام پیش پا افتادہ سی مثال دیا کرتا ہوں' یہ ایک قانون: Keep to the left (بائیں ہاتھ چلو) یہ بہر حال ایک چھوٹا سا قانون ہے لیکن مملکت پاکستان میں جو سب بسنے والے ہیں' یہ ان کے لیے قانونِ واحد ہے' ایک قانون ہے۔ اس قانون کی سب اطاعت کرتے ہیں' سوائے ان کے جو دانستہ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کو تو چھوڑ دیجیے۔ جو اس قانون کی اطاعت کرتے ہیں کیا آپ نے کبھی ان میں بھی اختلاف دیکھا ہے کہ کسی گول دائرے کے اوپر جا کر ان میں اختلاف ہو کہ کوئی دائیں کو جائیں' کوئی بائیں کو جائیں۔ یہ بات ہی نہیں ہے' ایک قانون پہ چلنے والوں میں تفرقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تفرقہ یہاں نہیں ہوگا۔ اگر امریکا کے اندر قانون ہے Keep to the right تو دائیں والے وہاں چلیں گے' اور یہاں والے بائیں چلیں گے کیونکہ دو قانون الگ الگ ہو گئے۔

مسلمانوں میں ہزار برس سے فرقہ بندی کی بنیادی وجہ قرآن کریم کے احکامات کو عمل میں لانے کے بجائے شخصیت پرستی ہے

یاد رکھیے! اسلام اور امت کی وحدت لازم وملزوم ہے' امت میں اگر تفرقہ ہے تو اسلام نہیں ہے۔ اسلام خدائے واحد کی' کتابِ واحد کی اطاعت کا نام ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے یہ کہہ دیا ہے کہ فرقہ بندی شرک ہے۔ یہ تو خدا کے متعلق کہا کہ شرک ہے اور رسول ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ فرقے پیدا کرلیں' اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ نہ خدا کا تعلق نہ رسول کا واسطہ۔ اور جس چیز کا نام اسلام رکھا جاتا ہے' اسلام کے قانون رکھا جاتا ہے' وہ سارے انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔

اسی لیے یہ کیفیت ہے کہ ایک قانون نافذ ہوتا ہے' ایک فرقہ اٹھ کر کہہ دیتا ہے کہ ہم اس کو اسلامی نہیں مانتے۔قرآن کریم کا قانون نافذ 450 الزُّمَر ہوتو کیا کسی مسلمان کی جرأت ہوتی ہے کہ نہیں مانتا' نہیں مانتے تو اسلام کو چھوڑ کر غیر مسلم ہو جاؤ' ٹھیک ہے تمہیں اجازت ہے لیکن جب معاملہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کا رہے گا تو ہر ایک کی فقہ کا ہوگا' تو پھر تو ہر ایک کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ یہ کہے کہ میں اس کو نہیں مانتا۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی پھر اجازت دینی پڑ گئی۔یہی واقعہ آپ کے ہاں ہوا۔ہوا یہ کہ زکوٰۃ کا قانون ایک پبلک لا کی حیثیت سے نافذ کیا گیا کہ سب کو ماننا ہوگا' اختلاف پیدا ہو گیا۔ایک فرقے نے کہا کہ یہ تو خاص فرقے کی فقہ کا قانون ہے' ہمارے نزدیک یہ اسلامی نہیں ہے' ہم اسے اسلامی نہیں مانتے' ہمارے نزدیک اسلامی وہی ہے جو ہماری فقہ کے مطابق ہے۔آپ کو اس کے سامنے جھکنا پڑا' اس قانون میں تبدیلی کرنا پڑی کہ ہر ایک اپنی اپنی فقہ کے مطابق کر سکتا ہے۔تو وہ قانون مملکت تو رہا ہی نہیں۔

فرقوں کی موجودگی میں اسلام کا وجود قائم ہی نہیں ہوسکتا

عزیزانِ من! اس لیے اسے سن رکھیے' آنے والا مورخ شاید میرے اس ٹیپ سے ہی سن کر یہ دیکھے کہ جسے آپ اسلامی نظام' اسلامی مملکت' اسلامی شریعت' اسلامی قانون کہیں گے اس میں فرقے نہیں ہونگے' وہ تمام ان لوگوں پہ جو مسلمان کہلائیں گے یا بہرحال جو خدا پہ' قرآن کریم پہ' ایمان رکھنے والے ہونگے' وہ ان سب پہ لاگو ہوگا' اس کے اندر کوئی تفرقہ نہیں ہوگا۔امت کی وحدت اور اسلام لازم و ملزوم ہیں' جہاں فرقہ آیا اسلام چلا گیا۔وہ شرک ہو جاتا ہے۔کہا ہے کہ اَنۡتَ تَحۡکُمُ بَیۡنَ عِبَادِکَ فِیۡ مَا کَانُوۡا فِیۡهِ یَخۡتَلِفُوۡنَ (39:46) جن معاملات میں یہ اختلاف کرتے ہیں' اس کا فیصلہ تیرے ہی قانون کے مطابق ہوسکتا ہے' وہی کر سکتا ہے۔جو اس کے خلاف جانے والے ہیں' قرآن کریم نے کہا تھا کہ شرک ظلمِ عظیم ہے۔ظلم کے معنی ہوتے ہیں کہ جو شے جس مقام پہ ہونی چاہیے' اسے وہاں نہ رکھنا' خواہ اس سے نیچے لے آئیں' کمی کر دیں تو بھی اس کو ظلم کہتے ہیں' اس کو اس کے مقام سے اوپر لے جائیں تو بھی یہ ظلم ہوتا ہے۔شرک میں انسانوں کو ان کے انسانیت کے مقام سے اونچا لے جا کر خدائی مقام دیدیا جاتا ہے۔اس لیے قرآنِ کریم نے اس کو ظلمِ عظیم کہا ہے' ظلم ہی نہیں ظلمِ عظیم کہا ہے۔اور اسی لیے یہ کہا ہے کہ اور جو چھوٹی موٹی تمہارے ہاں کی معصیت ہو جاتی ہے' کوئی لغزش ہو جاتی ہے' کوئی غلطی ہو جاتی ہے' تو اس کا تدارک ہوسکتا ہے لیکن یہ جو دو قسم کے قانون ایک مملکت کے اندر تم چاہتے ہو کہ رائج ہوں تو اس کا تو تدارک ہی نہیں ہوسکتا۔یہ ہیں معنی اس آیت کے کہ جس میں کہا ہے کہ اس میں اور تو سب کچھ بخشا جا سکتا ہے شرک نہیں بخشا جا سکتا۔اگر اپنی اپنی الگ الگ انسانوں کی بنائی ہوئی فقہیں جو ہیں وہ قانون بنائیں تو پھر کوئی مملکت' جو قانونِ واحد ہے' وہ سارے مسلمانوں سے منوا ہی نہیں سکتی۔

مال ودولت، فرقہ بندی کی تباہ کاریوں کو ختم نہیں کر سکتے اس کا علاج صرف قانونِ واحد کا نفاذ ہے 450الزُّمَر

اسی لیے کہا کہ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ یَكُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ ((39:47 یہ روش اختیار کرنے والے اگر چاہیں کہ دنیا بھر میں جو کچھ بھی دولت مال سب کچھ ہے، اس کو دے کر اس کی وجہ سے جو تباہی آتی ہے، اس کا وہ بدلا بن جائے، اس کا کفارہ ہو جائے، قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ یہ غلط ہے، یہ نہیں ہوسکتا کیونکہ ایک مملکت میں ایک سے زیادہ قوانین چلنے سے جو تباہیاں آتی ہیں دنیا کی مال و دولت اس کا کفارہ نہیں بن سکتی۔ کیا انداز ہے! کہا ہے کہ اس کا نتیجہ تو ظاہر ہو کر رہے گا، یہ بات جو ناہمواریاں پیدا کرے گی وہ ظاہر ہو کر رہے گی۔ اور یہ تباہیاں ان راستوں سے آئیں گی جن کا سان گمان بھی تمہارے ذہن میں نہیں ہوگا۔ وَبَدَا لَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ((39:48۔ پھر کیا ہوگا؟ ناہمواریاں ہوں گی جو خود انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہے، اس کی پیدا کردہ ناہمواریاں نمایاں طور پر ابھر کر ان کے سامنے آجائیں گی۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ((39:48 اور ان سے جو کہا جاتا تھا کہ یہ جس روش پہ تم جا رہے ہو، یہ تباہیوں کی روش ہے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے ہر قسم کا انتظام کر رکھا ہے کہ تباہی نہ آئے۔ یہ تمہارے اس کہنے کا مذاق اڑایا کرتے تھے، استہزا کیا کرتے تھے۔ یہ ہدایت یہ راہنمائی جس کا یہ استہزا کرتے تھے کہ اس کی وجہ سے وہ تباہی کیوں آئے گی، وہ چیز ان کے اوپر آکر چھا جائے گی۔ عزیزانِ من! خلافِ روشِ خداوندی راہ اختیار کرنے سے اس قسم کی تباہی آیا کرتی ہے اور قوموں کی تو ساری تاریخیں اس کے اوپر شاہد ہیں۔

عزیزانِ من! وقت ہو گیا۔ سورۃ الزمر کی آیت 48 تک ہم آئے، 49ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔



رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀...❀...❀

پانچواں باب: **سورۃ الزمر** (49 تا55)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۫ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِىَ
فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ
مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۱﴾ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِىْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ قُلْ يٰعِبَادِىَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ
اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنِيْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ
مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ
مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

عزیزانِ من! آج دسمبر 1980ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الزمر کی آیت 49 سے ہو رہا ہے(:(39:49۔

پچھلے جمعہ کو درس کا ناغہ رہا' چونکہ پہلے اعلان نہیں ہوتا آپ احباب آ جاتے ہیں اور اس کے بعد مایوس لوٹنا پڑتا ہے تو جتنا قلق آپ کو ہوتا ہے' اس کا مجموعی اثر مجھ پر ہوتا ہے' وہ مجھ پہ بڑا گراں گزرتا ہے کہ آپ احباب اتنی اتنی دُور سے' اس کے لیے آئیں اور یہاں سے مایوس لوٹنا پڑے۔ میری طبیعت زیادہ ہی خراب تھی' آج بھی میں اچھا نہیں ہوں لیکن پھر اس اعتبار سے کہ یہ اعلان نہیں تھا' آپ احباب آ گئے' کوشش کرتا ہوں' جتنے وقت کے لیے یہ ہو سکے' درس پیشِ خدمت ہوگا۔ اور جو میں نے قرآنِ کریم کھولا ہے تو مسئلہ ایسا سامنے آ گیا ہے کہ اس کی اہمیت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ کچھ بات کر ہی لی جائے تو جس حد تک میری یہ صحت ساتھ دے گی اس حد تک میں پیش کرونگا۔ اس کے بعد اگر ایسی معذوری ہوئی تو معذرت چاہ لونگا۔

دنیا بھر کی انسانیت کے لیے ایک مشکل ترین مسئلہ غربت کا یا مفلسی کا ہے: یہ ورنوں کی تقسیم ہے 450الزُّمَر

کہا ہے کہ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِىَ فِتْنَةٌ وَّلٰـكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ o قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ((39:49-50)۔غور کیجیے کہ انسانیت کا سب سے بنیادی اہم مشکل ترین اور پریشان کن مسئلہ کیا ہے؟ یہ ہے غریبی کا مسئلہ۔امیری کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے' یہ صرف غریبی کا ہی مسئلہ ہے۔اور یہ اگر آبادی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دنیا میں 99% سے بھی زیادہ یہی مفلس' غریب' محتاج' پریشان پھر رہے ہیں۔ یہ کس جرم کی پاداش میں ہیں؟ ایک بچہ کوٹھی میں' محل میں' بنگلے میں' پیدا ہوتا ہے' عین اسی وقت دوسرا بچہ اسی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر کے اندر' پیدا ہوتا ہے۔وہ کوٹھی میں پیدا ہونے والے بچے نے کونسی کاریگری کی تھی کہ وہ وہاں پیدا ہوگیا اور اس کوٹھڑی میں پیدا ہونے والے بچے نے کونسا جرم کیا تھا کہ یہ اس غریب کے ہاں پیدا ہوا۔ان دونوں بچوں سے پہلے پوچھا نہیں گیا تھا کہ کہاں پیدا ہونا چاہتے ہو' یہ ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوا لیکن یہی جو کوٹھی اور آؤٹ ہاؤس کا تفاوت ہے' یہ ساری عمر ان کے ساتھ رہا۔وہ بلا کچھ کیے ہوئے جسے کہا جاتا ہے سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا' یہ بغیر کسی جرم کے ساری عمر اس پریشانی کے اندر رہا کہ رات کی روٹی کیسے ملے گی۔ یہ مسئلہ عالمگیر ہے' کسی خاص قوم' خاص ملک' خاص وطن سے متعلق نہیں ہے' یہ انسان کا عالمگیر مسئلہ ہے۔آج کا نہیں ہے' جب سے تاریخ کا پہلا ورق ہم اُلٹتے ہیں' یہ طبقات نظر آتے ہیں۔اوپر کے طبقے نے اس خیال سے کہ نیچے کے طبقے کی کوئی نگاہ ان کے خلاف ادھر نہ اٹھے' بڑا بندوبست کیا ہے کہ یہ بلا مزدومعاوضہ ساری عمر اس قدر آرام اور چین اور آسائش ہی کی نہیں بلکہ اس قدر عیاشی تک کی زندگی بسر کرے اور دوسری طرف میں ہوں یا یہ نیچے طبقے والے ہیں کہ ساری عمر دو وقت کی روٹی کی فکر نے ہی ان کی جان نہیں چھوڑی۔ یہ کیوں ہے؟ پوری تاریخِ انسانیت میں یہ مسئلہ چلا آرہا ہے اور اب تو کچھ ایسا ہو گیا ہے یا کر دیا گیا ہے کہ اس ''کیوں'' کے متعلق کبھی کوئی سوچتا ہی نہیں ہے۔اب ایسا ہے یہ تو ہے ہی' اسی طرح ہوتا ہے' اسی طرح ہو رہا ہے' اسی طرح ہوتا جائے گا۔جس طرح یہ کوئی نہیں سوچتا کہ دو آنکھیں کیوں ملیں' چار کیوں نہیں ملیں' اسی طرح یہ بھی کچھ ایک مسلمہ سا بن گیا ہے کہ اب کوئی سوچتا ہی نہیں ہے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ان کی توجہ اس مسئلے سے ہٹانے کے لیے بڑی گہری سازشیں ہوئی ہیں' ایسے ہی یہ غریب اس مقام پہ نہیں پہنچ گیا کہ اب یہ کھڑا ہو کر سوچے بھی نہیں کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ ہندو نے کہہ دیا کہ پیدائش کے اعتبار سے انسانی بچے چار ورنوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور وہ پیدائشی تقسیم ہوتی ہے' برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا پیدائشی برہمن' پھر کھشتری پھر ویش اور پھر سب سے نیچے شودر۔ برہمنوں کو برہما نے اپنے سر سے پیدا کیا' کھشتری کو بازوؤں سے پیدا کیا' ویش کو پیٹ سے پیدا کیا اور شودروں کو پاؤں سے پیدا کیا۔ یہ برہما کی تقسیم ہے جسے کوئی انسان الٹ نہیں سکتا۔ جب تک

انسان اس خدا کو مانتا رہے گا اس کے لیے سوال ہی نہیں پیدا ہو گا کہ جو پاؤں سے پیدا ہوا ہے' وہ یہ کہے کہ میں سر والے کے برابر ہو جاؤں 450 الزُمَر
وہ تو برہما نے یہ تقسیم کی ہے۔ ورنوں کی یہ تقسیم ایک بڑی گہری سازش ہے۔

غربت کو پروان چڑھانے کے سلسلہ میں ایک گہری سازش کا تذکرہ اور ہماری متضاد خیالی

ہم ورنوں کی اس تقسیم کا مذاق اڑاتے ہیں اور جب یہی مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے تو بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے' وہ جسے چاہتا ہے غریب بنا دیتا ہے' جسے چاہتا ہے امیر بنا دیتا ہے۔ بات تو وہی ہو گئی' برہما نے اس طرح سے پیدا کر دیا' یہاں خدا نے تقسیمِ رزق اپنے ہاتھ میں رکھی۔ نہ وہ شودر صاحبِ اختیار ہے کہ وہ پاؤں سے اٹھ کر سر کی طرف چلا جائے' نہ یہاں کا غریب صاحبِ اختیار ہے کہ رزق تو خدا نے لکھ رکھا ہے تو کیا خدا سے یہ جنگ یا لڑائی کی جائے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ چیز جس پہ ان بچوں کو کوئی اختیار نہیں تھا' یہ انسان جو ساری عمر مجبور رہا' اُسے کس طرح اس پوزیشن میں رکھ دیا کہ وہ کھڑا ہو کر سوچے ہی نہیں کہ میری اس غریبی اور افلاس کا ذمہ دار کون ہے۔ اُدھر برہما ہے' اِدھر خدا ہے جو رزق دیتا ہے۔ سوچیے تو سہی اس قسم کے برہما کے متعلق تو آپ مذاق اڑاتے ہیں۔ اس قسم کے خدا کے متعلق آپ کچھ نہیں کہتے۔ مجھ سے پوچھے بغیر مجھے دنیا میں بھیج دیا' کس باپ کے گھر بھیج دیا' ساری عمر مجھ سے نہیں پوچھا گیا' اس کے بعد رزق کی تقسیم اپنے ہاتھ میں رکھی کہ مجھے دو وقت کی روٹی بھی اطمینان سے نصیب نہیں ہوئی اور اسے اتنا کچھ دیا کہ میرے بچوں کو وہ کچھ نہیں ملتا جو اس کے کتوں کو ملتا ہے۔ اسے خدا کی تقسیم کہا جاتا ہے۔ انسان بیچارے کا سارا مسئلہ ہی یہ ہے' غریب کو فرصت ہی نہیں ملتی کہ کسی اور طرف دھیان دے۔ کیا یہ بات ایسی نہیں کہ اس پہ سوچا جائے؟ قرآن مجید نے بنیادی طور پر اسی مسئلے کو لیا ہے اور اس نے کہا یہ ہے کہ یہ سب انسانوں کا خود پیدا کردہ ہے۔ انسانی بچہ جو پیدا ہوتا ہے' جسے آپ کہتے ہیں کہ اتنی بڑی جائیداد کا مالک اور وارث اور اتنے بڑے امیر کا بیٹا ہے' وہ بھی اسی طرح بغیر تن ڈھانپنے کے کپڑے کے پیدا ہوتا ہے جیسا غریب بچہ۔ یہ دونوں ایک شکل میں پیدا ہوتے ہیں یعنی وہ اپنے ساتھ کوئی کپڑا بھی نہیں لاتا۔ یہ تو پیدا ہونے کے بعد کی بات ہے کہ اسے مخمل اور کمخواب اور سردیوں کے اندر اتنا گرم کپڑا ملتا ہے اور اس بیچارے کو گدڑی ملتی ہے۔

طبقاتی تقسیم کے سلسلہ میں خدا پر لگایا گیا بنیادی الزام: میں نے اپنی کاریگری سے یہ دولت کمائی ہے

عزیزانِ من! پیدائش کے ساتھ تو دونوں ننگے ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد' یہ جو پیدا ہونے کے بعد' پہلے سانس کا فرق ہے' یہ عمر بھر ساتھ ہی نہیں رہتا' اولاد تک ساتھ رہتا ہے' نسلوں تک ساتھ رہتا ہے' یہ سب کچھ مستقل ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید اس مسئلے کا حل بتا رہا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا خدا اس قسم کا نہیں ہے کہ وہ یہ طبقات پیدا کرے' یہ انسانوں کے خود پیدا کردہ ہیں۔

قرآن مجید نے ایک نظام دیا جس کے اندر یہ دونوں طبقات باقی نہیں رہتے' صرف انسان باقی رہتے ہیں اور ہر ایک کو ان کی 450 الزُّمَر
ضروریات کا سامان مہیا ہوتا رہتا ہے۔ مختلف مقامات پر وہ ان لوگوں کی خام خیالی کو' نظریئے کو' فریبِ نفس کو' سامنے لاتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی دولت جو ہمارے پاس ہے' یہ ہماری کاریگری ہے' جس کی وجہ سے ہمیں ملی۔ یہ جو انسان کا وضع کردہ نظام ہے اس کو آج کل کی اصطلاح میں نظامِ سرمایہ داری (Capital System) کہتے ہیں کہ جس میں ہر فرد کو اختیار ہے کہ جتنی دولت جی چاہے وہ سمیٹ لے' قانون اس میں مداخلت نہیں کرتا۔ اس کا نمائندہ قرآنِ کریم نے قارون کو قرار دیا ہے۔ کہا یہ ہے کہ جب اس قارون سے کہا کہ اتنی فراواں دولت جو تمہارے پاس ہے اور تمہیں اس کی بال آخر ضرورت بھی کیا ہے' تمہاری پرورش کے لیے تو وہی دو روٹیاں چاہئیں جو غریب کو چاہئیں' تو تم اس پر سانپ بن کر کیوں بیٹھے ہو' اس دولت کے اوپر تمہارا کیا حق ہے؟ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ((28:78 اس نے کہا کہ یہ میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے' میں نے اپنی کاریگری سے یہ دولت کمائی ہے۔ جب میں نے اپنی کاریگری سے' اپنی ہنرمندی سے' کمائی ہے تو میں اس کا مالک ہوں' کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اس میں سے کچھ لے جائے۔

غربت اور امارت کے سلسلہ میں فسادِ آدمیت کی اصل وجہ

عزیزانِ من! وہاں ((28:78 میں صرف قارون کا بیان تھا اور اس آیت ((39:49-50 کے اندر قرآن حمید کہتا ہے کہ یہ ایک قارون کی بات نہیں ہے' یہ سب قارون ہیں اور ان میں سے کسی سے بھی پوچھیے تو وہ یہی کہتا ہے۔ اس میں کہا ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو اس وقت تو انہیں خدا یاد آجاتا ہے اور جب یہ پھر مال دولت ملتا ہے' آسائشیں ملتی ہیں تو جب ان سے کہا جائے کہ بھئی! اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لو' زائد از ضرورت ان کے لیے رکھو جن کی ضرورتیں پوری نہیں ہو رہی رہیں تو کہا ہے کہ جواب وہی دیتے ہیں جو قارون نے دیا تھا کہ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ((28:78 میں نے اسے اپنی کاریگری سے کمایا ہے' کسی کا کیا حق ہے کہ اس میں سے کچھ لے جائے۔ ایک لفظ ہے جس سے قرآن حمید نے یہ بات کی۔ کیا بات ہے قرآن حمید کی! کہا کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ ((39:49 فسادِ آدمیت کی اصل جڑ یہ نظریہ ہے۔ کیا بات کہہ گیا ہے! یہ ذہنیت' یہ نظریہ' یہ تصور' یہ فریبِ نفس ہے کہ ''مجھے اپنی کاریگری کی بنا پہ یہ ملا ہے''۔ یعنی وہی کہ مجھ میں کمانے کی زیادہ صلاحیتیں ہیں' میں نے یہ طریقے اختیار کیے' یہ سب کچھ کیا' اس بنا پہ مجھے یہ ملا' کسی کو کیا حق حاصل ہے اس پہ اعتراض کرنے کا۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ ((39:49 یعنی وہ چیز جو بظاہر بڑی معقول نظر آتی ہے' وہ کہتا ہے کہ ''فسادِ آدمیت کی جڑ ہی یہ بات ہے''۔ یہ تصور اس کی جڑ ہے۔ اس تصور کے ماتحت آگے پھر نظام قائم ہوتا ہے جس کی رو سے یہ ساری دولت اوپر ہی اوپر گردش کرتی رہتی ہے۔ طبقات کی تقسیم اس ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

450الزُمَر

نظامِ سرمایہ داری کی چابک دستی کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وَلٰـكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ((39:49 جو حقیقت کی بات ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اس پہ نگاہ نہیں رکھتے' اُسے نہیں سمجھتے بلکہ دلیل یہی دیدیتے ہیں۔ اور پھر یہ چیز کسی خاص قارون سے متعلق نہیں ہے۔ کہا ہے کہ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ((39:50 یہ سرمایہ داری نظام کے حامل شروع سے یہی کہتے چلے آ رہے ہیں' یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اور پھر اس کا نتیجہ دو لفظوں میں بتادیا کہ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ((39:50 یہ جو وہ کہتے تھے کہ ہم نے کمایا ہے' اس غلط نظام کی تباہی کا جب وقت آیا تو ان کی اس کمائی نے ان کو کچھ فائدہ نہ دیا۔ یہ جو بات وہ کہتے ہیں کہ یہ ہماری ہنرمندی کا نتیجہ ہے' قرآن کریم اس کی تردید کرتا ہے' اس کی تغلیط کرتا ہے۔

قرآنِ کریم کی رو سے سرمایہ دارانہ ذہنیت کی اصل جڑ انسان کا اپنا بنایا ہوا نظام ہے

قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ تصور ہی غلط ہے کہ یہ جو کچھ انہیں ملا ہے وہ ہے جسے تم کہتے ہو کہ یہ میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے' ہماری صلاحیتوں کا نتیجہ ہے۔ قرآنِ کریم اسے غلط قرار دے کر آگے بڑھتا ہے' کہتا ہے کہ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ((16:52 پہلے یہ سمجھ لو کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے' وہ کسی انسان کی ملکیت نہیں ہے۔ وہ بچہ جو امیر کے گھر میں پیدا ہوا ہے' وہ رحمِ مادر سے اپنے ہاتھ میں کوئی دستاویز لے کر نہیں آیا کہ خدا نے اس کے نام پٹہ لکھ دیا ہو کہ یہ ساری جائیداد تمہاری ہے۔ وہ جو انسانوں کا بنایا ہوا قانون یا نظام ہے یہ دستاویز وہ دیتا ہے یعنی وہ اسے ان تمام چیزوں کا مالک ٹھہراتا ہے۔ خدا مالک نہیں ٹھہراتا' اس نے تو کہا ہے کہ ساری ملکیت جتنی بھی ہے' یہ تو خدا کی ملکیت ہے اور عزیزانِ من! اس کے بعد یہ کہا ہے کہ یہ جو چیزیں' جنہیں تم اپنی صلاحیتیں کہتے ہو' جن کی بنا پہ یہ کچھ تمہیں ملتا ہے یا کماتے ہو' وہ کس کی عطا کردہ ہیں؟ انسان کی صلاحیتیں' سماعت و بصارت اور فہم و بصیرت' جسے یہ کہتے ہیں کہ بڑا اعلیٰ دماغ پایا ہے' بڑی قابلیت ہے' اُسی کی بنا پہ وہ کہتا ہے کہ وہ زیادہ کما رہا ہے' یہ تمام کس کی عطا کردہ ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ سنو! پہلی چیز تو یہ بتایئے کہ یہ سماعت و بصارت' یہ قلب' یہ فواد' یہ دماغ' یہ اس کی صلاحیتیں' تم نے کہاں سے خریدی ہیں؟ یہ تو غریب اور امیر دونوں کے جو بچے تھے' ان کو یکساں طور پہ ملی تھیں۔ اگر امیر کے ہاں پیدا ہونے والا بچہ اندھا پیدا ہو جاتا تو وہ ساری دنیا کی دولت خرچ کر دیتا تو اسے آنکھیں نہیں مل سکتی تھیں' یہ تو اس بچے کو بھی اسی طرح سے ملیں جس طرح غریب کے بچے کو ملی ہیں۔ اب آگے یہ ہوا کہ صاحب! اس کی تعلیم ہے' Opportunities ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ یہ تو تمہارے انسانوں کا بنایا ہوا جو نظام ہے' اس کی رو سے ہے کہ اُس کو ملیں گے' اِس کو نہیں ملیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں بچوں کی تعلیم و تربیت یکساں کیوں نہیں کی گئی' ان کو یہ مواقع (Opportunities) یکساں کیوں نہیں بہم پہنچائے گئے؟ کہا کہ یہ کچھ ہم تو نہیں

کرتے' یہ تو تمہارا نظام کرتا ہے کہ ایک اپنے بچے کی پہلی جماعت میں' وہ جماعت بھی ابھی نہیں ہوتی' نرسری ہوتی ہے' جہاں بچہ گھنٹے بھر کے 450الزُّمَر لیے کھیلنے جاتا ہے' چار چار' پانچ پانچ سو روپیہ مہینہ ❶ اس پہ صرف ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس یہ دوسرا بچہ ہوتا ہے اس کو وہ لکھنے کی تختی اور قلم بھی نہیں ملتی۔ یہ کس کی پیدا کی ہوئی چیز ہے؟ کیا خدا کے ہاں کی ہے؟ تعلیم کے اعتبار سے اس طبقے کو اتنے مواقع میسر ہیں' اس کے بعد پھر زندگی میں جو مختلف میدان ہیں اُس کے لیے اُس کے سامنے کوئی پھاٹک نہیں لگا ہوا اور اس کے برعکس اس غریب کے بچے کو آگے ہی نہیں بڑھنے دیا جاتا' نہ کوئی سفارش' نہ Contacts' نہ روابط' نہ اعلیٰ درجے کی خاندانی خدمات یعنی کوئی چیز بھی اس کے پاس نہیں ہے۔ وہ دوسرا جو بنگلے میں پیدا ہوا تھا اسے یہ سب کچھ میسر ہے۔ عزیزانِ من! کہا ہے کہ یہ بتاؤ تو سہی کہ یہ جن نعمتوں کی بنا پر جو عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (28:78) کہتے ہو کہ مجھے یہ میری کاریگری کی بنا پر ملا ہے' یہ کاریگری تم جن چیزوں کا نتیجہ بتا رہے ہو' یہ سماعت و بصارت' یہ فہم اور صلاحیتیں' یہ دماغ اور قلب' یہ ساری صلاحیتیں اور پھر یہ مواقع اور یہ تعلیم' (وہ اس بچے سے پوچھتا ہے کہ) یہ سب تم نے کہاں سے خریدی تھیں؟ یہ تمہارا پیدا کردہ نظام ہے کہ ایک طبقے کے بچوں کو یہ سب کچھ میسر ہوتا ہے' دوسروں کو اس سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اس طرح سے وہ غریب پیدا ہوا اور پھر عمر بھر وہ غریب رہا اور تم اس کو یہ کہہ کر تھپکیاں دے کر سلاتے ہو کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔

قرآنِ کریم کا خدا پر ایمان لانے کا تصور انسانی سوچ اور عمل کے خدوخال کو بدل دیتا ہے

قرآنِ کریم نے پہلی چیز یہ کاٹ دی جو اس نے کہا تھا کہ یہ کچھ میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس کے بارے میں تو کہا ہے کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) کسب و ہنر کی جس قدر صلاحیتیں تمہیں نصیب ہیں' وہ سب خدا کی عطا کردہ ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ خدا پر جو ایمان ہے' وہ کیا فرق پیدا کرتا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں' خدا پر میرا ایمان ہے۔ وہ امیر کا بچہ بھی یہ کہتا ہے' غریب کا بچہ بھی یہ کہتا ہے۔ غریب تو بے چارہ خدا کو اور زیادہ زور سے یاد کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا پر ایمان کیا فرق پیدا کرتا ہے کہ ایک کا ایمان ہے اور ایک کا نہیں ہے۔ سنیے! کیا فرق پیدا کرتا ہے؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ ایک وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں لیکن جن صلاحیتوں کی بنا پر میں نے یہ سب کچھ کمایا ہے' وہ میری صلاحیتیں ہیں۔ دوسرا شخص وہ ہے جو خدا کو مانتا ہے' وہ یہ کہتا ہے کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) یہ سب صلاحیتیں میری نہیں تھیں' یہ ساری صلاحیتیں' یہ علم' یہ کاریگری' یہ سب کچھ خدا کا عطا کردہ تھا۔ اس سے یہ سارا ایمان کا فرق پیدا ہو گیا۔ جب وہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ سارے ذرائع' جتنے تھے' یہ میرے تھے ہی نہیں' یہ تو خدا کے

---

❶ یاد رہے یہ بات دسمبر 1980ء کی 12 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ آج یہ فیس اس سے کئی گنا زیادہ وصول کی جا رہی ہے۔

عطا کردہ تھے' اس لیے ان کی بنا پر جو کچھ مجھے حاصل ہوا ہے' وہ میرا نہیں ہے۔ آپ غور کرتے ہیں کہ خدا پر جسے ایمان کہا جاتا ہے' وہ کیا فرق پیدا کرتا ہے۔ اس کا نام ہے خدا پر ایمان۔ کہا ہے کہ وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)۔ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے۔ اب اس ایمان کے بعد امیر اور غریب کے یہ طبقات باقی ہی نہیں رہتے' وہ کاریگری جس کی بنا پہ وہ کہتا تھا کہ میں نے زیادہ کمایا اور کماتا ہوں' اس کا مالک میں ہوں تو وہ تو پہلے' ایمان کی بنا پہ یہ کہتا ہے کہ یہ میری کاریگری نہیں' یہ صلاحیتیں میری نہیں' یہ تو خدا کی عطا کردہ ہیں' وہ چھین کر لے جائے تو کوئی بھی مجھے واپس نہیں دے سکتا۔ عزیزانِ من! قرآن کریم اس ذہنیت والے انسان تیار کرتا ہے جو اس کے بعد ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں یہ طبقاتی تقسیم باقی نہیں رہتی۔

انسان کی گمراہی کے متعلق ہمارے ہاں قرآنی تراجم کی کیفیت اور کام کرنے کی صلاحیتوں میں اختلاف کی اصل حقیقت

دوسرے مقام پہ اسی سورۃ میں اس نے اور واضح کیا ہے۔ کہا ہے کہ وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (16:71)۔ وہ جو کہا ہے کہ پھر اسی قرآن سے یہ اتنے لوگ گمراہ ہوتے ہیں یا ان کو گمراہ کر دیا جاتا ہے' تو وہ اس قسم کی آیتوں کے صحیح ترجمے یا صحیح مفہوم نہ ہونے کی بنا پر ہوتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (16:71) اللہ نے تم میں سے فضیلت دی بعض کو بعض پر رزق کے معاملے میں۔ تو چلیے صاحب! وہ کہہ دیا کہ جب اللہ نے فضیلت دی ہے تو اس کو چھین کون سکتا ہے۔ یعنی وہ جس چیز کو باطل قرار دینے کے لیے سارے قرآن کریم کے اندر اس نے اتنا کچھ کہا تھا' وہ ایک ترجمے نے' ایک مفہوم نے' سارا ہی باطل قرار دیدیا' وہیں لے آئے کہ یہ تو خدا کی تقسیم ہوتی ہے۔

کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ کمائی کرنے کی صلاحیتوں میں یہ فرق ہے' اس فرق کی بنیاد پہ جو نظام تم قائم کرتے ہو' جو عمارت اٹھاتے ہو' وہ باطل ہے۔ کہا ہے کہ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (16:71) یہ مختلف نوعیّتوں کے جو کام کرنے ہوتے ہیں' وہ تو مختلف لوگوں کے سپرد کیے جاتے ہیں' کسی میں کچھ جسمانی محنت زیادہ صرف ہوتی ہے' کسی میں دماغی قابلیت زیادہ صرف ہوتی ہے' یہ تو معاشرے کے کام ہیں' جن کو مل کر سرانجام دینا ہے۔ اب یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ صاحب! دماغی قابلیت زیادہ تھی اس لیے ہم نے زیادہ کما لیا' قرآن کریم کہتا ہے کہ اس کمانے کے بعد یہ لوگ' انہیں جو ان کے ساتھ کام کر رہے ہوتے ہیں اور وہ ذرا پست درجے کے کاموں پر متعین ہوتے ہیں' ان کے متعلق یہ طے کرتے ہیں کہ ان کو اتنا نہیں ملے گا' اس سے کم ملے گا' کہتا ہے کہ پہلے تو یہی کس نے طے کیا ہے کہ اس کو کم ملے گا اور تمہیں زیادہ ملے گا؟ یہ خود ہی طے کرتے ہو۔ اور وہ کہتا ہے کہ یہ جو اس طرح سے جن کو زیادہ کمائی مل

جاتی ہے' وہ اپنی ضرورت سے زائد جو کچھ ہے وہ ان لوگوں کو نہیں دیتے' جنہیں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اس تصور کے ماتحت ہے 450 الزُّمَر صاحب! اس طرح سے تو گھوڑا گدھا برابر ہو جائیں گے' سارے ہی برابر ہو گئے' مزدور بھی ویسا ہی ہو گیا' انجینئر بھی ویسا ہی ہو گیا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ تصور ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے خدوخال سے انکار خدا سے انکار ہے اور اُسے قرآن حکیم نے کفر سے تعبیر کیا ہے

عزیزانِ من! یہاں (16:71) میں قرآن حکیم کا لفظ ''برآدی'' آیا ہے۔ یہ عجیب لفظ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ''جس کی کوئی چیز ہے' وہ اس کو لوٹا دی جائے''۔ کہا ہے کہ اس نظام کے تابع تم سب نے آپس میں معاونت سے' تعاون سے' یہ کچھ کیا ہے' ایک فیکٹری آپ لے لیجیے' ایک ادنیٰ مزدور' ایک بہت بڑا انجینئر' یہ سارے مل کر اس فیکٹری میں کچھ کر رہے ہوتے ہیں اور اس کی جو Product (پیداوار) ہوتی ہے' اس میں ہر ایک کا حصہ ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ جو زیادہ سنبھال لیتے ہیں' یہ انہیں نہیں دیدیتے جنہیں وہ اپنے ہاں کا مزدور سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس اعتبار سے تو وہ سب برابر ہو جائیں گے۔ کیا بات ہے قرآن حکیم نے ایک لفظ کہہ کر یہ سارا تصور کاٹ دیا۔ کہا ہے کہ اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ (16:71) تو گویا یہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ یہ جو چیزیں' نعمتیں اور صلاحیتیں ان کو ملی تھیں' یہ خدا کی عطا کردہ نہیں تھیں' یہ لوگ اس سے انکار کرتے ہیں۔ اس بات پر اگر ایمان رکھیں تو اس کے بعد معاشرے کے اندر تقسیم کار تو ہو جائے گی' مختلف نوعیتوں کے کام مختلف لوگ سرانجام دیں گے۔ اس کے نتیجے میں امیر اور غریب کے طبقے نہیں پیدا ہونگے۔ اس کے بعد یہ تصور کہ ہم میں کمانے کی زیادہ صلاحیت تھی اس لیے ہم کو زیادہ مل گیا نہیں چلے گا۔ یہاں کہا ہے کہ اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ (16:71) تو گویا بنیادی طور پر یہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ یہ جو صلاحیتیں اور مواقع ہمیں میسر ہیں' یہ خدا کے عطا کردہ ہیں' یہ لوگ اس چیز سے عملاً انکار کرتے ہیں' تو کہا ہے کہ یہ خدا سے انکار ہے' یہ ایمان نہیں ہے' یہ اسلام نہیں ہے' یہ کفر ہے۔ اُسی بنیاد پہ آپ دیکھیے کس طرح سے قرآن اس کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے۔ اور اسی لیے اس نے یہ کہا ہے کہ ذرا ان سے پوچھو تو سہی۔ کہا کہ قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ اَخَذَ اللّٰهُ سَمۡعَكُمۡ وَ اَبۡصَارَكُمۡ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ مَّنۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ يَاۡتِيۡكُمۡ بِهٖ (6:46) یہ جو سماعت و بصارت اور قلب و دماغ کی صلاحیتیں کہتے ہو' اگر انہیں خدا سلب کر لے تو کائنات میں کوئی قوت ایسی ہے جو تمہیں ان کو واپس دیدے۔ کہتا ہے کہ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ ثُمَّ هُمۡ يَصۡدِفُوۡنَ (6:46) ہم لوٹا لوٹا کر' پلٹا پلٹا کر' وہی حقائق ان کے سامنے بار بار بیان کرتے ہیں کہ ان پر حقیقت واضح ہو جائے لیکن اس کے باوجود ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ سننے کے بعد پھر اُدھر ہی چلے جاتے ہیں' وہی نظام قائم کرتے ہیں۔

انسانی صلاحیتوں کے علاوہ رزق کے سرچشموں میں بنیادی شے زمین ہی ہے' جہاں سے ہر قسم کا سامانِ

450الزُمَرْ

رزق پیدا ہوتا ہے

یہ جسے دولت کا تفاوت کہتے ہیں' یہ جو امیر غریب طبقات کی تقسیم ہوتی ہے' ایک تو اس کے اندر یہ کمائی ہے' اس کو انڈسٹری کہہ لیجیے' کامرس کہہ لیجیے اور جو دوسرا حصہ ہے اس کے اندر وہ زمین کی پیداوار ہے۔ درحقیقت اصل و بنیاد تو وہ زمین ہی ہے جہاں یہ سب کچھ پیدا ہوتا ہے۔ یہ انڈسٹری وغیرہ کی جتنی بھی چیزیں ہیں۔ یہ کچھ اس زمین سے حاصل ہوتا ہے' یہ اسی کو مختلف شکلیں دیتی ہے۔ حاصل ہونے میں نباتات ہی نہیں' اجناس ہی نہیں بلکہ اس میں سے تو یہ دھاتیں بھی نکلتی ہیں۔ زمین کے اندر سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے' وہ ہے جسے آپ Raw Material (خام مال) کہتے ہیں' وہ سارا زمین سے حاصل ہوتا ہے۔

انسانوں کی دنیا میں ملکیتِ زمین کی حقیقت اور اس میں نوعیتِ کھیتی باڑی

قرآن مجید اس کو بنیاد قرار دیتا ہے کہ کہو! اس زمین کے اوپر تم اپنی ذاتی ملکیت کس طرح سے ثابت کر سکتے ہو؟ یہ جو آج ایک شخص کے پاس زمین ہے' یا تو وہ یہ چیز ہے کہ صاحب! اس کے باپ سے وراثتاً منتقل ہو کر آئی ہے' تو گویا باپ کے پاس تھی' وہ کہتا ہے تم یہ بتاؤ کہ باپ کے پاس یہ ملکیت کیسے تھی۔ چوری کا مال اگر وراثتاً بھی کسی کے پاس آجائے تو وہ تو چوری کا ہی ہوتا ہے۔ اس کے پاس جو تم ملکیت کہتے ہو تو یہ تمہارا اپنا بنایا ہوا قانون ہے' قانون کی رو سے یہ ملکیتیں ثابت ہوتی ہیں اور تو کوئی ذریعہ ہی ثابت کرنے کا نہیں ہے کہ یہ زمین میری ہے' اس پر میری ملکیت ہے۔ وہ تو پٹواری کے ہاں جا کر دیکھنا پڑتا ہے' اس خانہء ملکیت کے اندر جو کچھ اس نے لکھا ہوتا ہے' قانون اس کو تسلیم کرتا ہے تو اس کی ملکیت قرار پاجاتا ہے۔ ملکیت کی تو کیفیت ہی یہ ہے' وہ پٹواری کے ریوینیو کے رجسٹر میں ملکیت کے خانے میں تبدیلی کرنے کے لیے پوچھو نہیں کہ کیا کچھ دھندے ہوتے رہتے ہیں' سارے مقدمے اسی پہ چلتے ہیں۔ خدا کی طرف سے دستاویز تو نہیں ملتی۔ پھر کہتے ہو کہ جی! میں نے فلاں سے یہ خریدی ہے' جس سے خریدی ہے' اس کی ملکیت کیسے ثابت ہوگی۔ پھر وہی چیز جو ہے کہ چوری کا مال خریدنے سے بھی تو وہ جائز نہیں ہوتا' قانوناً بھی وہ چیز چوری کی رہتی ہے۔ یہ تو آپس میں تم نے کچھ قانون بنا رکھے ہیں۔ اب دیکھیے وہ اس کو کس انداز سے سمجھاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ جو زمین ہے' جو کھیت ہے' ذرا غور کرو' اس میں سے جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے' حاصل ہوتا ہے' تم اپنے آپ کو اس سب کے مالک قرار دیتے ہو' ذرا سوچو' تمہاری ملکیت اس کے اوپر کیسے ثابت ہوئی۔ کہتا ہے کہ اَفَرَاَیْتُمْ مَّاتَحْرُثُوْنَ ((56:63 غور کرو یہ جو تم کھیتی باڑی کرتے ہو' زمین پہ کاشتکاری کرتے ہو' ذرا اس پہ غور کرو۔ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (56:64)۔ یہاں ((56:63 پہلا لفظ ''تحرثون'' ہے یعنی کاشتکاری کرنا۔

کاشتکاری میں تو انسان اور خدا کا مشترکہ طور پر اپنا اپنا حصہ ہوتا ہے

دوسرا لفظ ''تَزْرَعُوْنَهٗ'' ہے' اس زمین میں سے کچھ پیدا ہونا۔ کہا ہے کہ یہ جو چیز ہے' ٹھیک ہے تم محنت کرتے ہو۔ اور پھر یہ کہ اس زمین سے ایک ایک دانے سے سات سات سو دانے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کہو یہ کچھ تمہاری کاریگری ہے یا ہم نے اس زمین کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے۔ اگر اس زمین میں یہ صلاحیت نہ ہو یا نقص ہو جائے تو کہا کہ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ o اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ o بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ((56:65-66-67 اگر تمہاری کھیتی ماری جائے' جسے کہتے ہیں کہ وہ جو بیج ڈالا ہوتا ہے' وہ بھی تمہیں چٹی پڑ جائے' تم اس سے بھی محروم ہو جاؤ۔ کہو کہ اس میں تمہارا کتنا حصہ تھا؟ یہی کہ یہ ہل چلانا' بیج ڈالنا' کچھ محنت کرنا اور باقی رہی وہ صلاحیت جو ایک ایک دانے کو سات سو میں تبدیل کرتی ہے' کہو کہ وہ تو تمہاری پیدا کردہ نہیں تھی۔

کھیتی کے لیے بیج میں اگنے کی صلاحیت' زمین کے نمکیات' سمندر سے کشید کردہ میٹھا پانی' سورج کی تپش' بادِ نسیم اور موسموں کا تغیر' چاند کی سنہری کرنیں' بارش کا ایک ایک قطرہ اور آخر پر خدائے علیم و خبیر کی قدم قدم پہ نگہ بانی: یہ سب خدا کا ہے' تمہاری صرف محنت ہے۔ اس کا حساب کیسے ہو؟

قرآن مجید کس انداز سے بات سمجھاتا چلا جاتا ہے! آخر میں بات کرتا ہے' کہتا ہے کہ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ o ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ o لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ((56:68:66:70 کھیتی کے بعد پانی کا سوال آتا ہے۔ یہ سمندر کا کھارا پانی کہ اس کے ایک گھونٹ سے بھی ہلاکت ہو جائے' اچھی بھلی فصل کے اوپر چھڑک دیا جائے تو وہ جل جائے' راکھ ہو جائے۔ وہ سمندر کا پانی وہاں سے کشید کرنے کے بعد' وہ بادلوں کے مشکیزوں میں بھر کر ہم ہواؤں کے کندھے پہ ان کو لاد کر' تمہارے کھیت کے اوپر لاتے ہیں اور وہاں سے وہ صاف میٹھا پانی' جو فصل کے لیے مدد ہوتا ہے' وہ پانی اس میں سے برستا ہے۔ کیا تمہاری کاریگری یہ کر سکتی تھی؟ اگر وہ پانی جیسا سمندر میں ہے' اسی قسم کا پانی تمہاری کھیتی پہ برس جاتا تو پھر کیا اس کھیتی میں سے کچھ اگتا؟ نہیں' کچھ بھی نہیں۔ اس پانی کے اوپر تو نہ تمہاری ملکیت تھی' نہ وراثتاً تمہیں ملا تھا' نہ زر خرید تھا' نہ تم نے خود ہی اس کو ایسا تیار کیا تھا۔ یہ کس نے کیا ہے؟ کہا ہے کہ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِىْ تُوْرُوْنَ o ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ)(56:71-72 یہ حرارت' خواہ وہ سورج کی حرارت ہو' خواہ تمہاری پیدا کردہ آگ ہو' جس پہ زندگی کا کھیتی کا دارومدار ہے' ہر شے جو زندہ رہتی ہے' بتاؤ! یہ جو حرارت ہے یہ کس کی عطا کردہ ہے؟ کیا یہ تمہاری پیدا کردہ ہے یا ہماری عطا کردہ ہے؟ عزیزانِ من! اب اس کے بعد بات آئی ہے کہ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً ((56:73 یہ ساری باتیں تمہیں جو ہم نے بیان کی ہیں' یہ کوئی داستان نہیں ہے' یہ ایک بہت بڑی حقیقت کا تذکرہ ہے جو تمہارے سامنے ہم کر رہے ہیں' اُس کی یاد دہانی کرا رہے ہیں۔ ہم اس لیے یاد دہانی کرا رہے ہیں کہ تمہیں ماننا پڑے گا کہ یہ ایک مشترکہ کاروبار تھا' اس

میں تمہارا حصہ صرف تمہاری محنت کا ہے۔اس ساری کاشتکاری کے‘ زراعت کے‘ پروگرام کے اندر شروع سے آخر تک جو تم نے کیا‘ 450 تھوڑا سا بیج ڈالا‘ باقی سارا کچھ تم نے صرف محنت کی ہے۔اور اس کے بعد اس محنت میں جو کچھ ماحصل یہاں سے پیدا ہوا ہے‘ تمہاری محنت کے سوا باقی سارا کچھ ہمارا ہی ہے۔کہا ہے کہ یہ تمہارا اور ہمارا مشترکہ کاروبار ہے۔مانتے ہو؟ تم اس سے انکار تو نہیں کر سکتے۔جب کاروبار مشترکہ تھا تو جو اس میں سے پیدا ہوا ہے‘ وہ جو پیدائش ہے‘ وہ بھی تو تمہاری اور ہماری مشترکہ ہے‘ اپنا حصہ تم لے لو‘ ہمارا حصہ ہمیں دیدو۔ دیانتدار تو کاروبار یوں کرتا ہے۔اس میں جو تمہارا ہے وہ ہمارے اس اصول کی رو سے تمہیں ملنا ہے کہ لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:39)۔کہا ہے کہ غور سے دیکھو تو جو کچھ بھی یہ پیدا ہوتا ہے‘ جو ملتا ہے‘ اس میں صرف تمہاری محنت ہوتی ہے‘ ہم اس محنت سے تمہیں محروم نہیں کرنا چاہتے۔آؤ! بانٹ لیں‘ اس کے اعتبار سے تقسیم کر لیتے ہیں۔تقسیم کرنے سے دیکھو تو سہی تمہارے حصے میں کتنا آتا ہے۔وہ جتنا تمہارے حصے میں آتا ہے‘ وہ تم لے لو‘ جو باقی ہے وہ ہمارا حصہ ہے‘ تو وہ ہمیں دیدو۔اب تُو سامنے آتا نہیں تو اس پہ تم یہ کہو گے کہ ہم تو دینے کو تیار تھے‘ آپ لینے والے تو تھے ہی نہیں تو ہم اس کو کیا کرتے۔کہا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ یہ کس کا حصہ ہے اور کس کو دو تو وہ ہم تک پہنچ جائے گا۔کہا کہ وَّمَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِیۡنَ (56:73) یہ بھوکوں کا حصہ ہے‘ ان کو دیدو‘ ہم تک پہنچ جائے گا۔ہم تمہاری محنت کو غصب نہیں کرتے‘ ہم Exploit (استحصال) نہیں کرتے‘ نہایت ایماندار کاروباری کی طرح بات کرتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی نعمتوں کا تجزیہ اور تباہیوں کی وجہ

اب آپ غور کیجیے کہ اس نے جو بنیاد رکھی تھی کہ یہ میری کاریگری کا نتیجہ ہے جو کچھ مل رہا ہے‘ وہ اس کاریگری کا تجزیہ (Analysis) کیسے کرتا چلا جاتا ہے۔کسب و ہنر سے کچھ کماتے ہو تو اس میں جو تمہاری یہ صلاحیتوں کی بنیاد ہیں‘ وہ کس کی ملکیت ہیں؟ وہ ہماری عطا کردہ ہیں۔ہم انہیں چھین کر لے جائیں تو دنیا بھر کی قوت صرف کر دو‘ وہ تمہیں واپس نہیں مل سکتیں۔اور وہ ہم نے ہر انسان کو یکساں دی ہوئی ہیں‘ اس میں ہم نے امیر اور غریب کا فرق نہیں کیا۔پھر یہ زمین کی پیداوار‘ جو کچھ اس میں سے ملتی ہے‘ اس میں بھی تمہاری محنت صرف ہوتی ہے‘ باقی وہ جسے Investment (سرمایہ کاری) کہتے ہیں‘ وہ تو سارا ہمارا ہوتا ہے۔کہتا ہے کہ حساب کر کے دیکھ لو۔اور پھر وہی فساد کی جڑ یہ بات ہے کہ کہتا چلا جاتا ہے کہ نہیں صاحب! اِنَّمَاۤ اُوۡتِیۡتُہٗ عَلٰی عِلۡمٍ (39:49) یہ میری کاریگری کا نتیجہ ہے اور اسی سے یہ دونوں امیر اور غریب کے طبقے دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔یہ خدا کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔انسانوں نے مل بیٹھ کر ایک نظام بنایا‘ نظام ہمیشہ یہ جو اوپر کا طبقہ ہے وہ بناتا ہے‘ اس نظام اور اس قانون کے بنانے میں اس غریب کا تو کوئی حصہ ہی نہیں ہوتا۔خود یہ نظام بناتا ہے‘ خود طبقات کی تقسیم کرتا ہے‘ خود اس قسم کے قانون بناتا ہے اور انہیں کہہ دیتا ہے کہ یہ سب خدا نے کیا ہوا ہے۔کہا ہے کہ تاریخ میں یہ جتنی قوموں میں

450الزُّمَر

تباہیاں تم دیکھو گے وہ اسی ذہنیت کے ماتحت آتی ہیں۔

کمائے کوئی کھائے کوئی: یہ تو قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے ہی خلاف ہے

جب تک طبقات کی یہ تقسیم موجود ہے' یہ جسے آپ غریب اور امیر کا طبقہ کہتے ہیں' اُس نے کہا ہے کہ یہ فتنہ ہے' فساد ہے' یہ مٹ نہیں سکتا۔ اسے ختم کرنے کے لیے وہ اس ذہنیت کے انسان تیار کرتا ہے جو جان مار کر محنت کریں' کیونکہ اس نے تو ماسعٰی کہا ہے کہ جو محنت نہیں کرتا اور وہ محنت کے قابل ہے تو اس کا تو حصہ ہی کوئی نہیں ہے۔ اس کے برعکس کچھ ایسے ہیں جو محنت کرنے کے قابل تو ہیں لیکن اتنی محنت نہیں کر سکتے' وہ معذور ہیں تو اُن کے لیے کہا ہے کہ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ((51:19 ان کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں یا محنت کرنے سے وہ بالکل ہی معذور ہیں' یہ ہیں جن کو بغیر محنت کے اس میں سے دیا جائے گا ورنہ اصول یہی ہے کہ محنت کا جو معاوضہ یا ماحصل ہے' یہ دیا جائے گا۔ اب وہ طبقہ جسے آپ آج دیکھ رہے ہیں کہ کچھ محنت نہیں کرتا' صرف سرمائے کے زور پر سارا کچھ لے جاتا ہے۔ محنت کے لحاظ سے وہ بیچ میں سے نکل جاتا ہے۔ قرآن مجید اپنے معاشی نظام کی رو سے اس کا کوئی حصہ ہی نہیں بتاتا۔ باقی یہ سارے وہ ہیں جو محنت کرتے ہیں اور ان کی محنت سے سب کچھ پیدا ہوتا ہے' خواہ وہ فیکٹریوں میں پیدا ہو' خواہ وہ زمینوں سے پیدا ہو۔ ان کے بالمقابل ایک شخص فیکٹری کا مالک ہے' ہزار مزدور اس میں کام کر کے اتنا کچھ کر کے دیتے ہیں۔ جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس کا مالک وہ اکیلا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ مزارعے اس زمین پر سال بھر محنت کر کے کاشت کرتے ہیں جو پیدا ہوتا ہے اس کا مالک' وہ زمین کا مالک ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید اپنے نظام میں بنیاد ہی یہ رکھتا ہے کہ یہ ملکیت کہاں سے ثابت ہوتی ہے۔

طبقاتی تقسیم میں نہ امیر واجب التکریم رہتا ہے اور نہ ہی غریب

یہ جو کہتے ہیں کہ قرآن حکیم اقتصادی مسائل کا حل کیا پیش کرتا ہے تو وہ یہ حل نہیں پیش کرتا ہے کہ ان کو کچھ خیرات دیدی جائے یا ان لوگوں کے لیے یتیم خانے کھول دیئے جائیں' Poor Houses (مساکنِ غربا) بنا دیئے جائیں۔ یہ وہی ہے جسے آج کل Welfare State (فلاحی ریاست) کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اس کا یہ حل نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) کو بنیاد قرار دیتا ہے کہ ہر انسان' انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ کہتا ہے کہ جب طبقاتی تقسیم کر دیتے ہیں کہ یہ غریب ہے اور یہ امیر ہے تو غریب ہو یا امیر' وہ واجب التکریم رہتا ہی نہیں ہے۔ اس غریب کو تو یہ احساس ہوتا ہے کہ میں کسی دوسرے کا محتاج ہوں' اس بیچارے کا شرف اور تکریم جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتی ہے۔ اس لیے تکریمِ انسانیت کا بھی تقاضا یہی ہے کہ یہ جو Man Made (انسان کے پیدا کردہ) طبقات ہیں' یہ انسانوں کی خود پیدا کردہ چیزیں ہیں' یہ باقی نہ رہیں۔

450الزُّمَر

قرآنی معاشرے کے خدوخال

جنّتی معاشرے میں تقسیم کار رہے گی' مختلف قسم کے کام مختلف قسم کے جولوگ ہیں' وہ ان کے سپرد کیے جائیں گے' وہ ان کاموں کو سرانجام دیں گے' یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوگا کہ شام کو میری دیہاڑی کتنی بنی آیا وہ دو روپے ہے پانچ روپے یا دس روپے ہے اس کے بعد اور بڑھا دیئے۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اب تو بس اُس کی دیہاڑی بنتی ہے جو وہ مقرر کر دیتا ہے جو ان چیزوں کا مالک ہے' خواہ وہ کارخانے کا مالک ہو' خواہ زمین کا مالک ہو' یہ دیہاڑی وہ مقرر کر دیتا ہے۔ یہ بھی وہ ہے جس غریب کو کام مل جائے اُسے وہ مل جاتا ہے' جسے کام ہی نہ ملے' اس کو وہ بھی نہیں ملتا۔ قرآن کریم کی رو سے یہ انسانوں کے بنائے ہوئے نظام ہیں۔ اس لیے یہ چیز جو غریبوں کے ذہن میں کوٹ کوٹ کر بھر دی جاتی ہے کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اس لیے کسی غریب کا یہ کہنا کہ اس امیر کو اتنا کچھ کیوں مل گیا مجھے کیوں نہیں ملا' یہ تو خدا کے خلاف جنگ کرنا ہے' اس کی تقسیم کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرنا ہے۔ تو (معاذ اللہ) خدا کے متعلق یہ تصور ہے۔ شروع سے آخر تک سارے قرآن کریم میں آپ دیکھیے' وہ یہی کہتا جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا خود پیدا کردہ تصور ہے۔ یہ ذہنیت ہے جسے یہ عام کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ طبقات اسی طریق سے قائم رہ سکتے ہیں' اگر انہیں بتا دیا جائے کہ اس میں انسانوں کا کوئی ہاتھ نہیں ہے' یہ خدا کی طرف سے تقسیم ہے۔ شودر عمر بھر شودر رہے گا' اسی بنا پہ غریب عمر بھر غریب رہے گا۔ عزیزانِ من! قرآن کریم کی جو بنیاد ہے' وہ اس نظریئے پر نہیں ہے۔

انسانیت کے لیے سب سے اہم سوال اُس جذبہء محرکہ کا ہے جس کی نشاندہی قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں کر رکھی ہے

میں نے عرض کیا کہ خواہ وہ یورپ کی ویلفیئر اسٹیٹس ہی کیوں نہ ہوں' یہ ذہنیت وہاں تو سب سے زیادہ قائم ہے کیونکہ وہاں Capital System (نظامِ سرمایہ داری) ہے۔ یہ روس نے یا چین نے جنہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ Capital System (نظامِ سرمایہ داری) ختم کریں گے' اُسی زمانے میں اقبالؒ (1877-1938ء) نے ان سے کہہ دیا تھا کہ بات تو تم نے بڑی اونچی سوچی ہے لیکن کیا وہ بنیاد بھی تمہیں مل گئی ہے جس کے اوپر یہ عمارت استوار ہوگی؟ اور بنیاد یہ تھی کہ ہر فرد اس کے اوپر یقین رکھے کہ مجھ میں جو یہ کمانے کی صلاحیتیں ہیں' یہ میری اپنی نہیں ہیں' یہ خدا کی دی ہوئی ہیں' اس لیے ان کا ماحصل جو کچھ بھی ہوگا وہ میری ملکیت نہیں ہے۔ وہ پیدا ہوا ہے' اس کی تقسیم انسانوں کی ضروریات کے مطابق ہونی ہے' مجھے بھی میری ضرورتوں کے مطابق اس میں سے مل جائے گا۔ یہ جو کہا تھا کہ ان (کمیونسٹوں) کے ہاں خدا کا انکار ہے اس لیے وہ نظام پنپ نہیں سکتا' تو وہ پوچھتے تھے کہ ہم انکار کرتے ہیں' تم اقرار کرتے ہو تو

بتاؤ تو سہی' ہمارے انکار کا کیا نقصان ہے' تمہارے اقرار کا کیا فائدہ ہے۔ وہ اتنی سی بات ہے کہ تم خدا کو مانتے ہو' ہم نہیں مانتے' اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔تم ماننے والے تو ہمارے محتاج ہو۔ یہ خدا کے ماننے کے یہ معنی ہیں کہ یہ میری کاریگری کا نتیجہ نہیں ہے' یہ چیزیں تو اس کی عطا کی ہوئی تھیں۔عطا کی ہوئی بات کو تو (مرزا اسداللہ خان) غالب (1869-1797ء) انتہا تک پہنچتا ہے کہ

جان دی ' دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی نعمتوں کے احساس کی اہمیت اور قوموں کی تباہی کے اسباب وعلل

یہاں تو ان نعمتوں کا حق ہی ادا نہیں ہوتا جو اس کی طرف سے ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ ذہنیت جہاں پیدا ہوتی ہے کہ خدا کی طرف سے ملنے والی نعمتوں کے احساس کی اہمیت ہو تو' اُسے خدا پر ایمان کہتے ہیں۔اسی لیے اس نے یہ چیز کہی ہے۔اب یہ چیز کہ یہ خدا کی طرف سے تقسیم ہے' دیکھیے کس طرح سے وہ اسے کاٹتا چلا جاتا ہے۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس ذہنیت کی بنیاد کے اوپر جو نظام قائم کیا تھا اس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (39:50) یہ جو اس نظام کی تباہی والی بنیاد تھی اس کی وجہ سے جب یہ عمارت گری ہے تو ان میں سے کوئی نہ بچا' اُن کا کسب وہنر ان کے کسی کام نہ آیا۔آپ تاریخ میں دیکھیے جتنی بڑی بڑی قومیں تباہ ہوئی ہیں' وہ قومیں وہ نہیں تھی جو غریبی کی وجہ سے تباہ ہوئی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اپنے ہاں یہ طبقات پیدا کیے۔تو یہ جو دونوں طبقوں کی تفریق تھی' اس کا نتیجہ یہ تھا لیکن قومیں وہ تباہ ہوئی ہیں جن کے ہاں دولت کی بڑی فراوانی تھی۔قرآن حکیم نے کہا ہے کہ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (28:58) جب دولت کی فراوانی اتنی زیادہ ہو جائے اور تقسیم اتنی غلط ہو جائے تو پھر یہ جو عدمِ توازن ہوتا ہے' بیلنس قائم نہیں رہتا' اس وقت قوم ڈوبتی ہے اور گرتی ہے۔فرد چلتا ہوا ہو' چلتے میں اگر اس کا ایک قدم ذرا سا بیلنس ادھر ہو جائے تو گر جاتا ہے' اچھے سے اچھا طاقتور بھی نہیں سنبھلتا اگر ذرا سا بیلنس بگڑے۔آپ کرسی پہ بیٹھے ہیں' کرسی کا ایک پایہ دوسرے سے ذرا سا بھی نیچا ہو تو ساری کرسی الٹ جاتی ہے۔جب انسانی معاشرے کے اندر یہ عدمِ توازن اس حد تک پہنچے' بیٹھنے والا اسی کی وجہ سے گر جائے' قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم نے کہا ہے کہ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا (39:51)۔ یہ جو ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے کیا ہوا ہوتا ہے' وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ مَا كَسَبُوْا (39:51) یہ جو انہوں نے اپنے لیے نظامِ اکتساب بنایا تھا' یہ اس کی وجہ سے تھا' یہ جو ان کو تباہی آئی ہے' یہ اس غلط نظام کا نتیجہ تھا' ہم نے یہ تقسیم نہیں کی تھی۔ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (39:51) جو بھی یہ غلط نظام قائم کریں گے اس کا نتیجہ اسی قسم کی تباہی ہوگا۔

ہمارے ہاں لفظ من یشآء کے غلط ترجمے نے قرآنی تعلیم کو ہی بدل دیا ہے

450الزُّمَرْ

عزیزانِ من! اب آگے پھر ایک آیت آ گئی جس سے ان لوگوں نے پھر فائدہ اٹھایا اور یہ آیتیں تو عام طور پر قرآن میں آتی رہتی ہیں اور یہ ان کا ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ آیت یہ ہے کہ اَوَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ((39:52 یعنی اوپر سے وہ کہتا چلا آ رہا ہے کہ یہ سارا کچھ ان کے ہاتھوں کا کرتا دھرتا ہے' جس کی وجہ سے یہ تباہی آتی ہے' جس کی وجہ سے یہ غریبی اور امیری کے طبقات پیدا ہوتے ہیں۔ ترجمہ آیت کا یہ کر دیا کہ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے' اس کی کشاد بھی اسی کے ہاتھ میں' اس کی تنگی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ چلیے! جو اوپر سے کہتا چلا آ رہا تھا اب خود ہی اس کے برعکس ہو گیا۔ یہ صرف ایک لفظ من یشآء کا ترجمہ کیا کہ ''جو خدا چاہتا ہے'' اور وہ سارا نظام ہی باطل کر دیا۔ اس نے یہ کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ ہم تقسیم کرتے ہیں' جو بھی کشاد سے رزق لینا چاہتا ہے' اس کو کشاد سے رزق مل جاتا ہے' جو قوم اپنے ہاں رزق کی تنگی چاہتی ہے' اس پہ رزق کی تنگی ہو جاتی ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ((39:52 جو بات ہم نے کہی ہے اس میں سمجھنے کے لیے بہت بڑی نشانی ہے۔ یہ انسانوں کا خود پیدا کردہ ایک نظام ہے' جس کے تابع یہ ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد یہ بتا دیا کہ انسان اس غلط نظام کے ہاتھوں مایوسی تک پہنچ جاتا ہے۔ اور واقعی پھر آہستہ آہستہ ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں کہ یہ جو طبقہ ہے' جسے آپ غریب کہتے ہیں' وہ مایوسی تک پہنچ جاتا ہے۔ اب اگر یہ جو Situation (صورتِ حال) ہے' یہ خدا کی پیدا کردہ (Created) ہو تو ٹھیک ہے' یہ کہے کہ بھئی! ہماری پیدا کردہ ہے' اس میں مایوسی والی کوئی بات نہیں ہے' ہم جانتے ہیں کہ تمہیں کیوں بھوکا رکھا جا رہا ہے' ان کو کیوں اتنا زیادہ دیا جا رہا ہے۔ کہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ((39:53 یہ لوگ جنہوں نے خود غلط نظام سے اپنے اوپر زیادتی کی ہوئی ہے اور خود یہ طبقہ جو اپنے آپ کو اس قدر محتاج اور غریب اور ضعیف قرار دے رہا ہے' اس نے بھی اپنے اوپر زیادتی کی ہوئی ہے کہ یہ اس پر قناعت کر کے بیٹھ گیا ہوا ہے کہ یہ خدا ہی کی طرف سے ہے' کچھ نہیں ہو سکتا۔ کہا ہے کہ یہ سب غلط ہے۔

خود ساختہ غلط نظام کو بدل دینے کا نتیجہ تو جہانِ نو کو جنم دینے کی نوید ہے

قرآنِ مجید کہتا ہے کہ خدا کی طرف لوٹو اور لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ((39:53 وہ تو سامانِ نشوونما با افراط دیتا ہے' اس کی طرف سے مایوس کیوں ہو رہے ہو' غلط نظام اپنے ہاتھوں سے قائم کرتے ہو' مایوس خدا کی طرف سے ہوتے ہو۔ کوئی بات نہیں' تم لوگوں نے یہ غلط

نظام قائم کیے' غلطیاں ہوئیں' لغزشیں ہوئیں تو اب اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ((39:53 قبل اس کے کہ 450 الزُّمَر آخری تباہی آئے' اگر تم غلط نظام کو بدل دو' اس کی جگہ صحیح نظام لے آؤ' تو غلط نظام کی پیدا کردہ تباہیوں اور نقصانات سے بھی تمہیں حفاظت مل جائے گی اور پھر اس کے بعد وہ رحیم بھی ہے یعنی سامانِ نشوونما عطا کرنے والا ہے۔ ابدی طور پر مایوسی نہیں ہونی چاہیے۔ اور اس کے لیے طریقہ کیا ہے' یہ بھی اگلی آیت میں بتا دیا۔

یہ جو تھا کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے' وہ اسی طرح سے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ صاحب! مایوس نہیں ہونا چاہیے اور وہ اسی طرح سے سارا نظام جس کا نتیجہ یہ مایوسی ہوتی ہے' وہ قائم ہوتا ہے۔ مایوسی کفر ہے۔ مایوسی کو دور کرنے کے لیے کیا کیا جائے۔ کہا کہ وَ اَنِیۡبُوۡۤا اِلٰی رَبِّکُمۡ وَ اَسۡلِمُوۡا لَہٗ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ الۡعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنۡصَرُوۡنَ (39:54) قبل اس کے کہ وہ آخری تباہی آ جائے' اس کے نظام کی طرف لوٹو' اس کے قوانین کے سامنے جھکو' اس آخری تباہی آ جانے کے بعد تو پھر کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکے گا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وَ اتَّبِعُوۡۤا اَحۡسَنَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ الۡعَذَابُ بَغۡتَۃً وَّ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ)(39:55 خدا نے جو نازل کیا ہے' اس کا بطریق احسن اتباع کرو۔ یہ وہی چیز ہے جو قرآن کریم دہراتا ہے کہ اس نظام کو بدلنا ہے تو قرآن کریم کے نظام کی طرف آؤ' وہاں سے یہ سارے فسادات کی جڑ کٹ جائے گی' معاشرے کے طبقاتی تفاوت مٹ جائیں گے' پھر کوئی محتاج اور مفلس باقی نہیں رہے گا' کوئی اس کے اندر بڑا اور چھوٹا طبقہ نہیں ہوگا' پھر سے تکریمِ انسانیت قائم ہو جائے گی' کوئی روٹی کے لیے کسی دوسرے کا دست نگر نہیں ہوگا۔ یہ کرنا ہے تو مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ ((39:55 کے مطابق اپنا نظام قائم کرو۔ یہ ہے جو قرآنِ کریم نے اس کا طریقہ بتایا۔

عزیزانِ من! وقت تو ابھی ہے لیکن میں تھک گیا ہوں' ہمت نہیں ہے اس لیے میں دس پندرہ منٹ کی تھوڑی سی آپ سے اجازت بھی چاہتا ہوں۔ اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ مجھ میں کمزوری بڑھ گئی ہے اور آئندہ بھی میں ایک دو درس دینے کے قابل نہیں رہونگا تو اسی لیے اچھا یہ ہے کہ پہلے سے میں یہ اعلان کر دوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آئندہ جو دو جمعہ ہیں' ان میں ناغہ رہے تو اچھا ہے' میں Recover (صحت میں ہونے والی کمی پوری) کر سکوں گا ورنہ اگر مجھ پر یہ پریشر رہا تو ممکن ہے کہ میری یہ تکلیف بڑھ جائے۔ تو اگلا درس' دو جنوری 1981ء کو جو جمعہ ہے' اس دن ہوگا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ



450الزُّمَر

چھٹا باب: سورۃ الزمر (53[1] تا66)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ
هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾
وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَنْ
تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ
لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ بَلٰى قَدْ
جَاۗءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى
اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا
بِمَفَازَتِهِمْ ۡ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْۗءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۡ وَّهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۶۲﴾ لَهٗ
مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْۗنِّىْٓ
اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1981ء کی 2 تاریخ ہے۔ سابقہ درس پچھلے ماہ (دسمبر 1980ء) کی 12 تاریخ کو ہوا تھا اور میری ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے دو درسوں کا ناغہ ہو گیا۔ آج بھی میں ابھی بالکل معمول پہ تو نہیں آیا لیکن جی نہ چاہا کہ ناغوں کا یہ سلسلہ دراز تر ہو جائے' اس لیے حاضر ہو گیا ہوں۔

---

[1] سابقہ درس (12 دسمبر 1980ء) اس سورۃ کی 55 ویں آیت تک پہنچا تھا۔ ناسازیٔ طبیعت سے دو درس کا ناغہ ہوا۔ اب اس درس میں آیت 53 سے آغاز کیا گیا ہے تاکہ سابقہ نکات سے سامعین کا تسلسلِ ذہن وفکر قائم کیا جا سکے۔

450الزُّمَر

تجدید یادداشت بسلسلہ سابق درسِ قرآن کریم

تجدیدِ یادداشت کے لیے یہ عرض کردوں کہ سابقہ درس میں سورۃ الزمر کی آیت 49 یعنی (39:49) پہلے سامنے آئی تھی۔ موضوع یہ تھا کہ جب سرمایہ داروں سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم جو اتنا مال و دولت ہے' اس کو صرف اپنی ذات کے لیے سمیٹ کر کیسے بیٹھ جاتے ہو' اس میں تو دوسروں کا بھی حصہ ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں' یہ ہم نے اپنے کسب و ہنر سے' اپنی کاریگری سے' کمایا ہے' کسی اور کو کیا حق حاصل ہے کہ اس میں سے کچھ لے بھاگے۔ اور قرآن کریم نے کہا تھا کہ بَلۡ هِيَ فِتۡنَةٌ (39:49)۔ بڑی عجیب چیز ہے! کہا ہے کہ یہ ذہنیت ہے جو فسادِ آدمیت کی جڑ ہے۔ قرآنِ کریم کے اعجازات گنانے شروع کیجیے تو اُن کی تو حد و نہایت ہی نہیں۔ بعض مسائل اتنے اہمیت اختیار کر جاتے ہیں کہ بے ساختہ زبان پہ یہ آ جاتا ہے کہ واقعی یہ چیز خدا کا ہی کلام ہے۔

آج کے دورِ معاشیات نے سیاست اور حکمرانی کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا ہے

جس زمانے میں قرآن کریم نازل ہوا ہے' یہ ٹھیک ہے' غریبی امیری اس زمانے میں بھی تھی لیکن Economics یا اقتصادیات یا معاشیات نے اس دور میں ایسی اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔ یہ اکنامکس عالمگیر پرابلم یا مسئلے کے اعتبار سے ہمارے دور میں آ کر ہوئی ہے' اس نے سائنس کی حیثیت بھی ہمارے ہی دور میں اختیار کی ہے' یہ عالمگیر پرابلم ہمارے دور میں آ کر بنی ہے۔ یہ جو ہمارا دور ہے' اسے Age of Economics کہتے ہیں یعنی یہ دور ہی اقتصادیات کا ہے' معاشیات کا ہے۔ اور اب تو اس نے اتنی اہمیت اختیار کر لی ہے کہ دنیا کی سیاست اس کے تابع ہو گئی ہے۔ سیاسی مسائل کا حل معاشی بنیادوں کے اوپر ڈھونڈا جاتا ہے' پیدا بھی اس سے ہوتا ہے' تلاش بھی اسی سے کیا جاتا ہے۔ ہر قوم کی نگاہ دوسری قوم پر جو اٹھتی ہے تو کسی زمانے میں تو محض وہ ہوسِ حکمرانی ہوتی تھی' جس کی بنا پر یہ قومیں دوسری قوموں کو جا کر فتح کرتی تھیں۔ اب یہ سارا مسئلہ معاشیات کا ہے۔ فلاں سرزمین میں دولت کے' معدنیات کے' تیل کے' بہت سے ذخائر ہیں۔ ہر بڑی قوم کو اس کی ہوس ہے کہ اس کا وہ سب کچھ ہمارے پاس آ جائے۔ یہ وہی اکنامکس کا مسئلہ ہے۔

قرآنِ حکیم کا آدھا حصہ تو روٹی کے مسئلہ کے متعلق ہی ہے

قرآنِ کریم میں اگر آپ غور و فکر سے دیکھیے تو آدھا قرآن کریم' جسے عام الفاظ میں روٹی کا مسئلہ کہتے ہیں' اس سے بھرا پڑا ہے۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی تعلیم رزق سے متعلق ہے' یہ اس دور کی بات ہے جب رزق یا روٹی کا مسئلہ یا اقتصادیات' جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' نہ کوئی عالمگیر پرابلم تھی' نہ اس نے کسی سائنس کی حیثیت اختیار کی تھی اور یہ آدھا قرآن کریم قیامت تک کے لیے پوری نوعِ انسانی کے لیے' ضابطہءِ ہدایت ہے' وہ اکنامکس پر مبنی ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ پرابلم' پرابلم کیوں بنتی ہے' وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ پرابلم

درحقیقت ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو انسانوں کی اپنی بنائی ہوئی پرابلم ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس سے پھر فسادِ آدمیت کے کتنے گوشے ابھرتے ہیں اور پھر وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کا حل کیا ہے۔

روٹی کے معاملے میں قرآنی حل تک پہنچنا آج پہاڑ کی گھاٹی چڑھنے کے مرادف ہے' رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے: مروجہ تصور

اس دور میں جنہیں اکنامکس سے دلچسپی ہے' وہ اگر ایک طرف اکنامکس کا مطالعہ کریں اور اس نگاہ سے دوسری طرف قرآن کریم کو دیکھیں تو قرآن کریم کی عظمت نکھر کا سامنے آجاتی ہے کہ آج دنیا بھر کے اکنامسٹ' بڑی بڑی ان کی سوسائٹیاں' ان کی انجمنیں' یونیورسٹیاں' حکومتوں کے ادارے' اکنامکس کے مسائل کے حل میں مصروف ہیں اور جو Points (نکات) وہ Discuss (بحث و تمحیص کر کے بیان) کرتے ہیں' غور کیا جائے تو قرآن کریم کے اندر وہ ملتے ہیں۔ حل انہیں ابھی تک نہیں مل رہا لیکن جس طرف ان کی نگاہ اٹھ رہی ہے تو وہ وہی نصب العین ہے جو قرآن کریم نے اس دور میں بتایا تھا۔ اس نے یہ کہا ہے کہ انسان بہت آہستہ آہستہ اس طرف آئے گا' اسے اس نے پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کی تشبیہ سے بیان کیا ہے کہ یہ پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنے والی بات ہے' بھاگ کے نہیں اس طرف آیا جائے گا' قدم قدم' تھک کر بھی کھڑا ہو جائے گا' مڑ کے پیچھے دیکھے گا' وہ ستائے گا بھی' پھر آگے قدم اٹھائے گا۔ یہ پہاڑی کی چوٹی پہ چڑھنے کے مرادف ہے لیکن اس نے جو اس کے لیے علاج بتایا' وہ پہاڑی کی چوٹی پہ چڑھنے کا نہیں ہے' یہ ان مسائل کا حل باہر کی دنیا میں تلاش کرتے ہیں' وہ کہتا ہے یہ انسان کی اپنی ذہنیت کا پیدا کردہ مسئلہ ہے' انسان کی ذہنیت کی تبدیلی سے یہ مسئلہ حل ہو سکے گا۔ ہمارے ہاں تو میں نے جیسا عرض کیا ہے ہزار برس سے بھی اوپر ہو چکے کہ غور وفکر کے دروازے بند کر دیئے گئے' رزق کا مسئلہ سامنے آیا تو اللہ رازق ہے' رزق اس کے ہاتھ میں ہے' جسے چاہے وہ جتنا جی چاہے دے' جسے چاہے غریب کر دے' جسے چاہے امیر کر دے' بھوکا بھی وہی مارتا ہے' دیتا بھی وہی ہے' اس کے خلاف کسی قسم کا حرفِ شکایت زبان پر لانا (معاذ اللہ) خدا پر اعتراض کرنے کی بات ہے' اس کی تقسیم کے خلاف یہ شکوہ اور شکایت ہے۔ ہزار برس سے یہ اعتقادات چلے آ رہے ہیں اور یہ سارے جو اعتقادات تھے سرمایہ پرستوں کے پیدا کردہ تھے۔ مذہب کے راستے سے یہ عقیدہ پھیلایا گیا تاکہ غریب آدمی کی نگاہ ادھر اٹھے ہی نہیں کہ یہ ہماری محنت کا سارا ماحصل لوٹ کر کیوں لے جاتے ہیں۔ جب عقیدہ یہ ہو کہ یہ لوٹ کر جانے والے کون ہیں' یہ تو خدا کی تقسیم ہے' وہ انہیں دیتا ہے' یہ تم سے چھینتے نہیں ہیں' یہ خدا کی مرضی ہے کہ تمہیں اتنا ہی ملے۔ اور پھر غریبی کی خصوصیات: خدا کی غریبوں کے اوپر رحمتیں' سب درویش غریب' اولیاء اللہ غریب' انبیائے کرامؑ غریب اور عاقبت میں جا کر' آخرت میں جا کر' جنت میں سارے یہ غریب جانے والے ہیں تو وہاں جا کر یہ سب کچھ

ملے گا' تھپکیاں دے کر ان کو سلاتے رہے کہ یہ چیز خدا کی طے کردہ ہے اس لیے اس کے خلاف حرفِ شکایت زبان پہ نہیں لانا چاہیے۔450 الزُّمَرْ

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کی مماثلت میں روس میں اٹھی ہوئی ایک آواز جو بغیر کسی جذبہء محرکہ کے تھی

ہمارے اس دور میں بھی دنیا کی یہ جو Big Powers (بڑی طاقتیں) اس سے پہلے یا آج بھی کہلاتی ہیں' وہ ساری Capitalistic System (نظامِ سرمایہ داری) کی حامل ہیں۔ اس سرمایہ داری نظام کے خلاف آواز تو اٹھی تھی' آواز صحیح تھی لیکن اس کی اساس اور بنیاد نہیں تھی' اس کا طریق کار غلط تھا۔ یہ روس کی آواز تھی جب یہ اٹھی ہے۔ آواز یہ تھی کہ دولت کی تقسیم ازسرنو کرنی چاہیے' ملکیت کا حق کسی کو نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آواز تو صحیح اٹھی تھی لیکن اس کی بنیاد نہیں تھی' اس لیے اس کا ناکام رہنا تو فطری امر تھا۔ (اور یہ ناکام ہوئی)۔

مسلمانوں کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی غرض کے تحت روس کی آواز کے خلاف سرمایہ دارانہ حکومتوں کی ایک گہری چال

عزیزانِ من! جو بات میں کہہ رہا ہوں' وہ یہ تھی کہ اس آواز کے خلاف دنیا بھر کی یہ ساری سرمایہ دارانہ سلطنتیں اٹھیں' انہیں معلوم تھا کہ مسلمانوں کا ایک بحرِ ذخار مراکو سے لے کر انڈونیشیا تک ہے' یہ بڑی افرادی قوت ہے' یہ بڑی وسیع مملکتیں ہیں۔ انہیں خطرہ یہ تھا کہ اگر یہ کہیں اس آواز کے پیچھے رشیا کی طرف چلے گئے تو یہ تو ہمارا تختہ الٹ کر رکھ دیں گے۔ انہوں نے اس آواز کو روکنے کے لیے اس کے خلاف ایک سازش کی' آپ احباب کو شاید یاد ہو' یہ فقرہ ابھرا تھا:

Believers in God, unite together آؤ خدا پرسو! ان خدا کے انکار کرنے والوں کا مقابلہ کریں۔

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

یعنی مسئلہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ سرمایہ داری نظام کا مسئلہ ہے یہ ہمارا اور اشترا کی نظام کا مسئلہ ہے' صرف یہ کہا کہ آؤ! اس کے خلاف ہمارے ساتھ مل جاؤ۔ یہ سرمایہ داری کا مسئلہ کچھ اس قدر نفرت آگیں ہو چکا ہوا تھا کہ وہ یہ نام بھی نہیں لیتے تھے۔ اُنہوں نے کہا یہ تھا: آؤ! خدا پرستو' ان منکرینِ خدا کا' اس الحاد کا' مقابلہ کریں۔ اس کی تہ میں یہی بات تھی کیونکہ جو خدا پرست تھے ان کو سکھایا ہی یہ گیا تھا کہ یہ سارا قصہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے اس سیاست میں یہ سمجھا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے اس کو معاشی مسئلہ بنانا ہی نہیں چاہیے' اس کو مذہبی مسئلہ رکھنا چاہیے۔ اس لیے ''خدا پرستو'' کہہ کر انہوں نے آواز دی تھی۔

الزُمَر450

محنت کشوں کے لیے روس کا سلوگن (نعرہ)

انہوں نے کہا تھا کہ

Workers in the world! unite together, you wouldn't loose any thing but your chains

آ ؤ' دنیا کے محنت کشو! اکٹھے ہو جاؤ' اس جدو جہد میں تمہارا کچھ اور نقصان نہیں ہو گا سوائے اس کے کہ تمہاری غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ وہ محنت کشوں کے لیے ایک سلوگن تھا۔ ان سرمایہ دارانہ مملکتوں نے یہ سلوگن جو دیا تھا' انہوں نے مسلمانوں کو ساتھ رکھنے کے لیے خدا کے نام پہ اپیل کی تھی۔ یہ ان لوگوں کی اتنی گہری سازشیں ہوتی ہیں۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کو متعارف کرنے کے سلسلہ میں جناب علامہ پرویزؒ کی سعی و کاوش اور کفر کا فتویٰ

عزیزانِ من! اس کے باوجود اکنامکس کا جو مسئلہ تھا یہ زور پکڑ گیا۔ اور جگہوں کا تو میں نہیں کہہ سکتا' یہاں غیر منقسم ہندوستان میں بھی' میں نے یہ بات ''روٹی کا مسئلہ'' ذرا اٹھائی تھی لیکن پاکستان کی تشکیل کے بعد' تو میں نے ہی یہاں سے مسئلے کو اٹھایا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ علامہ اقبالؒ (1938-1877ء) کے کلام میں یہ چیزیں ملتی ہیں' ان کا اپنا انداز ہے۔ قرآنِ کریم کی روشنی میں معاشیات کا مسئلہ' جسے روٹی کا مسئلہ کہا تھا' اسے میں نے اٹھایا اور کمیونزم کے مقابلے میں' سرمایہ داری کے مقابلے میں' اسلام کو پیش کیا جائے تو سرمایہ داری تو چند لفظوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں کے مقابلے میں قرآن حکیم کا معاشی نظام پیش کیا' مضامین شائع کیے' ایک کا تو عنوان ہی ''روٹی کا مسئلہ'' تھا۔ وہ جو مجھ پہ کفر کے فتوے لگے تھے' اس میں یہ بھی چیز تھی کہ صاحب! اب یہ اسلام' روحانیت' خدا پرستی' یہ سارا کچھ جو ہے' وہ تو رہا ایک طرف' یہ سمٹ سمٹا کر کہتا ہے کہ یہ روٹی کا مسئلہ ہے' مسئلہ ہی روٹی کا ہے۔ ٹھیک ہے بھئی! تمہارے ہاں تو مسئلہ نہیں ہے' دوسرے کماتے ہیں' تم کھاتے ہو' روٹی کا مسئلہ ان سے پوچھو جو صبح سے شام تک محنت کرتے ہیں اور اس کے باوجود ان کو دو وقت کی روٹی نہیں ملتی۔ اس کا جواب کفر کا فتویٰ تھا۔ اس کے بعد پھر میری کتاب ''نظامِ ربوبیت'' شائع ہوئی۔ معاف رکھیے گا! میں کچھ اپنی داستاں بیان نہیں کر رہا' ایک بڑی اہم چیز ہے جو آپ کے سامنے آنے والی ہے۔ یہ اس کی تمہید ہے یا اس کا تعارف ہے۔

''نظامِ ربوبیت'' میں پہلی بات قرآنِ کریم کا معاشی نظام ہے جو میں نے پیش کیا تھا۔ کفر کا فتویٰ اس لیے تھا کہ اسے کمیونزم کہہ دیا' یہ بڑی آسانی کی بات ہے' کوئی شخص بھی جو کہے کہ غریب کو روٹی ملنی چاہیے' وہ ان کے ہاں کمیونسٹ ہے۔ کمیونسٹ کہا' مرتد ہوا تو ابھی تو چونکہ کوئی قوانین شریعت جو ان کے ہاں تھے' وہ نافذ نہیں تھے ورنہ مرتد ہوا اور قتل ہوا ہوتا' سیدھی سی بات ہے۔ ابھی کفر تک ہی بات پہنچی تھی' میری اس آواز کی بھی بڑی مخالفت ہوئی لیکن بہرحال میں اس وقت بات باہر کرتا ہوں' جب قرآن حکیم کی رو سے' اپنی بصیرت کے

مطابق، مجھے یقین حاصل ہوجاتا ہے کہ یہ حقیقت ہے۔ اور جب انسان کی یہ کیفیت ہوجائے، قرآنِ کریم کی رو سے اس کا یہ یقین ہوجائے 450الزُّمَرُ تو پھر اس سے پیچھے ہٹنا تو قرآن کریم کو چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ اس کی بڑی مخالفت ہوتی چلی گئی، میں مستقلاً اس کے اوپر ڈٹا رہا، میں نے اس کے اوپر بیشمار مضامین، مقالات لکھے، تقاریر کیں، خطابات دیئے، قرآن کریم کا جو معاشی نظام تھا، اس کو پیش کرتا چلا گیا۔ آہستہ آہستہ اس پچیس سال کے عرصے میں یہ چیز فضا میں پھیلتی گئی۔ عزیزانِ من! یہ وہ چیز ہے، جسے یہ کمیونسٹ یا مارکس ازم کی رو سے وہ Historical Necessity (تاریخی وجوب) کہتے ہیں لیکن یہ Necessity (وجوب) کا لفظ فلسفے کا ہے۔ اس کے معنی ہوتا ہے "ایسی واجب چیز جو ہو کر رہے، جو اٹل ہو، جس کو بدلا نہ جاسکے"۔ یہ چیز غلط تھی، یہ تو میں نے نہیں کہا تھا۔ قرآن کریم نے جس چیز کو کائناتی قوتیں (Cosmic Forces) کہا ہے یعنی ملائکہ کی تائید کہا ہے، وہ زمانے کے تقاضے ہوتے ہیں۔ اس دور میں زمانے کے تقاضے اس طرح سے بڑھے کہ رفتہ رفتہ نظامِ سرمایہ داری ہر ایک کی نگاہوں کے اندر قابلِ نفرت قرار پا گیا۔ یعنی اتنی سی چیز تو اب میں یہ نہیں لے رہا خدانکردہ کہ میں وہ کریڈٹ لونگا کہ میں نے نظامِ ربوبیت لکھی، میں تو یہ کرتا گیا، قرآن کریم کی آواز تھی۔ زمانے کے تقاضوں نے یہ اتنا کیا کہ جو نظام سرمایہ داری (Capital System) ہے، اب وہ ہر ایک کی نگاہوں میں قابلِ نفرت قرار پا گیا۔ یہ تو اس کا ایک Negative Aspect (منفی گوشہ) ہوگیا۔ اب کوئی فخر سے نہیں کہتا، اب بڑی بڑی سرمایہ دارانہ سلطنتیں بھی اپنے آپ کو Welfare State (فلاحی ریاست) کہنے لگ گئی ہیں، ایسی مملکتیں جن کا مقصد عوام کی بہبود ہو۔ یہاں تک وہ آ گئی ہیں۔

قرآنِ حکیم کا دعویٰ ہے کہ اس کی طرف سے عطا کردہ نظامِ حیات آخرالامر تمام نظاموں پر غالب آ کر رہے گا

ہمارے ہاں جو یہ چیز تھی وہ میری ہی ان کوششوں تک محدود تھی لیکن آواز اٹھ رہی تھی، پھیل رہی تھی، وہ کائناتی قوتیں کچھ اسکا ساتھ دے رہی تھیں اور پھیلا رہی تھیں۔ میں اس یقین کے ساتھ اپنی اس چیز پر بھی قائم تھا اور بڑھتا بھی چلا جارہا تھا کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ آخرالامر اسی نظام نے لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ (9:33) اس نظام نے انسانوں کے وضع کردہ نظام پر غالب آ کر رہنا ہے، میرا یہ ایمان ہے۔ میں اس سہارے سے چلتا جاتا تھا۔

نظامِ سرمایہ داری کے خلاف اٹھنے والی آواز

جیسا میں نے عرض کیا ہے مذہب پرست طبقے کی طرف سے تو مخالفت ہونی تھی، حکومتوں کی طرف سے بھی بہر حال مخالفت تھی، ہمارے ہاں تو نظامِ سرمایہ داری ہے۔ تو کہیں سے مجھے یہ نظر نہیں آتا تھا کہ یہ جو مؤثر گوشے ہیں، وہاں سے بھی کبھی اس کی تائید ہو سکے گی۔

میں یہی سمجھتا تھا کہ جب وہ اس نظامِ سرمایہ داری کے الٹنے کی انتہائی تباہی آ جائے گی تو اسی کے ساتھ ہم بھی پسیں گے کیونکہ یہاں تو اس الزُّمَر 45 تصور کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی نہیں اٹھتا تھا لیکن ابھی حال ہی میں ایک ایسی آواز اٹھی ہے جس نے میرے اس یقین کو تو ایمان تک پہنچا دیا اور یہاں نظر آیا کہ فضا میں ایک انقلابی لہر پیدا ہوئی ہے۔ یہ آواز کہاں سے اٹھی؟ گزشتہ اپریل حکومت پاکستان نے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کا نام "Committee on Islamization of Economics" (کمیٹی آن اسلامائزیشن آف اکنامک) تھا۔

یہ اسلامائزیشن کا لفظ آج کل ایک عام سا لفظ چل پڑا ہے، یہ اصطلاح وضع ہوئی ہے، اس چیز کا بڑا غلط مفہوم ہے۔ اسلامائزیشن کے معنی ایک نظام کفر کو اسلامی بنانا ہے یعنی کفر کا ایک نظام ہے اور اس کو اسلامی بنانا ہے۔ کفر کے نظام کو اسلامی کیسے بنا سکتے ہیں؟ آپ اسلامی نظام میں اسے کیسے بدل سکتے ہیں؟ اس کی جگہ کیسے اسلامی نظام دے سکتے ہیں؟ اگر آپ اسلامائزیشن کا لفظ دیں گے تو اس کے معنی ہونگے کہ آپ کہیں کہ ان کے جو دیوتا شیو جی مہاراج ہیں، اس کی اسلامائزیشن کی جائے، وہ تو اس کی جگہ خدا لائیں گے تو وہ ختم ہوگا: زَهَقَ الْبَاطِلُ (17:81) وہ طریقہ ہی یہ ہے کہ "اسلام اس کی جگہ لے گا" اس کو مسلمان نہیں کیا جا سکتا، آپ شیو جی کو کیا مسلمان کریں گے۔

کفر کے نظام کی اسلامائزیشن تو نہیں ہو سکتی البتہ اسلام کفر کی جگہ ضرور لے سکتا ہے

بہرحال یہ ہمارے ہاں ایک روش، ایک رسم چل پڑی ہے۔ اصل میں ہمارے ہاں نیشنلائزیشن کی ایک اصطلاح آئی تھی، اس کے تتبع میں یہ بھی ایک نئی اصطلاح ہے جو آج کل آئی ہوئی ہے، ان کو اسلامی بنانا کہتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اسلام کسی کے ساتھ مفاہمت ہی نہیں کر سکتا، پیوند سازی ہو ہی نہیں سکتی، یہ تو غیر اسلامی نظام کو جڑ سے اکھیڑ کر اس کی جگہ اسلامی نظام قائم کیا جائے گا، اس کا تو نشان تک بھی باقی نہیں رہے گا۔

حکومتِ پاکستان کی طرف سے تشکیل پانے والی کمیٹی آن اسلامائزیشن: ذاتی ملکیت کی کسی کو اجازت نہیں

بہرحال انہوں نے یہ کمیٹی اپریل 1980 میں مقرر ❶ کی۔ اس کمیٹی نے مئی 1980ء میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ یہ کمیٹی ان افراد پر مشتمل تھی: (1) پروفیسر سید نواب حیدر نقوی، ڈائریکٹر پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس، اسلام آباد۔ آپ احباب میں سے اکثر ان سے واقف ہونگے کہ یہ کیا چیز ہے۔ یہ اس کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ (2) مسٹر ایچ یو بیگ، سیکرٹری منسٹری آف فنانس، اسلام آباد۔ (3) پروفیسر رفیق احمد، پرو وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، لاہور (ممبر) اور (4) پروفیسر میاں ایم نذیر، پروفیسر آف اکنامکس، پشاور

---

❶ اپریل 1980ء میں مرکزی حکومتِ پاکستان کی وزارتِ مالیات نے ایک کمیٹی مقرر کی کہ وہ حکومت کی راہنمائی کے لیے اسلامی اصطلاحات کا ایجنڈا مرتب کرے۔ اسے Committee on Islamisation سے تعبیر کیا گیا۔

یونیورسٹی (ممبر)۔ اپریل میں یہ کمیٹی مقرر ہوئی اور مئی (1980ء) میں انہوں نے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ وہ رپورٹ اتنے مہینوں تک باہر نہیں آئی تھی' گزشتہ نومبر (1980) میں اس کے متعلق اخبارات ❶ میں چرچا ہوا تھا تو چونکہ وہ Secret Document (خفیہ دستاویز) نہیں تھی' نہ ہی یہ تھا کہ وہ Official Use (دفتری استعمال) کے لیے ہے' یہ ایک عام پبلک ڈاکومنٹ (دستاویز) تھا۔ وہ رپورٹ میں نے منگائی' بڑی مختصر سی وہ رپورٹ ہے' رپورٹ کا پہلا صفحہ الٹیے تو وہ مسئلہ ہوتا ہے' وہ یوں کہیے کہ وہ عام طور پر اس کا ''مطلع انوار'' ہوتا ہے۔ بڑے جلی اور خوبصورت الفاظ میں پہلے ہی صفحہ کے اوپر آیت قرآنی ہے کہ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (3:180) اور اس کے نیچے لکھا ہوا ہے کہ ''ارض و سمٰوٰت اللہ کی ملکیت ہے'' یعنی ذاتی ملکیت کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ پہلا صفحہ الٹ کر میں بیٹھ گیا' پھر دیکھا کہ وہ وہی رپورٹ ہے یا میں کچھ اور پڑھ رہا ہوں۔ یہ وہی رپورٹ تھی اور میں کچھ اور نہیں پڑھ رہا تھا۔ میں نے اس رپورٹ کا مطالعہ مُسرت اور تعجب کے ملے جلے جذبات سے کیا۔

رپورٹ کا نقطہء ماسکہ ''زمین پر خدا کی ملکیت کے سوا کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی اور پھر کوئی شخص ضروریات زندگی سے محروم نہیں ہوسکتا''

اس کے بعد لکھا ہوا تھا کہ اسلامی اقتصادیات یا معاشیات کے متعلق تفاصیل تو بہت سی آئیں گی' لکھی جائیں گی' اس کا جو نقطہء ماسکہ ہے وہ یہی آیت ہے کہ ''ذاتی ملکیت کسی چیز پہ کسی انسان کی نہیں ہوسکتی''۔ اور اگلے صفحہ پر تھا کہ ادھر سے آپ یہی نہ سمجھیے کہ سرمایہ داری کا وہ نظام ختم ہوا کیونکہ ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ اس میں یہ تھا کہ ذاتی ملکیت اسٹیٹ یا مملکت کی بھی نہیں ہوسکتی' اگر ہوئی تو یہ کمیونزم ہو جائے گی۔ یہ بھی غلط ہے' ملکیت تو اس میں صرف خدا کی رہے گی' مملکت کو صرف اس کا انتظام کرنا ہوگا۔ اور اگلی شق یہ تھی کہ انتظام کس مقصد کے لیے کرنا ہوگا؟ اس کے لیے کہ معاشرہ کے ہر فرد کو ضروریاتِ زندگی بہم پہنچتی رہیں۔ اگر آپ حضرات نے میری کتاب ''نظامِ ربوبیت'' ❷ دیکھی ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے ہر Chapter (باب) کے یہ عنوانات ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی مملکت اس وقت اسلامی

---

❶ اسے اسلام آباد سے شائع ہونے والے روزنامہ ''دی مسلم'' نے اپنی اشاعت بابت 6-7-11-12 نومبر 1980ء میں بالاقساط شائع کیا۔ اس کے بعد اسی روزنامہ کی 27 نومبر 1980 کی اشاعت میں اس پر تفصیلی تبصرہ بھی شائع ہوا۔
اس رپورٹ کا نام ہے: An Agenda for Islamic Economic Reform
اور یہ شائع کردہ ہے: Pakistan Institute of Development Economics, Islamabad

❷ یہ کتاب 1955ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی تو قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس رپورٹ میں حوالے ''نظامِ ربوبیت'' کے 1978ء کے ایڈیشن کے ہیں۔

ہوتی ہے جب اس مملکت کے اندر کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ اُس میں کہا ہے کہ یہ ذاتی ملکیت کے اندر زمین ہی نہیں 450الزُّمَر کہتے' یہ جسے آپ دولت کہتے ہیں' وہ بھی اس میں آتی ہے۔ اس کے آگے یہ ہے کہ اس کی تقسیم نو کیسے ہوگی؟ اس کا عنوان ''عدل اور احسان'' ہے۔ یہ نظام عدل اور احسان کا قرآنی آیت پر مبنی ہے۔ عدل کے معنی یہ ہیں کہ جس برتن میں' یہ جتنا مثلاً پانی' گلاس میں آگیا ہے' ضرورت کے مطابق اتنا ہی ہے' اس میں اور ڈال دیا جائے تو وہ اوپر سے بہہ جائے گا' Over Flow کرے گا' زائد از ضرورت اس کے اندر نہیں رہے گا' اس سے باہر چلا جائے گا۔ کہا ہے کہ یہ عدل ہے۔ اوپر سے بہہ کر' Over Flow ہو کر' یہ پانی جائے گا کہاں؟ وہاں جائے گا جہاں پانی نہیں ہے' یہ وہاں نشیب میں' جائے گا اور اس نشیب کو بھر دے گا' یہ احسان ہے یہ اس وقت تک اُسے بھرتا جائے گا اور اس نشیب کو بھر دے گا' یہ احسان ہے تا آنکہ دونوں کا لیول برابر ہو جائے۔

رپورٹ کی ایک شق یہ بھی ہے کہ امیر اور غریب کا تفاوت ایک ابلیسی نظام ہے

میں کیا پیش کر رہا ہوں! میں وہ رپورٹ پیش کر رہا ہوں۔ اس میں کہا ہے کہ یہ کچھ تعجب کی بات نظر آئے گی کہ یہ لیول برابر ہو جائے گا۔ یہ جو امیر اور غریب کے تفاوت کے طبقات ہیں' انہوں نے کہا ہے کہ یہی تو ابلیسی نظام ہے' یہ خدا کے مقرر کردہ نہیں ہیں۔ یہ امیر اور غریب کے طبقات ہیں' یہ انسانوں کے پیدا کردہ ہیں' انہی سرمایہ داروں کے پیدا کردہ ہیں' خدا تو نہ کسی کو امیر پیدا کرتا ہے' نہ غریب پیدا کرتا ہے۔ اسلام کے معاشی نظام میں یا اسلامی مملکت کے اندر امیر اور غریب کے طبقات ختم ہو جائیں گے۔ سن رہے ہیں آپ کہ یہ آواز کہاں سے اٹھ رہی ہے!

رپورٹ میں ربوٰ کے متعلق تحریر یہ ہے کہ یہ نظامِ سرمایہ کو قائم رکھنے کی کوشش ہے

اس کے بعد انہوں نے کہا ہے کہ یہ آج کل "Interest Free Economy" (بلا سود اقتصادیات) پر بہت زور دیا جا رہا ہے۔ انٹرسٹ کا ترجمہ سود کر دیا اور پھر اس پہ بحثیں شروع ہو گئیں کہ کونسا سود حلال ہے' کونسا سود حرام ہے' اس کو یوں نہیں' یوں کر دیا جائے تو پھر جائز ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سود کا تو لفظ فارسی کا ہے' قرآن حکیم کا لفظ ربوٰ ہے۔ نزولِ قرآن حکیم کے زمانے میں Capitalism (سرمایہ داری) کی یہ اصطلاح دنیا میں نہیں تھی' قرآنِ کریم نے کیپٹل ازم کے لیے ربوٰ کی اصطلاح استعمال کی ہے' ربوٰ کے معنی ہیں Capitalistic System (نظامِ سرمایہ داری)۔ نظام سرمایہ داری کو قائم رکھ کر کوشش کرنا کہ اس میں سے ربوٰ ختم ہو جائے' اس میں لکھا یہ ہے کہ یہ شیخ چلی کی باتیں ہیں۔ یہ وہی ہے جو انگریزی زبان میں ایک Don Quixote[1] ہوتا ہے۔

---

[1] Don Quixote (تلفظ: ڈان کیخوٹے) یعنی ارفع اور بلند لیکن ناقابلِ عمل نظریات کا حامل شخص

رپورٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ انٹرسٹ کی تو پھر بھی کوئی حد ہوتی ہے لیکن منافع میں تو کوئی حد ہی مقرر نہیں[450]الزُّمَرْ

اس کے بعد لکھا ہے کہ یہ کچھ کوشش ہے کہ صاحب! یہ سود نہیں ہے' بلکہ وہ ہے جسے آپ شرکتِ منافع یعنی منافع میں شرکت کہتے ہیں' جسے Interest Partnership (شرکتِ منافع) کہتے ہیں۔ اس کے متعلق کہا ہے کہ اس سے صرف یہ نام ہی نہیں بدلا بلکہ یہ خطرناک قسم کی کیپٹل ازم (سرمایہ داری) کی ایک نئی بنیاد ڈال دی گئی ہے۔ انٹرسٹ کی تو پھر بھی کوئی شرح ہوتی تھی' کوئی ذرا زیادہ لیتا تھا' محسوس ہوتا ہے کہ اتنا لے گیا ہے' دہائی مچ جاتی تھی کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکے گا۔ کہنے لگے کہ منافع کے اندر حصہ تو آپ سو فیصد لے سکتے ہیں' یہ پوچھو ذرا تاجروں سے کہ ان کا کتنا ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کے مروجہ تصور کے متعلق تحریر ہے کہ یہ سوچ رکھنے والے اکنامکس کی الف ب سے بھی واقف نہیں

مروجہ تصور کے مطابق یہ اڑھائی پرسنٹ والی زکوٰۃ غریبی کا علاج ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تصور کرنا کہ اس سے غربت کا مسئلہ حل ہو جائے گا' یہ سوچنے والے اکنامکس کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہیں۔ کہا ہے کہ یہ زکوٰۃ اڑھائی پرسنٹ کا نام نہیں ہے' یہ تو قرآن حکیم کا جو معاشی نظام ہے' اس کا مقصود و مفہوم ''نشوونما دینا'' ہے' یہ تو اس کی ایک علامت (Symbol) سی چیز ہے جو زکوٰۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ ہم تو یہ سمجھے ہیں کہ یہ ہے اسلام کا نظام اور وہ جو اسلامائزیشن کہا جا رہا ہے' وہ اکنامکس ہے۔

عزیزانِ من! اس کے جو موٹے موٹے عنوان ہیں' وہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ ان تمام چیزوں کو ان خطوط کے اوپر از سرِ نو تسلیم کیا جائے گا تو پھر یہ نظام بدل سکتا ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں ہم کھڑے ہیں' یہاں سے اس منتہا تک جو پہنچنا ہے' یہ ایک دن میں نہیں پہنچا جائے گا' قدم بہ قدم پہنچا جائے گا۔ اس عبوری دور کے لیے ایسے قوانین بنائے جائیں گے جن میں جمپ کر کے وہاں نہیں جایا جائے گا۔ قرآن حکیم میں بھی عبوری دور کے لیے قوانین دیئے ہوئے ہیں۔ کہا کہ اس طرح سے جایا جائے گا لیکن اس منتہا کو پہلے سامنے رکھ کر' مقرر کر کے' پھر قدم اٹھایا جائے گا اور ہر قدم پر یہ دیکھا جائے گا کہ ادھر اُٹھ رہا ہے یا نہیں۔ عزیزانِ من! میری اس بیماری کے زمانے میں کچھ فائدہ یہ بھی ہوا کہ مجھے اتنی سی فرصت مل گئی' مجبوراً جو لیٹا رہا' میں نے اس رپورٹ کا تجزیہ کیا۔ پہلے میں نے یہ بتایا کہ قرآن حکیم کا جو معاشی نظام ہے' اس کے جو Salient Features (اہم عنوانات) ہیں' وہ کیا ہیں' میں نے

انہیں نظامِ ربوبیت میں کس طرح سے لکھا تھا اور اس کے بعد میں نے پھر یہ جو رپورٹ ہے اس کا اسی طرح تجزیہ کر کے اس رپورٹ کو سامنے رکھ دیا ہے۔ 450الزُمَر

مذکورہ رپورٹ ایک پمفلٹ کی شکل میں الگ بھی شائع ہو چکی ہے۔اس کا نام ہے: ''سنیے! قرآن کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟''

میں نے عرض کیا ہے کہ وہ رپورٹ تو مئی 1980ء میں شائع ہوئی تھی، وہ ابھی تک باہر ہی نہیں آئی تھی، معلوم نہیں کہ اس کو کیوں عام نہیں کیا گیا لیکن یہ میرے نزدیک قرآنِ کریم کی رو سے ایسی چیز تھی جس کی اتنی اہمیت تھی کہ اس کا عام کرنا نہایت ضروری تھا۔ چنانچہ اس کے لیے یہ پمفلٹ چھاپ دیا گیا ہے، یہ سولہ صفحہ کا مختصر سا ایک پمفلٹ ہے اس کا عنوان میں نے یہ لکھا ہے کہ ''سنیے! قرآن کی آواز کہاں سے اٹھ رہی ہے''۔ یہ پمفلٹ باہر موجود ہے۔ اسے آپ غور سے پڑھیں گے تو آپ کے سامنے یہ بات آئے گی کہ میں نے ابھی جو کہا تھا کہ یہ کچھ کائناتی قوتیں (Cosmic Forces) ہیں، کوئی زمانے کے تقاضے ہیں، جن کی وجہ سے یہ ہو رہا ہے۔ تصور میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا کہ حکومت کی طرف سے کمیٹی بیٹھتی ہے کہ ہمارے ہاں کا جو موجودہ نظام Capital System (سرمایہ داری نظام) ہے اس میں کچھ اسلامائزیشن کی بات کی جائے اور وہ کمیٹی یہ رپورٹ پیش کرتی ہے۔ مجھے بےساختہ یہ بات آئی کہ بہرحال اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و کرم ہے کہ میں نے جو بات پچیس سال پہلے کہی تھی، کہتا چلا آ رہا تھا اور اس وقت کوئی اس کا سیکنڈ کرنے والا بھی نظر نہیں آ رہا تھا، اب خود ایوانِ حکومت سے بعینہٖ وہی چیز آئی ہے جو ان کی ایک خصوصی کمیٹی کی رپورٹ کی شکل میں سامنے آئی ہے۔

مذکورہ رپورٹ کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کا اظہارِ تشکر

عزیزانِ من! اس پر بیساختہ یہ شعر زباں پہ آ گیا ہے:

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

یہ قرآن کی بات ہے اس کا جو First Spark (شررِ اوّل) ہوتا ہے، مجھے تو موٹروں کا پتہ نہیں، کہتے یہ ہیں کہ فرسٹ اسپارک کے لیے بڑی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) فرسٹ اسٹارٹ (آغاز کا قدمِ اوّل) لے اور اس کے بعد پھر استقلال کے ساتھ اس کے اوپر جما رہے تو تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ (41:30) اس کے اوپر ملائکہ کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔ میں بارگاہِ ایزدی میں سربسجود ہوں کہ اس نے میری بڑی ہی ''ناکام سی'' کوشش کو میری زندگی میں ہی اتنا

شرفِ قبولیت بخش دیا ہے۔ اُنہوں نے بھی یہ لکھا ہے کہ ہم نے حکومت کے سامنے یہ ایجنڈا پیش کیا ہے کہ وہ اب اس ایجنڈے کے 450الزُّمَر
Items (شقوں) کو لے کر خود دیکھے کہ اس پہ کس طرح سے عمل پیرا ہوا جائے گا۔ تو یوں وہ بات ہے جو آگے چلے گی۔ لیکن بہرحال گورنمنٹ کے Documents (دستاویزات) کے اندر' یہ ایجنڈا آ گیا ہے کہ جسے اسلامی اقتصادیات کہا جائے گا' وہ یہ ہوگا۔ انہوں نے کہا ہے کہ تفاصیل اب بیٹھ کر خود ورک آؤٹ کیجیے کہ اب یہ کیسے کرنا ہے لیکن نصب العین یہ ہوگا جو ہم نے آپ کو بتایا ہے۔ اور اس میں سے ہر شق جو انہوں نے تجویز کی ہے اس کے نیچے قرآن کریم کی وہ آیت Quote (نقل) کی ہے جو میں نے قرآن حکیم کی آیتیں ''نظامِ ربوبیت'' میں دیدی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے ترجمہ ہی دیا ہے کیونکہ رپورٹ انگریزی میں ہے لیکن وہی قرآن حکیم کی آیتیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں قصرِ حکومت سے شاید یہ پہلی رپورٹ ہے' جس میں قرآن حکیم کی آیتیں بھی کبھی آئیں اور ہر شق کے نیچے قرآن حکیم کی آیت ہے۔ یہ تو رہی اس رپورٹ کی بات۔

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ اتفاق ایسا ہے کہ آخری درس جو بارہ دسمبر 1980ء کا تھا اس میں زیرِ نظر آیت ہی یہ تھی کہ جب تک اقتصادی مسئلے کا حل نہیں ہوگا' انسانیت اپنے پاؤں پہ کھڑی نہیں ہو سکے گی۔ اور قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کی جو بنیاد تھی' جو ان کے ہاں کی دلیل تھی' آج بھی وہی دلیل دی جاتی ہے۔ یہ فری انٹرپرائز والی جو بات ہے اس کے متعلق نظامِ سرمایہ داری میں اس پہ دلیل ہی یہ دیتے ہیں کہ ایک شخص اپنی صلاحیتوں سے' اپنی محنت سے' اپنی ہنرمندی سے' اپنی کاریگری سے' جتنا جی چاہے کمائے اور وہ اس کا حق ہے' کوئی دوسرا اس میں دخل ہی نہیں دے سکتا۔ قرآنِ کریم نے یہ کہا تھا کہ بَلۡ هِیَ فِتۡنَةٌ ((39:49 یہ ہے اصل فسادِ آدمیّت کی جڑ۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد پر حاصل شدہ نتائج قوم میں مایوسی کا مرض پیدا کر دیتے ہیں

عزیزانِ من! سوچیے کیا کہتا ہے قرآن پاک؟ یہ دولت کے انبار ہیں' یہ اس طرح زمینوں کے اتنے رقبے ہیں' اس نے کہا ہے کہ یہ تو اس کے ہاں کی محسوس شکلیں ہیں' اصل چیز تو ذہنیت ہے اور یہ هِیَ فِتۡنَةٌ ((39:49 ہے۔ آج حکومت کے ایوان سے آواز اٹھتی ہے کہ هِیَ فِتۡنَةٌ ((39:49 یہ ہے اصل فسادِ آدمیت کی جڑ۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد اب آئیے قرآن کریم کی طرف۔ یہ سارا نظام گنا کر اس نے یہ کہا تھا۔ سرمایہ داری کے نظام میں آہستہ آہستہ یہ جو اسی نوے فیصد غریب انسانوں کی آبادی ہوتی ہے وہ کشاکش روزگار کی' چیزوں کی' اتنی مہنگائی کی وجہ سے' نظم وضبط کے اندر ابتری کی رو سے' آہستہ آہستہ اس مقام پہ پہنچ جاتی ہے کہ مایوس ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں آج بھی آپ دیکھیں گے کہ ہر ایک جو ملے گا وہ اپنی زبان سے یہ کہے گا کہ ''جی! فیر پاکستان دا کی بنے گا جی' ساہڈے نال کی ہووے گا

جی''(پھر پاکستان کا کیا بنے گا پھر ہمارے ساتھ کیا ہوگا) یہ مایوسی کی آوازیں ہیں۔ مایوس اسے کہتے ہیں کہ جس کولق ودق صحرا کے اندر نشانِ راہ نہ ملے' جس کو وہاں راستہ نہ ملے' یہ ہے مضل۔ کیا بات تھی اس قوم کی! قرآن کریم نے بھی یہ مضل کہا تھا۔ یہ مایوس ہوتا ہے' جو راستے کی تلاش میں سرگرداں ہو اور اس کو راستہ نہیں ملے۔ راستہ اگر سامنے ہو اور معلوم بھی ہو تو وہ تھکا ہوا ہو' درماندہ ہو' تنہا ہو' اسے کوئی مشکلات ہوں تو وہ مایوس نہیں ہوتا' وہ مشکلات پر قابو پانے کی تدبیریں سوچتا ہے۔ یہ سارا کچھ گنانے کے بعد کہا ہے کہ کس طرح سے یہ لوگ رزق کے سرچشموں پر سانپ کی طرح بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور خدا کے بندوں کی جو اتنی بڑی آبادی ہے اس کو دو وقت کا کھانا بھی نہیں ملتا۔

ساڑھے بارہ لاکھ کے عوض ایک باز کی خریداری کے متعلق ایک خبر

یہ تفاوت کہاں تک بڑھتا ہے' اس کے لیے سنیے کہ 31 دسمبر 1980ء کے ''نوائے وقت'' میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی ہے۔ خبر یہ ہے کہ یہیں غالباً ساہیوال کے ضلع کے اندر ایک زمیندار ہے۔ اس کا ایک باز چوری ہو گیا جس کی قیمت بارہ لاکھ روپیہ تھی۔ کہا کہ کیا اس کے پروں کے اوپر یہ بارہ لاکھ روپیہ لگا ہوا تھا۔ اس روزنامہ میں لکھا یہ تھا کہ دربار خواجہ فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمہ پاکپتن والے (1901-1841ء) یہ جن کے ہاں بہشتی دروازہ اسی محرم میں کھلتا ہے' اس کے جو سجادہ نشین قطب صاحب ہیں' انہوں نے اس کی ساڑھے بارہ لاکھ روپیہ قیمت کی پیش کش کی تھی اور اس نے نہیں دیا تھا۔ یہ 31 دسمبر 1980ء کا ''نوائے وقت'' ہے اور اس کے آخری صفحہ کے اوپر یہ اتنی سی خبر ہے۔ خبر تو اتنی سی ہے لیکن قرآن بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ ((39:49 کہتا ہے۔ سنیے! وہ جو بہشتی دروازے میں جانے والے ہوتے ہیں انہیں آپ دیکھیے' اس سردی میں ان کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں ہوتا اور وہ پھر اپنی عقیدت میں یعنی جوان کے لیے جہالت پھیلائی ہوئی ہوتی ہے' اس کے تحت جو کچھ وہ وہاں جا کر دیتے ہیں' اس کی باقی کی کیفیت کا آپ خود اندازہ لگا لیجیے میں کیا اندازہ لگاؤں۔ میں تو اس ایک خبر کی بات بتا رہا ہوں کہ وہ سجادہ نشین صاحب ساڑھے بارہ لاکھ روپے ایک باز کی قیمت پیش کرتے ہیں۔ آپ سوچیے! وہ پیسہ ان کے پاس کہاں سے آیا؟ وہ عقیدت کا یہی نذرانہ ہوتا ہے۔ آپ سوچیے کہ اس مقام کے اوپر یہ غریب' یہ اسی نوے فیصد جن پہ عرصہء حیات اتنا تنگ ہو جاتا ہے یا ہو چکا ہوتا ہے' وہ کس طرح مایوسی کے عالم میں پہنچتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کسی کو مایوس نہیں ہونے دیتی

قرآن حکیم کہتا ہے کہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ((39:53 وہ' ایسے لق ودق صحرا میں' اُسے جس کو راستہ نہیں ملتا' دور سے آواز دیتا ہے کہ اے! گھبراؤ نہیں' میں بتاتا ہوں کہ کونسا راستہ ہے۔ کیا بات ہے! جب اس نے یہ کہا تو میں نے کہا' کیا چیز ہے! اٹھ دیکھ کہ راستے کی آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ مایوس نہ ہو۔ اور پھر قرآن حکیم کے یہ الفاظ ہیں۔ یہ ٹھیک ہے

کہ اَسۡرَفُوۡا عَلٰٓی اَنۡفُسِهِمۡ ((39:53 آیا ہے اس کا ترجمہ تو یہی کیا جاتا ہے ''جو اپنے خلاف زیادتی کر بیٹھے ہیں''۔ یہ بنیاد ذرا دیکھیے الزُّمَر 450 یہاں تو قرآن حکیم کے الفاظ کی بنیاد دیکھنی چاہیے۔ یہ زمیندار جو کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں، وہ کنویں کے پانی سے کرتے ہیں، وہ پانی جن نالیوں میں سے گزرتا ہے ''اوہنوں پنجابی اچ آڈ کیندے نیں، اوہناں وچوں لنگدا اے'' (انہیں پنجابی زبان میں آڈ (نالی) کہتے ہیں، وہ پانی ان میں سے گزرتا ہے)۔ ہمارے ہاں پختہ نالیاں نہیں ہوتی تھیں، کچی نالیاں ہوتی تھیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر یہ ہوتا تھا کہ راستے میں ہی وہ کچی سی آڈ (نالی) ہوتی تھی تو ادھر سے ذرا مٹی ہٹی تو وہ پانی اِدھر بہہ گیا، کچھ اُدھر بہہ گیا۔ یعنی بجائے اس کے کہ وہ اس کھیت میں پہنچے، جہاں سے کچھ پیدا ہونا ہے، وہ راستے میں ہی اِدھر اُدھر بہتا چلا گیا، وہ لوگ اسے اسراف کہتے تھے۔

عزیزانِ من! اب دیکھیے اُس ساڑھے بارہ لاکھ روپے سے کتنے غریبوں اور کمزوروں کے بچوں کی فصلیں ہری ہونی تھیں، وہ راستے میں ہی بہہ گیا۔ کیا لفظ ہے! کہا ہے کہ جب یہ نظام پیدا ہو جائے، وہ پانی کھیتی تک نہ پہنچے تو جہاں سے اس نے کچھ Produce (پیدا) کرنا ہے، یہ Non-Productive (غیر پیداواری) ہو گیا۔ یہ ساری پیشکشیں جو آپ نے دیکھی ہیں وہ یہی ہیں کہ پانی کھیتی تک نہیں پہنچ رہا، راستے میں بہہ رہا ہے یہ غیر پیداواری ہو گیا ہے۔ کہا ہے کہ اگر یہاں تک بھی پہنچ چکے ہو تو تمہیں کیا چاہیے۔ میں نے کہا ہے کہ رحمت کے معنی ہوتا ہے: ''سامانِ نشوونما جو بلا مزد و معاوضہ ملے''۔ انسان کے ہاتھ سے جو ملتا ہے، وہ رحمت نہیں ہوتا۔ یہ وہ سامان ہوتا ہے جو رحمِ مادر میں جنین کو، بچے کو ملتا ہے، وہیں سے یہ لفظ رحمت ہے۔ کہا ہے کہ لَا تَقۡنَطُوۡا ((39:53۔ یہ جو لفظ قنط ہے، اس کا مادہ (Root) ''ق ن ط'' ہے۔ اس کے معنی ہوتا ہے ''کسی کا پانی روک لینا''۔ کیا بات ہے! ایک ایک لفظ میں قرآنِ کریم کیا کچھ کہتا چلا جا رہا ہے کہ اے وہ کہ جن کے پانی روک لیے اور جنہوں نے وہ پانی روکے۔ یہ نہیں کہا کہ وہ کھیتی تک پہنچے، وہ راستے میں ہی بہنے شروع ہو گئے۔ کہا ہے کہ اگر یہ کیفیت یہاں تک بھی ہے تو بھی مایوس مت ہو، تمہیں راستہ ہم بتائیں گے۔ یہ جو اس قسم کی لغزشیں ہیں، ان کی کوئی بات نہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا ((39:53 اس سے ہم تمہیں سامانِ حفاظت دیں گے۔ اس وقت تم سمجھ رہے ہو کہ صاحب! ہم بچ ہی نہیں سکتے، ہمارے پاس حفاظت کا سامان ہی نہیں ہے، ہم سامانِ حفاظت دیں گے۔ کہا ہے کہ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ((39:53 حفاظت بھی وہ کرے گا، سامانِ نشوونما بھی وہ دے گا۔

خدا کی طرف سے رحمت کے حقیقی مفہوم کے برعکس ہمارے ہاں پایا جانے والا اس کا تصور

اب اس نے صرف یہ کہا ہے کہ رحمت سے مایوس مت ہو۔ میں نے کہا کہ ''یاس'' کے معنی یہ ہیں کہ راستہ نہ ملے اور وہاں انسان مایوس کھڑا ہو کہ کہاں جاؤں۔ راستے کی نشاندہی کرنا، یہ ہے مایوسی سے نکالنا۔ ضمناً آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے ہاں پھر ''خدا کی رحمت سے مایوس مت ہو بھئی!'' کہاں بولتے ہیں: جتنا جی چاہے گناہ کرتے چلے جاؤ، اس کی رحمت سے مایوسی کفر ہے، وہ سب بخش دے گا۔ بچپن میں

ہمارے ہاں ایک بہت بڑے واعظ آیا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کون کہتا ہے کہ گناہ نہ کرو' جی بھر کر گناہ کرو' اگر گناہ نہ کرو گے تو خدا کی 450 الزُمَر بخشش اور مغفرت کی صفت کیسے بروئے کار آئے گی "اوہدا سودا کیویں وکے گا" (اس کا مال کیسے بکے گا)۔ گناہ کرو جی بھر کر' بس ایک درود شریف پہلے' ایک درود شریف بعد میں تو بس یوں سمجھو کہ دو سمندر آپس میں ملیں گے' گناہوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائیں گے۔

انسانوں کی دنیا میں قرآنِ حکیم کا معاشی نظام متشکل کرنے کی عملی شکل شہد کی مکھی کا طرزِ عمل ہے ❶

اس مقام پہ وہ کہتا ہے کہ خدا کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ راستے ہی کی تلاش ہے' راستہ نہیں ملتا' اس لیے مایوس ہو' آؤ ہم بتائیں: وَ اَنِیۡبُوۡۤا اِلٰی رَبِّکُمۡ وَ اَسۡلِمُوۡا لَهٗ ((39:54 انسانوں کے بنائے ہوئے جتنے نظام ہیں' ان سے منہ موڑو۔ "اناب" ہوتا ہے "ایسے آنا جیسے شہد کی مکھی اپنے چھتے کی طرف آتی ہے"۔ کہا ہے کہ یوں آؤ۔ ایک ایک کلی کا منہ چومو' وہاں سے رس کا ایک ایک قطرہ اپنے منہ میں لو۔ شہد کی یہ مکھیاں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں نکلی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ رس ایک ایک جگہ کی کلی سے چوسو' راستے میں خود ہی نہ کھا جاؤ' آپ ہی نہ تقسیم کرنا شروع کر دو' چھتے میں آؤ۔ اور یہ مکھیاں جو شہد لاتی ہیں' یہ عجیب نظام ہے' یہ تو مطالعہ کے قابل ہے' اس پہ بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ شہد کی مکھی کا یہ نظام ہے۔ یہ جو باہر سے کما کر لاتی ہیں راستے میں خود نہیں لیتیں بلکہ خود آ کر سارے کا سارا وہاں جمع کر کے' چپکے سے بیٹھ جاتی ہیں۔ وہاں ایک مرکز ہوتا ہے' جسے کوئین (ملکہ) کہتے ہیں۔ وہ سب سے پہلے بچوں کو دیتی ہے' ان کی پرورش کے بعد جو بچتا ہے' وہ موم والا شہد ہوتا ہے' وہ ان کے حصے میں آتا ہے جو یہ محنت کر کے لاتی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ اَنِیۡبُوۡۤا اِلٰی رَبِّکُمۡ ((39:54 اس کی طرف آؤ جس نے نظامِ ربوبیت دیا ہے۔ صرف آؤ ہی نہیں' صرف رپورٹ ہی نہ لکھو بلکہ وَ اَسۡلِمُوۡا ((39:54 اپنے آپ کو اس کے سامنے سرنڈر کرو' اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو' اس نظام کو اختیار کرو۔

ہم نے اپنی بدعملی کے تمام نتائج کو قیامت تک اٹھا رکھا ہے جبکہ زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے

اور پھر وارننگ ہے۔ یہ تو تھا کہ مایوس مت ہو' قرآن کریم نے یہ کہا تھا کہ اب اس کا طریقہ یہ ہے۔ فرمایا کہ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ الۡعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنۡصَرُوۡنَ ((39:54 قبل اس کے کہ وہ تباہی آ جائے کہ پھر تمہاری کوئی مدد نہ کر سکے۔ ہم نے تو یہ تباہیاں' یہ عذاب' یہ ساری چیزیں' قیامت پہ اٹھا رکھی ہیں۔ اکنامکس (اقتصادیات) کا تو یہ سارا تذکرہ چلا آ رہا ہے۔ یہ جو عذاب کہہ رہے ہیں یہ عذاب وہی ہے' جو ان قوموں کے اوپر آتا ہے' جہاں تقسیمِ رزق Unbalanced (غیر متوازن) ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ ثُمَّ لَا

---

❶ قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے سلسلہ میں سورۃ النحل کی قرآنی تفسیر' جو 334 صفحات پر مشتمل ہے' ملاحظہ کریں۔ قارئین کرام یہ تفسیر "(پرویزؒ: (2003ء)۔ مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورہ النحل' ڈاکٹر منظور الحق (مدیر)' ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ' لاہور" سے حاصل کر سکتے ہیں۔

تُنْصَرُوْنَ ((39:54اس سے پہلے حدتک توقومیں' جو بڑی بڑی سرمایہ دار ہیں' وہ خیرات کے بھیک کے ٹکڑے پھینکتی رہتی ہیں' پھر ایک وقت ایسا آ جاتا ہے جہاں یہ ان کے مفاد میں نہیں رہتا' پھر وہ ان کی مدد کرنا چھوڑ دیتی ہیں' پھر یہ قومیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے لاَ تُنْصَرُوْنَ۔

قرآنِ حکیم کی پوری تعلیم اپنے اندر احسن اورصرف احسن کے عنصر کے ساتھ ہی جلوہ افروز ہوکر عمل میں ڈھلتی ہے

اب کروکیا؟ کہا کہ وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ((39:55۔قرآن حکیم تومتعین طور پر بات کرتا ہے' محض نظریہ ہی نہیں دیتا۔کہا ہے کہ وَاَنِیْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ ((39:54۔ یہ جو کہا تھا تو بات کچھ متعین نہیں تھی۔ وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ((39:54 کے یہ معنی نہیں کہ جو ہم نے نازل کیا ہے اس میں سے جو احسن ہے' اس کا اتباع کروتو گویا اس کے اندر غیر احسن بھی ہے''اوہدے اچوں چنگیاں چنگیاں گلاں لے لیا کروتے باقی چھڈ دیا کرو''(معاذ اللہ) (اس میں سے اچھی باتیں لے لیا کرو اور باقی چھوڑ دیا کرو)۔ یہاں لفظ احسن آیا ہے۔کہا ہے کہ جو پرابلم سامنے آتی ہے اس کولو' پھر قرآنِ کریم میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے متعلق اس کو دیکھو' پھر دیکھو کہ جو وقت کا تقاضا' حالات کا تقاضٓ آ ہے اس کے مطابق قرآن کریم میں جوٹھیک ٹھیک طریقے دیئے گئے ہیں' اتنے طریقوں میں سے اس کو وہاں Apply (استعمال) کرو۔ اس کی تو ہر تدبیر' ہر تجویز ہی احسن ہے لیکن اسے Apply (استعمال) کرنے کے لیے اس میں سے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ حالات کا تقاضا کیا ہے' اس کے مطابق اس میں سے اس تدبیر کو Apply (لاگو) کرو۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ سینکڑوں دوائیاں ہوتی ہیں' یونانی کے تو ہمارے ہاں مفردات ہی اتنے اطباء کے سامنے زیادہ ہوتے ہیں' مرض بھی سامنے ہوتا ہے' ہر دوائی کے اندر شفا ہوتی لیکن دیکھنا تو یہ ہوتا ہے کہ جو اس وقت مریض کا مرض ہے' مریض کی جو حالت ہے' اس کے مطابق ان دوائیوں میں سے' ان مفردات میں سے' کون کون سی چیز ہے' جو اس وقت احسن ہے۔اس کے یہ معنی ہیں۔

عزیزانِ من! قرآن حکیم کے احسن کا اتباع کرنا ہے۔ یہ تدبر کہلاتا ہے۔لہٰذا جیسا کہ اس رپورٹ [1] میں کہا گیا ہے تو پھر آج کے حالات میں جہاں ہم آج کھڑے ہیں جب یہاں سے ہم چلیں گے تو ظاہر ہے کہ ہم بڑے آہستہ آہستہ ہی چلیں گے۔عزیزانِ من!

---

[1] یہ وہی رپورٹ ہے جس کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے۔ بارِ دگر اس کا حوالہ یہ ہے:

Report for An Agenda for Islamic Economic Reform, Pakistan Institute of Development Economics, Islamabad, 1980.

بڑے اچھے لوگ ہیں جنہوں نے یہ رپورٹ لکھی ہے، میں نے ان کی بڑی تعریف بھی کی ہے، مبارکباد بھی دی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے نظر ایسا ہی آئے گا کہ جیسے ہماری رفتار بڑی سست ہے لیکن موجودہ حالات میں تو وہاں تک جانے کے لیے سست رفتاری سے ہی کام لینا پڑے گا، یہاں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ آج ہمارے وسائل کیا ہیں، ہمارے تقاضے کیا ہیں، ان کے مطابق ہی ہمیں قدم اٹھانا ہوگا، جذبات میں نہ آ جایئے گا۔

قوموں کی تباہی کی بنیادی وجہ اور آج کے دور میں اٹھنے والے انقلاب کی نوعیت

ارشادِ خداوندی ہے کہ وَ اتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً (39:55) بعض اوقات تو تباہی تبدریج آیا کرتی ہے، آہستہ آہستہ آیا کرتی ہے، نظر آتی ہے کہ وہ آ رہی ہے اور اکثر و بیشتر قوموں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ قومیں اپنی گمراہی میں، قوت کے نشے میں، دولت کے نشے میں، اندھی ہو جاتی ہیں۔ تو وہاں تباہی تو بتدریج ہو رہی ہوتی ہے لیکن انہیں نظر نہیں آتی، انہیں ایسا پتہ چلتا ہے کہ اچھے بھلے رات سوئے تھے، صبح اٹھے تو تباہ ہو گئے۔ یہ انقلابات جو آج کل مختلف قوموں میں آ رہے ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیسے یہ بغتۃً آتے ہیں، اچھی بھلی کل تک ایک سلطنت ہے، اس کا ہیڈ آف دی اسٹیٹ بھی موجود ہے جو اتنے عرصے سے چلا آ رہا ہے، خواہ وہ پریزیڈنٹ ہے، خواہ وہ بادشاہ ہے، خواہ وہ کچھ بھی ہے دوسرے دن صبح اٹھو تو

بیک گردش چرخ نیلو فری
نہ انجن سلامت نہ انجینئری

وہ سارا کچھ ہی الٹ جاتا ہے۔

آج دنیا بھر میں اٹھنے والے انقلاب کی نوعیت پہلے دور سے کہیں مختلف ہے

یہ بغتۃ کے انقلاب کی جو شکلیں ہیں، وہ پہلے نہیں آیا کرتی تھیں، پہلے یہ انقلاب کسی ہلاکو سے، کسی چنگیز سے آتا تھا مثلاً وہ اٹھتا مرکزی ترکستان سے اور بغداد تک آتے آتے ساری دنیا کو معلوم ہوتا تھا۔ آج یہاں جو اس دور کے اندر قوموں کی تباہیاں آ رہی ہیں، یہ بغتۃ آ رہی ہیں۔ وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (39:55) اور تمہارے شعور میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ یہ تباہی کہاں سے آ رہی ہے یا یوں تباہی آئے گی۔ کہا ہے کہ پھر ایسی بات نہ ہو جائے کہ وہ تباہی آئے تو پھر تمہاری حالت یہ ہو جائے کہ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ (39:56) وہاں پھر تم یہ کفِ افسوس ملؤ دانت میں انگلی لو اور یہ کہو کہ افو ہو! میں نے واقعی خدا کے نظام کی طرف جانے میں بڑی کمی کی بلکہ میں نے اس کا مذاق اڑایا۔ Capitalistic System (سرمایہ داری نظام)

والے اس کا مذاق اڑاتے چلے جا رہے ہیں۔ اَوۡ تَقُوۡلَ لَوۡ اَنَّ اللّٰہَ ھَدٰىنِیۡ لَکُنۡتُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ ((39:57 یا یہ کہو کہ صاحب! ہدایت تو خدا نے دینی تھی، وہی یاد کرتا ہے، وہ مجھے اگر ہدایت دیدیتا تو میں بھی بچ جاتا۔ کہا ہے کہ ہدایت تو ہم نے تمہیں پہلے ہی دیدی، ہم نے تو راستے کی آواز دیدی تھی، تمہیں بتادیا تھا کہ یہ صحیح راستہ ہے، اب یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ یعنی ہر حجت کا اتمام ہے جو قرآن مجید کررہا ہے۔

قوموں کی تباہی میں دو باتیں خاص طور پر اثر انداز ہوتی ہیں

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ قومیں اس وقت تک تباہ نہیں ہوتیں جب تک دو باتیں نہ ہوجائیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان میں قرآن مجید کے نظام یا اصول یا قوانین یا اقدار کے سمجھنے کی صلاحیت ہو اور دوسرا یہ ہے کہ ان تک یہ چیزیں پہنچ چکی ہوئی ہوں۔ تو یہ جو کہا کہ اگر مجھے ہدایت ہوتی، تو سنو! یہ تو ہم نے تمہیں پہلے دیدیا تھا کہ راستہ یہ ہے، اس طرف آجاؤ، تم یہ نہیں کہہ سکو گے کہ ہمیں بتایا نہیں گیا تھا کہ راستہ کونسا ہے۔ باقی قوموں کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہاں تک یہ پہنچی ہے یا نہیں، ہم جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، وہ تو یہ جو راستہ اس نے بتایا ہوا ہے، ہمارے سامنے ہے۔ یہ الگ چیز ہے کہ راستے کی حیثیت سے ہم اس کو نہیں لے رہے لیکن اس چیز کو جتنا دنیا میں دہراتے ہیں کوئی بھی مذہب اپنی کتاب اتنا نہیں دہراتا جتنا اس کتاب کو ہم دہراتے ہیں۔ ہم کیسے کہہ سکیں گے کہ ہمارے سامنے صحیح راستہ نہیں آیا تھا۔

زندگی کا ایک ایک لمحہ جوئے رواں ہے جو کسی شکل میں بھی واپس نہیں آتا اس لیے اسے خطا نہیں کرنا

عزیزانِ من! آگے کہا ہے کہ اَوۡ تَقُوۡلَ حِیۡنَ تَرَى الۡعَذَابَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ کَرَّۃً فَاَکُوۡنَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ((39:58۔ یہ آیت پہلے بھی کئی دفعہ آچکی ہے۔ کہا ہے کہ یا تم اس عذاب کو دیکھ کر یہ کہو کہ بارِ خدایا! ایک موقع اور دیدے پھر دیکھ ہم کیسے اچھے کام کرتے ہیں۔ اور قرآن حمید نے ہر بار یہ بات کی ہے، یہ بڑی اہم چیز ہے جو میں ابھی کہنے لگا ہوں۔ جب موقع ملے یعنی یہ ایک اہم چیز ہے کہ جب Opportunity (موقع) آپ کے سامنے آئے، اس کو سینگوں سے پکڑو، Don't Miss the Bus۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی میں مواقع آتے ہیں، تم نے خود تو اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا اور اب کہتے ہو کہ صاحب! دوبارہ اگر اسی قسم کا موقع مل جائے تو دیکھو ہم کیا کرتے ہیں۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ تاریخ کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں پلٹا کرتا، جو پانی پل کے نیچے سے بہہ گیا، وہ بہہ گیا۔ یہ اس میں ایک اہم چیز بھی ہے جو کہی گئی ہے۔ ہر ایک کی زندگی میں Opportunities (مواقع) آتی ہیں، ہم انہیں Miss (خطا) کر جاتے ہیں اور Miss (خطا) کرنے کے بعد آخر میں، ہم میں سے ہر ایک کہتا ہے کہ صاحب! اگر ایک دفعہ اور اسی قسم کے حالات آجائیں تو پھر دیکھو میں کر کے دکھاتا ہوں۔ کتنی بڑی چیز قرآن حمید نے کہی ہے کہ جو First Opportunity (پہلا موقع) آتی ہے، اسی کو پکڑو، اسے

Miss (خطا) نہ کرو' بعد میں ہزار مرتبہ بھی تم کہو گے' تو یہ دوبارہ نہیں آئے گی۔ کہا ہے کہ بَلٰی قَدْ جَآءَتْکَ اٰیٰتِیْ فَکَذَّبْتَ بِھَا 50الزُمَر وَ اسْتَکْبَرْتَ وَ کُنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ) (39:59 تمام جتنے اصول ہم بیان کر رہے ہیں یہ سارے تمہارے سامنے آ چکے تھے' تم نے ان کی تکذیب کی۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں بتایا کرتا ہوں کہ تکذیب کے کیا معنی ہوتے ہیں: ایک تو بات ہوتی ہے کہ انکار کر دینا کہ میں اس کو سچا نہیں سمجھتا' یہ جھوٹ ہے' ایک یہ ہے کہ زبان سے کہتے رہنا کہ ہاں صاحب! یہ خدا کا کلام ہے' بالکل صحیح ہے' اسی میں ہدایت ہے' سب کچھ ہے مگر کرنا اس کے خلاف' اسے تکذیب کہتے ہیں۔ تم یہ کہا کرتے تھے۔ ہدایات تمہارے سامنے آ چکی ہوئی تھیں' تم نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہمارے سامنے یہ راستے کا نشان نہیں آیا تھا' راستے کا نشان موجود تھا' تم خود دوسری طرف چل نکلے تھے: وَ اسْتَکْبَرْتَ) (39:59 یا پھر تمہاری جو قوت کا نشہ تھا' وہ تمہیں ادھر نہیں آنے دیتا تھا۔ یہ ساری چیز تھی۔ اس اعتبار سے تم دونوں ہی انکار کرنے والوں میں سے ہو گئے' یہ دونوں میں کفر ہو گیا' تکذیب بھی ہو گئی اور نشۂ قوت میں بدمستی سے جو کسی نے لاپرواہی برتی' وہ بھی کفر ہو گیا۔ کہا ہے کہ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ تَرَی الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَلَی اللّٰہِ وُجُوْھُھُمْ مُّسْوَدَّةٌ اَلَیْسَ فِیْ جَھَنَّمَ مَثْوًی لِّلْمُتَکَبِّرِیْنَ) (39:60 ظہورِ نتائج کے وقت پھر آپ دیکھیں گے' جسے کہتے ہیں کہ اس کا منہ کالا ہو گیا' ذلت کے معنی ہوتے ہیں کہ یہ پھر کس قدر ان کی تذلیل ہو گی' اس جہنم میں قوموں کے اندر یہ کیسی ذلیل قوم شمار ہو گی۔ کہا ہے کہ پھر اس کے بعد تم دیکھو گے کہ یہ جو قومیں ہیں' تباہی کے جہنم میں ہونگی' یہ بھی کہ جو بیچارے ضعیف اور ناتواں تھے اور جو ان کے متکبرین قوت کے نشے میں بدمست تھے ان کی بھی یہ کیفیت ہو گی۔ وَیُنَجِّی اللّٰہُ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِھِمْ لَا یَمَسُّھُمُ السُّوْٓءُ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ((39:61 ان کے برعکس وہ کہ جنہوں نے پھر اس نظام کو اختیار کر لیا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے یا ہدایت دی ہے یا راہنمائی دی ہے' انہیں ہم اس تباہی سے محفوظ رکھیں گے۔

مذاہب میں نجات کا تصور

یہاں ((39:61 میں دو الفاظ آ گئے۔ ایک تو نجات کا لفظ ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں نجات (Salvation) کے معنی ہوتے ہیں کہ آدمی پہلے ٹھیک اچھا بھلا ہو' پھر کسی مصیبت میں پھنس جائے' پھر اس مصیبت سے اس کی نجات ہو جائے۔ ہمارے ہاں بھی یہ کہتے ہیں کہ اس سے نجات ہو جائے' چھٹکارا ہو جائے۔ اور مذہب کا ماحصل یہی بتایا گیا ہے۔ تو ہوا ہی کیا' یعنی صبح اچھا بھلا صحت مند تھا' دوپہر کو بخار ہوا' دوائی دی' شام کو چار بجے پھر ٹمپریچر پھر نارمل ہو گیا تو یہ ایسا ہی ہو گیا جیسا صبح تھا تو گویہ سارا سلسلۂ رشد و ہدایت' تخلیقِ کائنات' انسانوں کو بنانا' انبیائے کرامؑ کو بھیجنا' پھر اس کے بعد اگلی دنیا آخرت' سارا یہ سارا کچھ' اس لیے ہے کہ As you were (جیسے تھے ویسے ہی) ہو جاؤ' می نہ سزد خدائے را۔ یعنی یہ کھیل کیا ہوا' تماشا کیا ہوا' کہ جیسا پہلے تھا ویسا پھر ہو گیا' تو یہ درمیان میں ایسا کیوں کیا اور

انسان نے اس سے کیا کمایا' اس کو حاصل کیا ہوا۔ جتنے بھی دنیا کے مذاہب ہیں' ان کے اندر نجات کا یہی تصور ہے۔ 450الزُّمَر

عیسائیوں کے ہاں نجات کے سلسلہ میں پایا جانے والا تصور

عیسائیت کے اندر ہر انسانی بچہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے ماں باپ کے اولیں گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لاد کر آتا ہے یا اس میں ملوث ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد اس دنیا میں اس کا کام یہ ہے کہ وہ کسی طرح سے وہ داغ دھودے۔ وہ داغ عمل سے نہیں دھویا جاسکتا' حضرت مسیح کے کفارے پہ ایمان سے دھویا جاسکتا ہے۔ وہ اس کے لیے کیا ہوا کہ پہلے تو خدا نے بچے بھیجے' جو داغدار تھے' گناہوں سے آلودہ تھے' اس آلودگی کے دھونے کی کوئی شکل باقی نہیں تھی تو جو میں کہا کرتا ہوں (معاذ اللہ) عیسائیوں کے اعتقاد کی رو سے کہ وہاں پھر اللہ میاں بیٹھے' اپنے بیٹے سے مشورہ کیا کہ ''کیتا کی جائے آمیں کر بیٹھا ہیگا آں'' (اب کیا کیا جائے' میں تو یہ کچھ کر بیٹھا ہوں) تو یہ تو سارے جتنے انسان پیدا ہو رہے ہیں' وہ سارے کے سارے ہی گنہگار پیدا ہو رہے ہیں' سارے جہنم میں چلے جائیں گے۔ بیٹے نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے' آپ مجھے بھیج دیجیے' مجھے یہ لوگ صلیب دیدیں گے' میرا خون بہا جو ہوگا اس کے صدقے میں آپ انسانوں کو معاف کر دیجیے گا۔ اُس نے کہا ''واہ واہ جیوندا رہو'' (واہ واہ! جیتے رہو)۔ تو اس طرح سے وہ اس حضرت مسیح کا جو کفارہ ہے وہ ان انسانوں کو اس سے نجات دے جو آلائش وہ لے کر آئے تھے۔ اس کے معنی نجات (Salvation) ہیں۔ یہودیوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے صاحب! ہم تو جہنم میں جائیں گے نہیں' چند دنوں کے لیے جائیں گے' وہ بھی اس وقت تک جب تک ہمارے ان بوڑھوں کو پتہ نہیں چلے گا کہ ہمیں پولیس حوالات میں لے گئی ہے ''نہیں تے ایناں نے شام نوں ای ضمانت دوالیونی سی'' (ورنہ انہوں نے تو شام تک ہی ضمانت کروا دینی تھی)۔ وہ جتنے دن ان کو لگ جائیں گے یہ پتہ لگنے کے بعد ہمارے تک آنے میں بس وہاں تک ہم رہیں گے' پھر وہاں سے وہ ہم کو چھڑا دیں گے۔

ہندو کے اور ہمارے نزدیک نجات کا حل اور قرآنِ کریم کا فیصلہ

ہندو نے کہا کہ جو بچہ پیدا ہوتا ہے' وہ کوئی سور ہے' کوئی کتا ہے' کوئی شودر وغیرہ ہے' پچھلا جو جنم تھا' وہ ان کی پاداش میں یہ کچھ کر کے آتا ہے' اس میں یہ پھنسا ہوا ہے' یہ 33 کروڑ چکر ہوں گے۔ اس 33 کروڑ کے بعد جیسا پہلی دفعہ پیدا ہوا تھا پھر یہ ویسا ہی ہو جائے گا۔ ''اے گھن چکر جھڑے نے کاہدے لئی دتے سارے'' (یہ جو گھن چکر ہیں' یہ سارے کس لیے دیئے گئے)۔ کہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا پہلے تھا۔ ہمارے ہاں بھی نجات کا یہی تصور ہے' شفاعت کو چھوڑ دیجیے' جن کو جہنم میں جانا بھی ہے' وہ جہنم میں جانے کے بعد' وہاں سے کچھ سزا بھگت کر اور پھر اس کے بعد سارے جنت میں آجائیں گے۔

ہمارے ہاں کے بڑے بڑے اولیائے کرام' صوفی' قطب' ابدال ہیں صاحب! وہ تو بتاتے ہی یہ ہیں کہ جیسے وہ دھوبی کپڑے کو بھٹی 450 لزُّمَر پہ چڑھا دیتا ہے تاکہ اس کی میل ویل کٹ جائے اور اس کے بعد پھر وہ سفید ہو جائے' بس یہ ہے سارا جسے جہنم کہتے ہیں۔ ایک اور تھے انہوں نے اسے Senitorium (سینی ٹوریم) کہا ہے ''تپ دق دے مریض اوتھے بھیجے جان گے' علاج ہون گے'' (وہاں تپ دق کے مریض بھیجے جائیں گے' وہاں ان کے علاج ہونگے)۔ یعنی بات وہی ہے' نجات کے متعلق یہ ہے کہ جیسا پہلے تھا' ویسا ہو گیا۔ یہ تصور قرآن کریم نے نہیں دیا۔ Salvation (نجات) میں کوئی Achievement (فوز) نہیں ہوتی' یہ سارا قصہ اس لیے ہوتا ہے کہ جیسا پہلے تھا ویسا ہی ہو جائے۔ قرآن کریم نے اس کے لیے بِمَفَازَتِهِمْ کا لفظ کہا ہے' اس کا ترجمہ Achievement (فوز) ہے۔ ان قوانین کے اتباع سے' ان کی اطاعت سے' اس نظام سے' Achievement (فوز) ہوتی ہے' کچھ Achieve (حاصل) ہوتا ہے' وہ As you were نہیں ہوتا۔ کہا ہے کہ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوٓءُ (39:61) اس کی حفاظت یہ ہوتی ہے کہ یہ جو ناہمواریاں ہیں اس کو چھوتی نہیں ہیں۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (39:61) اور خوف تو پہلے ہی ختم کیا تھا۔ یہ حزن کی بات بھی بڑی عجیب ہے۔ میں اس کا ترجمہ دل گرفتگی کیا کرتا ہوں' وہ جو انسان کے اوپر افسردگی چھا جاتی ہے' ہمارے ہاں حزن و ملال بھی بولتے ہیں۔

عربوں کے ہاں لفظ حزن کا مفہوم اور پھر اس سلسلہ میں خدا تعالیٰ کی ذمہ داری اور اس کے نظامِ ربوبیت کے خدوخال

عرب ''حزن'' کا لفظ متفرق معنوں میں استعمال کرتے تھے' عام طور پہ استعمال کرتے تھے کہ شام کے وقت مزدور گھر آئے اور بچوں کے پاس کھانے کو نہ ہو تو اس وقت جو اس کی حالت ہوتی ہے' اسے حزن کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ پھر کسی کو حزن نہیں ہوتا۔ سوچو تو سہی کہ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (39:62) وہ پیدا کر دے اور پھر ان کو سامانِ پرورش نہ دے' یہ کوئی خدا سے ہونے والی بات ہے۔ آپ تو اپنے ملازم کو' نوکر کو' جب روٹی پہ رکھیں گے' اُسے دو وقت کے لیے روٹی نہ دیں' آپ اندازہ لگائیے کہ وہ پھر معاشرے میں کیا کہلاتے ہیں۔ کہا ہے کہ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (39:62) کسی نے اپنی پسندیدگی سے' اپنی چوائس سے' یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے پیدا کر دو' پیدا ہم نے کیا تھا' جب ہم نے پیدا کیا تھا تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ان کو سامانِ پرورش سے نوازیں۔ کل شیء وکیل (39:62) جو وکالت ہوتی ہے' وہ کسی چیز کی ذمہ داری ہوتی ہے' اس کو بھروسہ (Confidence) کہتے ہیں' ہم پہ بھروسہ کرو۔ انسان اس وقت مرتا ہے جب وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نظام کے اوپر بھروسہ کر لیتا ہے۔ کہا ہے کہ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (39:63) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جتنا کچھ سامانِ نشوونما ہے' اس کی چابیاں' اسی کے ہاتھ میں رہنی چاہئیں' یہ انسانوں کے ہاتھ میں نہیں رہنی چاہئیں۔ آگے کہا ہے کہ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (39:63) جو اس سے انکار کرتے ہیں' ان کا نقصان ہوتا ہے' وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔

عزیزانِ من! اگر ایک آیت اور آجائے تو پھر دوسرا موضوع شروع ہو جاتا ہے۔ کہا ہے کہ قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَاْمُرُوْنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّھَا 450 الزُّمَر الْجٰھِلُوْنَ ((39:64 اولوگو! جو ان حقیقتوں سے واقف نہیں، تم تو اس غلط راستے پہ جا ہی رہے ہو، تم کیا یہی چاہتے ہو کہ میں تمہاری طرح انہی غلط راہوں کے اوپر چلا جاؤں اور اس کی محکومیت اختیار نہ کروں۔

خدا تعالیٰ کے بیان کردہ نظامِ حیات کے ساتھ انسانوں کا خودساختہ نظام شرک کہلاتا ہے

کہا ہے کہ وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ ((39:65 اور ہم نے تو راہنمائی کے لیے تمہاری طرف وحی کی، تم سے پہلے بھی جو قومیں تھیں، ان کی طرف سے بھی ہم نے وحی کی، ہر قوم کو ہم نے صحیح راستہ دکھایا ہے۔ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ((39:65 لیکن اگر خدا کے نظام کے ساتھ تم دوسروں کے وضع کردہ نظاموں کو بھی ملاؤ گے تو یہ شرک ہو جائے گا۔ کفر ہی نہیں کہ اس کو بالکل چھوڑ دو، اس میں پیوندسازی کرو، اس کے اندر اپنی طرف سے بنائے ہوئے نظام اور قانون کو بھی ساتھ ملاؤ تو یہ سارے اعمال ہی غارت ہو جائیں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ جتنا خدا کے نظام کا حصہ تم نے لے لیا، اتنا مل جائے اور باقی دوسرا غارت ہو جائے۔ شرک تو چیز ہی ایسی ہے کہ دودھ کی ایک کڑاہی کے اندر دہی کا ایک چھینٹا دیدیا جائے تو سارا دودھ پھٹ جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ پیوندسازی ہے، وہ توحید ہے۔

یا سراپا نالہ بن جا یا فغاں پیدا نہ کر

یہ ہے اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ((39:65 تو بھی خدا کے ساتھ اور کے قوانین کی اطاعت کرے گا تو تیرے تمام اعمال رائیگاں چلے جائیں گے اور وہاں سخت نقصان اٹھاؤ گے۔ اس لیے کہا ہے کہ بَلِ اللّٰہَ فَاعْبُدْ وَکُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ ((39:66 صرف اس ایک خدا کے نظام کی اطاعت کر، اس طرح تمہارے اعمال بھرپور نتائج کے حامل ہونگے اور دیکھ! پھر تیری بکری ''کنا دودھ دیندی اے'' (تمہاری بکری کتنا زیادہ دودھ دیتی ہے)۔ یہ ہے شاکرین، وہ بکری کہ جس کے تھنوں سے دودھ کے قطرے خود ٹپک رہے ہوں۔ اس ایک خدا کے قوانین کی اطاعت کر کے پھر دیکھ۔ اور آگے کہا ہے کہ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ((39:67 انہوں نے خدا کے متعلق کبھی صحیح اندازہ لگایا ہی نہیں ہے۔ یہ بڑی بات شروع ہوگئی عزیزانِ من! اسے ہم آئندہ لیں گے۔

سورۃ الزمر کی آیت 66 تک ہم آ گئے ہیں، 67ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ



450الزُّمَر

ساتواں باب: **سورۃ الزمر** (67 تا اختتام)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى
عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى
فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْۗءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَقُضِيَ
بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٦٩﴾ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا
اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ
اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧١﴾ قِيْلَ
ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۭ
حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴿٧٣﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ
لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاۗءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿٧٤﴾ وَتَرَى الْمَلٰۗىِٕكَةَ
حَاۗفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٥﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1981ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الزمر کی آیت 67 سے ہو رہا ہے: (39:67)۔

قوموں کی زندگی کی تعمیر وتخریب اور عروج وزوال کا انحصار صرف خدا کے صحیح اور غلط تصور پر مبنی ہے

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس کے آخر میں، میں نے یہ کہا تھا کہ اگلی آیت بڑی اہم آتی ہے، بڑی غور طلب ہے، بڑی عمیق ہے، بڑی عظیم ہے۔ ویسے تو قرآن کریم کی کونسی آیت ایسی نہیں ہے لیکن بعض آیات میں حقائق ذرا Concentrated (مرتکز) طریقے کے اوپر بیان کیے جاتے ہیں، اس اعتبار سے بعض آیات کے متعلق خصوصیات سے کہا کرتا ہوں کہ یہ بڑی غور طلب ہیں۔ اور یہ بڑی غور طلب چیز ہے۔

مغرب کا ایک مشہور فلاسفر ❶ ہے' اس نے کہا تھا کہ اگر آپ مجھے یہ بتادیں کہ فلاں قوم نے اپنے لیے جو معبود تجویز کیا تھا وہ کس قسم کا تھا تو میں اس قوم کی تہذیب تمدن معاشرت معیشت' ساری زندگی کے متعلق' تمہیں بتادوں گا کہ وہ کیسی ہے۔ یعنی اس تصور کی اہمیت اتنی ہے کہ افراد کا ہی نقشہ نہیں بدلتا' خدا کے تصور کے متعلق قوموں کی پوری کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ صحیح تصور ہے تو وہ زندگی صحیح خطوط پر ہوگی اور وہ تصور غلط ہوجاتا ہے تو پھر ساری زندگی غلط خطوط پر متشکل ہوجاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جو اتنی تفصیل سے' اس قدر شرح وبسط سے' صفاتِ خداوندی کا ذکر کیا ہے' تو وہ اسی لیے ہے کہ خدا کا صحیح تصور ذہنوں کے اندر قائم ہوجائے کہ یہ مسئلہ صرف نظری' تصوری' اعتقادی نہیں ہے بلکہ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے' قوموں کی ساری زندگی کا دارومدار اس پر ہے کہ خدا کا تصور کس قسم کا ہے۔

عبادت کے لفظ کا ترجمہ پرستش ہوا تو خدا کے صحیح تصور کی ضرورت ہی پیش نہ آئی

اوپر سے بات چلی آرہی تھی کہ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ((39:63۔ یہاں ایک چیز ہے۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں' جن میں نیچے یہاں ارض شامل ہے اور اوپر سماوات ہیں' میں چیز یہ ہے کہ خارجی کائنات اور انسان کی زندگی' دونوں کی جو کلیدی چیزیں ہیں' وہ خدا کے قبضے کے اندر ہیں۔ اس کے بعد یہ تھا کہ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ((39:64 ہمارے ہاں اس اعبد کا ترجمہ عبادت کرنا ہوگیا' عبادت کا ترجمہ سکڑ کر پرستش کرنا ہوا۔ کیا تم یہ کہتے ہو کہ میں نے بس یونہی خدا کو سمجھ لیا ہے کہ وہ ایک پرستش کی شے ہے۔ اس سے سارا تصور ہی باطل ہوگیا۔ پرستش ایک انفرادی چیز ہے' ہر فرد اپنے اپنے ذہن کے مطابق پرستش کر لیتا ہے۔ نام چھوڑ دیجیے کہ کسی نے برہما رکھا' کسی نے God کہا' کسی نے یزداں کہا' سب پرستش ہی کرتے ہیں۔ پرستش انسان اور خدا کے درمیان ایک Private (نجّی) تعلق کا نام ہے' متعین طور پر آپ بتا ہی نہیں سکتے کہ وہ کیا تعلق ہے' بس ایک ذہنی نظری قلبی نفسیاتی کسی قسم کا کہہ لیجیے اور پھر جب آگے بڑھے تو ایک خاص مکینکی طریقے کے اوپر آپ نے وہ پرستش کے جو اجزا ہیں ان کو ادا کرلیا' تو بس پرستش ہوگئی۔ اب جو خدا کی پرستش کا تصور ٹھہرا تو خدا کے صحیح تصور کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

قرآن حکیم کا پہلا لفظ ربوبیت عالمینی ہے۔ وہی قوم مستحق تعریف ہے جو ربوبیتِ عالمینی کا فریضہ ادا کرے یہ ایک عملی نظام کا نام ہے

یہی جو خدا کے صحیح تصور کی چیز ہے' وہ خدا کی عبودیت کی بنیاد ہے' اس کی ربوبیت عالمینی سے قرآن کریم کی پہلی آیت شروع ہوئی کہ اَلْحَمْدُ

---

❶ یہ جان لاک (1704-1632ء) کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی درج ذیل دو کتب' اس لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہیں۔

1- An Essay Concerning Human Understanding (1690)

2- Two Treatises of Government (1690), where he opposed the nation of the Divine Rights of Kings.

لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ((1:1 وہ باعثِ حمد و ستائش ہے۔ کس بات کے لیے؟ اپنی ربوبیتِ عالمینی کی وجہ سے۔ اس تصور کے ماتحت اب آگے بڑھئے450الزُّمَر تو وہی قوم وجہ مستحقِ تعریف و توصیف ہوگی جو ربوبیتِ عالمینی کا فریضہ ادا کرے گی۔ عالمگیر ربوبیتِ انسانی کرنا' ہر فرد کی نشوونما کرنا' اس کی طبعی زندگی کے لیے بھی' اس کی انسانی صفات و خصائص کے لیے بھی' پرورش دیتے ہوئے' نشوونما دیتے ہوئے' ان کو تکمیل تک پہنچانا' یہ ربوبیت ہے۔ خدا چونکہ رب العالمین ہے' اس واسطے اس کی ربوبیتِ عالمینی ہے' اس کے نام پر نظام کو قائم کر کے وہ قوم بھی آہستہ آہستہ ربوبیتِ عالمینی کے فریضے کو ادا کرے گی تو وجہ حمد و ستائش قرار پائے گی۔ آپ نے دیکھا کہ پہلے ہی تصور سے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ یہ وقت نہیں ورنہ میں آگے بتاتا کہ رحمانیت کیا ہے اور رحیمیت کیا ہے اور مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ((1:3 کیا ہے [1]۔ آگے جو بات میں نے کہی تھی وہ یہ تھی کہ اس کے بعد ہم اقرار کرتے ہیں کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ((1:3 تو اس کے متعلق تصور یہ آتا ہے کہ ہم تیری پرستش کرتے ہیں۔ اتنے عظیم اعلانات کے بعد ایک ذاتی پرائیویٹ سی بات ہے کہ ہم تیری پرستش کرتے ہیں۔ زبان کے اعتبار سے قرآنِ کریم میں جس انداز سے یہ لفظ یہ اصطلاح استعمال ہوئی ہے تو وہاں اس کے اندر پرستش کا تصور نہیں ہے' اس کے معنی محکومیت کے ہیں۔ اعلان یہ ہے کہ اس قسم کا خدا کا تصور جب ہمارے سامنے ہے تو محکومیت اسی کی ہو سکتی ہے' کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ اب محکومیت میں آپ دیکھیے یہ بات کہاں سے کہاں چلی گئی' انسان اور خدا کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام نہ رہا' یہ ایک عملی نظام کا نام آ گیا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ خدا کی محکومیت کس طرح سے اختیار کی جائے' وہ بھی اپنے طور پر ذہنی طور پہ نہیں کہ میں نے اپنے طور پہ کہہ دیا کہ میں خدا کی اطاعت کرتا ہوں' وہ لفظ پھر اطاعت آ گیا' کسی اور نے کہا میں اپنے طور پہ کرتا ہوں۔ قرآن مجید اس کو یوں چھوڑتا نہیں ہے کہ اپنے طور پہ کسی بات کا تعین کر لیں' اس نے یہ ساری بنیادی چیزوں کو خود متعین کیا ہے۔

خدا کی محکومیت سے مراد یہ ہے کہ خدا نے اپنی کتاب میں جو نظامِ حیات عطا کیا ہے اس کی پیروی کی جائے' اس میں کسی اور کے وضع کردہ قوانین نہ ہوں

اس نے کہا ہے کہ خدا کی محکومیت کے معنی ہیں کہ اس کی کتاب تمہارے لیے ضابطہء حکومت ہو۔ کہا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ((5:44 کفر اور اسلام میں خطِ امتیاز یہ ہے کہ خدا کی کتاب کے مطابق اگر حکمرانی ہے' حکمرانی خدا کی کتاب کی ہے' اس کی حاکمیت ہے' اس کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں' اس کے مطابق حکومت قائم ہوتی ہے' تو اسلام ہے' جو ایسا نہیں کرتے وہ مسلم نہیں کافر ہیں۔ اب خدا کی عبودیت کے معنی ہو گئے خدا کی کتاب کی حاکمیت۔ بات متعین ہو گئی۔ شرک کے معنی ہو گئے کہ اس کے

---

[1] ان تصورات کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ الفاتحۃ (مدیر پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق)' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007ء' ص ص۔105 تا137۔

ساتھ انہی صفات کو لیے ہوئے اور قوانین ملا لینا۔ کفر تو یہ ہے کہ اس سے انکار ہی کر دینا۔ شرک یہ ہے کہ کچھ وہاں سے لیے' کچھ اپنے 450 الزُّمَر
بنائے۔ اور اگر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو وہ خصوصیت دیدی جائے جو خدا نے اپنے قوانین کے متعلق رکھی ہے' تو یہ شرک ہو گیا۔ یہ ان قوانین کو یا ان قوانین کے وضع کرنے والوں کو الوہیت کے مقام پہ ہم نے بٹھا دیا۔ کیا خصوصیات اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں اپنے قوانین کی! کہا ہے کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ((6:115 ابدی طور پر قانون جس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ کسی انسان کا' انسانوں کی جماعت کا بنایا ہوا کوئی قانون' جس کے متعلق سمجھ لیا جائے کہ اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی' یہ اسے الوہیت کا مقام دیدینا ہے۔ یہ خدا کے کلام کے' خدا کی کتاب کے' مثل قرار دیدینا ہے۔ اور اس نے تو ساری دنیا کو چیلنج دیا ہے کہ ساری دنیا اکٹھی ہو جائے تو بھی قرآن حمید کی مثل نہیں بنا سکتی۔ اور جونہی ہم نے انسانوں کے بنائے ہوئے کسی ضابطہ قانون کو یہ خصوصیت دیدی کہ مکمل ہے اور ابدیت ہے اور غیر متبدل ہے تو یہ تو قوانین خداوندی کے مثل ہو گیا' یہ تو قرآن حمید کی مثل ہو گیا۔ اسی لیے اس نے تاکید کر دی کہ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ((39:65 اور تو اور اگر تُو بھی' اے رسول! خدا کے ساتھ کسی اور کی محکومیت کرے گا تو تیرے تمام اعمال رائگاں چلے جائیں گے اور تُو سخت نقصان اٹھائے گا۔ اسی لیے کہا کہ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ) (29:66 تو صرف ایک خدا کے قوانین کی اطاعت کر۔ اس طرح تیرے اعمال بھرپور نتائج کے حامل ہونگے یوں محکومیت صرف اس کی اختیار کرنی ہے۔ یہ ہوگی شکر گزاری۔

خدا تعالیٰ کی ذات صرف اس کی صفات سے ہی جانی جا سکتی ہے اور بس! محدود ذہن غیر محدود کا تصور نہیں کر سکتا

صرف ایک کتاب اللہ کی محکومیت کا یہ تصور سارے قرآن کریم میں آپ کو ملے گا' یہی خدا پر ایمان ہے اور یہی خدا کی عبودیت ہے۔ خدا کا جو تصور ہے' ذاتِ باری تعالیٰ کا جو تصور ہے' وہ تو ناممکن ہے کہ ذہنِ انسانی میں آ جائے۔ یہ تو خدا کے متعلق ہے۔ کوئی چیز جو محدود ہو' جسے Finite کہتے ہیں' وہ Infinite (لامحدود) کا تصور کر ہی نہیں سکتی' وہ اس کے احاطہ میں آ ہی نہیں سکتی۔ ذرا ذہن پہ زور دیجیے گا کہ اگر میں مثال سے سمجھاؤں کہ کیسے نہیں آ سکتی۔ خدا ابتدا سے ہے' ابتدا کا تصور ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا' جب بھی ہم ذہن میں وقت کا کچھ تصور کریں گے تو ہم کسی خاص وقت سے بات شروع کریں گے' اس خاص وقت سے پیچھے یا اس سے پہلے کا تصور ہمارے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہ Infinite (لامحدود) ہے۔ ہمارا ذہن تو جو Finite (محدود) چیزیں ہیں' ان کا تصور کر سکتا ہے اور وہ محسوس

ہوتی ہیں۔ یہ جو محسوس کائنات ہے' اس کے اندر جو چیزیں ہیں' وہ محدود ہوتی ہیں' ان کا تصور کرتے ہیں' Infinite (لامحدود) کا تصور نہیں 450 الزُّمَر کر سکتے اور خدا جو اپنی ہر صفت میں Infinite (لامحدود) ہے اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ یہ سارا کچھ کہتے ہوئے فرمایا کہ خدا کی ذات تک کا تصور آپ نہیں کر سکتے: سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ((23:91 جو کچھ بھی اس کے متعلق تم کہو گے' وہ اس سے بلند اور اس سے بالا ہے' وہ اس لیے کہ جو کچھ تم کہو گے' وہ Finite (محدود) ذہن کا پیدا کردہ ہو گا' Infinite (لامحدود) تو اس سے دور ہوتا ہے اس سے ماورا ہوتا ہے' تو ذاتِ خداوندی کے متعلق آپ تصور تک بھی نہیں کر سکتے۔

انسانی حد تک خدا تعالیٰ کی ذات کا اندازہ لگانے کے لیے قرآنِ حکیم نے قدر یا اقدار کا خارجی پیمانہ بتایا ہے جو اس کی ذات کی صفات ہیں

اب آپ اس آیت پر آیئے۔ کیا بات ہے قرآن حکیم کی! کیا الفاظ ہیں! کہا ہے کہ وَ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖ)(39:67۔ یہ ''قدر'' کا لفظ اس نے استعمال کیا ہے' اس کے معنی کچھ اندازہ لگانا کے ہیں' ذہن انسانی کچھ اندازہ لگا سکتا ہے۔ بات ساری اندازے کی ہو گئی کہ خدا کے متعلق اندازہ کیا ہے۔ ایک اندازہ تو وہ ہے کہ جو کچھ اس نے اپنی صفات قرآن حکیم میں بیان کی ہیں' ہم اپنے محدود ذہن کے مطابق اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایک یہ ہوا۔

عزیزانِ من! یہ اب دو قسم کی چیزیں ہو گئیں' ایک اس کے متعلق صحیح اندازہ لگانا' ایک غلط اندازہ بھی لگانا۔ اب صحیح اندازہ کس طرح سے لگتا ہے؟ جو کچھ اس نے خود اپنے متعلق کہا ہے' اس کو سمجھ لیا جائے تو اس کے متعلق صحیح اندازہ ہو گیا' اگر اس کے مطابق نہیں ہے تو یہ غلط اندازہ ہو گیا۔ اب اس نے یہ کہا ہے کہ خدا کے متعلق یہ لوگ صحیح اندازہ بھی نہیں لگا سکتے' یہ صرف اپنے طور پر ہی اندازہ لگا رہے تھے یعنی ذہن انسانی خود ہی اندازہ لگا رہا تھا جبکہ خدا کے متعلق یہ اندازہ لگا ہی نہیں سکتا۔ دراصل اندازہ پیمانے کو کہتے ہیں جس کے لیے کوئی Measurement (پیمائش) کرنے کا خارجی معیار ہونا چاہیے جس کے مطابق کوئی چیز ماپی جائے گی۔ خارجی معیار یہ ہے کہ یہ اتنے گز ہے' آپ کے ذہن نے یہ بات نہیں کی' گز تو باہر کا ایک معیار ہے جو بتاتا ہے کہ یہ اتنے میل ہو گیا' وہ ایک خارجی معیار ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو خود اپنے متعلق اندازہ کرنے کا خارجی معیار بتایا ہے' وہ قرآن حمید میں اس کی دی ہوئی صفات ہیں۔ کہا ہے کہ انہوں نے اس کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔ یہ کون تھے جنہوں نے صحیح اندازہ نہیں لگایا؟ یہاں سے بات ایک اور طرف چلی گئی۔

قرآنِ حکیم کی اصطلاحات کے مفہوم کو بدل دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے کا پورا دین ہی مذہب میں تبدیل ہو گیا' یہ ضابطۂ اقدار وقوانین نہ رہا 450الزُّمَرْ

میں نے شروع میں کہا تھا کہ قرآنِ کریم کے الفاظ اور اس کی جو اصطلاحات ہیں' ان کے تراجم' ان کے مفاہیم' ان کی تفسیریں' جب یہ سب غلط پٹڑی پہ پڑی ہیں تو اس وقت سے خدا کا دین مذہب بنا ہے اور اسی زمانے میں یہ سب چیزیں وضع ہوئیں۔ جیسا میں نے یہاں عرض کیا ہے کہ عبادت کا مفہوم پرستش ہوا' خدا کا جو صحیح اندازہ ہے' وہ باطل ہو گیا کیونکہ وہ تو محکومیت تھی' محکومیت کے لیے ایک محسوس شے کی ضرورت تھی' محسوس شے وہ قرآن حمید ہے جو اس نے دیا ہے۔ اور آگے آیئے۔ یہ تو ہمارے ہاں مذہب کی دنیا ہے' اسلام مذہب نہیں ہے' یہ تو دین ہے' دین ایک نظام کا نام ہے جس کے لیے Constitution (آئین)' ایک ضابطہء اقدار' ایک ضابطہء احکام' ہونا چاہیے۔ دین میں تو یہ بات ہو گئی۔

مذہب کے بعد اہلِ طریقت کے ہاں معرفت کے مقام کی نوعیت جس کی قرآنِ کریم میں کوئی تائید نہیں ملتی

اور آگے بڑھے' ہمارے ہاں یہ اہلِ طریقت آئے' انہوں نے ایک اور اصطلاح وضع کی جس کا ذکر ہی قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے اور وہ ہے خدا کی معرفت یعنی اس کو پہچان لینا۔ یا اللہ! وہ کہتا ہے کہ تم خدا کا صحیح اندازہ ہی نہیں لگا سکتے' یہ اس کے لیے کہیں سے معرفت کا لفظ لے آئے جبکہ خدا نے کہیں بھی عرفان کا تقاضا ہی نہیں کیا ہے' تقاضا صرف ایمان کا ہے۔ سارے قرآن مجید میں خدا کے لیے یہ لفظ بھی نہیں آیا۔ اور ہمارے ہاں جو دین کا مغز ہے' اس کے لیے رومیؒ (560-638/1165-1240A.Dھ) کے یہ الفاظ ہیں:

ماز قرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

قرآن کا مغز ہم نے لے لیا ہے' یہ باقی جو کچھ الفاظ وغیرہ سے کرتے ہو (توبہ معاذ اللہ) یہ ہڈیاں ہیں' جو ہم نے کتوں کے آگے پھینک دی ہیں۔ یہ معرفتِ خداوندی کا دعویٰ کیا ہے۔ تو معرفت تو جاننے پہچاننے والی بات ہے۔ جی تا کہ اس کا تعارف ہو جائے' یہ اس کی معرفت حاصل کر لینا' اس کا عرفان حاصل کر لینا ہے۔ اور پھر آگے اس کی معرفت کی تفاصیل ان کے ہاں دیکھیے تو ایسا نظر آتا ہے جیسے یہ اللہ میاں کے ساتھ اکٹھے کھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر روز رات اس کے ہاں ہیں اور پھر ایسی بے تکلفی کے ساتھ اس کے ہاں جو باتیں ہوتی ہیں' مذاق ہوتے ہیں' یہ ہے معرفتِ خداوندی جس کے احکام میں جا کر وہ تبدیلیاں کرا لیتے ہیں' لوگوں کی عرضیاں اور درخواستیں پیش کی جاتی ہیں' تقدیرات پہلے سے وہاں سے معلوم کر کے آ جاتے ہیں۔ یہ خدا کی معرفت اور عرفان ہے مگر وہ کہتا ہے کہ تم ایک لامحدود کا صحیح تصور بھی قائم نہیں کر سکتے۔ کہا ہے کہ وَمَا

قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ❶ (39:67)۔اور یہ انہیں اپنے ہاں معرفت تک لے گئے۔عزیزانِ من! یہ ساری چیزیں خلافِ قرآن کریم ہیں450الزُّمَرْ نہیں غیر قرآنی کہہ لیجیے'خارج از قرآن کریم کہہ لیجیے' قرآن کریم سے آپ کو ان چیزوں کی کوئی تائید نہیں مل سکتی۔

خارجی کائنات اور انسانی دنیا میں قوانین خداوندی کی ثنویت کیوں؟

مذہب میں تو ہم نے انسانوں کی دنیا کے اندر اختیار' اقتدار اور اس کے قوانین' تسلیم کیے۔ساری سائنس اس پر چلتی ہے کہ خارجی کائنات میں غیر متبدل قوانین (Unchangeable Laws) کارفرما ہیں۔یہ وہی لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ((15 ہے جو قرآن کریم نے کہا تھا۔وہاں وہ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین کو مانتے ہیں لیکن انسانوں کی دنیا کے اندر اس قسم کے قوانین نہیں مانتے ہیں۔پہلے بات تھی تو ملوکیت کی تھی کہ ایک فرد جو قانون نافذ کردے' اس کی اطاعت فرض ہے' یہ آمریت آئی۔آہستہ آہستہ آپ جمہوریت پہ آ گئے۔وہ بھی تو انسانوں کے وضع کردہ قوانین ہوتے ہیں' ایک انسان کے نہیں' انسانوں کے ایک گروہ کے وضع کردہ۔تو خدا کا اقتدار' اس کی حاکمیت' انسانوں کی دنیا میں نہیں' خارجی کائنات میں ہے یعنی سما میں تو ہے' ارض میں نہیں ہے۔اُس نے کہا تھا کہ صحیح تصور یہ ہے کہ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ((39:63۔اب یہ جو نکتہ ہے اسی کی ساری تفسیر ہے جو آگے آ رہی ہے' جو کہا ہے کہ انہوں نے خدا کا صحیح اندازہ نہیں لگایا تو وہ یہ چیز ہے کہ سما کی دنیا کے اندر' خارجی کائنات کے اندر' تو قوانین خداوندی کی کارفرمائی کو مانتے ہیں' انسانوں کی دنیا کے اندر وہ کہتے ہیں کہ نہیں' یہاں ہمارے بنائے ہوئے قوانین چلیں گے' وہاں کا الٰہ الگ ہوگا' یہاں کا الٰہ الگ ہوگا۔

جو خدا کا صحیح اندازہ ہے' وہ کیا ہے؟ ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ انہوں نے یہ دو دنیائیں الگ الگ کردیں: (1) خارجی کائنات' جس کو وہ سما یا سماوات کہتا ہے' اس میں تو اقتدار خدا کے قوانین کا ہوا' (2) انسانوں کی' ارض کی دنیا میں' خدا کے قوانین کا نہیں۔اس کو سما میں الٰہ مانتے ہو تو یہ اتنی سی بات کافی نہیں ہے' سنو! ارض میں بھی وہی الٰہ ہے۔ارض تو انسانوں کی دنیا کا نام ہے۔یہ انسانوں کی دنیا میں' اس کی الوہیت یا اس کا الٰہ ہوتا ہے۔الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں' معبود کے نہیں ہیں ورنہ اگر عبد یا عبادت کے معنی محکومیت کے نہ لیے جائیں تو پھر تو معبود ہو جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

---

❶ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا کے متعلق صحیح صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا اور سمجھا ہی نہیں کہ اُس کا مقام کیا ہے ((6:92;22:75۔(اسی لیے یہ سمجھتے ہیں کہ خارجی کائنات میں تو خدا کا قانون کارفرما رہنا چاہیے لیکن انسانی معاشرہ' ان کے خودساختہ قوانین کے مطابق متشکل ہونا چاہیے۔یہی وہ عملی شرک ہے)۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔1084 تا1085)

خدا کا صحیح تصور یہ ہے کہ خارجی کائنات میں اور ارض یعنی انسانی دنیا میں صرف اور صرف خدا کا قانون رائج ہے مگر انسان تو ہر گھڑی اپنی آستیں میں ایک نیا خدا رکھتا ہے 450الزُّمَرْ

الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں۔ جس طرح خارجی کائنات کے اندر تم دیکھتے ہو کہ ایسے قوانین ہیں جو انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں' ان چیزوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں' کہیں خارج سے خدا کے قوانین ہی اس کے اوپر مسلط ہیں اور پھر وہ غیر متبدل ہیں جن کی بنیاد پر یہ نظام کائنات چل رہا ہے۔ اس میں کارفرما جو قوانین ہیں' وہ غیر متبدل (Unchangeable, Immutable) ہیں۔ اگر کوئی قانون' جسے سیکنڈ کا کروڑواں حصہ کہتے ہیں' بدل جائے تو یہ سارا سلسلہء کائنات تہس نہس ہوجائے۔ قرآن حمید نے کہا ہے کہ اگر کہیں اس طرح سے دو الٰہ ہوجائیں تو لَفَسَدَتَا ((21:22 یہ جو ساری کائنات ہے' یہ تہس نہس ہوکر رہ جاتی۔ خالص قوانین' میں نے عرض کیا کہ ہم انہیں قوانینِ خداوندی کہتے ہیں' وہ فطرت کے قوانین کہیں لیکن قوانین کا ضابطہ تو تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ وَهُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ o وَتَبٰرَكَ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ((43:84-85۔ یہ ہے خدا کا صحیح تصور۔ یہ جو کائنات کے اندر الگ الگ الٰہ ہیں' خارج کی دنیا کے الٰہ الگ اور انسانوں کی دنیا کے الٰہ الگ' وہ کہتا ہے کہ کیا ان لوگوں نے جو خارجی دنیا میں تو قانون کا اقتدار مانتے ہیں اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ((21:21 تو ارض کے اندر یہ کوئی اور اربابِ اقتدار مانتے ہیں۔ کہا ہے کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ((21:22 خارجی کائنات میں بھی اگر ایک سے زیادہ الٰہ ہوتے' ایک سے زیادہ قانون چلانے والی ہستیاں' صاحبِ اقتدار ہوتیں' تو وہ تہس نہس ہوجاتا اور کہا ہے کہ جب تم یہ سمجھو گے خارجی کائنات کا الٰہ اور ہے' تمہاری زندگی کا الٰہ اور ہے' تو یہاں بھی فساد پیدا ہوجائے گا۔

عزیزانِ من! یہ ساری دنیا میں جو اس وقت فساد پیدا ہو رہا ہے وہ اس ثنویت (Dualism) کا نتیجہ ہے کہ خارجی کائنات میں تو یہ سارے ایک غیر متبدل ضابطہء قانون کی کارفرمائی کو مانتے ہیں' انسانوں کی دنیا کے اندر اس کے قوانین کی کارفرمائی نہیں مانتے' یہاں انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے قوانین کی کارفرمائی ہے' وہ تو پوچھو نہیں کہ پھر کتنے الٰہ ہوگئے۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر

(ہماری فکر ہر لحظہ ایک نیا الٰہ تراشتی ہے)۔ یوں کہو کہ انسانی فکر تو ہر آن ایک نیا الٰہ تراشتی ہے۔

رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

(جب وہ ایک بند (قید) سے نکلتی ہے تو کوئی اور بند میں گرفتار ہوجاتی ہے) یعنی ایک خدا کی خدائی کی رسی تڑا کر کہیں باہر آئے تو دوسرے

کی رسیاں اپنے گلے میں ڈالیں۔ کہتا ہے کہ ان کی تو کیفیت یہ ہے' یہاں ہی نہیں جسے کعبہ یا بیت اللہ کہتے ہیں' وہاں بھی ان کی حالت یہ ہے کہ اسمیں طواف تو ہو رہا ہوتا ہے۔ 450 الزُّمَرْ

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را

(اے حرم کے پیر! اقبال کو کعبہ میں داخل نہ ہونے دے)۔

ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

(وہ تو ہر گھڑی اپنی آستیں میں ایک نیا خدا رکھتا ہے)۔ ''ایتھے لکائے ہوئے نیں اینیں بہت سارے خدا'' (اس نے تو یہاں بہت سارے خدا بنا رکھے ہیں) کیا بات ہے اس کی' طواف کعبہ میں بھی اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ وہاں بھی اپنے خدا اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے۔

دنیا بھر کی مشکلات کا حل صرف اس میں ہے کہ انسان کرۂ ارض پر بھی خدا کی Writ (حکم نامے) کو تسلیم کرے

کہا ہے کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (21:22) اگر کائنات میں' خدا کے علاوہ اور الٰہ بھی ہوں یعنی اس کے ایک الگ گوشے میں خدا کے قوانین نافذ ہوں اور دوسرے گوشے میں کسی اور کے تو کائنات کا سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے۔ عزیزانِ من! اس وقت ساری دنیا چیخ رہی ہے' دنیا میں فساد برپا ہے' انسانیت جہنم میں جھلس رہی ہے۔ اس کے اسباب معلوم کرنے کے لیے انکوائری کمیٹیاں بٹھائی جاتی ہیں' غیر مسلموں کے ہاں تو اپنے طور پہ رہے' خود ہمارے ہاں بھی تو بٹھائی جاتی ہیں۔ اور اس نے پہلے ہی دن یہ بتا دیا تھا کہ یہ جو فساد ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک صاحبِ اقتدار کی حکومت نہیں ہے۔ دنیا کس طرح سے اب اپنے ذہن میں محسوس کر رہی ہے بلکہ چیخ رہی ہے کہ ساری دنیا کے اندر ایک ہی صاحبِ اقتدار ہونا چاہیے۔ آپ حیران ہونگے کہ ہمارے مسلمانوں کے ممالک سے نہیں' مغرب کے دانشور ساری زندگی بھر کی فکر کے بعد' اس نتیجے پہ اب پہنچے ہیں کہ ساری دنیا میں اسی طرح غیر متبدل ضابطہء قانون ہونا چاہیے جس طرح سے کائنات کے اندر کار فرما ہے۔ میرے ذہن میں ہے' میرا ارادہ ہے کہ اس دفعہ عید میلاد النبی ﷺ کی تقریب سعید جو آ رہی ہے' اس پہ میں یہی موضوع رکھوں کہ دانشورانِ مغرب اپنی عمر بھر کے تفکر اور تجربے کے بعد اس نتیجہ پہ پہنچے ہیں کہ پوری دنیا کے اندر جب تک ایک ضابطہء قوانین نافذ نہیں ہو جاتا فساد مٹ نہیں سکتا۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا [1] (21:22) اُس نے پہلے یہ بتا دیا تھا

---

[1] اگر کائنات میں' خدا کے علاوہ اور الٰہ بھی ہوں یعنی اس کے ایک گوشے میں خدا کے قوانین نافذ ہوں اور دوسرے گوشے میں کسی اور کے تو کائنات کا سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 731)۔

کہ فساد کا موجب تو یہ ہے جو ایک سے زیادہ الٰہ تم نے مان رکھے ہیں۔ پھر وہ الٰہ کس قسم کا ہو' صاحبِ اقتدار کس قسم کا ہو' کیا بات ہے! میں 450 الزُّمَر یہاں عرض کروں کہ کوئی بھی نکتہ لیجیے' 'کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست' آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ Sovereignty (اقتدارِ مطلق) کا آپ کو پتہ ہے کہ یہاں Definition (تعریف) کیا ہے؟ یہ وہ Sovereign Power ہو یعنی جس کے اوپر کوئی اور Power نہ ہو' وہ آخری اقتدار ہو' یہ ہے اس کی Definition (تعریف) کہ وہ Accountability to None (کسی کے سامنے جوابدہ نہ) ہو۔ یہ اس کے ڈکشنری کے Meaning (معنی) ہوتے ہیں' وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک الٰہ کی بنیادی خصوصیت

کہا ہے کہ یاد رکھو! یہ جو ہم نے کہا ہے کہ وہ الٰہ وہی ہوگا' اس الٰہ کے متعلق یہ ذہن میں رکھو کہ اس کی خصوصیات کیا ہوں گی۔ یہ کہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ ((21:23 اپنے ذہن کے اندر کتنا ہی بڑے سے بڑا انسان ہی کیوں نہ رکھ لو' کسی کے سامنے اس کو Accountable (جوابدہ) ہونا پڑے گا۔ Sovereignty Belongs to God (اقتدارِ اعلیٰ خدا کا ہے) کے معنی یہ ہیں کہ الٰہ حقیقی وہ ہے' وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہے۔ اگر ہم یہاں یہ Sovereignty[1] (اقتدارِ مطلق) اس کے سوا کسی اور کو تفویض کر دیتے ہیں تو یہ سب سے بڑا شرک ہے۔ خدا بھی Sovereign (اقتدار اعلیٰ کا مالک)' انسان بھی Sovereign (اقتدارِ اعلیٰ کا مالک) تو یہ ہے سب سے بڑا شرک۔ کہا ہے کہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ ((21:23۔ یہ چار لفظوں کی آیت ہے' عزیزانِ من! آپ دیکھیے تو سہی کتنے کتنے اہم مسائل قرآن حکیم چند لفظوں کے اندر حل کر کے چلا جاتا ہے' اس نے سارا نظامِ حکومت بیان کر دیا۔ الگ الگ الٰہ نہیں ہونگے' ایک الٰہ کی حکومت اور وہ الٰہ ہوگا کہ جس کو انتہائی قوت جسے آپ مطلق اقتدار (Sovereignty) کہتے ہیں' وہ اس کو حاصل ہوگی وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ ((21:23 ھم میں ساری دنیا آ جاتی ہے' باقی کوئی بھی ہو وہ Accountable (جوابدہ) ہونگے۔ اگر ان کا کوئی ایکشن' کوئی فیصلہ' کوئی قول' اس کے خلاف چلا جائے گا تو گرفت ہو جائے گی۔

خدا تعالیٰ اپنی ذات کو نظریاتی طور پر پیش کرنے کی بجائے انسانی زندگی کے لیے بطور ضابطہءِ قوانین پیش کرتا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ اس نے اس چیز کو نظری اور تصوراتی نہیں رکھا کہ ہم ذہن میں خدا کا تصور رکھ لیں۔ اس نے محسوس شکل میں اپنا ضابطہءِ قوانین ہمیں دیا ہے۔ اب معیار وہ ہے تو اس خدا کے ضابطہ قوانین کو (Sovereignty) (قوتِ مطلق) حاصل ہوگی' اس

---

[1] Sovereignty کی تعریف (Definition) یوں کی گئی ہے:

The power to do all things without accountability. (Ref. Quoted by Jacques Maritain in "Man and the State" p. 51).

کوئی ایسا نہیں ہوگا جس کے لیے 450 الزُّمَر کے سوا دنیا میں کوئی اور ایسا نہیں ہوگا' ایک فرد ہو یا افراد کی جماعت ہو' گروہ ہو یا جمہوریت' کچھ بھی ہو' کوئی ایسا نہیں ہوگا جس کے لیے جائے کہ وہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ ((21:23 ہے کہ وہ جوابدہ نہیں ہے' وہ Sovereign Power (قوتِ مطلق) رکھتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ جب اس نے یہ کہا ہے کہ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ)(39:67 یہ جو ارض کے اندر اور الٰہ تجویز کرتے ہیں' انہوں نے خدا کی الوہیت کا صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔

خدا تعالیٰ کی تخلیق کردہ کائنات ایک مدت تک کے لیے ہی ہے' خود سائنسدان بھی آہستہ آہستہ اس پر پہنچ رہے ہیں

اب آگے آیات آتی ہیں جو میں نے عرض کیا تھا کہ وہ بڑی غور طلب ہیں اور ان میں گہرے غور و تفکر کی ضرورت ہے۔ قرآنِ کریم میں بیشتر مقامات پر ایسی آیات آتی ہیں جن سے یوں نظر آتا ہے جیسے یہ سلسلۂ کائنات کسی وقت درہم برہم ہو جائے گا' ٹکرائے گا۔ یہ صحیح ہے۔ یہ کچھ ہوگا۔ یہ ساری کائنات خدا کی مخلوق ہے' اسے ابدیت تو حاصل نہیں ہے یہ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ❶ (39:5) ہے۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ ہم نے اسے ایک مدتِ معلوم تک چلنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ ایک دن تو اس سلسلۂ کائنات نے بہرحال ختم ہونا ہے۔ آج کا میرا موضوع نہیں ہے ورنہ میں عرض کردوں خود سائنٹسٹ آہستہ آہستہ اس چیز پہ پہنچ رہے ہیں۔ وہ تو ایک سورج کی حرارت جس انداز سے' جس تیزی سے' ختم ہو رہی ہے' اس کے متعلق گنتے ہیں' گن کر حساب کر کے بتا دیتے ہیں کہ ایک دن اس نے ٹھنڈا ہو جانا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس قسم کی آیات ہیں جن میں یہ چیز بھی آتی ہے۔ ٹھیک ہے اگر ان کا مفہوم یہی ہے' ہمارا اس پہ بھی ایمان ہے لیکن ہر مقام پہ ان کا یہ مفہوم نہیں ہے۔

لفظ قیامت کا مروجہ اور لغوی مفہوم اور ظہورِ نتائج کے وقت کو بھی قیامت کہا گیا ہے

پھر یہ چیز ہمارے مذہب کی دنیا میں آ گئی ہے کہ جو بات بھی یہاں کی جائے' اس کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ قیامت میں ایسا کچھ ہوگا' وہ کہیں گے کہ جو قومیں اس نظام کے خلاف چلتی ہیں' ہم ان کو عذابِ الیم میں مبتلا کریں گے تو ہم کہیں گے یہ قیامت میں جہنم میں جائیں گی۔ یہ ہے اس سے مراد۔ قرآن حکیم عذابِ خداوندی کو یہاں کی تباہی بتاتا ہے' اگر آپ وہ تباہی تصور کر لیں یا اس کے معنی یہ کر لیں' تو بات آپ کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اور پھر وہ یہ جو تمام اقوامِ سابقہ کی داستانیں بیان کرتا ہے' وہ عاد کی' ثمود کی' لوطؑ کی' حضرت ابراہیمؑ کے بعد کی' یہ تمام اقوام' ان کی تباہیاں' وہ کہتا ہے کہ جاؤ تاریخ کے نوشتوں کو پڑھو' جاؤ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی

---

❶ ایک مدتِ معینہ کے لیے ہے۔

450 الزُّمَر اینٹوں پہ دیکھو کہ ان کے عذاب کی داستانوں کا کیا لکھا ہے۔ ہم نے عذاب کا تصور بھی وہاں آخرت میں رکھ لیا ہے۔ وہ یہاں اینٹیں دکھا رہا ہے‘ ہم کہہ رہے ہیں کہ قیامت کے بعد کے جہنم کے عذاب کا ذکر ہو رہا ہے۔ اُس عذاب پر ہمارا ایمان ہے‘ آخرت کی زندگی پر ایمان کے بغیر تو مسلمان ہی نہیں ہوسکتا لیکن یہ جو چیزیں ہیں‘ یہ جوالہٰ فی الارض ہے‘ یہ چیزیں اس کے متعلق ہیں۔ اس ضمن میں جو آیات اس قسم کی آئیں گی جن کے عام معنی کے اعتبار سے ذہن اس کائنات کے اس آخری نقشے کی طرف جائے گا جہاں یہ ٹکرائیں گے‘ پاش پاش ہوجائیں گے‘ وہ بھی تصور آپ کر سکتے ہیں۔ جہاں یہ کہا جائے گا کہیں عذاب کا ذکر‘ عذابِ جہنم بھی ہوگا‘ وہ بھی ٹھیک ہے‘ جنت کہا جائے گا‘ وہ آخری جنت بھی ہوگی لیکن یہی مفہوم نہیں ہوگا۔

یاد رکھیے! اس دنیا کے ساتھ جو تعلق ہے‘ اس کا وہ بھی مفہوم اس کے ساتھ ہوگا۔ چونکہ اوپر سے ارض وسماوات کے اندر خدا کے اقتدار کی ساری بات چلی آ رہی تھی تو میں نے اپنی بصیرت کے مطابق ان آیات کو سمجھا ہے وہ یہی ہے کہ وہ نقشہ یہ بتا رہا ہے کہ جسے توحید کہا جائے گا‘ جسے ایک خدا کے قانون کی کارفرمائی کہا جائے گا‘ اس نظام میں خارجی کائنات میں جس طرح سے خدا کے قوانین کارفرما ہیں‘ اسی طرح انسانوں کی دنیا میں جب وہ کارفرما ہونگے تو اس نقشے کا نام اس نے اَلْقِیٰمَةِ رکھا ہے۔ ابھی میں عرض کرتا ہوں کہ خود اس کے معنی کیا ہیں۔ وہ مرنے کے بعد کی جو قیامت ہے اس کے متعلق سن لیجیے کہ اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن حکیم میں ہر جگہ وہی مراد نہیں ہے۔ خود جو لفظ قیامت ہے‘ یہ تو قام سے ہے‘ اٹھ کھڑے ہونا‘ اور یہ جو اس کے آخر میں ’’ۃ‘‘ لگی ہوئی ہے‘ عربی زبان میں کوئی بات جو یکلخت ہوجائے‘ یہ اس کے لیے آتی ہے۔ اس طرح یہ ہے ’’ظہورِ نتائج کی گھڑی۔‘‘

لفظ شرک کے علاوہ توحید کا بنیادی مفہوم: ارض وسما میں خدا ہی کے قوانین کی کارفرمائی

وہ آیت ابھی آتی ہے۔ کہا ہے کہ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ((39:67 خدا کا جو صحیح اندازہ ہے‘ وہ تمہیں اس وقت لگ سکے گا جب تمہاری اس دنیا کا یہ نقشہ [1] ہوگا کہ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِہٖ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ((39:67۔ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ غلط اندازہ ہے‘ غلط اندازہ تو یہ ہے کہ ’’سماوات میں جتنی قوتیں کارفرما ہیں‘ وہ تو خدا

---

[1] یہ قرآن کے انقلابی دور میں ہوگا۔ مرنے کے بعد کی زندگی‘ قیامت‘ جنت‘ جہنم ایسی حقیقتیں ہیں جن پر ہمارا ایمان ہے اس ایمان کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا لیکن قرآنِ کریم بھی بتاتا ہے کہ مکافاتِ عمل کی ابتدا اسی دنیا سے ہوجاتی ہے۔ اور جو معاشرہ خدا کے قوانین کے مطابق متشکل ہو‘ اس کا نقشہ اُسی قسم کا ہوتا ہے جیسا مرنے کے بعد کی زندگی کا۔ یعنی ہر بات کا فیصلہ عدل کے مطابق۔ ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ۔ اعمالِ حسنہ کے خوشگوار نتائج۔ غلط اعمال کے تباہ کن عواقب۔ اس حقیقت کے پیش نظر آیت ((39:67 سے آخر سورت تک جو کچھ کہا گیا ہے اُس سے اِس دنیا میں قرآنی انقلاب بھی مراد لیا جاسکتا ہے اور مرنے کے بعد کی قیامت بھی۔ ہم نے اول الذکر مفہوم لیا ہے بالخصوص اس لیے کہ آپ ((39:74 میں وراثتِ ارض کا ذکر ہے اِس سے اِس دنیا کی فتوحات مراد لینا زیادہ صحیح ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔ 1085)۔

کے قبضے میں ہیں' یہ انسان کی جوارضی زندگی ہے یہ اس کے قبضے میں نہیں ہے۔ یہاں انسان جس طرح سے جی چاہے خود اپنا اقتدار 450 الزُّمَر قائم کرے' اپنا نظام قائم کرے۔ کہا یہ ہے کہ یہ شرک ہے۔ توحید وہ ہے کہ جس میں' سمجھانے کے لیے جیسے کہتے ہیں کہ اس کے دائیں ہاتھ میں سماوات ہوگی اور بائیں ہاتھ میں ارض ہوگی اور اس طرح سے یہ نظامِ توحید قائم ہوگا۔ جب دونوں سلسلے اس کے قبضے کے اندر ہونگے' جب اس کی حاکمیت سماوات میں بھی اور ارض میں بھی چلے گی جب یہ نقشہ ہوگا تو توحید ہوگی۔'' آپ نے غور فرمایا جو قرآن مجید نے کہا ہے کہ توحید یہ ہوگی کیونکہ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِكُوۡنَ((39:67 شرک یہ ہے کہ خارجی کائنات میں اور اللہ مانتے ہو' اپنی انسانی دنیا میں اور اللہ مانتے ہو۔ یہ شرک ہے۔ وہ دنیا اور یہ دنیا' جب دونوں اس کے قبضہءقدرت میں ہونگے' اس کا نام توحید ہوگا۔

طبقاتی تقسیم کے نتائج کے متعلق نبی اکرم ﷺ کی ایک پیش کردہ محسوس مثال

اب یہاں یہ چیز ہے جس کو یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ (39:67) کہا گیا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جب میں انہیں قرآن کریم میں بصیرت سے دیکھتا ہوں' تو آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس تصور سے روح پر کپکپی طاری ہوجاتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اس کے متعلق بھی اس زمانے میں چودہ سو سال پہلے' اس وقت جب ابھی یہ جو امیر اور غریب کے درمیان کی خلیج ہے' وہ اتنی زیادہ نہ تو گہری تھی' نہ اتنی زیادہ چوڑی تھی' طبقے تو موجود تھے لیکن یہ عالمگیر احساس نہیں تھا' اس طبقے کو جو پستی میں رکھا ہوا تھا' اس کو یہ سمجھایا گیا تھا کہ جن کے ہاتھ میں قوت ہے' ان کو حق حاصل ہے کہ تم سے یہ کام لیں' مذہب کی دنیا میں ان سے کہا گیا تھا کہ یہ خدا کی مشیت ہے کہ تمہیں جیسے چاہے وہ رکھے' تمہیں اس کے اوپر قناعت کرنی چاہیے' راضی برضا رہنا چاہیے۔ وہاں اسلام میں یہ بات نہیں تھی۔ نیچے والوں کا یہ احساس بیدار نہیں ہوا تھا کہ ان کو کیا حق حاصل ہے کہ یہ ہمارے اوپر مسلط ہوئے ہیں اور رزق کے سارے چشمے انہوں نے اپنے قبضے میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں ابھی یہ احساس عالمگیر نہیں تھا۔ عزیزانِ من! حضور نبی اکرم ﷺ کی یہ بصیرت نبوی ہے' ایک مثال میں حضور ﷺ نے سمجھادیا کہ اگر تم نے یہ سلسلہ قائم رکھا تو کیا ہوگا؟ کہا کہ یادرکھو! ایک کشتی تھی' اس میں کچھ لوگ سوار ہوئے' کچھ اوپر کے تختے میں بیٹھ گئے' کچھ نیچے کے تختے میں بیٹھ گئے' جو نیچے والے تھے انہیں پانی کی ضرورت ہوئی تو وہ اوپر پانی لینے کے لیے گئے' اوپر والوں نے کہا کہ ادھر مت آیا کرو' ہمیں اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ غور فرمایئے گا ایک ایک لفظ' یہ مثال نبوی ﷺ پیش ہے۔ اِن نیچے والوں نے ان اوپر والوں سے کہا کہ اگر تم ہمیں اس طرح پانی نہ لینے دوگے تو پانی کی تو بہر حال ہماری ضرورت ہے' اسے تو پورا کرنا ہے' اور کوئی طریقہ نہیں ہوگا' تو ہم نیچے کشتی میں سوراخ کرکے پانی لے لیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان کو پانی دیدو' اگر انہوں نے کشتی میں سوراخ کرلیا' تو نیچے والے اور اوپر والے دونوں ڈوب جاؤ گے۔ عزیزانِ من! صحیح حدیثیں تو جوہر کی طرح چمکتی بتادیتی ہیں کہ حضور ﷺ کا یہ

ارشاد ہے۔ چودہ سوسال پیشتر کہا کہ یاد رکھو! انہیں پانی دیدو، ان کی ضروریات پوری کر دو ورنہ انسان ہے مجبور ہو جائے گا، انہوں نے کشتی کے اندر سوراخ کر دیا تو اوپر والے اور نیچے والے دونوں ہی پھر غرق ہو جاؤ گے۔ الزُّمَر 450

قیامت کے روز رونما ہونے والے دور کی ترجمانی اور اس کے برپا ہونے کا وقت

عزیزانِ من! یہ ہے وہ دور جو میری سمجھ میں آتا ہے کہ جو القیمۃ کہا ہے وہ ہے کھڑے ہونا۔ اور میں نے کہا ہے کہ اس کے آخر میں جو 'ۃ' لگی ہوئی ہے گرامر والے جانتے ہیں، اس کے معنی ہوتا ہے کہ ''یکلخت کسی چیز کے لیے ابھر کر کھڑے ہو جانا''، لیکن کہا ہے کہ یہ تب ہوگا جب یہ ارض کی زندگی کا نظام بھی قوانینِ خداوندی کے تابع ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ کب رونما ہوگا، کس دن ہوگا؟ فرمایا يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) جس دن خدا کی اس ربوبیت کا نظام قائم کرنے کے لیے عالمگیر انسانیت اٹھ کھڑی ہوگی۔

اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ عالمگیر سطح پر انسانیت اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے کب اٹھ کھڑی ہوتی ہے

چودہ سوسال پہلے اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ يَقُوْمُ النَّاسُ (83:6) الناس اٹھ کھڑے ہونگے یہ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) ربوبیتِ خداوندی کو عالمگیر کرنے کے لیے ہے۔ یہی قام ہے، یہی جسے القیمۃ کہا ہے پھر الناس کھڑے ہونگے، پوری انسانیت تنگ آ کر کیونکہ ان کو پانی نہیں دیا گیا تھا، وہ اٹھ کھڑے ہونگے۔ کاہے کے لیے اٹھ کھڑے ہونگے؟ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) خدا کی ربوبیت کو عالمگیر کرنے کے لیے جب یہ پوری انسانیت اٹھ کھڑی ہو جائے گی، اس دن یہ آ جائے گا۔ کہا ہے کہ اس سے پہلے ہی یہ کچھ کر لو ورنہ اس طریق سے اگر یہ کچھ ہوا تو محاورے میں جیسے کہتے ہیں کہ 'یاد رکھو! قیامت آ جائے گی'۔ کہا کہ ایسا نہ ہونے دو، اس سے پہلے ہی یہ جو تفاوت اور یہ تفرقہ ہے، اسے مٹاؤ، ان کو پانی لینے دو۔ اس حدیثِ نبویؐ میں مثال بھی پانی کی دی ہے کہ اوپر اور نیچے کا طبقہ دونوں اس کے محتاج ہوتے ہیں، اس میں امیر اور غریب کا فرق ہی نہیں ہوتا اور ضرورت ایسی ہوتی ہے کہ اس کو روک ہی نہیں سکتے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (21:30) زندگی کا مدار پانی پہ ہے۔ تو مدارِ حیات جس چیز پہ ہے، حضور ﷺ نے اس کی مثال دی ہے کہ وہ پھر تنگ آ کر اس چیز کے اوپر جب اتر آئے تو پھر یاد رکھو! اوپر نیچے والے دونوں ڈوب جاؤ گے تو انہیں ایسا مجبور نہ کرو کہ وہ کشتی میں سوراخ کر لیں۔ اور قرآن حمید نے جو یہ کہا تھا، میں سمجھتا ہوں کہ حضور ﷺ نے اسی کی تفسیر بیان فرمائی تھی کہ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ[1] (83:6)۔ اب یہاں کہا ہے کہ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (39:67) وہ شرک سے بہت دور اور بلند ہے۔

---

[1] اور اس طرح وہ انقلابِ عظیم واقع ہوگا جس میں عالمگیر انسانیت خدا کا نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوگی (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص1426)

قیامت کے روز صور پھونکنے کی اصطلاح کا قریب تر قرآنی مفہوم

450الزُّمَر

آگے کہا ہے کہ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ (39:68)۔ ہمارے ہاں ''نفخِ صور'' وغیرہ کے متعلق بھی تصور یہ ہے کہ مرنے کے بعد' قیامت کے دن' پھر ایک صور پھونکا جائے گا' جس کو ہم بگل کہتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ لفظ اس لیے بھی آتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ پہلا صور پھونکا جائے گا تو اس میں سب بیہوش ہوجائیں گے' پھر دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو پھر سارے زندہ ہوجائیں گے' اٹھ کر کھڑے ہوجائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جو چیزیں قیامت کے متعلق ہیں' یہ اسی طرح سے ہوں' وہاں جس انداز سے کچھ ہوگا' ہم شعور کی موجودہ سطح پہ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے' اس کو سمجھ نہیں سکتے کہ وہ کیسے ہوگا' اس پہ ایمان ہی لاسکتے ہیں کہ اس طرح سے ہوگا لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے' جس سیاق (Context) سے' پیچھے سے' یہ چیز چلی آرہی ہے' اس میں تو یہ وہی جو عالمگیر انسانیت کا قیام ہے' انسانیت کا جو اٹھ کھڑے ہونا ہے' غلط نظام کے خلاف جو بغاوتِ عالمینی ہے' یہ اس سے متعلق سب چیز ہے۔ عزیزانِ من! یہ جو ''صور'' ہے یہ صورت کی بھی تو جمع ہوسکتی ہے' جس کے معنی ''پیکر'' ہے۔ یہ انسانیت' نوعِ انسانی جو زندہ انسانوں کی بجائے پیکرانِ آب و گل رہ گئے ہیں اور نفخ کے معنی ہوتا ہے ''اس میں روح پھونک دینا''۔ اس جمہور کے اندر جب یہ روح پھونکی گئی' اس احساس سے کہ ساری دنیا کے رزق کے چشموں کے اوپر اپنا قبضہ جمانے والے کون ہوتے ہیں اور اس طرح سے ہم سے اپنی خدائی منوانے والے' جب اس احساس کی جو توانائی ہے' وہ ان پیکرانِ آب و گل کے اندر آئے گی تو پھر اس وقت ان کو اندازہ ہوگا اور اس وقت نظر آتا ہے کہ ''انسانیت یکلخت اٹھ کھڑی ہوگی'' وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ [1] (39:68)۔ پہلی دفعہ ہجوم کے ساتھ کھڑے ہونے کے لیے تو یہ بتایا ہے کہ حواس باختہ ہوجانے والی جسے بات کہتے ہیں' وہ ہے ''صعق'' اور اس کے معنی یہ ہوتا ہے کہ ''بالکل حواس باختہ ہوجائیں گے''۔ اور واقعی یہ ایک عجیب منظر ہوگا۔ اگر انسانوں نے اس سے پہلے نہ روک لیا' اس غلط نظام کو نہ ختم کیا تو اس نظام کو الٹنے کے لیے عالمگیر انسانیت اٹھ کھڑی ہوگی تو پھر یقیناً ایسی صورت میں قیامت برپا ہوگی جس میں لوگ حواس باختہ ہونگے اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ [2] (39:68)' سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اپنے آپ کو خداوندی نظام وقوانین کے مطابق رکھا ہوا ہوگا' وہ تو حواس باختہ نہیں ہونگے' ان کو تو معلوم ہوگا کہ کیا ہو رہا ہے' کیا ہونا چاہیے۔

---

[1] جب اس انقلاب کے لیے پہلا بگل بجے گا' تو پستیوں اور بلندیوں (ارض وسما) میں سب حواس باختہ ہوجائیں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1085)۔

[2] اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ سے مراد بلا استثناء بھی ہوسکتا ہے لیکن آیت (27:87) میں قرآن نے جو استثناء خود کی ہے' اس کے پیش نظر مندرجہ بالا مفہوم کو ترجیح دی گئی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1085)۔

آخر کار اس ارض وسما میں توحید کا یہ روشن چراغ جلوہ گر ہو کر رہے گا

450الزُّمَر

کہا ہے کہ ثُمَّ نُفِخَ فِيۡهِ اُخۡرٰى (39:68) اس کے بعد پھر اس انقلاب کے لیے بگل بجے گا یعنی اس کے بعد پھر جب دوسری دفعہ یہ توانائیاں ابھریں گی تو فَاِذَا هُمۡ قِيَامٌ يَّنۡظُرُوۡنَ (39:68)۔ یہاں وہی ''قیام'' ہے۔ تو یہ وہ قیام ہوگا جس کو عالمگیر انسانیت دیکھنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔ یہ جمہور، یہ بے کس و بے بس انسان، جن کو پانی لینے سے روکا گیا تھا، کب تک صبر کر سکتے تھے، یہ الناس، یہ جمہور، اُس وقت اٹھ کھڑے ہونگے۔ پھر کیا ہوگا؟ پھر کائناتی قوانین خدا کے ایک ہاتھ میں اور ارض کے قوانین اس کے دوسرے ہاتھ میں ہونگے، یہ توحید ہوگی یعنی دونوں جگہ خدا تعالیٰ کے قوانین نافذ العمل ہونگے، یہ نظام اس دنیا میں قائم ہوگا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ عزیزانِ من! قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے، پوچھیے نہیں کیا آیت ہے! کہا ہے کہ وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا (39:69) یہ زمین تیری ربوبیت دینے والے خدا کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ عزیزانِ من! یہ قیامت تک کی بات تو نہیں ہو سکتی، وہ تو ارض کی بات کہہ رہا ہے۔ کیا نقشہ سامنے آتا ہے؟ یہ کہ انسانوں کو مجبور مت کرو کہ تنگ آ کر یہ یکلخت بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ یہ اٹھ کھڑے ہونگے تو یہ سلسلہ تہس نہس ہو جائے گا لیکن اس کے بعد آخر الامر نتیجہ پھر یہ چیز ہوگی۔ ان کا قیام جو ہوگا، توحید جو ہوگی، خدا کے قوانین کی کارفرمائی جو ہوگی، وہ خارجی کائنات میں بھی اور اس ارض کے اندر بھی ہوگی۔ کہا ہے کہ وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا (39:69) اُس وقت، زمین (انسانی معاشرہ) خدا کی عالمگیر ربوبیت کے نور سے جگمگا اٹھے گا۔ عزیزانِ من! یہاں بھی رب کا لفظ آیا ہے، ساری جگہ رب کا لفظ چلا آ رہا ہے یعنی یہ ربوبیت ہے جس کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ تیرے خدا کے نظامِ ربوبیت سے یہ ارض جگمگا اٹھے گی۔ کیا لفظ ہے صاحب! اس وقت تو تاریکیاں ہی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں، روشنی کی کرن کہیں نظر نہیں آتی۔

قرآنِ حکیم کی ایک قابلِ غور آیت کہ خدا اور اس کے ملائکہ یہاں جلوہ گر ہونگے اور جہنم بھی ساتھ ہوگی

بات کچھ دور چلی جائے گی لیکن میں نے، جیسا عرض کیا تھا، پتہ نہیں پھر اس قسم کے مواقع آتے ہیں یا نہیں:

'انیس جمع ہیں احباب' حالِ دل کہہ لے

اس لیے جو چیز سامنے آتی ہے اشارتاً ہی سہی، اس کا ذکر ضروری نظر آتا ہے۔ ہم تو ذہن میں یہی سمجھتے ہیں کہ وہاں جانا ہے، یہ ہمیشہ کہتے ہیں کہ خدا کے ہاں جانا ہے۔ ٹھیک ہے، ہمارا ایمان ہے کہ خدا کے ہاں جانا ہے، آخرت کی زندگی ہے، ہر چیز کا حساب بھی دینا ہے، یہ سب کچھ ہے لیکن قرآن مجید سے تو کچھ نقشہ اور بھی نظر آتا ہے۔ کہا ہے کہ وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا (39:69)۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ میں نے عرض کیا ہے کہ ہم تو کہتے ہیں کہ ہم نے وہاں اس کے ہاں جانا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ رَبُّكَ وَالۡمَلَكُ صَفًّا صَفًّا

((89:22 خدا اور اس کے ملائکہ صف بستہ یہاں آئیں گے۔ جسے On the Spot Decision (موقع پر فیصلہ کرنا) کہتے ہیں وہ 450 الزُّمَر لیا جائے گا۔ یہاں ہے کہ وَّ جَآءَ رَبُّکَ ((89:22 اور تیرے خدا کا نظام ربوبیت زمین پر متمکن ہوجائے گا۔ عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ سے یوں نہ گزر جایئے' کھڑے ہوکر سوچیے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کہتا ہے کہ وَّ جَآءَ رَبُّکَ وَالۡمَلَکُ صَفًّا صَفًّا [89:22] وَ جِایۡٓءَ یَوۡمَئِذٍۭ بِجَھَنَّمَ ((89:23 اور تیرے خدا کا نظامِ ربوبیت' کائناتی قوتوں کو' صف در صف' اپنے جلو میں لیے' زمین پر متمکن ہوگا ❶ اور اس جہنم کو بھی یہیں اپنے ساتھ لے آئے گا۔ ❷

ایمان کی قوت کے متعلق ہم کیا جانیں' ہمیں کیا خبر کہ کیا ہے راہ و رسمِ شاہ بازی!

یہ ڈرامہ تو کچھ یہاں ہی کھیلے جانے والا نظر آ رہا ہے کہ وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّہَا ((39:69 (یہ زمین تیری ربوبیت دینے والے خدا کے نور سے جگمگا اٹھے گی)۔ ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ جو بات تھی' وہ نفخِ صور کی تھی' پیکروں کے اندر نئی توانائیاں پھونکتے چلے جانے کی تھی' وہ جن کو اس طرح سے بالکل کچلا ہوا ہے' جسے پیکرِ آب و گل کہتے ہیں' ان کے اندر ایک توانائی آتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کس چیز کی وہ توانائی ہوتی ہے؟ وہ ایمان کی توانائی ہوتی ہے' یقین کی توانائی ہوتی ہے۔ اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں یوں کہیے کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

یہ "یقین پیدا کرنا"' یہ "بال و پرِ روح الامیں پیدا کرنا" کچھ چھوٹی قوت نہیں ہے۔ عزیزانِ من! ہم نے تو یہ قوتِ ایمان نہ اپنے ہاں رکھی ہے' نہ کبھی دیکھی ہے کہ ایمان کی قوت کیا ہوتی ہے' ہم اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ یہ بڑی قوت ہوتی ہے۔

ربوبیتِ عالمینی کو دیکھنے کے بعد انسان آزادی سے بے ساختہ پکار اٹھے گا: الحمدللہ

کہا ہے کہ وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّہَا ((39:69 اُس وقت زمین یعنی انسانی معاشرہ' خدا کی عالمگیر ربوبیت کے نور سے

---

❶ یعنی اس نظام میں فطرت کی قوتوں کا ماحصل کسی خاص گروہ یا خاص قوم کی قوت اور دولت میں اضافہ کرنے کے بجائے عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لیے وقف ہوگا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1448)۔

❷ یعنی اس وقت صورت یہ ہے کہ عوام ان کی سلگائی ہوئی آگ میں تو جل رہے ہیں لیکن یہ لوگ انہیں معلوم نہیں ہونے دیتے کہ یہ آگ لگائی ہوئی کس کی ہے۔ اُس وقت اِن کا یہ فریب بے نقاب ہوجائے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1448)۔

جگمگا اٹھے گا اور وَجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا ((89:22۔(اور تیرے خدا کا نظامِ ربوبیت کائناتی قوتوں کو قطار در قطار اپنے ساتھ لیئے زمین پر متمکن ہوگا یعنی اس نظام میں فطرت کی قوتوں کا ماحصل کسی خاص گروہ یا خاص قوم کی قوت اور دولت میں اضافہ کرنے کے بجائے، عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لیے وقف ہوگا)۔ جو میں نے کہا ہے کہ یہ یہاں کی ارض ہے جس کے متعلق قرآن حکیم یہ کچھ کہہ رہا ہے۔ اور اب آپ ایک دو حوالے لیتے جائیے۔ جہاں کہا ہے کہ وہ جہنم بھی یہاں ساتھ ہی آ جائے گی۔ دوسری جگہ ہے کہ اتنا ہی نہیں کہ وہ صرف جہنم ہی لے کر آئے گا، جنت بھی ہے۔ کہا ہے کہ اس وقت جب یہ نظامِ ربوبیت خداوندی عالمینی حیثیت اختیار کر لے گا، زمین تیرے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی، تو اس وقت وَقَالُوا ((39:74 اپنے اعمال کے درخشندہ نتائج کو دیکھ کر انسان یہ کہیں گے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَہٗ ((39:74۔(فی الحقیقت در خور ہزار حمد وستائش ہے خدا کا قانونِ مکافات جس کے مطابق خدا کے تمام وعدے پورے ہوئے)۔ دیکھیے! الحمد للہ سے قرآن کریم شروع ہوا تھا، یہاں کیا ہے کہ اُس وقت لوگ کہیں گے کہ ہاں وجہء باعثِ حمد وتوصیف وہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے جس کی ربوبیتِ عالمینی اس طرح ہمارے سامنے آئی اور صَدَقَنَا وَعْدَہٗ ((39:74 جو وعدہ اس نے کیا تھا، اُسے سچ کر دکھایا ہے۔ وہ وعدہ کیا تھا اور اس نے کیا سچ کر دکھایا تھا؟ کہا ہے کہ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ)(39:74۔ اب دیکھیے یہاں وہی ارض ہے کہ ''ہمیں اس ارض کا وارث بنا دیا'، ہمیں اس ارض کا مالک بنا دیا۔ اب تو مالک کوئی اور ہوتے ہیں، مزارع اور ہوتے ہیں اور پھر سب کی سب ہی کسی اور کی ملکیت ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّۃِ حَیْثُ نَشَآءُ ((39:74 اور ہمیں دنیا میں مملکت اور حکومت عطا ہوگئی۔ یہاں ساتھ ہی جنت کہا ہے کہ یہاں وہ جنّتی نقشہ پیدا ہو گیا ہے اور ایسی آزادی مل گئی ہے کہ ہم اس میں جہاں چاہیں رہیں سہیں۔ عزیزانِ من! اس میں ایک بڑی چیز جو بتائی ہے وہ یہ ہے کہ اب کسی قسم کی کوئی ایسی ناجائز پابندی ہمارے اوپر نہیں ہے، جہاں ہمارا جی چاہتا ہے ہم اس کے اوپر جا سکتے ہیں۔ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّۃِ حَیْثُ نَشَآءُ ((39:74 اور ہمیں دنیا میں حکومت مل گئی اور اس میں ایسی آزادی مل گئی کہ ہم اس میں جہاں چاہیں رہیں۔ یہ اتنی Freedom (آزادی) ہے۔

جنت میں آدم کے لیے بیان کردہ ان سہولیات کا تذکرہ جو قانون کی حکمرانی کا نتیجہ ہونگی

پہلی چیز جو ہے، اسے تو آپ انگریزی میں ہی سمجھیں گے۔ وہ دو الفاظ [1] بڑے عمدہ ہیں۔ پہلی چیز Freedom from

---

[1] ایک ہے Freedom From اور دوسرا ہے Freedom to۔ یہ بات Erick Fromm (1900-1980) نے اپنی کتاب Escape From Freedom (آزادی سے فرار) میں کی ہے۔ دلچسپی رکھنے والے قارئین اس کا چوتھا باب The Two Aspects of Freedom For Modern Man ضرور پڑھیں۔ اس کتاب کا ساتواں ایڈیشن (ڈسکس)، مارچ 1968ء میں Holt, Rinehart &Winston,Inc.Ny سے چھپا۔

wants (احتیاجات سے خلاصی) ہے' قرآن حمید نے یہ کہا ہے کہ تمہیں وہاں جنت کے اندر Freedom (آزادی) ملے گی۔ وہ جو 450 الزُّمَر Freedom (آزادی) ہوتی ہے تو ایک تو یہ Freedom from wants (احتیاجات سے گلوخلاصی) ہے۔ یہ کس چیز کی Freedom (آزادی) ہے؟ جنت کے متعلق تو یہ بتایا گیا ہے' آدم سے کہا یہ گیا ہے کہ اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَ لَا تَعْرٰی ٥ وَ اَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَ لَا تَضْحٰی ((20:118:119 اس میں تمہیں نہ تو روٹی کی فکر ستائے گی' نہ لباس کی تنگی ہوگی' نہ مکان کی احتیاج ہوگی۔ یہ تمام چیزیں جتنی بھی ہیں' جنت میں ہر ایک کو نصیب ہونگی۔ یہ قرآن حمید جنت کے متعلق کہہ رہا ہے۔ یہ ہے ان کے لیے جو ہمارے قانون کو سامنے رکھے گا اور اس کے مقابلے میں وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا ((20:124 اور جو ہمارے ان قوانین سے اعراض برتے گا' اس کی روٹی تنگ کردیں گے' اس کی معیشت تنگ کردیں گے۔ یہاں معیشت (Economics) کا ذکر آرہا ہے۔ جو ان قوانین سے اعراض برتے گا تو اس کو رزق کی تنگی ہوگی۔ چلیے صاحب! ان غریبوں کو' بھوکوں کو' اطمینان دلا دیا کہ کوئی بات نہیں' یہاں اگر غریبی ہے تو کوئی بات نہیں' چار دن کی تو یہ بات ہے' ان کو یہ عیش کر لینے دیجیے' اس کے بعد اصلی زندگی تو وہ آنی ہے' تو اس زندگی کے اندر تو پھر راوی غریبوں اور مفلسوں کے لیے عیش ہی لکھتا ہے' یہ امیر سب جہنم کے کندے ہیں' تمہاری وہاں موج ہوجانی ہے' تمہیں وہاں جنت ملنی ہے' وہ تمہارے حصے میں ہے حالانکہ وہاں یہ کہا ہے کہ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا ((20:124 اس دنیا کے اندر ان کی روٹی' ان کی روزی' تنگ ہوجائے گی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد کہ روٹی کی احتیاج انسان کو کفر کی حد تک لے جاتی ہے اور صدرِ اوّل میں قائم کیا گیا نظام وہ ضابطۂ قانونِ خداوندی ہے جسے قرآنِ کریم کہا جاتا ہے

آگے کہا ہے کہ وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ((20:124 اور جو یہاں کا اندھا ہوگا' وہاں بھی اندھا ہی اٹھے گا۔ وہ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ روٹی کی جو احتیاج ہے' وہ انسان کو کفر تک لے جاتی ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ جو ارض ہے' آپ تفسیروں کے اندر ہر جگہ یہی دیکھیں گے کہ اس کے معنی ارض الجنت ہے' وہ جنت کی زمین وہاں جا کر ملے گی۔ یہ یہاں کی زمین ہے' یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے اسلام کے صدرِ اول میں جتنا نظام قائم کیا گیا تھا' یہ وہ بات ہے۔ یہ تمام جو ساری کی ساری جدوجہد کی گئی تھی اس کا نتیجہ کیا تھا جو خدا نے ان لوگوں کو بطور انعام گنایا ہے کہ تم نے بیشک بڑی جدوجہد کی' بڑی تکالیف اٹھائیں' بڑی مشقتیں برداشت کیں' لیکن آخر میں تم نے دیکھا کہ وَ اَوْرَثَکُمْ اَرْضَھُمْ وَ دِیَارَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ ((33:27 یہ تمام جتنے تمہارے مخالفین نے غلط نظام قائم کیے ہوئے تھے' تمہیں ہم نے ان کی زمینوں کا مالک بنا دیا' ان کی بستیوں کا مالک بنا دیا' ان کے اموال و دولت

کا مالک بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ ((33:27 ان زمینوں کا بھی جہاں ابھی تک تمہارے پاؤں نہیں پہنچے ہیں وہ بھی تمہارے زیرِ قدم آنے والی زمینیں ہیں' یہ اس صحیح نظام کا' اس صحیح یقین اور ایمان کا نتیجہ ہے۔ ان پیکرانِ آب و گِل میں اگر وہ قوت اور توانائی ہوئی تو یہ کہا ہے کہ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ((83:6 عالمگیر انسانیت خدا کا نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ)(39:69۔ اُس وقت' زمین (انسانی معاشرہ) خدا کی عالمگیر ربوبیت کے نور سے چمک اٹھے گا اور ہر معاملہ خدا کے ضابطہء قانون کے مطابق ہوگا۔ یہ یہاں جو الکتاب آیا ہے یہ یہی ہے' یہ ضابطہء قانونِ خداوندی ہے' جسے قرآن کریم کہا جاتا ہے۔ یہ ہوگا ضابطہ جو وہاں قائم کیا جائے گا۔

وحی کے مطابق نظامِ حیات قائم کرنے کا نتیجہ

عزیزانِ من! شروع سے یہی کچھ قصہ چلا آ رہا ہے۔ وَ جِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ ((39:69 اقوامِ عالم کو اسی ضابطہء قانون کے مطابق ترفع وشوکت نصیب ہوئی اور یہاں اس ضابطہء قانون کا نام قرآن کریم ہے۔ ہر نبی کو یہی ضابطہ دیا گیا تھا تو پھر اسی کے مطابق ان کی اقوام کو پہلے ترفع نصیب ہوا' ترقی نصیب ہوئی' شوکت نصیب ہوئی' اسی کے چھوڑ دینے سے ان کی تباہیاں ہوئیں' ان کی بربادیاں ہوئیں۔ تاریخ اس پہ شہادت دیتی ہے کہ حق کے ساتھ ہر ایک کا فیصلہ ہوا۔ اور یہ بھی کہ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ((39:69 اسی طرح سے جب یہ نظام قائم ہوگا تو کسی کے اوپر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا۔ پھر ہوگا کیا؟ عزیزانِ من! دو الفاظ میں ساری بات سمجھا دی۔ کہا ہے کہ وَ وُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ((39:70 ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔ یہ ہے نظامِ عدل۔

قرآنِ حکیم نے انسانی محنت کے عوض معاوضہ کی بجائے ماحصل کا اصول متعارف کرایا ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ معاوضہ کا لفظ بھی ہمارے ہاں نظامِ سرمایہ داری کی پیدا کردہ ہے اس لیے معاوضہ وہ متعین کرتے ہیں جو اوپر بیٹھے ہوتے ہیں کہ (مثلاً) تمہیں تین روپے روز ملیں گے اور تمہیں دس جو تمہاری محنت کا معاوضہ ہے۔ قرآن حکیم نے معاوضہ نہیں کہا بلکہ وَ وُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ((39:70 کہا ہے۔ یہ وہ ہے جسے آپ محنت کا ماحصل کہیں گے: لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ((53:39 یہ بڑا باریک لیکن بڑا گہرا فرق ہے'' محنت کا یہ سارا ماحصل محنت کش کا حصہ ہے''۔ معاوضہ ان کا مقرر کردہ ہوتا ہے جتنا جی چاہے یہ مقرر کریں۔ یہاں اس کو عدل کہتے ہیں کہ اس مقرر شدہ معاوضے کے مطابق پیسے دیدینا' خواہ اس کا گزر اوہ ہو یا نہ ہو۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ یہ ظلم ہے۔ وہ تو مَا سَعٰی ((53:39 محنت کے ماحصل کا مالک ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ نہیں کہ پوری محنت وہ کرے اور

جواس کا ماحصل ہے' اس میں سے کچھ اس کو دے اور باقی کوئی اور لے جائے۔ مَا سَعٰی ((53:39 کے یہ معنی نہیں ہیں۔ 450الزُّمَر

خدا تعالیٰ کے نزدیک محنت کے ماحصل کی تفصیل حضرت موسیٰ ؑ کے قصے میں در آئی ہے

کہا ہے کہ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ((39:70 ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا صلہ ملے گا۔ حضرت موسیٰؑ کے قصے میں اس کی تفصیل آتی ہے۔ صاحب ضربِ کلیمؒ کی داستاں بیان کرنے والا خدا ہے' اس سے زیادہ دلنشیں داستاں کوئی نہیں ہوسکتی۔ کہا ہے کہ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ((20:13 سنو! جسے کہتے ہیں کہ دل کے کانوں سے سنو' کان لگا کر سنو جو ہم کہہ رہے ہیں۔ ایک بات یاد رکھو کہ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ ((20:14 عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ اس میں کتنا زور ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا((20:14 ہمارے دستخطوں اور مہرِ عدالت سے جاری ہوا۔ اب بھی آپ وہ دیکھتے ہیں وہ "انا یعنی ہم" لکھتے ہیں' جتنے وہ حاکم ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہاں تم دیکھو گے' وہ پکار رہا ہے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ((79:24 تمہارا سب سے بڑا رب میں ہوں۔ فرعون کا دعویٰ یہ تھا۔ کہا ہے کہ پہلی بات یہ سن لو کہ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا ((20:14 ہمارے سوا کوئی حاکم نہیں ہے اس لیے فَاعْبُدْنِيْ ((20:14۔ عبودیت کے معنی یہاں واضح ہو گئے کہ ہماری محکومیت اختیار کرنی ہے۔ کہا ہے کہ تمہیں ہم نے اپنے ایک کام کے لیے چن لیا ہے۔ یعنی اَنَا اخْتَرْتُكَ ((20:13۔ ہمارا ایک بہت بڑا کام ہے' وہ ایک کام رکا ہوا تھا ہم نے تمہارے ذریعے وہ پورا کرنا ہے۔ کیا کرانا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا)(20:15 یہ دیکھیے وہ الساعت کے معنی بھی قیامت کیے جاتے ہیں' یہ یہاں وہ کام موسیٰؑ سے کہہ رہے ہیں کہ وہ ایک آنے والا انقلاب ہے' اس وقت تو وہ غیر محسوس طور پر چلا آ رہا ہے کیونکہ ایک ہی دن کے اندر انقلاب برپا نہیں ہوگا بلکہ پہلے تو وہ غیر محسوس طور پر ذہنوں کے اندر' ذہنیتوں کے اندر' احساسات کے اندر' نشوونما پاتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ(20:15 وہ آنے والا انقلاب نشوونما پا رہا تھا' مخفی طور پہ چلا آ رہا تھا۔ اَكَادُ اُخْفِيْهَا ((20:15 اب ہم نے چاہا ہے کہ وہ ذرا محسوس طور پر سامنے آ جائے' اس لیے وہاں فرعون کے ہاں جاؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ انقلاب آ جائے گا تو اس انقلاب کا نتیجہ کیا ہوگا۔ عزیزانِ من! جواب میں دو الفاظ ہیں۔ کہا ہے کہ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ((20:15 تا کہ ہر محنت کرنے والے کو اس کی محنت کا ماحصل مل جائے' موسیٰؑ! جاؤ فرعون کی طرف۔ دیکھتے ہیں انبیائے کرامؑ کا ہے کے لیے آیا کرتے تھے؟ یہ انقلابات خداوندی کیا ہوتے تھے؟ فرعون کی طرف کا ہے کے لیے یہ وہاں گئے؟ کہا ہے کہ جاؤ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ((20:15۔ یہاں وہی کچھ کہا ہے۔

قرآن فہمی کا انداز تصریفِ آیات ہے اور نظام کا تصور اجتماعی ہے جس میں ہر شخص کو جنت و جہنم میں اس کے کام کا پورا پورا صلہ ہے مگر عذاب کے وارد ہونے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں

عزیزانِ من! Cross References (تصریفِ حوالہ جات) لکھتے چلے جایئے گا' شاید پھر یہ کراس ریفرنس (تصریفِ حوالہ جات) بتانے والا بھی آپ کے پاس نہ رہے۔قرآن مجید انہی کراس ریفرنسز سے' تصریفِ آیات سے' سمجھ میں آتا ہے یعنی ایک آیت کی تفسیر دوسری آیات سے۔آپ دیکھ رہے ہیں میرا یہ جو انداز ہے وہ آپ کے سامنے ہے' اور اس سے کیسے بات واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔کہا ہے کہ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (39:70)۔ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا صلہ ملے گا کسی کا کوئی کام نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پائے گا۔ہم جانتے ہیں کہ کوئی کتنا کام کرتا ہے' اس کا ماحصل کیا ہے' یہ اس کو مقرر کرنے والے کون ہوتے ہیں۔عزیزانِ من! یہ کچھ نقشہ یہاں ہوگا۔اور اس کے بعد یہ غلط نظام قائم کرنے والے جو آج ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں' یہاں کی جنت کے بھی اور وہاں کی جنتوں کے بھی' ان کے لیے کہا ہے کہ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا (39:71)۔وہ جہنم کی طرف ہنکائے جائیں گے۔عزیزانِ من! اسلام کے اس سارے نظام کا تصور اجتماعی ہے' انفرادی نہیں ہے' ایک فرد ذمہ دار نہیں ہوتا۔اس لیے کہا ہے کہ جہنم کی طرف ہنکائے جائیں گے۔سیق کے معنی ''ہنکائے جائیں گے'' ہوتا ہے' زمرًا اجتماعی طور پر' جماعتی طور پر جانا ہوتا ہے۔کہا ہے کہ حَتّٰىٓ اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (39:71)۔وہ وہاں جائیں گے تو ان کے لیے دروازے کھولے جائیں گے۔

کہا ہے کہ وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ (39:71) اور اُن کے محافظ ان سے کہیں گے۔میں نے آپ کو بتایا تھا کہ قرآن کریم نے دو باتیں کہی ہیں: ایک تو یہ کہ عذاب سے پہلے اس قوم کی ذہنی سطح اتنی بلند ہو کہ وہ یہ بات سمجھ سکے اور دوسرے یہ کہ یہ بات ان تک پہنچا دی گئی ہو۔میں نے بہت سے اس کے ریفرنسز دیئے تھے۔یہاں بھی وہی آتا ہے کہ وہاں جائیں گے' اس کا پھاٹک داخل ہونے کے لیے کھولا جائے گا' وہ جو وہاں چوکیدار ہونگے' پاسبان ہونگے' دربان ہونگے' وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم جو جہنم میں اس طرح سے داخل ہو رہے ہو' سنو! اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (39:71) او! کیا تمہارے پاس خدا کے پیغامبر نہیں آئے تھے' انہوں نے خدا کے قوانین تمہارے سامنے پیش کر کے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ تمہارے اس غلط نظام کا نتیجہ یہ جہنم ہوگا۔تمہیں ایک دن اپنے ان اعمال کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا' وہ نتائج تمہارے سامنے آ کر رہیں گے۔کیا انداز ہے بات کرنے کا! قَالُوْا بَلٰى (39:71) وہ انکار نہیں کر سکیں گے۔وہ کہیں گے کہ ہاں! یہ سب کچھ ہوا تھا۔قیامت کی بات ہی قرآن کریم نے ایک ایسی بتائی ہے کہ وہاں کوئی شخص جھوٹ نہیں بول سکے گا' کہنا پڑے گا کہ ہاں آئے تھے۔یہاں تو آسانی سے کہہ دیا جا سکتا ہے کہ ''جی نہیں' قرآن پاک

الزُّمَر 450 وہ کہیں گے قَالُوْا بَلٰی ((39:71 ہاں! یہ سب کچھ ہوا تھا۔ وَلٰکِنْ حَقَّتْ کَلِمَۃُ الْعَذَابِ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ((39:71 بات یہ ہے کہ وہ سب کچھ بتا دیا گیا تھا' جو کچھ کہا گیا تھا' انہوں نے آ کر ہم سے کہا تھا' ہمارے ساتھ ایک ایک بات سچی ثابت ہو کر رہی' کوئی بات ایسی نہیں ہے جو غلط ہوا اور یونہی دھاندلی سے ہمارے اوپر وارد کر دی جائے۔ قِیْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَکَبِّرِیْنَ ((39:72 ان سے کہا جائے گا کہ پھر جب یہ شرط بھی پوری ہو گئی تھی' تم سمجھتے بھی تھے' تمہیں بتا بھی دیا گیا تھا' Warn (وارن) بھی کر دیا گیا تھا' تو اب باقی کیا رہ گیا ہے۔ پھر یہ ہے جہنم اور یہ ہے ٹھکانہ۔ جہنم کے دروازے میں داخل ہو جاؤ اور خود دیکھ لو کہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے والوں کا ٹھکانہ کیسا بُرا ہوتا ہے۔ یہ کن کا ٹھکانہ ہے؟ کہا ہے کہ مُتَکَبِّرِیْنَ ((39:72 ان کا جو ''بہت بڑے پھنّے خاں بنے پھردے ہیگے سی'' کبریائی اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی' اقتدار اپنے ہاتھ میں تھا' اپنے آپ کو خدا سمجھتے تھے۔ نظام الٹے گا تو یہ صورت ہو جائے گی۔ آگے کہا ہے کہ وَسِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّھُمْ اِلَی الْجَنَّۃِ زُمَرًا ((39:73 ان کے برعکس جو لوگ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں گے' انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ دیکھیے! وہاں جنت میں بھی یہ انفرادی چیز نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم میں جہانِ فردا کے متعلق تمام وضاحتیں تمثیلاً بیان کی گئی ہیں

عزیزانِ من! یہ اجتماعی چیز ہے' یہ نظام کی چیز ہے' یاد رکھو! اس میں کہا ہے کہ ڈرو اس آنے والی تباہی سے کہ جب وہ آیا کرتی ہے تو وہ انہی تک نہیں رہا کرتی جنہوں نے ظلم کیا تھا بلکہ وہ سب کو لپیٹ لیا کرتی ہے۔ حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْھَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُھَا ((39:73 چنانچہ جب وہ وہاں آئیں گے تو جنت میں بھی دروازے کھلیں گے' وہاں وہ بات پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی جو اہلِ جہنم سے پوچھی گئی تھی کہ کیا تمہارے پاس پیامبر آئے تھے وہاں تو یہ ہوگا کہ وَقَالَ لَھُمْ خَزَنَتُھَا ((39:73 جنت کے جو دربان ہیں ان سے کہیں گے۔ قرآنِ کریم تمثیلاً یہ ساری چیزیں بیان کرتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ہم یہ ساری چیزیں تمثیلاً دیتے ہیں مثل الجنۃ التی ((13:35 جنت کی مثال یوں ہے کہ تو وہاں ...... پھر وہ اس کے دربان کہیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کہیں گے؟ یہ کہ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ ((39:73 آہاہا! کیا مہمان نوازی ہے! کیا استقبال ہے! کیا Reception (استقبال) ہو رہا ہے! ایک لفظ سَلٰمٌ ہے اس کے معنی سلامتی یا امن ہی نہیں ہیں' ہمارے ہاں تو اس کے معنی سلامتی ہوتا ہے' یہ تو Negative (منفی) چیز ہے' یعنی خطرات سے محفوظ رہنا۔ صرف محفوظ رہنا ہی تو زندگی نہیں ہے۔ سلام کے معنی ہیں ''کسی چیز کی تکمیل ہو جانا''۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ مرغِ مسلّم تو آپ نے سن رکھا ہوگا' یہ کسی چیز کی تکمیل ہو جانا ہے۔ جنت اس کے لیے ہے۔ کہا ہے کہ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ) (39:73 تم پر ہر طرح کی سلامتی ہے۔ قرآن مجید میں طاب کا لفظ

---

❶ جی نہیں' قرآنِ پاک اٹھوالو' کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ آیا تھا اور یہ کہتا ہے کہ جھوٹ بولتا ہے۔

بڑا جامع ہے۔ اس کے معنی ہیں ہر قسم کی خوشگواریاں‘ نفسیاتی طور پر‘ ذہنی طور پر‘ ہر قسم کی خوشگواریاں‘ پاکیزگیاں۔ ان کے لیے یہ لفظ طبتم آتا ہے کہ **فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ** ((39:73 جاؤ تمہیں اس میں رہنا ہے۔ **وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ** (39:74) وہ کہیں گے ساری حمد اس خدا کے لیے ہے جس نے اپنے وعدوں کو یوں سچا کر دکھایا اور ہمیں اس ارض کا وارث بنا دیا جہاں ہمارا جی چاہے پھر سکیں۔ وارث کے معنی ہیں ''صاحبِ اختیار''۔ ہم ایسے ہیں کہ اب یہاں کسی پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت نہیں ہے‘ اتنی آزادی حاصل ہے۔ میں نے پہلے کہا تھا کہ Freedom From Wants (احتیاجات سے گلوخلاصی) تو قرآن حکیم نے کہا تھا‘ اب یہ Freedom to بھی ہے یعنی کرنے کی آزادی بھی ہے۔ یہ ہے وہ آزادی جس کے لیے کہا ہے کہ **نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ**[1] (39:74)

جنت کا سکون انسانی اعمال کا ہی اجر ہوگا

عزیزانِ من! ایک لفظ ہے جو قرآن حکیم جاتے جاتے کہہ گیا ہے ''تے ساڈیاں امیداں نوں ہرا بھرا کر گیا''[2]۔ کہا ہے کہ **فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ** ((39:74 کام کرنے والوں کا یہ کیسا اجر ہے! جس نے یہ کیا نہیں ہے اس کو یہ اجر کیسے مل جائے گا۔ اگر کام کرنے والے کی محنت کو وہ رائیگاں نہیں جانے دیتا تو بلا کام کیے ہوئے جنت بھی نہیں مل سکتی۔ کہا ہے کہ اصول یہ ہے کہ **لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى** ((53:39 یہاں تو محنت کا معاوضہ یا محنت کا ماحصل ملتا ہے۔ یہ ہے **فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ** ((39:74 جنت کام کرنے والوں کا کیسا اچھا معاوضہ ہے‘ نتیجہ ہے!

اب اس سورۃ کی آخری آیت میں کہا ہے کہ **وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ**)(39:75۔ (اور جملہ کائناتی قوتیں‘ اور مدبرات امورِ الٰہیہ خدا کے تختِ اجلال کے گرد احاطہ کیے ہونگے اور اس کے نظامِ ربوبیت کو درخورِ حمد و ستائش بنانے کے لیے نہایت مستعدی سے سرگرمِ عمل۔ اس وقت تمام انسانی امور کے فیصلے حق کے ساتھ ہونگے اور خدا کی ربوبیت عالمینی اس حسن و خوبی سے آشکارا ہوگی کہ ہر ایک کی زبان اُس کی حمد و ستائش میں زمزمہ بار اور نغمہ سنج ہوگی)۔

یہ عزیزانِ من! اس سورۃ الزمر کی آخری آیت ہے۔ ملائکہ‘ عرش‘ اس کے گرد گھومنے والے‘ اور یہ اس کے رب کی سبح کیا چیز ہے؟ ہمارے ہاں تو کہتے ہیں کہ ''تسبیحاں کردے رہندے نیں او تھے'' (وہاں تسبیحیں کرتے رہتے ہیں)۔ بہرحال ہر معاملہ وہاں الحق کے

---

[1] اور ہمیں اس میں ایسی آزادی مل گئی کہ ہم اس میں جہاں چاہیں رہیں سہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔1087)۔

[2] ہماری امیدوں کو ہرا بھرا کر گیا۔

مطابق فیصلہ ہوگا' یہ ہے اس نظام کی لمّ' ہر فیصلہ الحق کے مطابق ہوگا اور الحق قرآنِ کریم ہے۔ قِیۡلَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ)(39:75
اور پھر ہر ایک زبان پہ وہی بات ہوگی جہاں سے قرآن حکیم شروع ہوا تھا: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ o اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ)(1:1-2)۔ (جب انسان اس کارگاہِ کائنات کے نظم و نسق پر غور کرتا ہے تو اس کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہوکر آجاتی ہے کہ اس میں' ہر شے کو وہ سامانِ نشوونما کس طرح بلامزد و معاوضہ ملتا چلا جاتا ہے جس سے وہ اپنے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ اس حیرت انگیز نظامِ ربوبیت کو دیکھ کر ہر صاحبِ بصیرت کی زبان پر بے اختیار کلماتِ تحسین و آفریں آجاتے ہیں اور وہ بلاساختہ پکار اٹھتا ہے کہ ''اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کائنات کی کسی شے کو نہ بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج کے لیے''۔ یہی وہ اربابِ علم و ایقان ہیں جو صحیح معنوں میں خدا کی حمد کرنے والے ہیں)۔

عزیزانِ من! سورۃ الزمر تو ختم ہوئی' اگلے درس میں ہم سورۃ المؤمن لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ



الزُّمَر 450

450الزُّمَـرْ

450الزُّمَر

450الزُّمَرْ

450الزُّمَر

450 الزُّمَر

450الزُّمَـرُ

450الزُّمَر

450الزُّمَـرْ

الزُّمَر 450

450الزُّمَـرُ

الزُّمَر 450

450الزُّمَر

450الزُّمَـرْ

450الزُّمَرْ

450الزُّمَرْ

الزُّمَـرْ 450

450الزُّمَر

450الزُّمَـرْ

450الزُّمَر

450الزُّمَر

الزُّمَـرْ 450

450الزُّمَـرْ

450الزُّمَر

الزُّمَر 450

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔معراجِ انسانیت)